ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸؍ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔ منیجر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۴۰ء	شمار (۲)

جنگ کے آیندہ امکانات (ملاحظات)

جنگ جہاں کہیں بھی ہو، خوفناک چیز ہے، لیکن یہ جنگ جتنی خطرناک ہے، اتنی ہی عجیب بھی ہے، اور "ہٹلر واسٹالین" کے اتحاد نے، امکانات وقیاسات کی دنیا کو اتنا وسیع کردیا ہے کہ ذہن انسانی مشوش ہوکر رہگیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آیندہ کے متعلق کیا حکم لگائے

ہٹلر کے نقطۂ نظر سے

اسوقت قدرتاً ہر شخص کے دماغ میں یہ سوال چکر لگا رہا ہے کہ اس جنگ کا حقیقی مقصود کیا ہے اور روس کیوں یہ چاہتا ہے کہ جرمنی کامیاب ہو، بعض کا خیال ہے کہ گزشتہ اگست میں مابین روس وجرمنی ایک سمجھوتا یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کردینے کا ہوچکا ہے جس کا نام حسب بیان رابن ٹراپ، آر پلین (R. Plan) ہے

اس قیاس کے مطابق، یورپ کے موجودہ جغرافیہ میں جو تبدیلی یہ دونوں چاہتے ہیں اس کو آپ نقشہ میں دیکھئے یعنی فن لینڈ اور ناروے کی سرحدوں کے نقطۂ اتصال سے ایک سیدھا خط جنوب کی طرف بحیرۂ روم تک کھینچا جائے اور اس خط کے مشرق پر جتنے ممالک ہیں وہ روس کے زیر اثر آجائیں اور مغربی جانب کے ممالک پر جرمنی کا اقتدار ہوجائے یعنی بالٹک ریاستیں، مشرقی پولینڈ، رومانیا، بلغاریہ اور یونان کا مشرقی حصہ، سودیٹ یونین میں شامل ہوجائے اور سویڈن، ناروے، ہنگری اور یوگوسلیویا اور مغربی یونان پر نازی حکومت کے اثرات قایم ہوجائیں

جن لوگوں نے یہ قیاس قایم کیا ہے وہ ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جرمنی کا روس کو اس بات کی اجازت دیدینا کہ وہ بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ پر قبضہ کرے، بغیر اس سمجھوتے کے ممکن ہی نہیں کہ اس کے عوض جرمنی کا بھی کوئی حصہ مقرر ہوگیا ہوگا اور وہ حصہ "سویڈن وناروے" ہوسکتا ہے یا ریاستہائے بلقان یا دونوں

اگر یہ کہا جائے کہ ہٹلر نے روس کے ان جارحانہ اقدامات کو صرف اس لئے منظور کیا ہے کہ وہ اس کے عوض روس سے خام پیداوار حاصل کریگا، تو یہ اس لئے درست نہیں ہوسکتا کہ اول تو روس کی خام پیداوار اتنی زاید نہیں کہ وہ کسی اور ملک کو فراہم کرسکے اور دوسرے یہ کہ جرمنی وروس کے درمیان ذرایع نقل وحرکت اس قدر خراب ہیں کہ جرمنی، روسی پیداوار سے کوئی فایدہ اُٹھا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جرمنی نے سودا کچھ اور ہی کیا ہوگا اور وہ سوائے ریاستہائے بلقان اور سویڈن، ناروے کے کچھ نہیں ہوسکتا

اس لئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنی کا آیندہ قدم کیا ہوگا جب تک فن لینڈ کا مسئلہ طے نہیں ہوجاتا اسوقت تک تو جرمنی یونہی خاموش بیٹھا رہیگا، لیکن روس جونہی فن لینڈ کو عبور کرکے ناروے کی سرحد تک پہونچے گا کہ بحیرۂ بالٹک میں جرمنی کی فوجی نقل وحرکت ...

وسویڈن اور ڈنمارک (ریاستہائے اسکنڈی نیویا) کے خلاف شروع ہوجائے گی ظاہر ہے کہ یہ ممالک جرمن افواج کا مقابلہ نہیں کرسکتے اسلئے ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو بالٹک ریاستوں کا ہوا اور اس طرح بہت سی کارآمد معدنیں بھی جرمنی کے ہاتھ آجائیں گی اور بحر شمال میں وہ زیادہ آسانی سے ہلاکت پھیلا سکے گا

جب یہ ہو چکے گا تو پھر روس کی باری آئے گی اور وہ ریاستہائے بلقان کا رخ کریگا۔ جرمنی خاموش رہیگا یہانتک کہ روس کا پورا دباؤ ترکی پر پڑجائے اور جب جرمنی یہ دیکھ لیگا کہ ترکی کے اقدامات کو روس نے روک دیا ہے تو پھر وہ رومانیا، ہنگری اور یوگوسلیویا کو ہضم کرنے کیلئے دوڑ پڑیگا
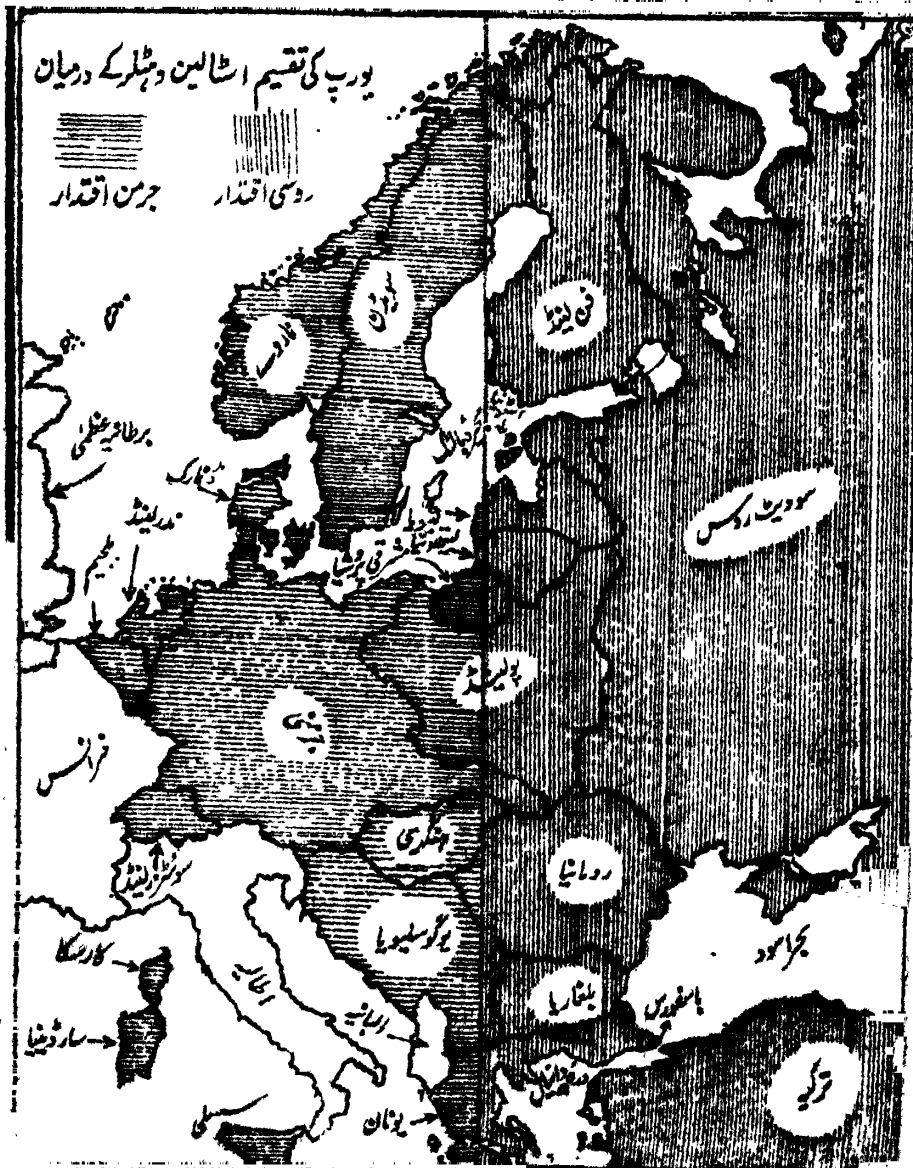
اس سلسلہ میں سب سے بڑا سوال اٹلی کے رجحان کا ہوگا، لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں کہ وہ روس و جرمنی کا ساتھ دیگا، کیونکہ ان کے ساتھ دینے سے اس کو پانے کی اتنی توقع نہیں جتنا اندیشہ کھو دینے کا ہے اور اس لئے قوی امکان اس بات کا ہے کہ فرانس و برطانیہ کے ساتھ اٹلی، اسپین اور ہنگری، کا بھی معاہدۂ اتحاد ہوجائے گا۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ یہ تمام حکومتیں لڑنے ہی کے لئے طیار ہوجائیں

اسٹالین کے نقطۂ نظر سے

دوسری جماعت کا مطالعۂ جنگ ہر ل فلر کی رائے کے مطابق ذرا اس سے مختلف ہے اور وہ اس جنگ کو جرمنی و اتحادیین کی جنگ نہیں قرار دیتی بلکہ اشتراکیت و غیر اشتراکیت کی جنگ قرار دیتی ہے۔ چونکہ روس سب سے بڑی بری حکومت ہے اس لئے وہ برطانیہ کو جو سب سے بڑی بحری قوت ہے، ہمیشہ حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتی چلی آرہی ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ روس، برطانیہ کو سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بھی سمجھتا ہے، اس لئے دوسرا سبب عناد کا یہ بھی ہے

برطانیہ کے خلاف روس کی یہ برہمی لینن ہی کے وقت سے چلی آرہی ہے، جس نے کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا تھا کہ "لندن کا راستہ دہلی ہوکر گیا ہے" اور اب اسٹالین اس کی تکمیل جرمنی کے ساتھ شریک ہوکر کرنا چاہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسٹالین نے اتنی گہری پالیسی اختیار کی ہے کہ ساری دنیا اس کے دھوکہ میں آگئی ہے۔ کچھ عرصہ سے برطانوی مدبرین یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسٹالین نے انقلابی پالیسی ترک کر دی ہے اور اب وہ قدامت پرست جمہوریت کی طرف مایل ہوتا جارہا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اسٹالین بدستور انقلابی پالیسی کا حامی ہے اور مقصد برآری کے لئے وہ اپنے آپ کو بجائے سیاہ کے سفید دکھانا چاہتا ہے۔ ایکبار ۱۸ء میں لینن نے ظاہر کیا تھا کہ "اسوقت روس میں تو ہماری پوزیشن مضبوط ہے لیکن اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے کہ بین الاقوامی ملوکیت کا مقابلہ کر سکیں، اسلئے ہماری پالیسی یہی ہو سکتی ہے کہ موقعہ کا انتظار کریں"۔ چنانچہ اس موقعہ کا انتظار ہوتا رہا یہاں تک کہ اب بوساطت جرمنی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے

یہ خیال کہ روس اشتراکی اصول کو ترک کرتا جاتا ہے صحیح نہیں اور اکابر روس نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے، چنانچہ ۳۵ء میں وہاں کے سکریٹری جنرل ڈیمی ٹروف (Dimitroff) نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ:- "ہم پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ ہم اشتراکی اصول سے ہٹتے جارہے ہیں۔ لیکن یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم مارکس اور لینن کے صحیح پیرو ہو ہی نہیں سکتے جبتک موقعہ و محل کے لحاظ سے اپنی ترکیبوں میں تغیر و تبدل نہ کرتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹے ہوئے نظر آئیں، لیکن یہی ہماری ترکیب ہوگی جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا"

اب اسٹالین کی پالیسی پر غور کیجئے۔ اسٹالین اس خیال کو ظاہر کر چکا ہے کہ تجارتی مسابقت سے زیادہ کوئی چیز سرمایہ دار ممالک کو تباہ کرنے والی نہیں، اس لئے ان کو آپس میں لڑاتے ہی رہنا چاہئے۔ اپنے مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے ۳۴ء میں اسنے ظاہر کیا تھا کہ "گزشتہ جنگ، جرمنی کو تباہ نہ کر سکی، بلکہ بغض و عناد کا بیج اس میں بو گئی اور فاتح قوموں کے خلاف ایسا شدید جذبۂ انتقام پیدا کر گئی جس کو دور کرنا ناممکن ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ کتنا بڑا فایدہ پہونچا گئی کہ روس کی سرمایہ داری ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جو جنگ ہونے والی ہے اس کے نتائج ہمارے لئے اس سے بہتر نہ ہوں گے؟"

۲۴ اگست ۳۹ء کو روس کے مشہور اشتراکی اخبار پراودا (Pravda) نے اسٹالین کی اسی پالیسی کو دوسرے

الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا تھا کہ :- "پہلی جنگ ملوکیت نے جب لوگوں کو اقتصادی تباہی میں مبتلا کیا تو اشتراکی انقلاب نے اسکا خاتمہ کیا اور اب اگر جنگ ہوگئی تو یورپ و ایشیا کی بہت سی سرمایہ دار حکومتیں انقلاب کا شکار ہونگی اور اُنکے سر سے بھی یہ عذاب دور ہوگا"

پراوڈا کے اس بیان پر ایک انگریز صحافی (Lancelot Lawton) نے لکھا تھا کہ :- "اگر پراوڈا کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی تو اسکے معنے یہ ہیں کہ سوویٹ جمہوریتیں، دریائے رھائن کے سواحل پر، بحر روم کے علاقوں اور مشرق بعید میں بھی قائم ہوجائیں گی اور یہ انجام بڑا دردناک ہوگا"

اسٹالین کے بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں سرمایہ دار حکومتوں سے کوئی بڑی لڑائی لڑنا نہیں چاہتا، چنانچہ مارچ سنہ ۳۹ء کی تقریر میں اس نے ظاہر کیا تھا کہ :- "ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مبادا دوسروں کے بھڑکانے سے ہم آگ میں پھاند پڑیں اور دوسرے اس سے فایدہ اُٹھائیں"

اسی قسم کا خیال کامریڈ مخلس (Mekhlis) نے ظاہر کیا تھا کہ "سرخ افواج کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سوویٹ جمہوریتوں کی تعداد بڑھائی جائے، اور اس باب میں اسٹالین سے بہتر ناخدا اور کوئی نہیں ہوسکتا"

اس لئے اسٹالین کا ہٹلر سے مل جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ نازیت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولینڈ کے مسئلہ میں یورپین حکومتیں ضرور لڑیں گی اور آخر میں تباہ ہوں گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب روس کو اپنی اشتراکیت پھیلانے کا موقعہ ملیگا۔ چنانچہ پولینڈ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہاں کی اشتراکی جماعتوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ "ہمیں لڑائی سے علحدہ رہنا چاہئے، لیکن جب فریقین کمزور ہوجائیں تو ہمیں مداخلت کرکے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے"

ہٹلر خود روس و جرمن اتحاد کا حامی تھا، اس کا یقین تو نہیں ہوسکتا، لیکن جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت کی ضمانت لیلی تو اس کے لئے چارۂ کار صرف یہی تھا کہ وہ اسٹالین کو ملائے۔ ہرچند وہ اسٹالین کو اپنا دوست نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ اس کا کیا ارادہ ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روس کی فوجیں، جرمنی فوجوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر اخیر میں اسٹالین سے جنگ کرنا پڑی بھی تو فیصلہ جرمنی ہی کے حق میں ہوگا

بہرحال اسٹالین و ہٹلر کا اتحاد جو نوعیت بھی رکھتا ہو، اس میں کلام نہیں کہ روس ابھی تک فایدہ ہی میں ہے۔ آدھا پولینڈ اس کو ملگیا، بالٹک ریاستوں پر اس کا قبضہ ہوگیا اور اگر فن لینڈ کو بھی اس نے فتح کر لیا تو بحرِ اٹلانٹک کی طرف وہ برطانیہ کے لئے بڑے خطرہ کی چیز ثابت ہوگا

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ فن لینڈ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ قیاس چاہتا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرف اقدام نہ کریگا بلکہ لڑائی کا رنگ دیکھے گا۔ اگر اتحادیئن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ (اور ظاہر ہے کہ اتحادیئن کی اس کامیابی کا سبب ناکہ بندی ہوگی) تو جرمنی کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہوجائے گی کہ وہاں انقلاب پیدا کرنا آسان ہوجائے گا اور وہ جرمنی پر اسی آسانی کے ساتھ قابض ہوجائے گا جس آسانی سے پولینڈ اور ریاستہائے بالٹک پر قابض ہوا ہے اور جرمنی ایسے زبردست

ملک کا اشتراکی ہوجانا گویا سارے یوروپ کا اشتراکی ہوجانا ہے
اگر کامیابی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو بیشک اسٹالین کی پوزیشن نازک ہوجائے گی، کیونکہ جرمنی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے، علاوہ اس کے ایک بڑا سوال جاپان کا بھی ہے جو اسے جرمنی سے علحدہ نہیں کر سکتا۔
فرض کیجئے کہ برطانیہ کو شکست ہوئی تو کیا جاپان خاموش بیٹھا رہے گا اور اس کو تنہا فایدہ اُٹھانے دیگا، ہرگز نہیں، وہ فوراً جزایر فلپائن، ہانگ کانگ، فرانسیسی انڈو چاینا اور جزیرہ نمائے ملایا پر قبضہ کرکے برما اور ہندوستان کا رخ کرے گا اور پھر اس وقت روس، بغیر جرمنی کی مدد کے جاپان کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

بلقانی ریاستوں کو سامنے رکھکر آپ نے بحث کے دو پہلو مطالعہ کرلئے، لیکن ایک تیسرا پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس جنگ کا اثر ریاستہائے بلقان پر کیا پڑے گا اور سیاسی و اقتصادی نظر سے فریقین کے وہ کونسے اغراض ان ریاستوں سے وابستہ ہیں جو استخوان جنگ ثابت ہوسکتے ہیں
ریاستہائے بلقان (یعنی ہنگری، رومانیا، یوگوسلیویا، بلغاریہ) کا جائے وقوع ایسا ہے کہ نہ جرمنی اُن سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ وہ جرمنی سے۔ کیونکہ ان ریاستوں کی خام پیداوار کا نصف حصہ جرمنی ہی کے کام آتا ہے اور جرمنی کی صنعتی ترقیاں رُک جائیں اگر یہاں سے لوہا، تانبہ، تماکو، لکڑی اور پٹرول وغیرہ کی برآمد بند ہوجائے۔ جرمنی یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ یہ ریاستیں صنعت وحرفت میں ترقی کرکے بازاروں میں اپنی جگہ علحدہ پیدا کریں وہ چاہتا ہے کہ یہ ریاستیں صرف خام اشیا پیدا کرکے جرمنی کی ضروریات کو پورا کرتی رہیں اور وہ ان ٹھوس کارآمد چیزوں کے عوض میں انھیں آئینہ، کنگھا، تیل، غازہ وغیرہ تکلفات کی چیزیں فراہم کرتا رہے وہ ان کو اپنی مستعمرات یا نوآبادیاں سمجھتا ہے اور یوروپ کی کسی اور سلطنت کا دخور یہاں گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس اقتصادی سبب کے اس کی سیاسی اغراض بھی ان ریاستوں سے وابستہ ہیں
روس کے تعلقات، ریاستہائے بلقان سے اقتصادی نہیں ہیں کیونکہ خام پیداوار کی خود اس کے یہاں بھی کمی نہیں، لیکن بلغاریا اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادی سے اس کے جذباتی و روایاتی تعلقات بیشک دیرینہ ہیں، کیونکہ اُنیسویں صدی میں بلقان کی سلافی آبادی نے جب ترکی اور جرمنی کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو روس ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ علاوہ اسکے اس کا سیاسی تعلق بھی سرزمین بلقان سے کم نہیں ہے، کیونکہ اوکرائن، کریمیا اور قاف پر اس کا تسلط اسی وقت قایم رہسکتا ہے جب بحر اسود (Black Sea) خطروں سے پاک رہے اور آبنائے باسفورس کا تعلق سرزمین بلقان ہی سے ہے
ہرچند قیام بالشویت کے بعد، روس کے اثرات بلقان میں کم ہوگئے ہیں، لیکن بلغاریہ اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادیاں ابتک روس کی طرف مایل ہیں اور اگر روس و جرمنی، دونوں بلقان کی طرف بڑھیں تو ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہاں کی سلافی آبادی، روس کی طرف مایل ہوجائے اور روس و جرمنی کے تعلقات اچھے نہ رہیں، لیکن اٹلی کا سوال اس سے زیادہ

اہم ہے اور وہ روس کا اقدام بلقان کی طرف کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اٹلی بلقان سے دوگونہ تعلقات رکھتا ہے یعنی یہاں کی خام پیداوار بھی حاصل کرتا ہے اور بحر اڈریاٹک کے سواحل اور اپنے مستعمرات افریقہ کی حفاظت کے لئے بھی اس کے اثرات کا یہاں قایم رہنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس نے ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ کر لیا کیونکہ البانیہ اور جزایر ڈوڈکینز سے وہ ترکی اور یونان دونوں پر دباؤ ڈال سکتا ہے

اٹلی، بلقان میں اپنا قبضہ توسیع کرنا نہیں چاہتا، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کا ایک اقتصادی بلاک ایسا بن جائے کہ جرمنی کا اقتصادی دباؤ اور روس کا سیاسی اثر وہاں نہ بڑھنے پائے۔ ہٹلر اور مسولینی میں باہم جو سمجھوتا ہوا تھا اس سے اٹلی کو (سوائے قبضۂ البانیہ کے) اور کوئی خاص فایدہ اسوقت تک نہیں پہونچا اور اب روس کے ساتھ جرمن تعلقات نے اس کو اور زیادہ مشتبہ کر دیا ہے۔ وہ اس سے بھی ڈرتا ہے کہ روس کی مداخلت یہاں اشتراکی تحریک پیدا کر دیگی جسے وہ اقتصادی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے اپنے لئے نقصان رساں سمجھتا ہے

فرانس و برطانیہ کے تعلقات، بلقان میں زیادہ تر سرمایہ دارانہ رہے ہیں ــ انھوں نے زیادہ کوشش اس بات کی کی کہ یہ ریاستیں صنعتی ترقی زیادہ کریں اور جرمنی کو صرف خام پیداوار بھیجنے کا ذریعہ بنی رہیں، لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوئی۔ کیونکہ جرمنی یہاں کی خام پیداوار کے عوض اپنے مصنوعات فراہم کیا کرتا ہے اور اسے یہاں بہت اچھا سودا سمجھا جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کی خام پیداوار کی کھپت نہایت آسانی سے جرمنی میں ہو جاتی ہے اور دوسرے دور دراز ملکوں کو بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی

جرمنی نے بلقان میں اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے بعض سیاسی حربوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً اس نے یہ بھی کیا کہ ان ریاستوں میں جہاں کہیں جرمن آبادی یا جرمن نسل سے تعلق رکھنے والی آبادی پائی جاتی تھی اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے تسلیم کرائے اور اپنے جداگانہ حقوق حکومت سے حاصل کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازیت کے جراثیم آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئے اور جرمن رائش کا خوف لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اسوقت ۲۵ لاکھ جرمن آبادی ہنگری، یوگوسلیویا، رومانیا اور سوویٹ یونین میں پھیلی ہوئی بتائی جاتی ہے

اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور قوموں کو بھی اپنے افراد کے حقوق کا احساس پیدا ہو گیا، یعنی ہنگری بھی کہنے لگا کہ رومانیا اور یوگوسلیویا میں ۲۵ لاکھ ہنگیرین پھیلے ہوئے ہیں، بلغاریا بھی رومانیا میں اپنی بارہ لاکھ کی آبادی کا ذکر کرنے لگا، روس بھی سربیا میں اپنی دو لاکھ آبادی کی حمایت پر آمادہ ہو گیا اور اس طرح بلقان کی تمام ریاستوں میں انقلاب و اختلاف کے جذبات پیدا ہو گئے، چنانچہ ہنگری اور بلغاریا دونوں چاہتے ہیں کہ ان کا جتنا علاقہ رومانیا اور یوگوسلیویا نے لے لیا ہے وہ انھیں واپس ملجائے اور اگر بلقان پر جرمنی یا روس نے حملہ کیا تو ہنگری اور بلغاریہ کو بھی لالچ دلا کر وہ اپنے ساتھ ملا لیں گے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فتح پولینڈ کے بعد ہی بلغاریا نے روس سے معاہدۂ تجارت کی گفتگو شروع کر دی

یونان کی حالت البتہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ اسے جرمنی کا اتنا خوف نہیں ہے جتنا اٹلی کا ہے ہر چند دونوں میں ایک نوع کا معاہدۂ اتحاد ہو چکا ہے لیکن یونان مطمئن نہیں ہے اور اسی لئے برطانیہ کا دامن نہیں چھوڑتا کہ اگر کسی وقت اٹلی نے حملہ کیا تو برطانیہ ہی اسے بچا سکتا ہے

ترکی، جسے اسوقت ریاستہائے بلقان کے لیڈر کی حیثیت حاصل ہے، بیشک فرانس و برطانیہ سے معاہدہ کر چکا ہے، لیکن اس معاہدہ کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ روس و جرمنی سے جنگ کرنے پر بھی مجبور ہو۔ اگر روس نے بلقان پر حملہ کیا تو اتحادیئن کے جہاز مجبور ہوں گے کہ وہ درۂ دانیال سے گزر کر اپنی فوجیں بلقان میں اُتاریں اور یہ وقت میرے خیال میں ترکی کے لئے بہت نازک ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ حالات اسے کیا پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے

یہ ہیں وہ سیاسی پیچیدگیاں جن سے بلقانی ریاستیں اسوقت دوچار ہیں اور ان کا جو نتیجہ بھی ہو، لیکن تین باتیں بظاہر بہت کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فرانس و برطانیہ کا اثر وہاں وہ نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ بلقانی آبادی کی حفاظت کی ذمہ داری جو برطانیہ کی طرف سے لی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور ہٹلر نے جو دست درازیاں آسٹریا زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر کی ہیں ان کو دیکھ کر بلقانی ریاستیں بھی ڈر رہی ہیں کہ اتحادیئن جب تک مدد دینے کا فیصلہ کریں اسوقت تک کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس کی مداخلت نے جرمنی کے اثرات کو جو یہاں پائے جاتے تھے بہت کم کر دیا ہے اور اٹلی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر چکا کہ اسے کیا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ روس کے ساتھ ملکر وہ کام نہیں کر سکتا اور جرمنی سے بھی وہ اس لئے خفا ہے کہ اس نے روس کو کیوں بلقان میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ بلقانی ریاستیں اب پوری طرح محسوس کر رہی ہیں کہ دول عظمیٰ میں سے کوئی ان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، جب تک وہ خود آپس میں اتحاد پیدا کر کے روس و جرمن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قایم نہ کریں ـــ بہرحال دریائے ڈینوب کی وادیوں پر اسوقت جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس وقت برس پڑیں۔

تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ رومانیا کو مجبور کر رہا ہے کہ اُسے پٹرول فراہم کرے۔ ظاہر ہے کہ رومانیا پر حملہ کرنے کے لئے یہی اک بہانہ کافی ہے۔ اگر جرمنی نے حملہ شروع کر دیا تو روسی فوجیں یقیناً رومانیا کے مشرقی علاقہ (سربیا) کی طرف بڑھیں گی لیکن پولینڈ کی طرح یہاں کامیابی آسان نہیں ہے، کیونکہ بلغاریہ، ہنگری اور ترکی اس کو کبھی گوارا نہ کریں گے اور پھر اٹلی اور یونان کو بھی اس آگ میں کودنا پڑے گا

رہا یہ سوال کہ اتحادیئن اس صورت میں کیا کریں گے، اس کا بڑا انحصار اس امر پر ہے کہ مغربی محاذ کا اُسوقت کیا رنگ رہتا ہے۔

عہدِ قدیم کا اِنسان کیا نہ جانتا تھا

آج دنیا کی علمی ترقیاں اور اُصولِ اخلاق کی بلندیاں بہت حیرت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور عہدِ حاضر کے اکثر اختراعات و ایجادات کا سراغ تاریخ انسانی سے عہدِ ماضی تک پہونچتا ہے۔ آپ کو شاید یہ سنکر تعجب ہوگا کہ بڑے بڑے پہیوں اور دباؤ ڈالنے والے انجنوں کا اسٹیم کے ذریعہ سے حرکت میں لانا، عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا اور طباعت و جلد سازی سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔

ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے، رُوم کے برتن بنانے والے روز کے استعمالی ظروف پر ٹائپ کے ذریعہ سے اپنے نام نقش کر دیتے تھے، اور نویں صدی عیسوی میں اہلِ چین بلاک بنا بنا کر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔

قدیم اسکندریہ میں، اشتہاروں کے لئے ستون نصب کئے گئے تھے اور انھیں پر اعلانات وغیرہ گوند سے چسپاں کئے جاتے تھے۔ روم میں بڑے بڑے تختوں کا بھی رواج تھا جن پر سیاہ و سرخ حروف میں اشتہارات تحریر کئے جاتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق کی سُمیری آبادی ڈامر اور اسبتوسؔ[1] (Asbestos) کا استعمال جانتے تھے۔ اسی طرح کنکریٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

آگ بجھانے کا انجن مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ہی یونان میں ایجاد ہو چکا تھا اور روم میں تو باقاعدہ آگ بجھانے والا بریگیڈ بھی تھا۔ قدیم دُنیا میں خود حرکت کرنے والی (Automobile) مشینیں بھی پائی جاتی تھیں، چنانچہ اسکندریہ کے معبد میں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی جس کے اندر سکّہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار از خود مل جاتی تھی۔ فراعنہ سے پہلے بطلیموسی خاندان کے زمانہ میں ایک مشین کا بنا ہوا آدمی طیار کیا گیا تھا۔ روم میں نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی لوگوں نے بنا لیا تھا جو ہتوڑوں کی ضرب سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا، لیکن وہ طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔

---

[1] ایک ریشہ دار معدنی چیز جو آگ کو قبول نہیں کرتی جیسے ابرک۔

سَن کا کپڑا طیار کرنا مصرِ قدیم کے نہایت ابتدائی عہد کے لوگوں کو معلوم تھا جس کا ثبوت مومیائی شدہ لاشوں کے لباس سے ملتا ہے۔ توریت میں جن لباسوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ معبدوں کے پروہت اور راہبوں کے لباس نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے۔ تین ہزار سال قبل کی مومیائی شدہ لاشوں کے کپڑوں میں اب بھی وہی نرمی پائی جاتی ہے اور اُن کا رنگ تو ایسا نظر آتا ہے گویا ابھی نیا تھان سامنے کھول کر رکھدیا گیا ہے۔

افلاطون نے، پانی سے چلنے والی گھڑی میں ایک ٹیڑھی نلی لگاکر اس کو الارم کلاک بنالیا تھا جس وقت پانی اس نلی کی سطح تک پہونچتا تھا تو وہ دوسرے ٹیوب سے اتنی تیزی کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس سے سیٹی کی آواز پیدا ہوتی تھی افلاطون نے یہ ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس کے شاگردوں کو صبح چار بجے اس کا علم ہوجائے اور وہ اُٹھ بیٹھیں۔ ایک پانی سے چلنے والی گھڑی کا ہشت پہل مینار جو آخری صدی قبل مسیح میں طیار کیا گیا تھا، اب بھی پایۂ تخت یونان میں قایم ہے۔

خارجی گرمی پہونچا کر انڈوں سے بچہ نکالنے کا طریقہ قدیم مصریوں کو بھی معلوم تھا چنانچہ ان مشینوں سے بیک وقت سات سات ہزار انڈوں سے بچے نکالے جاتے تھے۔ ان مشینوں میں اُپلے یا بھوسے کی آگ سے گرمی پہونچائی جاتی تھی۔ وٹرو دیس (Vitruvius) نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، اس زمانہ کے آلہائے مکبر الصوت (Loud Speaker) کا ذکر کیا ہے جن کو Echea (یعنے آواز بازگشت کو قوی کرنے والا) کہتے تھے۔ یہ کانسے کے ظروف تھے جو تھیٹر کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں نصب کردئے جاتے تھے، آواز ان سے ٹکراکر بہت بلند ہوجاتی تھی اور بہت سریلی ہوکر سامعین کے کانوں تک پہونچتی تھی۔ اسی طرح کے آواز بڑھانے والے آلات اسٹیج کی طرف بھی ستونوں سے نصب کردئے جاتے تھے تاکہ آواز کا تموج بڑھجائے۔ یہ مختلف سایز کے ہوتے تھے اور اس طرح سُر میں ایک دوسرے سے گھٹا بڑھا کر ملائے جاتے تھے کہ اُن سے بالکل انسانی آواز پیدا ہو۔

فولاد کے نہایت عمدہ پھل بنانا بھی انھیں معلوم تھا، جس کا ثبوت تلواروں اور خنجروں کے پھل سے ملتا ہے۔ ان پر وہ کچھ نشانات بھی بنادیتے تھے جو مٹتے نہ تھے۔ فولاد کو اس قدر سخت بنا دینے کا راز ابتک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا۔ قدیم اہلِ ہند کے لوگوں کو معلوم تھا کہ زنگ نہ لانے والا لوہا کیونکر طیار کیا جاتا ہے، چنانچہ دہلی میں ساڑھے تین سو سال قبل مسیح جو لوہے کی لاٹ نصب کی گئی تھی وہ آج تک موجود ہے اور اس پر زنگ کا نام نہیں۔ یہ فن بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنا اور اس سے مجسمے طیار کرنا یہ فن بھی عہد قدیم کے انسان کو معلوم تھا جو ابتک ہمیں معلوم نہیں ہوا۔

قدیم روما میں مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے یہ ترکیب کی جاتی تھی کہ گرم ہوا فرش مکان کے نیچے اور دیواروں کے اندر دوڑادی جاتی تھی۔ چونکہ فرش اور دیواریں پتھر کی ہوتی تھیں اس لئے سردی میں ان کی ٹھنڈک بہت بڑھجاتی تھی

اور اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی جاتی تھی۔

معبدوں میں عجیب و غریب میکانکی ترکیبوں سے کام لیا جاتا تھا، مثلاً قربانگاہ کی آگ سے یہ کام بھی لیا جاتا تھا کہ ہوا کو پھیلا کر نلوں کے اندر سے لیجاتے تھے اور مصنوعی چڑیوں کے اندر سے یہ ہوا گزر کر مختلف آوازیں پیدا کرتی تھی سنگین بتوں میں حرکت بھی میکانکی طریقوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اسکندریہ کے معبد سرالیس کے گنبد میں ایک مقناطیس اس طرح رکھدیا گیا تھا کہ بُت کے سر کو وہ کھینچتا تھا اور وہ بُت اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بہت سے معبدوں میں قربانگاہوں کے پتھر کے نیچے، ہوا کا خزانہ بنا رہتا تھا جس کا تعلق زیر زمین نلوں کے ذریعہ سے ایک ایسے ظرف سے تھا جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔ جب گرمی سے اس کا پانی جوش کھاتا تھا تو ایک دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا جو اس کے پاس ہی معلق رہتا تھا اور جب اس کا وزن بڑھجاتا تھا تو پوشیدہ پہیوں کے ذریعہ سے مندر کا دروازہ کھولدیا کرتا تھا اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

مصر کے پوجاری علم مناظر و مرایا (Optics) سے بخوبی واقف تھے۔ جب کوئی شخص پوجا کرتا تھا تو مندر کی پشت کی دیوار پر دفعتاً بُت کا چہرہ نمودار ہوجاتا تھا، اس کی ترکیب یہ تھی کہ بُت کے سامنے ایک مقعر (Concave) آئینہ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے سامنے کی دیوار پر بُت کا عکس پڑتا تھا۔

اپالو کے بُت کا جلوس جس وقت باہر نکالا جاتا تھا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے تخت سے اُٹھتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ بُت کھوکھلی لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھدیا جاتا تھا جو اسے اُبھارتا رہتا تھا۔

صنعت و حرفت میں فیکٹری سسٹم اسوقت کی چیز بتائی جاتی ہے لیکن سنٹ آگسٹاین ہپو کا بشپ لکھتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہ طریقہ رائج تھا اور ایک ہی چیز مختلف کاریگروں کے ہاتھ سے نکل کر تیار ہوتی تھی۔

پریسیڈنٹ روزولٹ صدر امریکہ کی یہ اقتصادی تدبیر کہ غلہ کے ذخیرے محفوظ رکھنا چاہئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں، پیغمبر یوسف کو بھی معلوم تھی، جنھوں نے مصر میں اس پر عمل کیا تھا۔ قدیم مصر میں غلہ کے مستقل کھتے رکھے جاتے تھے اور آجکل کی طرح غلہ کا تبادلہ غلہ سے، تقاوی، فصلوں کا بیمہ اور بھاؤ کی نگرانی سب وہاں پائی جاتی تھی اشیاء خوردنی کو محفوظ رکھنے کی ترکیب بھی انھیں معلوم تھی، چنانچہ اسوقت کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں اب تک اچھی حالت میں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کو کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین (Iodine) لے ہوئے پانی میں رکھدیتے تھے۔

ہیروڈوٹس، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، لکھتا ہے کہ امراء مصر اپنے ہاتھ میں Quartz (ایک قسم کا پتھر) کی چھوٹے چھوٹے گیند رکھا کرتے تھے تاکہ ہاتھ ٹھنڈے رہیں۔

برف بنانا یا برف سے چیزوں کو ٹھنڈا رکھنا بھی پچھلے لوگوں کو معلوم تھا۔ گڑھوں میں مٹی کے پیالے رکھکر برف جمانا قدیم اہل ہند کو معلوم تھا اور اسکندر اعظم کے زمانہ میں آسمانی برف کو دبا دبا کر گڑھوں میں بھر دیتے تھے اور عرصہ تک اس سے کام لیتے تھے۔ نیرو پہلا بادشاہ تھا جس نے شراب کو برف میں لگا کر ٹھنڈا کرنا رائج کیا۔ سنیکا اور پلوٹارک اب سے بہت پہلے تبا تاتی اُصول کے عادی تھے اور رامسیس ثانی (فرعون مصر) نے ۱۲۵۰ قبل مسیح میں ایک مانع شراب نوشی لیگ قایم کی تھی۔

علاج کی غرض سے بجلی کا استعمال بھی عہد قدیم میں رائج تھا، چنانچہ دردِ سر میں ایک ایسی مچھلی کا استعمال ہوتا تھا جس کی برقی رو اعصاب میں سکون پیدا کر دیتی تھی۔ عمل جراحی کے لئے مردم گیاہ (Man Drake) بوٹی کھلا کر ایک انسان کو تین چار گھنٹے تک کے لئے بیہوش و بے حس بنا دیا جاتا تھا۔ مٹی کی تختیاں جو سواحلِ دجلہ سے دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰۰ ق۔م، اسیریا کے ایک بادشاہ کا علاج مُلٹھی سے کیا گیا تھا بابل کے کھنڈروں سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں بخار کی مکھی کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے مراد مچھر ہے۔ گویا یہ حقیقت انسانِ قدیم کی دریافت کی ہوئی ہے کہ مچھر سے فصلی بخار پھیلتا ہے۔

قدیم مصر میں آبپاشی کی نہروں کو گھاس وغیرہ سے صاف رکھنے کے لئے لقلق (ایک چڑیا بگلا یا سارس کے قسم کی) پالے جاتے تھے اور یونان میں طاعون کے چوہے فنا کرنے کی خدمت سانپوں کے سپرد تھی۔ بعض امراض کے ٹیکہ کا رواج قدیم ہندوستان اور چین میں پایا جاتا تھا۔

بدن کی مالش کے ذریعہ سے علاج ۴۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا اور یونان کا ایک حکیم ۵ سال قبل مسیح میں علاوہ مالش کے سرد پانی، مینہ کے پانی اور ننگے پاؤں ریت پر چلانے سے بھی کیا کرتا تھا اور شاہ آگسٹس کا علاج ایک طبیب موسیٰ نامی نے اسی طریقہ سے کیا تھا۔

زخمیوں کے لئے مصنوعی اعضا بھی طیار کئے جاتے تھے، چنانچہ ۲۱۸ قبل مسیح میں کیٹی لائن (Catetina) کے پرداد اکے لئے جنگ قرطاجنہ میں ایک مصنوعی ہاتھ تیار کیا گیا تھا۔ انگلستان کے رایل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں ۳۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا رکھا ہے۔ قدیم ہند کے باشندے پلاسٹر سے مصنوعی ناک، ہونٹ اور کان بناتے تھے۔

روم و یونان کی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدودوں کا علاج کوئی نئی چیز نہیں ہے، اور مریضوں کو جوش دیا ہوا پانی پلانا بھی انھیں معلوم تھا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ (Cyrus) شاہِ فارس اپنے ساتھ ہمیشہ جوش دیا ہوا پانی چاندی کے برتنوں میں رکھا کرتا تھا، اسی طرح روم کا مشہور بادشاہ نیرو بھی ہمیشہ اُبلا ہوا پانی پیتا تھا۔

پمپائی میں بعض قدیم آلات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے بعض امراض کا علاج آپریشن سے کیا جاتا تھا۔ یہ آلات لوہے کے ہیں، لیکن اس قدر تیز و صاف ہیں کہ آج بھی ان سے آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ جولیس قیصر اپنی ماں کے پیٹ سے آپریشن کے بعد ہی پیدا ہوا تھا اور اسی لئے یہ آپریشن اب بھی اسی کے نام سے منسوب ہے اور اُسے (Caesarian Section) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے بعض کاسہائے سر ایسے ملے ہیں جن پر جراحی کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔

سکندرِ اعظم کے زمانہ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا (اگرچہ ارسطو اسے پسند نہ کرتا تھا) مصرِ قدیم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح، موتیا بند کے آپریشن کا وہاں رواج عام تھا۔ بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی بھی ملی ہیں، جن کے دانت مصنوعی ہیں اور بعض کی آنکھیں بھی۔

بال اُگانے کے لئے رینڈی کا تیل دوسرے کسی تیل میں ملا کر اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ڈاکٹر جانتے تھے کہ انسانی جلد پر سورج کی مصنوعی روشنی، بلور کے شیشے کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور محدب شیشوں کے ذریعہ سے بدن جل سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ڈاکٹروں کو فیس بھی دیجاتی تھی، چنانچہ پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ شاہی طبیبوں کو علاوہ اُس فیس کے جو عام لوگوں سے ملتی تھی سالانہ ۲۵۰ پونڈ ملا کرتے تھے اور روم کے مشہور طبیب (Galen) کی فیس ۵۰ پونڈ تھی۔

روحوں کو بلانا اور میز کا گردش میں لانا قدیم مصر میں بھی رائج تھا، مصر ہی سے یہ رسم یونان میں پہونچی اور پھر تمام عیسوی دنیا میں عام ہو گئی۔

حضرت موسیٰ سے بہت پہلے قوتِ مقناطیس سے کام لیکر خود اپنے آپ کو بیہوش کر لیتے تھے اور بعض بیماریوں کا علاج اسی عالمِ بیہوشی میں بتاتے تھے۔ سنٹ آگسٹائن کا بیان ہے کہ ایک پادری اپنے آپ کو ایسا بیہوش وبےحس بنا لیتا تھا کہ اس پر زخموں کا بھی اثر نہ ہوتا تھا اور اسی عالم میں وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ ڈاکخانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۱۲ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر نگار

کلام ماہر لکھنوی

"طاقِ نسیاں" کی جستجو اکثر ایسے جواہر پاروں سے روشناس کرتی ہے جو "گردِ تغافل" کے تہ بتہ طبقوں میں پوشیدہ ہوگئے ہیں مگر دستِ طلب کی معمولی سی تحریک جب اُنھیں نمایاں کر دیتی ہے تو آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی ہے۔

نواب مولوی میر مہدی حسین ماہر مرحوم انہی "جفا کشیدۂ روزگار" افراد میں سے ہیں جنھیں دُنیا نے اُن کے بعد بھلایا اور ایسا کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

آج یہ اُن کی نہیں، ادب کی خوش قسمتی ہوگی کہ اُن کے کلام سے اربابِ ذوق کا تعارف ہو جائے اور معلوم ہو کہ خاکِ غفلت میں کیا صورتیں ہیں جو اب تک پنہاں ہیں۔

ماہر لکھنؤ کے مشہور "خاندانِ اجتہاد" کے ایک ممتاز فرد تھے، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا ہے اور قدرت نے دنیاوی جاہ و جلال، مال و دولت عطا کیا تھا اس لئے نواب کہے جانے لگے۔

ابتدائی عمر میں عربی صرف و نحو اور ادبیات کی تحصیل کی اور معلوم نہیں کہاں تک پڑھا۔ تاج العلماء مولانا سید علی محمد (متوفی ۱۳۱۲ھ) سے مختصر معانی پڑھنے تک کا پتہ کتابوں سے چلتا ہے اس کے بعد شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور منشی مظفر علی خاں اسیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور برابر اُنہی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس طرح ماہر کا ادبی سلسلہ صرف ایک واسطہ سے مشہور اُستادِ سخن مصحفی تک پہونچ جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب لکھنؤ کی شاعری میں رندانہ بے باکیوں کا دور دورہ تھا اور ابتذال کی فراوانی تھی۔ خود منشی اسیر کے ممتاز شاگرد امیر مینائی ایسے "مقدس" اور "مذہبی" انسان کا کلام "اچکوں" وغیرہ کی ایسی رکیک لفظوں سے خالی نہ رہا۔ مگر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ماہر کا کلام اس طرح کے ابتذال سے بالکل پاک ہے۔

لکھنؤ کی شاعری کے خصوصیات انگیا چوٹی، کاجل، مسّی وغیرہ کا اُن کے یہاں پتہ بھی نہیں، اُنھوں نے اپنے لئے ایک دنیا ہی الگ بنائی تھی جہاں تمام کائنات عالم اُن کے سامنے تھی اور ہر ایک سے تشبیہات کے ذریعہ وہ بوقلموں نصائح و مواعظ اور مضامین کا خزانہ فراہم کرتے تھے۔

یہ وہ انفرادی رنگ ہے جس میں ماہر اپنی آپ مثال نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر سیر حاصل بحث بعد کو آئے گی

جہاں آپ کو کائنات عالم شاعر کے پیش نگاہ دکھلائی دے رہی ہوگی۔ ابھی دوسرے خصوصیات کو سنئے جو عام طور سے شاعری کے محاسن میں سمجھے جاتے ہیں۔

ماہر کے کلام میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں :۔

صفائی و سادگی۔ لطف زبان۔ محاورات۔ شوکتِ الفاظ۔ فارسی ترکیبوں کا اعتدال۔ مشکل پسندی۔ طنز۔ محاکات۔ ندرت اسلوب۔ جذبات کی تحلیل۔ منظر کشی۔ حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو شاعری کے اصل جوہر سے متعلق ہیں اور اس کے علاوہ تشبیہ۔ استعارہ۔ مراعات النظیر۔ طباق و تضاد ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ جو شاعری کے خارجی زیور ہیں۔ انھوں نے ناسخ کے بعد اسے لکھنؤ کی شاعری میں اکثر مقصد اصلی کی حیثیت اختیار کرلی تھی مگر ماہر نے اُنھیں وہی ضمنی درجہ عطا کیا ہے جس کے یہ مستحق ہیں۔

اب ہر ایک عنوان کے تحت میں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

صفائی و سادگی ماہر کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ہیں جن میں تکلف و تصنع کا لگاؤ نہیں معلوم ہوتا ہے شعر کہا نہیں گیا بلکہ الفاظ نے مجتمع ہو کر خود شعر کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

میں عزیزوں سے بھلا ترکِ وفا کیا کرتا
خون میں خون ملا تھا تو جدا کیا کرتا

آپ بیٹھا ہوا زخموں پہ چھڑکتا ہوں نمک
اور اب مجھ سے محبت کا مزا کیا کرتا

ہم نے تو جان نذر دی، دل کو فدا کیا
اب تم بتاؤ چاہنے والوں سے کیا کیا

نہ پوچھو عشق نظر میں کہ کیا گزرتی ہے
تڑپ رہا ہوں کلیجہ پہ تیر کھائے ہوئے

اُنھی سے پوچھئے صدمہ اسیروں کی جدائی کا
کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں جو آشیاں میرا

جنازہ لا کے لحد پر پٹک دیا سب نے
میں بارِ دوش تھا، اک دفن بھی بہانہ ہوا

ہزاروں آپ کی ہوتیں ادائیں اُس میں بھی
بری بھی بات جو منہ سے نکل گئی ہوتی،

وہ دن خدا دکھائے کہ قاصد یہ دے خبر
لیجے وہ آپ آتے ہیں خط کے جواب میں،

مضمون پتے کے لکھ کے مجھے خوب بن پڑی
غصہ نکالنے وہ خود آئے جواب میں

جگر و دل کو تو کھوئے ہوئے گزری مدت
پھر نجانے کہ یہ سینہ میں تڑپتا کیا ہے

کچھ ایسا پڑ گیا ہے محبت میں تفرقہ
دل کی ہمیں تو دل کو ہماری خبر نہیں

خوشی یہی ہے تو اچھا سنو گلہ دل کا
کسی طرح سے سہی ہو تو فیصلہ دل کا

وہ دیکھ لیں تو نہ ہو دل نہ ولولہ دل کا
لڑے نگاہ تو ہو جائے فیصلہ دل کا

کسی کے آنے کا احسان اب نہیں مجھ پر
لحد پہ جو مری آیا پئے ثواب آیا

لاکھوں ہی حسرتیں ہیں تمنائیں سیکڑوں ـــــ بستی جو میرے دل میں بسی ہے کہیں نہیں
آئینہ لیکے جاؤں نہ کیونکر میں سامنے ـــــ اُن کی کسی طرح سے ادھر کو نظر تو ہو،
یہی نشانِ دلِ حزیں ہے ـــــ تھمے جہاں ہاتھ دل وہیں ہے
ایک نے حق میں ہمارے نہ کہا کلمۂ خیر ـــــ سب کا مُنھ دیکھتے ہم مجمع محشر میں رہے
نجانے جنبش ابرو میں دل پہ کیا بنتی ـــــ ہنسی ہنسی ہی میں تلوار چل گئی ہوتی،
عدم سے آئے ہیں، جائیں گے پھر عدم اک دن ـــــ اس ابتدا کو ہم انجام کار سمجھے ہیں،
دل کو برباد کیا آرزوؤں کو بے گھر ـــــ تم سا عالم میں کوئی خانہ برانداز نہیں
باغ میں آکے اسیرانِ قفس کیا بہلیں ـــــ سب ہوائیں ہیں ہوائے پرِ پرواز نہیں

ماہر کو بجا طور سے اپنی زباں دانی پر ناز تھا کیونکہ وہ لکھنؤ کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے

لطفِ زبان تھے جہاں بیرونی عناصر کا اثر بالکل نہیں پڑا تھا۔ پھر اُن کی صحبت بھی ارباب کمال اور سخنوروں کا مجمع تھی۔ مولانا علی میاں کامل۔ بنے صاحب مشتاق وغیرہ کا ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے ان کی زبان اور نکھر گئی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

نظم اشعار میں بھی حسنِ بیاں ہے ماہر ـــــ جس کو کہتے ہیں زباں، ہم وہ زباں رکھتے ہیں

ذیل کے شعروں میں زبان کا لطف خاص طور پر نمایاں ہے:۔

تنگ ہوں زیست سے، اے موت مسیحائی کر ـــــ جان آجائے اگر روح بدن سے نکلے
تھا قیام اپنا بہارِ چمنستاں کی طرح ـــــ وہ وطن ہی نہ رہا ہم جو وطن سے نکلے
دیکھو خرام ناز سے دیتا ہے دل مرا ـــــ پھر یہ کہو گے ہم سا کوئی نازنیں نہیں
رسوائے خلق بھی ہوئے، منھ پر بھی آئی بات ـــــ وصلت میں اور کیجئے مجھ سے نہیں نہیں
توبہ! یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہو میری جاں ـــــ یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ ہو اور کہیں نہیں
دل مرا اب نگہِ تند کو برمانے دو ـــــ تیر خالی جو گیا، دور کرو، جانے دو
جائے کس طرح طنطنہ اُن کا، ـــــ ابھی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے
سنتے ہو اے کلیم اُن کی صدا؟ ـــــ جن کو دعوائے لن ترانی ہے
دل و جگر کی تمنائیں قتل ہوتی ہیں ـــــ اُجڑ رہے ہیں مرے گھر بسے بسائے ہوئے
نہ دل میں حسرتیں اب ہیں، نہ دل ہی سینہ میں ـــــ بتوں کی راہ میں بیٹھے ہیں گھر لٹائے ہوئے
مجھ کو پھر درد کی باتوں کا مزا مل جائے ـــــ منھ میں دم بھر کو زباں بن کے اگر دل ٹھہرے

خطا مجھی سے ہوئی، اب جو کچھ کہوں مجرم —— چلو، سدھارو، مبارک تمھیں گلہ دل کا،

تم ہنسو پھولوں سے بلبل کو میں بڑھکر چھیڑوں —— باغ میں آکے کوئی گل تو کھلائیں ہم تم

رنج میں رنج ہی شاید سببِ تسکیں ہو —— آؤ روتے ہوئے دل کو تو رُلائیں ہم تم

پھولی پھولی ہے شفق، وقت مئے سرخ ہے یہ —— آگ میں آگ چلو اور لگائیں ہم تم

مجمع ہے اک خدائی کا ماہرؔ کے دفن میں —— تم بھی چلو شریک ہو کارِ ثواب میں

دنیا ادھر کی جن سے ہوا کرتی تھی اُدھر —— وہ کروٹیں فقط ترا بیمار لے گیا

ڈھونڈھیں تڑپ تڑپ کے مریض جہاں ہزار —— جو درد تھا وہ آپ کا بیمار لے گیا

شکست رنگ سے گل دیتے ہیں یہ صاف صدا —— خزاں نصیب چمن، ہم بہار لیکے چلے

وہ عندلیب تھے ہم جن کے دم سے لطفِ چمن —— چلے جو اڑکے تو رنگ بہار لیکے چلے

جہاں میں آئے تھے ماہرؔ تو تھی سبکدوشی —— چلے تو سر پہ گناہوں کا بار لیکے چلے

محاورات یہ حقیقتاً زباں دانی کا اہم شعبہ ہے۔ جتنا شاعر کو زبان پر اقتدار ہوگا اُتنا ہی محاورات اُس کے یہاں زیادہ لطف سے نظم ہوں گے چنانچہ ماہرؔ کے یہاں یہ ذخیرہ بہت فراواں ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

گھر اُن کے جاکے سنا یہ عوض میں خاطر کے —— سراٹھی کیا جو چلے آئے مُنھ اُٹھائے ہوئے

پتا یہ کوچۂ دلدار کا ہے اے قاصد —— ہزاروں بیٹھے ہیں واں دھونیاں رمائے ہوئے

نصیب آستنوں میں کھلتے ہیں دیکھئے کس کے —— بڑھے ہیں قتل کو وہ آستیں چڑھائے ہوئے

تقاضا سن کا ہے الڑھ پنے سے راہ چلو —— ادا یہ کہتی ہے چال اور بھی بنائے ہوئے

منعمو عالمِ فانی میں خوشی ہے معدوم —— کان بجتے ہیں کہ نوبت کی صدا آتی ہے

سچ تو کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی نیند آتی ہے —— شمع پر سوگئے پروانے تو کچھ دل ٹھیرے

کرتے ہیں ہم کو ذبح جو وہ آستیں چڑھائے —— لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہے تماشائے عام ہے،

راز دل کہتے ہو بیمار سے کچھ خیر تو ہے —— نہ سہی غیر کوئی، حال مرا غیر تو ہے،

بھرا ہوا تھا نجانے یہ کب کا اے گردوں —— برس پڑا مری تربت پہ جب سحاب آیا،

کہے نہ دل کی تو کیونکر نہ ہو گلہ دل کا —— کبھی تو منھ سے بھی پھوٹے کچھ آبلہ دل کا

مہندی پاؤں کی نہ چھٹ جائے گی چلئے دو گام —— آپ بھی پاس ہیں تربت بھی مری دور نہیں

شوکت الفاظ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شوکتِ الفاظ فارسی ترکیبوں ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ خیال کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ خالص اُردو الفاظ کے اجتماعی تیور بھی شوکت کا باعث ہو سکتے ہیں،

بہر حال یہ امر ایک حد تک قابل تسلیم ہے کہ غزل میں شوکتِ الفاظ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ چیز قصیدہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ناسخ نے غزل میں اس خصوصیت کا بہت استعمال کیا جس کی وجہ سے اُن کی غزل کے شعر اکثر قصیدوں میں کھپائے جانے کے قابل ہیں۔ غزل میں شوکتِ الفاظ کسی کسی موقع پر اس حد تک محدوح ہے کہ شعر میں ایک تیکھاپن پیدا ہوجائے۔ اس کے لئے محل کی شناخت شاعر کی سلاست طبع اور صحت ذوق پر مبنی ہے۔

ماہر نے غزل میں اس جنس کا استعمال کمی کے ساتھ کیا ہے۔ پھر بھی بعض اشعار میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

لگا اتنی تو آگ اے آتشِ فرقت سراپا کو، سینہ آسا اُڑا دوں مجمرِ دل سے سویدا کو
آفریں اے زورِ بازو، مرحبا اے جذبِ عشق سے اُڑا کنج قفس زورِ پرِ پرواز سے
تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے
کہتا ہے اُٹھ کے زور میں یہ دردِ دل مرا یا میں رہوں زمین پہ یا آسماں رہے
او دلِ جانباز رہیو باادب شمشیر پر یہ وہ جادہ ہے جہاں سر بھی قدم بنجائے گا

آپ دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں ایک خاص قوت مضمر ہے اور وہ ایک ایسے ہی محل پر ہے جہاں کمزور انداز معانی کی نوعیت کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتا۔

فارسی ترکیبوں کا اعتدال ہندوستانی مسلمانوں کے اندر گزشتہ صدی کے آخر تک فارسی زبان کا اتنا رواج تھا کہ عام طور سے خط و کتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے اُردو کلام میں فارسی ترکیبوں کا کثرت سے استعمال ہوا، اس سے کوئی شاعر مستثنیٰ نہیں ہے۔

میر تقی میر ایسا اُستاد جس کے یہاں صفائی و سادگی شاعرانہ اعجاز کے درجہ پر پہونچ گئی ہے وہ بھی اس طرح کے اشعار ضرور کہہ گزرتا ہے:۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا، پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا،
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا،
صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

پھر کسی اور کا کیا ذکر، غالب نے اپنے فطری ذوق فارسی کے غلبہ سے اس میں کچھ اضافہ کر دیا اور ایسے اشعار بھی کہہ دئے جن میں اگر روابط اُردو کے نہوں تو معلوم ہی نہو کہ یہ شعر فارسی کا ہے یا اُردو کا۔ بہر حال اس سلسلہ میں عدم اعتدال اس حد تک کہ اُردو زبان جس کی متحمل نہ ہو کسی طرح محدوح نہیں۔ ماہر نے فارسی ترکیبوں کا جہاں تک استعمال کیا ہے

اُس میں اعتدال کا پہلو ملحوظ رکھا ہے ۔ اُن کی فارسی ترکیبیں طبیعت پر بار اور زباں پر گراں نہیں ہیں ۔

همراہ بوئے غنچہ کرو تم بھی سیرِ باغ ـــــ سب قفل کھل گئے ہیں طلسمِ بہار کے
ملالِ رنجشِ ہر آشنا کا یار رہا ـــــ صفائی بن کے مرے قلب میں غبار رہا
مثالِ دانۂ بارودِ روسئے آتش ہوں، ـــــ نہ ہوش اُڑیں جو چمک دردکی اُٹھا نہ کرے
برقِ آہِ غمِ سوزاں جو نکل کر چمکی، ـــــ دودِ دل بھی صفتِ ابرِ بہاراں نکلا
سبب ہے کیف فلک کا مری عرق ریزی ـــــ یہی شراب تھی مینائے آسماں کے لئے
بھرا خون قاتل کے دامن میں جب ـــــ بہارِ ریاض ادا ہو گیا،
کیا محوِ طی ارض کوئی رہگزر میں ہے ـــــ پیچیدگی غبارِ طریقِ سفر میں ہے
ہمتِ مردانگی غم کے شکنجوں میں خموش ـــــ جنتری میں تار جب کھنچتا تھا ہے آواز تھا
گر نہ کیجئے قدر تو ناقدر دانی آپ کی ـــــ ہر ادا ہے ناز پروردِ جوانی آپ کی

مشکل پسندی یہ ایک خاص طرزِ کلام ہے جس کے ساتھ معنی ذرا غور کرنے کے بعد واضح ہوں۔ موجودہ زمانہ کے بہت سے تعلیمیافتہ اور روشن خیال لوگ اس جنس شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں :-

پاؤں اُلجھے رہے دامن سے طریقِ غم میں ـــــ ہاتھ طے کر کے رہ چاکِ گریباں نکلا
ضعف جب ساری مرا ہنگامِ بزمِ ساز تھا ـــــ رنگ کا نالہ شکستِ رنگ کی آواز تھا
ضعف میں جب طائرِ تصویر سے کچھ ساز تھا، ـــــ رنگ کا تھمنا بدن پر مانعِ پرواز تھا
ہجر میں سنتا کوئی کیونکر مری فریاد کو ـــــ دودِ دل ہنگامِ نالہ سرمۂ آواز تھا
تصویرِ رنگ دادہ ہوں دیکھو قرارِ دل ـــــ روکے ہے دوڑتے ہوئے خوں کو وقارِ دل
احساں نہ لے تو مثلِ ترا بھی کہیں نہیں ـــــ اکسیر ہے وہ خاک جو دامن نشیں نہیں،
بیقراری سببِ بستگیِ خاطر ہے، ـــــ جب گرہ کھل گئی کچھ آنسوؤں کی دل ٹھہرے
وجودِ بحرِ جہاں ہے بقدرِ تاب و تواں، ـــــ بہت ہے یہ، جو کوئی دم حباب باقی ہے
آتش قدم ہوں قید عجب کا مقام ہے ـــــ زنجیرِ اشک ریختۂ مومِ خام ہے
دشتِ وحشت میں شرر اُڑتے تھے جب ـــــ برق اُلجھی تھی مری زنجیر سے

طنز طنزیہ انداز کا کلام ایک خاص صنفِ سخن ہے جو اگر صحیح طور پر صرف ہو جائے تو وجدان کو ایک خاص لطف و کیفیت بخشتا ہے ۔ اثر کے کلام میں یہ بہت حسن کے ساتھ استعمال ہوا ہے :-

جلجائے دل زبان سے عاشق نہ اف کریں ـــــ ارشادِ ناز کا ہے ادا کا پیام ہے

عشاق کو یہ شرع محبت کا حکم ہے　　گردن پہ ہو چھری تو تڑپنا حرام ہے

نہ آتے آپ جو دم کو تو اور کیا ہوتا　　تڑپ تڑپ کے طبیعت سنبھل گئی ہوتی

عشاق پاس آکے یہ اُن کی بلا سنے　　ہے ہے، ہے دل کی۔ ہائے جگر کی پکار ہے

مہربان چین جبیں کو مری رہنے دیجئے　　کہیں مٹتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

خاک جس طرح جلا کرکئے دل لوگوں نے　　ہم سے تو شمع بھی اس طرح جلائی نہ گئی

اسی کو اور زیادہ مخفی انداز سے یوں کہا ہے :۔

دل وہ تھے جن سے جلائی نہ گئی شمع کبھی　　اور جو بھولے سے جلائی تو بجھائی نہ گئی،

نزع میں روتے ہو کیوں یاد کر و ہجر کے دن　　دل مرا آج بھی گھبرائے تو گھبرانے دو

مجھ پہ تو طعن تھے آیا ہے اب آئینہ کیوں　　دل جو تنہائی میں گھبرائے تو گھبرانے دو

ہر روز سرفراز تو کرنا محال ہے　　اُس کو بھی کہئے عذر جو ہو گاہ گاہ میں

میں ہی تو تھا سبب استراحت عالم　　مری ہی نیند کے اُڑنے سے سب کو خواب آیا

ستمگر وستم ایجا دیاں چلی جائیں　　نہ اُٹھ رہے کوئی بیداد آسماں کے لئے

رنگ الفت جو کوئی چیز نہیں، جانے دو　　اک کلی دل بھی ہے، مرجھائے تو مرجھانے دو

ذکر ہجراں تو ہوتا ہے سنا کر مجھ کو　　خیر آنکھوں سے بھی دو اشک نکل جانے دو

محاکات

کسی کیفیت یا حالت کا اس طرح اظہار کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور اُس کا تصور کامل دل میں پیدا ہو جائے "محاکات" ہے۔ اس کا مفہوم "منظر کشی" سے کسی حد تک وسیع ہے کیونکہ "منظر کشی" کا تعلق صرف حسیات سے ہوتا ہے۔ ماہر کے کلام میں محاکات کا جوہر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

نازنیں ہاتھ سے شکنوں کو مٹایا جلدی　　جب نشان وصل کے سمٹے ہوئے بستر میں رہے

دم نکلتے ہوئے دیکھا تو کہا گھبرا کر　　ارے مجھ سے بھی تو کہدے کہ یہ کیا ہوتا ہے

اس کو کیا کہتے ہیں یوں جاگ کے کاٹیں راتیں　　وصل کی شب جو ہوئی شام سے آرام کیا،

کچھ بھی ہے اعتبار تمھارے مزاج کا　　آئے تو بے بلائے، بلایا تو ہٹ گئے

چاک ہونے کا یہ وحشت نے کیا تھا خوگر　　ہاتھ سینہ تلک آیا کہ گریباں نکلا،

پھر پھر کے آپ سونگھ رہا ہوں میں اپنی بو　　بازو پہ سر وہ رکھ کے جو لیٹے تھے خواب میں

برہم تو میری دید سے ہیں اُف رے چھپنا　　آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہیں حجاب میں

تڑپوں میں وقت نزع نہ کیوں لیکے ہچکیاں　　گھٹ گھٹ کے رو رہے ہیں مجھے وہ حجاب میں

ندرتِ اسلوب سیدھی سی بات ایک نئے انداز میں کہی جائے جو خاص کیف و اثر پیدا کردے۔ ماہر کے یہاں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) تکمیل بربادی کی آرزو:-

نقش و نگار خاک سے صورت نما ہوں پھر آ اے ہوا فنا کو ترا انتظار ہے،

(۲) ملامت گردوں کا شکوہ:-

شرر و برق کو روکے، نہ کوئی پارے کو میرے دم بھر کے تڑپ لینے میں کیا ہوتا ہے

کوئی آزردہ ہے شمعوں سے نہ شبنم سے تنگ اک مرے رونے میں کیا جانیے کیا ہوتا ہے

(۳) دل گمشدہ کی یاد:-

خیال دل مجھے یادش بخیر آتا ہے چراغ جل کے مرے سامنے بجھا نہ کرے

(۴) ناوک قاتل کا استقبال:-

لے وہ پیکاں سرِ ناوک قاتل آیا پیشوائی کو بڑھ اے آہ، مرا دل آیا،

(۵) منزل آخرت کی صعوبت:-

جانے والو سفر قبر کی سختی دیکھو بار جاں پھینک کے رہ رو سوئے منزل آیا

(۶) ابرو و شمشیر کی مشابہت:-

ابرو کی جنبشوں پہ جو چاہو وہ اب کہو سیکھے ہو یہ ادا مجھے تلواریں مار کے

(۷) حیات بخشی کی آرزو:-

گر یاد عادتیں ہوں تو شانہ ہلا دو تم کچھ سو رہے ہیں چین سے مہماں مزار کے

(۸) دفن:-

سب مل کے دفن خاک کے پتلوں کا دیکھ لیں خشکی میں ڈوبتے ہیں سفینے غبار کے

(۹) تقاضائے وصل:-

انکار میرے گھر سے فقط سن کا ہے سبب دل میں اگر رہے تو مری جاں کہاں رہے

(۱۰) جواب دہی سے معذوری:-

جواب دوں تجھے اے عیب پوش بھیڑ میں کیا گنہ کی طرح سے گھیرے ہیں اہل محشر بھی

(۱۱) خواہش دیدار:-

اُلٹو نقاب مُنہ سے دکھا بھی چکو جمال ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں تم حسیں نہیں

جذبات کی تحلیل شاعری کی ”کارگاہ شیشہ گری“ میں یہ کام بڑا نازک ہے۔ اس کے لئے صحیح فطرت کی نباضی کی ضرورت ہے۔ ماہر اکثر اس مرحلہ میں کامیاب ہوئے ہیں :-

سب اسیرانِ قفس دیکھ کے رہ جاتے ہیں ساتھ والوں سے اگر کوئی رہا ہوتا ہے

آئینہ لیکر میں اُن کے ہاتھ سے نادم یہ ہوں ایسی ہی کوئی ادا تھی جس پہ اُن کو ناز تھا

میں سمجھتا ہوں کہ ماہر کی کائنات شاعری میں ایک یہی شعر ناز کے لئے کافی ہے :-

میرے آگے تیلیاں توڑیں نہ قیدیِ قفس زورِ بازو پر کبھی مجھ کو بھی اپنے ناز تھا

دوستوں نے بھر کے آہ سرد میری جان لی شمع کے پروانے بھی دشمن تھے صرصر کی طرح

صیاد کی تسلیوں کا اعتبار کیا ، کھڑکی کھلے قفل کی تو سمجھیں کہ ہاں چلے ،

منظر کشی حیات کی اجتماعی صورت اس طرح نظم ہو جائے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھرنے لگے :-

پچھلے سے مست بیٹھے ہیں اس انتظار میں پھوٹے شفق تو جام مئے ارغواں چلے

یہ شکل اُن کی دمِ صبح شامِ وصلت ہے نگاہ نیچی ہے ، بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

وہی ہیں میرے جنازے پر آج آئے ہوئے ادھر جو دیکھتے ہیں منہ اُدھر پھرائے ہوئے

سب کے ہمراہ جھکے دیکھ رہے ہیں وہ بھی جان کا میری نکلنا بھی تماشا کیا ہے

رندانِ بادہ کش نے کھولے قبا کے بند پنکھے چلے جہاں میں جو ابرِ بہار کے

پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں ، کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں

لڑ بھڑ کے کس سے سوئے ہیں کس سے بگاڑ ہے کون اُن کی لے رہا ہے بلائیں خبر نہیں

حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری یہ چیز غزل کے اصل مفہوم سے تو خارج ہے مگر اساتذہ نے اصطلاحی غزل کے ذیل میں اس کی جگہ نکال کر شاعری کو کارآمد بنا دیا ہے۔ ماہر کے یہاں تشبیہات و استعارات کے ماتحت اور کائناتِ عالم سے نتیجہ اخذ کرنے کے ذیل میں جسے میں ماہر کا مخصوص رنگ سمجھتا ہوں اور جس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ موعظہ و نصیحت اور اخلاق کا ذخیرہ بڑی کثرت کے ساتھ ہے مگر میں اس مقام پر خالص وہ اشعار پیش کروں گا جن میں براہ راست یہی ہے اور کچھ نہیں، اس سے آپ کو خود ماہر کے طبعی رجحان اور اخلاقی میلانات کا پتہ بھی لگیگا۔ فرماتے ہیں :-

کان رکھکر نہ کبھی میں نے سنی بات اُس کی آدمیت سے جو خارج کوئی انساں دیکھا

منعموں کے گھر بنانے کا نتیجہ یہ ہوا آپ سوئے کنج مرقد میں عمارت رہ گئی

انہی باتوں پہ ہے ماہر تجھے مطلب کی طلب منہ سے مانگا تو دل آگاہ دعا سے نہ ہوا

جس کو ہنگام دعا شغلِ نظر بازی رہا — چشم بنکر قفل درہائے اجابت رہ گئی
فاش پایا جبکہ رازِ عسرتِ اربابِ فقر — پردہ رکھ لینے کو دنیا میں قناعت رہ گئی

اپنا ثبات بحرِ جہاں میں نہ جان تو — مٹتا ہے جلد نقش جو آبِ رواں میں ہے

دیکے کچھ اس پیشکش کو کرے او منعم قبول — آبرو سی چیز کشتیِ کفِ سایل میں ہے

نہ دیکھو گر تو ہوں کم ظرف مثلِ جامِ جم بیشک — اگر دیکھو تو گنجایش ہے مجھ میں ایک عالم کی

فقیری قناعت کا باعث ہوئی — بری بھی تو اچھی بسر ہو گئی

ہے آبرو کی طلب گر تو کر ہنر حاصل — بقائے بو ہے تو قدرِ گلاب باقی ہے
نہ فیض پائیگا اس خاکداں سے او غافل — سراب پر تجھے امیدِ آب باقی ہے

نہ تن کے دیکھ ہر اک بارِ حسن کو غافل — یہ آب و تاب بدن تا شباب باقی ہے

جھک کے چل ماہر ہر اک سے رہ گزارِ دہر میں — کھائی ہے ٹھوکر انھوں نے جو اٹھا کر سر چلے

(باقی) — ع۔ ل

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی: — مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد عہ

مضامین رشید: — پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، ترو تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

میدان عمل: — ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد عہ

بیوہ: — منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

اپنے ایک اشتراکی دوست سے!

دسمبر کے نگار میں "معراجِ تمدن" کی سرخی سے ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ مقالہ نگار کا روئے سخن میرے دو گزشتہ مضامین کی طرف ہے۔ جواب الجواب کا میں قایل نہیں ہوں۔ لیکن معترض نے میرے مضامین سے دو تین حوالے جو نقل کئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔

مقالہ نگار نے مجھ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مینے نہ اشتراکیت کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی اشتراکی سے مجھے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا ہے، ورنہ میں نازیت و فاسیت کو اشتراکیت کے ساتھ ملا کر نہ دیکھتا۔ خاکسار کے جہل کے متعلق معترض کا ارشاد بجا اور درست ہے، لیکن باادب گزارش ہے کہ مقالۂ مذکور میں اشتراکیت۔ نازیت اور فسطائیت کو ایک ثابت کرنے کی میں نے ایک جگہ بھی کوشش نہیں کی ہے۔ میرے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "لیکن اس کے بعد ہی ایک دوسری چیز جمہوریت کی حریف بن کر آ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔۔ جسے کہیں نازیت کہتے ہیں، کہیں فاسیت اور کہیں بالشیوزم اور ہر جگہ اس کا آلۂ کار بھی ـــ ایک ہی ہے یعنی شخصِ واحد یا ایک منظم جماعت کی مطلق العنانی"

آگے چل کر مقالہ نگار نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ "مینے جمہوریت کا مفہوم آزادانہ رائے دہندگی تک محدود کر دیا ہے" حالانکہ جمہوریت کی تعریف میں نے یہ کی ہے "کہ عنانِ حکومت عوام کے ہاتھ میں آ جائے اور حکومت کا ہر کام عوام کے مشورہ سے عوام کے ہاتھوں اور عوام کے فایدے کے لئے کیا جائے"

اس کے بعد میں نے موجودہ جمہوری ریاستوں کے نظام (Constitution) پر ایک طایرانہ نظر ڈالی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسی سے معترض کو غلط فہمی ہو گئی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ امریکہ انگلستان یا فرانس کی حکومتوں کو میں جمہوریت کا معیار قرار دے رہا ہوں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے جمہوریت کے کھوکھلے پن کو دکھایا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات نفسِ جمہوریت پر کئے جا رہے ہیں یا ان ریاستوں پر جو اپنے جمہوری ہونے کے مدعی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوری اصول پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جمہوری حکومتوں ہی پر نکتہ چینی کی گئی ہو گی لیکن اس کی کیا ضرورت تھی جبکہ میں خود لکھ چکا تھا کہ حقیقتاً امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آتے ہیں اگر امریکہ میں دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات کا بت لوگوں سے ابتک سجدۂ عبودیت وصول

کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تا وقتیکہ اجتماعیات کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قایم ہو جائے۔ جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے اور گارنر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے، معاشرتی اصلاح بھی ہے اور مذہبی تخیل بھی۔

اس کے بعد معترض نے چند تنقیحات قایم کرکے ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تنقیحات اور ان کے جواب اسی قسم کے ہیں جو حامیانِ اشتراکیت کی نوکِ زبان رہا کرتے ہیں اور جو عموماً سطحی ہوتے ہیں کیونکہ ننانوے فی صدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے ہوئے معلمانہ انداز گفتگو اختیار کر لیتے ہیں۔

موجودہ نظامِ معاشرت کی خامیوں سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کی ناانصافیوں کی کون حمایت کرے گا؟ اسی لئے سرمایہ داروں اور طبقۂ امرا کے مظالم پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کے جذبات اس طرح اُبھر آتے ہیں کہ غور و فکر کی صلاحیت بالکل رخصت ہو جاتی ہے اور بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت قابل عمل بھی ہے یا نہیں، یہ حضرات اسی طرف مایل ہو جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر جب کوئی چیز مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے معائب پر نظر کم پڑتی ہے۔ اسی بنا پر اگر میں یہ کہوں کہ اشتراکیت سے اکثر اشتراکی خود نابلد ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ مارکس اور انجل کے نام تو اشتراکیوں کے زبان پر ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو مارکس کو سمجھ سکتے ہوں؟ بہت سے تو ایسے ملیں گے جو مارکس کی تصانیف سے بھی ناواقف ہوں گے۔

موجودہ دور کی اشتراکیت تمام و کمال معاشیات کے نظریوں پر قایم ہے (موجودہ دور کی تخصیص سے اشتراکی متعجب نہ ہوں۔ اس شریعت کا پیغمبر صرف مارکس ہی نہیں۔ بلکہ اس کے قبل بیسیوں اور بھی گزر چکے ہیں، چنانچہ خود افلاطون بہت بڑا اشتمالی تھا) لیکن ان بزعم خود ہمہ داں اشتراکیوں کو اس خارزار میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

روس کی کامیابیوں کو اشتراکیت کی کامیابی بتانا بھی ہمارے ایسے ہی مدعیانِ اشتراکیت کا کام ہے۔ شاید ان حضرات کو خبر نہیں کہ جس روز لینن نے وہاں (New Economic Policy) کا نفاذ کیا، اسی روز اشتراکیت کی بنیادیں ہل گئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ اسٹیلن کی موجودہ پالیسی کو کس قسم کی اشتراکیت کہیں گے۔ میری مراد سیاسی نہیں بلکہ اس کی اقتصادی پالیسی سے ہے جو بیس سال کی طویل کوششوں کے بعد اسٹالین نے اعتراف شکست کے طور پر پیش کی ہے اور جس میں ذاتی جائیداد و املاک رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے، تجارت کرنے اور کارخانے قایم کرنے کے لئے بھی عوام کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

روس کی ترقیوں کا میں منکر نہیں ہوں اور نہ اس کے کارناموں کو میں جھٹلانا چاہتا ہوں۔ میری تو غرض اتنی

ہے کہ اس کا راز نہ اشتراکیت میں پنہاں ہے اور نہ بولشوزم میں۔ بلکہ لینن اور اسٹالین کی اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں میں، اور روس کی نیم وحشی آبادی میں۔

اسے روس کی خوش نصیبی کہئے کہ اسے لینن اور اسٹالین ایسے رہبر مل گئے اور یہ ان دونوں کی خوش بختی تھی کہ انھیں تختۂ مشق بنانے کے لئے ایسا ملک ہاتھ آ گیا جو مطلق العنانی کی ہر صدا پر لبیک کہنے کے لئے پشتہا پشت سے عادی تھا۔ روس کی یہ نئی کایا پلٹ اشتراکیوں کے لئے واحد معجزہ ہو تو ہو۔ لیکن تاریخ اسی روس میں ایسے ہی دو اور معجزوں کا پتہ دیتی ہے۔ ایک ۹۸۸ء میں۔ جبکہ (Vladimir) نے خود بھی مسیحیت قبول کی اور دوسیوں کو بھی ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دوسری مثال تو بہت حال کی ہے یعنی پیٹر اعظم کے اصلاحات۔ کیا تاریخ روس کے یہ دونوں واقعات انقلاب سے کم درجہ رکھتے ہیں؟ اور کیا ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی طرح عوام ان پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں کئے گئے تھے؟

بیرونی دنیا کے لئے انقلاب روس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے، خاندانِ آدم کا وہ طبقہ جو ابتک کچلا جا رہا تھا اس پر تلا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اپنے حقوق منوا کر رہے گا۔ جنگِ عظیم کا نشتر خاطر خواہ فایدہ نہ پہونچا سکنے پر بھی بالکل رایگاں نہ گیا اور بہتیرے ملکوں سے صدیوں کے منجمد موادِ فاسد کو نکال دینے میں کامیاب ہوا۔ اقوامِ عالم خوابِ غفلت سے آنکھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حصولِ مقصد کے لئے سبھوں نے الگ الگ لایحۂ عمل مقرر کیا۔ چین۔ جاپان۔ روس۔ ایران۔ ترکی۔ اٹلی وغیرہ وغیرہ سبھوں نے اپنے حیاتِ نو کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اور نئی نئی تحریکیں ایجاد و اختیار کیں۔ اس میں کون ناکامیاب رہا اور کون کامیاب اس کا فیصلہ آنے والے مورخین کریں گے۔ میں تو اسے صرف اتفاق ہی کہوں گا کہ روس میں کرنیسکی حکومت (Kerensky Govt.) کو اپنی اندرونی نااتفاقیوں کی باعث، لینن کے ہاتھوں شکست ہوئی اور روس کی ساری ترقیوں اور کامیابیوں کا سہرا لینن کے سر رہا، کیونکہ انقلاب روس کے بعد خواہ کوئی بھی حکومت ہوتی اس کی ترقی کی داستان وہی ہوتی جو آج ہے۔ اور اگر نہیں تو ہمارے اشتراکی حضرات ایران۔ ترکی۔ اٹلی۔ جاپان کی کامیابیوں کے لئے کونسی تاویل پیش کرتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اسکا جواب اشتراکی یہی دیں گے کہ "روس کے دوش بدوش دوسرے ممالک کو کھڑا کرنا عین حماقت اور جہالت ہے کیونکہ روس اور ان ممالک کی حکومتوں میں "چند اصولی اختلافات ہیں" ان کے یہاں ریاست ہی سب کچھ ہے۔ روس کے یہاں ریاست کوئی چیز نہیں۔ وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ کے لفظ لایعنی نہیں ہیں، وہاں طبقوں کی بلندی اور پستی متعین چیز ہے، لیکن روس میں نہیں۔ الغرض دونوں میں اُصولی اختلافات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک اُصول وضع کرنے کا تعلق ہے میں کیا، ہر شخص انھیں بے تامل قبول کریگا۔ لیکن یہاں بحث اُصول سے نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے سے ہے۔ اعتراضات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان

اُصول میں کچھ تو قطعی ناقابلِ عمل ہیں اور بعض ایسے ہیں جنھیں قابلِ عمل تو کہا جا سکتا ہے، لیکن درحقیقت ان پر عمل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا اُصول کی حقیقت نمبروار ملاحظہ ہوں :-

نمبر ۱ - دوسری حکومتیں انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں قبول کرتیں، کہ کبھی انسان اس منزل تک پہونچ سکتا ہے، جب اسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے برعکس کارل مارکس کا خیال تھا کہ ضرورت اور افلاس ہی ام الخبائث ہے خواہ افراد ہوں یا اقوام دونوں کے ارتکاب جرم کی باعث یہی ضرورت ہوا کرتی ہے اگر ضرورت یعنی افلاس کا خاتمہ کر دیا جائے تو دنیا کو نہ پولیس کی حاجت رہ جائے گی اور نہ فوج کی اور چونکہ اشتمالیت اسی افلاس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا ذمہ لیتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ریاست کا آلۂ جبر و احتساب عضوِ معطل ہو کر نہ رہ جائے۔ چونکہ روس بھی صحیفۂ کارل مارکس کا پیرو ہے، اس لئے وہ بھی مدعی ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس معراج تک پہونچ جائے گا۔ بفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مارکس کا یہ ہوائی قلعہ عملی جامہ پہن بھی سکتا ہے تو اس کے لئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ ساری دنیا مارکس کی پیرو ہو جائے اور ایک دفعہ روسو (Rousseau) کی ذہنی (State of nature) تمام روئے زمین پر ساری و طاری ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لینن نے ساری دنیا کو اشتمالی بنا دینے کی کوشش کی تھی اور ایک کامیاب انقلابِ عالم کا خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ لیکن بہت جلد اس تجویز کی حماقت اس پر ظاہر ہو گئی اور اُسے کنارہ کش ہو جانا پڑا۔ لیکن بطور ائیڈیل یہ اُصول اب بھی روس میں موجود ہے۔ اور اشتمالی کم از کم اس کا خواب ضرور دیکھ لیا کرتے ہیں۔

نمبر ۲ - بلند و پست کی تفریق غیر فطری ہے۔ اس کو فنا کر کے سبھوں کو مساوی حقوق دینا چاہئے۔ غیر اشتراکی دنیا اب بھی اس پر مصر ہے کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے بلند و پست کی تفریق نہیں مٹائی جا سکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کل کا اعلیٰ طبقہ آج ادنیٰ ہو گیا۔ اسی طرح آج کا ادنےٰ کل اعلیٰ ہو جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ سب ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دئے جائیں۔ خود روس میں کیا ہوا؟ یہ تو درست ہے کہ زار کے وقت کی اشرافیت اب وہاں باقی نہیں ہے۔ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس کی جگہ ایک دوسری ذرا پست درجہ کی اشرافیت پیدا نہیں ہو گئی۔ آپ لاکھ انسانیت پرست بن جائیں لیکن پست کاموں سے جو ذہنی پستی پیدا ہو جاتی ہے اُسے کیسے دور کر دیں گے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور، انجنوں میں کوئلہ جھونکنے والا انسان، یا صحرائے گوبی میں جانوروں کا گلہ بان، اسی قسم کی زندگی بسر کرنے لگ جائے گا جیسا کہ مابعد الطبیعات کا ایک معلم سائنس کا ریسرچ سکالر یا کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری بسر کرتا ہے۔ عموماً اشتراکیت پسند جماعت اس کا یہ جواب دیتی ہے "یہ کون کہتا ہے۔ ہمارے پیش نظر تو صرف روٹی کا سوال ہے۔ اشتراکیت کا مقصد تو صرف اکثریت کو افلاس اور فاقوں سے بچانا ہے۔ پھر چونکہ افلاس نام ہے ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی کا اور امارت نام ہے لوازمِ زندگی کا بافراط پائے جانے کا، اس لئے اشتراکیت

انھیں دونوں میں توازن پیدا کردینا چاہتی ہے ۔
اگر اشتراکیت صرف اتنے ہی کے لئے کوشاں ہے ۔ تو بادب گزارش ہے کہ دوسری ریاستوں کو تو چھوڑیے خود جرمنی اور اٹلی میں بھی یہی کچھ ہورہا ہے وہاں بھی ذاتی جایداد اور املاک پر اگر کلیتاً نہیں تو کافی حد تک ریاست کا قبضہ ہوگیا ہے۔ ساہوکار اور کارخانوں کے مالکوں پر بہت کچھ پابندیاں عاید کردی گئی ہیں (Labour legislation) کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جارہی ہے آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس ۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے حصول کے ذریعے ہیں اور جب زمانہ کی رفتار کا یہ رخ ہو اور ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظام سرمایہ داری پر اشتراکیت کی اکثر نکتہ چینیاں قابلِ قدر ہیں ۔ لیکن انقلاب روس اور سوویٹ نظامِ حکومت کے بغیر بھی یہ خامیاں ظاہر ہوکر رہتیں کیونکہ آزاد سرمایہ داری کی تباہ کاریاں ایسی نہ تھیں کہ چھپائے چھپ جاتیں ۔
نمبر ۳ ۔ غیر روسی اشتراکی اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جمہوریت روس ہی میں ہے ۔ کیونکہ دوسری ریاستوں کی طرح یہاں کی حکومت سرمایہ داروں کی دست نگر نہیں ہے بلکہ حکومت پر سوویٹ کو اقتدار کلی حاصل ہے نیز غیر ممالک کی طرح یہاں حکومت کی مشین اوپر سے نیچے نہیں آتی بلکہ نیچے سے اوپر جاتی ہے ۔ یہاں کے (پنچایت ۔ یونین بورڈ ۔ لوکل بورڈ ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ) Local bodies سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے فرائض بھی انھیں جیسے ہیں ۔ دیہاتوں ، قصبوں ، کارخانوں ، چھوٹے شہروں سے سوویٹس کی ابتدا ہوتی ہے ۔ ان کے اوپر ضلع اور صوبہ کے سوویٹس ہوتے ہیں اور سبھوں کے اوپر کونسل آف سوویٹس (Council of Soviets) قایم ہے ۔ یہی یہاں کی مجلسِ قانون ساز ہے ۔ اور ملک کی کیبنٹ (The council of Peoples Commissars) کا بھی یہی انتخاب کرتی ہے سوویٹس کے ممبروں کا انتخاب الکشن کے مروجہ قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا ۔ بلکہ سوویٹ کا صدر ، عام میٹنگ میں امیدواروں کے نام پیش کرتا ہے ۔ ان کی موافقت میں تقریریں ہوتی ہیں ۔ حکومت کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں حاضرین سے ہاتھ اٹھوا کر ممبروں کے انتخاب ہوجانے کا اعلان کردیا جاتا ہے ۔ عوام الناس کے اثر و اقتدار کو بڑھانے کی دوسری قابلِ ذکر چیز اجتماعیت ہے (Collectivism) ہے جس کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے ۔ لیکن اندرونی انتظامات بالخصوص کارخانوں اور کاشتکاری کا نظم و نسق یہاں اسی کے ذمہ ہے سمجھنے کے لئے اسے (Board of Directors) کہہ لیجئے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ یہاں ممبران تمام و کمال کارخانے کے مزدوروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور کارخانہ کے نفع و نقصان سے انھیں بحث نہیں

ہوتی۔ ان کا کام صرف انتظام کی دیکھ بھال ہے اور جہاں تک اپنے مخصوص کارخانے کا تعلق ہے وہ Trade Union کی خدمت بھی یہی انجام دیتے ہیں اور اس طرح سوویٹ پر بھی ان کا کافی اثر رہتا ہے۔

یہاں میں نے محض ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ حقیقت کو بے نقاب کروں پہلے سوویٹ کے طریقۂ انتخاب پر بھی ایک بے لاگ نظر ڈال لیجئے۔ پہلی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ممبروں کے انتخاب کا حق صرف مزدور، کسان اور فوج کو حاصل ہے دوسرے طبقوں سے قطع نظر اس کو بھی ایک حد تک (Universal Adult Suffrage) کہہ سکتے ہیں لیکن تا وقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح "حکومت اور انتخاب" کے معنی سمجھ سکے عام رائے دہندگی کا حق لایعنی سی بات ہے۔ چنانچہ مِل نے کہا تھا۔ "عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت کسی امیدوار کا نام پیش کر کے ایک جادو بیان مقرر حاضرین کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے تو غیر ارادی طور پر بھی اس کی حمایت میں ہاتھ اُٹھ ہی جاتے ہیں۔ مزید براں ووٹ بر سرِ عام لئے جاتے ہیں۔ امیدوار حکومت کا منتخبہ آدمی ہوتا ہے اور انتخاب کرنے والوں میں بھی ایک جماعت حکومت کی حمایتی ہوتی ہے جو ہر ممکن پروپیگنڈے سے کام لیتی ہے۔ نیم خواندہ یا جاہل عوام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عاقل اور پڑھے لکھے تک اس ماحول اور ایسی فضا میں حق و ناحق میں تمیز نہیں کر سکتے اور (Mass Psychology) کے غلبہ میں آ ہی جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ غیر معمولی فہم و فراست کے لوگ اس طوفانِ بدتمیزی میں بھی اپنے ہوش و حواس درست رکھ سکیں، پھر بھی حکومت کے خلاف کب آواز بلند کر سکیں گے؟ اور اگر بفرضِ محال یہ بھی مان لیا جائے تو پھر وہاں ان کی سنتا کون ہے؟

یہ اصولی اعتراض تھا لیکن درحقیقت روس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ کہنے کے لئے تو حکومت سوویٹس کے قبضہ میں ہے اور سوویٹس پر "کلکٹوز" قابض ہیں لیکن واقعتاً وہاں (Communist Party) مطلق العنانی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ روس میں اسٹالین کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسے روسی حکومت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ وہ محض کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری ہے۔ پھر پارٹی کے ممبران کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اتنے منظم ہیں کہ کلکٹو اور سوویٹ میں ان کے سوا دوسرے کی رسائی نہیں ہوتی پھر یہ بات بھی نہیں کہ صرف ان کی تنظیم یا بے لوث خدمت قوم انھیں برسرِ اقتدار کئے ہوئے ہے، بلکہ اس پارٹی کی قوت کا راز روس کی خفیہ پولیس یعنی (O.G.P.U.) میں پوشیدہ ہے۔ جس کے مظالم کی داستان لیول کے ہیبتناک افسانوں سے کم روح فرسا نہیں، حکومت یعنی پارٹی کے خلاف کسی کی مجال نہیں کہ اشارتاً بھی کچھ کہہ سکے۔ روسی قتلِ عام کی داستانوں سے کون واقف نہیں؟ ملک میں اخبارات بھی ہیں۔ جلسے بھی ہوتے ہیں۔ تجویزیں بھی پاس کی جاتی ہیں، لیکن ہوتا وہی ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ روس میں عوام

کی زندگی وبالِ جان ہوگئی ہے ملک اس قید و بند کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ روسی صدیوں سے اسی قسم کی زندگی کے عادی ہیں۔ زار کے زمانہ میں بھی حکومت کے خلاف لب کشائی ناممکن تھی، اسی وقت بھی شاہی پولیس کے مظالم کچھ کم نہ تھے اور دوسری قسم کی پابندیاں بھی آج کی پابندیوں سے کہیں زیادہ تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس کے لئے زار کی حکومت کے مقابلہ میں بولشیوک حکومت ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔

اب روس کی اس کمیونسٹ پارٹی کا جرمنی کے نازی اور اٹلی کی فاسسٹ پارٹی اور ان کا حکومت پر جو اقتدار ہے اس سے مقابلہ کیجئے تو یہ تمیز بھی دشوار ہو جائے گی کہ کون کس کا چربہ ہے۔

یہاں میں نے صرف تین ہی اصول سے بحث کی ہے۔ لیکن انھیں اصول کو لیا ہے جو اشتراکیوں کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ بہرحال میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نہیں ہو سکتی۔

گلاب چند

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے قیمت ۲ر

دیہی جلسں:۔ دیہی جلسں اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی۔ سی کمارپالتا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور انکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے قیمت ۴ر

شہری آزادی:۔ اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو انکے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت:۔ از ڈاکٹر زین العابدین صاحب یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اسکے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے۔ جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اصلاحی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

دنیائے آب کی کہانی

کرۂ زمین کا چوتھائی حصہ خشکی ہے باقی تین چوتھائی پانی۔ حصۂ آب کا رقبہ ۱۴ کرور مربع میل سے زیادہ ہے جو زمین کے شمالی حصہ میں ۶۱ فی صدی پایا جاتا ہے اور جنوبی حصہ میں ۳۹ فی صدی۔

ہر سال پانی کی ایک تہ ۱۲ فٹ ۹ انچ کی موٹی، بھاپ بنکر اُڑ جاتی ہے، گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ۵۲،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ فٹ مکعب، یا ۱۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن پانی ہر سال سورج کی گرمی کے نذر ہو جاتا ہے جسکی تلافی بارش اور دریاؤں سے ہوتی رہتی ہے۔ قطبین کے علاقہ میں پانی ایک اور شکل میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کا نام تودۂ برف ہے ان تودوں کا نہایت ہی تھوڑا حصہ ہر سال پگھلتا ہے، ورنہ اگر یہ تمام تودے پگھل جائیں تو سوائے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کے ساری دنیا غرقِ آب ہو جائے۔

سب سے بڑے تودے، گرین لینڈ کے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہوگی کہ گرین لینڈ کا سمندر بعض جگہ چھ ہزار فٹ کی موٹی تہ میں چار چار لاکھ مربع میل تک منجمد ہو جاتا ہے اور اس سے تقریباً ایک ارب ٹن پگھلا ہوا پانی ہر سال سمندروں میں پہونچتا رہتا ہے۔

برفیلے تودوں کی تعداد، جو شمال سے جنوب کی طرف بہ بہ کر آتے ہیں، اوسطاً ۴۰۰ ہے اور اس وقت تک سب سے بڑا تودہ، ۶۵ فٹ اونچا اور ۱۰۰ فٹ لمبا دیکھا گیا ہے جس کا وزن کروروں ٹن ہونا چاہئے، جب سنہ ۱۹۱۲ء میں ٹٹانک جہاز برف کے تودوں سے ٹکرا کر غرق ہوا تو تودوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی گئی تاکہ انکو توڑتی رہے اور جہازوں کی آمد و رفت مخدوش نہ رہے، لیکن پوری طرح اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایکبار دقت واحد میں پانچ سرنگیں لگا کر ایک تودہ کو اُڑانا چاہا لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ تودہ میں صرف پندرہ فٹ گہرا اور ۲۰ فٹ لمبا سوراخ پیدا ہو سکا۔ ایک مرتبہ بہت زیادہ قوی ڈائنامیٹ بجلی کے ذریعہ سے استعمال کیا گیا، لیکن اس نے بھی کوئی اثر نہ کیا۔

تودوں کا بہت بڑا حصہ (تقریباً ۸۰ فٹ کا) پانی کے نیچے رہتا ہے، اس لئے جب وہ کبھی سمندر کے گرم چشموں میں پہونچ جاتے ہیں، تو پگھلنے لگتے ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

سمندروں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ کبھی وہ خشک ہو سکتے ہیں بالکل مہمل ہے، بعض کا خیال ہے کہ سمندروں کا جتنا پانی بھاپ بنکر اڑتا ہے، اتنا انھیں واپس نہیں ملتا۔ بعض کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ سمندروں کے پانی کے دباؤ سے کسی وقت زمین کا شق ہو جانا بھی ممکن ہے۔ ایک امریکن ماہر کا بیان ہے کہ ان بلورات کے لئے جو سمندروں کی تہ میں بنتے رہتے ہیں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنا پانی ان میں ہر سال صرف ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سمندر کا پانی ہر سال دس انچ کم ہو رہا ہے اور اس طرح گویا بارہ ہزار سال میں اسے خشک ہو جانا چاہئے، لیکن آسٹریا کے ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ سمندروں کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، اس لئے یہ خیال کہ کسی وقت سمندر خشک ہو جائیں گے بالکل بے معنی ہے۔

کرۂ ارض کے پانی کی تقسیم جغرافیہ والوں نے مختلف سمندروں کے نام سے کی ہے۔ تین بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں بحر پاسفک، بحر اٹلانٹک، بحر ہند۔ بعض نے قطبین کے حصۂ آب کے بھی علٰحدہ نام رکھے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ ہیں انھیں تینوں سمندروں کے حصے۔

ان سمندروں میں بحر پاسفک سب سے بڑا اور بہت زیادہ گہرا سمندر ہے۔ شمالاً جنوباً ۹۶۰۰ میل تک چلا گیا ہے اور شرقاً غرباً ۱۰۶۰۰ میل تک۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۴۰۰۰ فٹ سے کچھ زاید ہے۔ سواحل جنوبی امریکہ کی طرف اس کی گہرائی ۱۸ ہزار سے ۲۵ ہزار فٹ تک دریافت ہوئی ہے اور جزایر فلپائن کے پاس ۳۵ ہزار فٹ تک۔ یعنی اگر ایورسٹ کی چوٹی جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے اس حصۂ آب میں ڈالدی جائے اور اس کے اوپر برطانیہ کا سب سے اونچا پہاڑ، بن نوس (Ben Nevis) اٹھاکر رکھدیا جائے، تو بھی دو ہزار فٹ پانی ان کے اوپر نظر آئے گا۔ نیوزیلینڈ کے شمال مشرق اور جزیرۂ گوام (Guam) کے قریب بھی جو جزائر فلپائن کے پاس ہے ۳۱ ہزار فٹ تک گہرائی دریافت کی گئی ہے۔

بحر پاسفک کا پچاسواں حصہ ایسا ہے جو ۲۳ ہزار فٹ سے زیادہ گہرا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ ۱۶ اور ۲۰ ہزار فٹ کے درمیان گہرا ہے۔

ایک مسافر جو شمالی افریقہ سے ہندوستان کی طرف سفر کرتا ہے، وہ بحر ہند میں اکثر یہ نظارہ دیکھتا ہے کہ رنگین روشنیاں پانی کی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب برشگالی ہوائیں سمندر میں تموج پیدا کر دیتی ہیں اور بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگتی ہیں تو آفتاب کی روشنی ان میں یہ گل کھلاتی رہتی ہیں۔

بحر ہند کی گہرائی کا اوسط ۱۳ ہزار فٹ ہے گویا بحر اٹلانٹک کی گہرائی کے اوسط سے ۱۲۰ فٹ زیادہ۔ چھوٹے سمندروں میں آرکٹک کی گہرائی کا اوسط سب سے کم ہے یعنی ۴ ہزار فٹ بحر روم کی گہرائی کا اوسط اس سے ہزار فٹ زیادہ ہے

سب سے چھچھلا پانی خلیج فارس کا ہے یعنی اوسطاً ۸۴ فٹ۔ بالٹک کا پانی اس سے دو چند گہرا ہے اور انگلش چینل (نہر انگلستان) اس سے بھی کچھ زیادہ یعنی اوسطاً ۱۹۲ فٹ۔ بحیرۂ شمالی (North Sea) البتہ نسبتاً گہرا ہے اور اس کی گہرائی کا اوسط ۳۱۲ فٹ ہے۔

جس طرح ہم کو زمین پر پہاڑ اور وادیاں وغیرہ نظر آتی ہیں، اسی طرح سمندر کے اندر بھی موجود ہیں بعض مقامات پر سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اوپر نکل آئی ہیں اور انھیں کا نام جزائر ہے، چنانچہ جزائر گلاپوگس (Galapagos) جو جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی طرف پائے جاتے ہیں، اس سلسلۂ کوہ کی چوٹیاں ہیں جو آبنائے پناما سے جنوب مشرق کی طرف پانی کے اندر ہی اندر چلا گیا ہے۔

مغربی بحر پاسفک میں بکثرت جزایر پائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں شمالی اٹلانٹک میں ایک سلسلۂ کوہ ۳۰۰۰ فٹ کی گہرائی میں اندر ہی اندر چلا گیا ہے جو اسکاٹ لینڈ کو آئس لینڈ سے ملاتا ہے۔ الغرض اسی طرح کے بہت سے سلسلے پہاڑوں کے پانی کے اندر پائے جاتے ہیں، شمالی اٹلانٹک میں سلسلۂ کوہستان بہ نسبت وسط اٹلانٹک کے کم پایا جاتا ہے، جہاں بعض پہاڑوں کا سلسلہ ۷۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے۔

بحر ہند میں سماترا کے مغرب اور جاوا کے جنوب میں ایک متوازن سلسلہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نہایت عجیب و غریب پایا جاتا ہے۔ پہلے ایک وادی مابین جزایر سماترا و نسادی پائی جاتی ہے جو ماورار جاوا بارہ ہزار فٹ گہری ہے اور اسی کے متوازی ایک سلسلۂ کوہ چلا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسری وادی بالکل متوازی ۱۲ ہزار فٹ کی ملتی ہے اور پھر ایک سلسلۂ کوہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔

سمندر کی سطح کبھی ساکن نہیں ہوتی اور اس کا پانی ہمیشہ مد و جزر میں رہتا ہے، اسی لئے اس کا درجۂ حرارت بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک نہیں رہتا۔ دن میں ہوا کے ٹمپریچر کے مقابلہ میں اس کا ٹمپریچر ایک ڈگری زیادہ رہتا ہے اور رات کو ڈیڑھ ڈگری گرم۔

سمندر کا پانی اپنی حرارت بالکل سورج سے حاصل کرتا ہے گو تھوڑی مقدار حرارت کی اندرون زمین سے بھی اسے پہونچتی رہتی ہے۔ سورج کی کرنیں کس گہرائی تک اپنا کام کرتی ہیں اور وہ کس مقدار کی حرارت پانی میں پیدا کرسکتی ہیں، اس کا صحیح علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا، لیکن ایک بار تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ ایک صاف روشن دن میں جبکہ ہوا نہ تھی، ۶۵ فٹ کی گہرائی میں بحر روم کا پانی بہ نسبت سطح کے ½ ڈگری زیادہ گرم تھا۔

سطح آب سے لیکر بارہ ہزار فٹ کی گہرائی تک سمندروں کا ٹمپریچر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے لیکن اس کے نتائج ایسے نہیں، جن کی بنا پر کوئی کلیہ قائم ہو سکے۔ خط استوا پر واقع ہونے والا حصۂ آب اور خط استوا سے

اِدھر اُدھر ہٹے ہوئے حصہ میں سورج کی گرمی کا اثر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی یکسانیت نہیں ہو اور مختلف موسموں میں اتنی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اس کی بنا پر کوئی اصول نہیں متعین کیا جا سکتا۔

گرمی کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ گرم حصۂ آب خلیج فارس ہے جس کا ٹمپریچر اس زمانہ میں ۹۶ ڈگری رہتا ہو بحرِ احمر (Red Sea) بھی تقریباً اتنا ہی گرم رہتا ہے، یعنی ۹۴ ڈگری۔ خلیج بنگال اور اسی طرح خطِ استوا پر واقع ہونے والے بحرِ ہند کے اور حصوں میں بھی بارش سے پہلے درجۂ حرارت ۸۶ تک پہونچ جاتا ہے۔ جاپان کے شمالی مشرقی حصۂ آب کا ٹمپریچر بہت بدلتا رہتا ہے یعنی جب کم ہوتا ہے تو ۲۰ ڈگری تک گر جاتا ہے اور بڑھتا ہے تو ۸۴ تک پہونچ جاتا ہے، اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہاں زمین کے اندر سے کبھی گرم چشمے اُبلتے ہیں اور کبھی سرد۔

سمندروں کے ٹمپریچر پر مقدارِ نمک کا اثر ہوتا ہے، یعنی جس حصۂ آب میں جتنا زیادہ نمک پایا جائے گا، اتنا ہی زیادہ سرد ہوگا۔

سمندر کا پانی خالص پانی نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سی اور چیزیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ اسوقت تک دنیا میں ۹۰ عناصر دریافت ہوئے ہیں جن میں تیس سمندروں کے پانی میں ملتے ہیں، یہاں تک کہ سونا اور چاندی بھی پانی میں موجود ہے، لیکن اتنی کم مقدار میں کہ اس سے کوئی تجارتی فایدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نمک اور نمک والے عناصر البتہ اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بحرِ اٹلانٹک سب سے زیادہ نمکین سمندر ہے، اس کے بعد بحرِ ہند کا نمبر ہے۔ خطِ استوا پر واقع ہونے والے حصوں میں نمک زیادہ پایا جاتا ہے اور قطبین کے حصوں میں سب سے کم۔ خلیج فن لینڈ اور بوتھنیا کا پانی نسبتاً بہت صاف ہے۔

سمندروں کے پانی کا نمک نکال کر اس کو پینے کے قابل بنانا آسان ہے۔ اس کا طریقہ قدیم سیاحوں کو بھی معلوم تھا اور اب تو خیر یہ عام بات ہو گئی ہے۔

سمندر کے پانی کو گہرے نیلے رنگ کا کہتے ہیں جو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن شاید حقیقت یہ نہیں ہے، آپ اگر بلندی سے اسکو دیکھیں تو چھچھلا پانی سبز نظر آئے گا، جس کا سبب یہ ہے کہ اس میں ریت ملی رہتی ہے۔ گہرے حصوں میں بھی بعض جگہ رنگ سبز نظر آتا ہے، جس کا سبب ان بیشمار کیڑوں کا جھنڈ ہے جو چھوٹی مچھلیوں کی غذا کے لئے قدرت نے سمندروں میں پیدا کئے ہیں۔ شمالی اٹلانٹک اور بحرِ ہند و بحرِ پاسفک کے منطقۂ معتدلہ میں پانی کا رنگ عام طور پر واقعی نیلا نظر آتا ہے، لیکن جتنا آپ قطب شمالی کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ سبز ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بحیرۂ شمالی کا پانی خالص سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ بحرِ روم کا نیلگوں رنگ بہت مشہور ہے، لیکن صرف مشرقی حصہ کا

مغربی حصہ کا مایل بہ سبزی ہے۔ رنگ کا تعلق پانی کی صفائی سے بھی ہے۔ یعنی پانی جتنا زیادہ صاف ہوگا، اتنا ہی زیادہ نیلگوں نظر آئے گا۔ پانی کی صفائی دیکھنے کے لئے سفید رنگے ہوئے گول توے، اندر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ نظر نہ آئیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے سرگاسو (Sargasso) سمندر کا پانی بہت زیادہ شفاف معلوم ہوا ہے، کیونکہ سات فٹ قطر کا توا، ۱۶۲ فٹ کی گہرائی میں بھی وہاں صاف نظر آتا ہے، برخلاف اس کے بحر شمالی میں ۶۰ اور ۱۰۰ فٹ کے درمیان ہی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کے اندر کرنوں کے نفوذ کا بھی تجربہ کیا گیا ہے، چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ بحر روم میں بارہ ہزار فٹ تک روشنی کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن جب ڈاکٹر بیب (Beebe) نے ایک خاص آلہ کے ذریعہ سے، ساحلِ برموڈا کے قریب تک پہونچنے کی کوشش کی تھی، تو دو ہزار فٹ کے بعد انکو سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

لہروں کی پوری ضخامت و قوت کا اندازہ بھی کھلے ہوئے سمندروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی جھیل ایسی نہیں ہے جہاں لہریں اپنی قوت کے ساتھ اُٹھ سکیں۔ بحر اٹلانٹک، بحرِ ہند اور بحر پاسفک میں چونکہ ہوا بہت زور سے چلتی ہے اس لئے وہاں موجوں کو پوری قوت کے ساتھ اُٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ سمندر کی لہر پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہے اور وہ واقعی ایسی ہی معلوم بھی ہوتی ہے، کیونکہ جب مسلسل اونچی اونچی لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی کے تھپیڑوں سے جو چھینٹے اُڑ اُڑ کر آتے ہیں ان کے اندر سے سامنے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے اور لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی عموماً چالیس پچاس فٹ ہوتی، گو کبھی کبھی طوفانی حالت میں وہ ستر فٹ تک پہونچ جاتی ہے ورنہ یوں سکون کی حالت میں اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اگر ہوا کا رُخ بھی وہی ہو جو سمندر کے ہیجان کا ہے اور اس کی رفتار زیادہ ہو تو لہروں کا تسلسل بہت بڑھ جاتا ہے۔ لہروں کی قوت ڈھلواں ساحلوں پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ بحر اٹلانٹک اور بحرِ شمالی میں لہروں کا دباؤ فی مربع فٹ ۳ ½ ٹن دریافت کیا گیا ہے، حالانکہ سڑک کوٹنے والے رولر کا دباؤ فی مربع فٹ ایک ٹن کے قریب ہوتا ہے۔

سمندر کی تباہ کاریاں تو ظاہر ہی ہیں، لیکن اس کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ ۳۵ سال کے عرصہ میں برطانیہ کی ۶۶۴۰ ایکڑ زمین اگر دریا برد ہوئی تو ۴۸ ہزار ایکڑ زمین دوسری جگہ سمندر نے دے بھی دی۔

سمندر کے اندر جتنی دولتیں پنہاں ہیں ان کا اندازہ مشکل ہے، لیکن سب سے بڑی دولت اس کا میگنیشیم ہے۔ یہ ایک چمکدار دھات ہے جس کی چادریں، سلاخیں اور ستون وغیرہ بن سکتے ہیں، اور نئی دنیا نے یہ اُمیدیں

قایم کی ہیں کہ آیندہ تمام مکانوں کی تعمیر اسی دھات سے ہوگی اور کرۂ زمین ان تعمیروں سے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جو اشیا سمندر میں پائی جاتی ہیں ان کے ۱/۲۵ حصہ سے ۶۰ لاکھ ٹن مگنیشیم، گیارہ کروڑ ستر لاکھ ٹن نمک، ۹ کرور ۸۰ لاکھ ٹن چاندی، ۸۰ لاکھ ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ مونگا بھی سمندر کی بڑی دولت ہے جسکا علم عہد قدیم کے انسان کو تھا، اور موتی کی قدر و قیمت تو خیر سبھی کو معلوم ہے۔

بعض چھوٹے چھوٹے سمندر ایسے ہیں جن کے چاروں طرف خشکی کا حصہ ہوتا ہے اور اصطلاح میں ان کا نام بحر محاط (Inland Sea) ہے۔ اس قسم کے سمندروں میں سب سے بڑا بحر اخضر (Caspian Sea) ہے، جس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ ان کو ہم ایک لحاظ سے جھیل بھی کر سکتے ہیں، یہ جھیلیں پہاڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایورسٹ کی چوٹی پر بھی ایک جھیل ہوائی جہاز سے دیکھی گئی ہے، لیکن وہاں تک کوئی پہونچ نہیں سکا۔ یہ جھیل بہت چھوٹی ہے، مگر بڑی جھیلوں میں سب سے اونچی جھیل ٹٹی کا کا ہے جو جنوبی امریکہ کے پہاڑ میں سطح آب سے ۱۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بعض جھیلیں ایسی ہیں جو سطح آب سے بہت نیچے واقع ہیں۔ ان میں بحر مردہ (Dead Sea) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے یہ سمندر کی سطح سے ۱۲۹۲ فٹ نیچے واقع ہے۔

گہری جھیلوں میں سب سے زیادہ مشہور سائبیریا کی بیکال جھیل ہے جس کی گہرائی کا اوسط ۲۳۰۰ فٹ ہے لیکن بعض جگہ اس کی گہرائی اس سے دوچند ہے۔ افریقہ کی جھیل ٹنگانیکا دنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے جو ۴۵۰ میل تک چلی گئی ہے اور گہری بھی بہت ہے یعنی بعض مقامات پر اس کی گہرائی ۴۰۰۰ فٹ ہے۔

یوروپ کی سب سے بڑی جھیل لڈوگا ہے جو روس اور فن لینڈ کے درمیان سرحد پر واقع ہے اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل ہے، لیکن گہرائی بہت کم ہے یعنی صرف ۷۰۰ فٹ۔

سب سے بڑا دریا دنیا کا وہ ہے جو مسوری (Missouri) اور مسی سپی (Mississippi) سے ملکر بنتا ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے اور اس کی لمبائی چار ہزار دو سو میل ہے۔

اس دریا سے ۱۲۵۰۰۰۰ مربع میل زمین میں آبپاشی ہوتی ہے جو امریکہ کا ایک تہائی حصہ ہے۔ دریائے امیزن بھی چار ہزار میل کا لمبا دریا ہے اور اس سے ۲۷۲۲۰۰۰ مربع میل زمین سیراب ہوتی ہے یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ ۲۳۰۰ میل تک اس میں بڑے بڑے جہاز چلے جاتے ہیں اور ۵۰۰ میل تک چھوٹے جہاز۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۲۰۰ فٹ ہے۔ بارش کے زمانہ میں اس کا پاٹ کہیں کہیں ۵۰ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس کا دہانہ ۲۰۰ میل چوڑا ہے۔

دریائے نیل بھی دنیا کا نہایت مشہور دریا ہے۔ یہ ۴۰۵۰ میل لمبا ہے، لیکن رقبۂ آبپاشی بہت کم ہے۔

بعض دریا ایسے بھی ہیں جو اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً مسی سپی، یا شمالی چین کا یلو (Yellow River)

بعض ایسے دریا بھی ہیں جو سمندر میں نہیں گرتے۔ ان میں وسط ایشیا کا دریائے ٹارم بہت مشہور ہے۔

دنیا کی سب سے اونچی آبشار امریکہ کی ونی زولا ہے۔ یہ ایک میل کی بلندی سے گرتی ہے اور اتنا شور پیدا کرتی ہے گویا ہزاروں گھنٹے بجائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آبشار جوگ جو (Western Ghats) میں واقع ہے ۸۲۰ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے۔ برٹش گائنا کی ایک آبشار ۸۲۲ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے اور ۷۴۱ فٹ تک تو بالکل عمودی شکل میں گرتی ہے۔

چوڑی آبشاروں میں امریکہ کی نیاگرا بہت مشہور ہے جس کی چوڑائی چار ہزار فٹ ہے، اس کے بعد افریقہ کی کی آبشار وکٹوریا ہے۔

بڑا گھر

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باپ، چچا، بھائی اور سب رشتہ دار رو رہے تھے، کیونکہ آج بالیش کی رخصتی ہو رہی تھی مگر سب کے دلوں میں تسلی سی تھی، کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ اپنے خاوند کے گھر جا کر اس کو ضرور سکھ ملے گا جو اس کو اپنے باپ کے گھر میں نہ مل سکا تھا۔ ماں نہ ہونے سے کسی کو بہت کم سکھ مل سکتا ہے۔ سب بالیش کو گھیرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو لیکن دلوں میں خوشی لے کر بالیش سے مل رہے تھے۔ مگر بالیش، ان سبھوں سے آنکھوں میں آنسو ہی لئے ہوئے مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں خوشی کو ٹٹولا۔ تو اس کا نام و نشان کہیں نہیں ملا۔ آنے والے زمانہ میں بھی دور تک اُس کی نظر گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی خوشی کا پتہ نہ چلا۔

بہت دنوں سے بالیش اور روپ ایک ہی مقام کی طرف منزلیں طے کرتے چلے آرہے تھے جہاں وہ دونوں ایک ہو جاویں گے۔ آخر کو دونوں نے پہلی منزل پار بھی کر لی تھی اور اس مقام کا نظارہ بھی وہ کرنے لگے تھے۔ ہماری زندگی میں پہلی منزل ہوتی ہی ایسی ہے کہ جب ہم کسی سے قول قرار کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا ارادہ ہمارے دلوں میں ایسا سما جاتا ہے، جیسے کہ بیل کی جڑ زمین میں۔ اور یہی محبت کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل کو پار کر کے دونوں کبھی پیچھے لوٹنے کا خیال نہیں کرتے چاہے آگے کتنی تباہیوں کے منظر ہوں۔ بلکہ تباہیوں کے منظر تو ان کو اور آگے بڑھنے پر آمادہ کر دیتے ہیں تا کہ اگر ان کے ایک ہو جانے کا مقام ان کی پہونچ سے باہر ہو تو وہ بھی ان تباہیوں میں فنا ہو جاویں یہ پہلی منزل ان دونوں نے پار کر لی تھی۔

ان دونوں کی نظروں کے سامنے پہلی منزل کے آگے کوئی مشکل نظر نہ آرہی تھی! ایک دوسرے کا مل جانا دونوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جنت مل گئی۔ روپ دولتمند نہ تھا۔ مگر فقیر بھی نہ تھا۔ اس کے پاس جائداد بھی تھی اور دو سو کا نوکر بھی تھا۔ مگر وہ اتنا دولتمند نہ تھا جتنا اُس کے چچا اور اُس کے باپ چاہتے تھے۔ مگر بالیش کو تو یہ دیکھنا تھا کہ اُسکے ارمان روپ پورے کر سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دولت ا۔ دولت نہ سہی، روپ کے پاس محبت کا تو ذخیرہ تھا۔ بالیش اپنے دل میں محبت چھپائے بیٹھی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد محبت مشکل سے ہی ملتی ہے اور بالیش محبت چاہتی تھی۔ دولت نہیں۔ اس لئے ان دونوں کے ملنے میں مشکلیں کیونکر حائل ہو سکتی تھیں۔ مگر اُس کے والدین

کی خواہش کو کیا کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی شادی کسی بڑے گھر میں ہو اور ان کے ساتھ ساتھ دنیا کی رکاوٹوں کو کیسے پار کیا جاوے!

دنیا ایک دوسرے کو مشکل سے سکھی دیکھ سکتی ہے۔ دونوں کو پہلی منزل سے پار ہوتے دیکھ کر دنیا والے آنکھ پھاڑتے ہوئے بالیش کے پتا کے پاس آئے اور بولے "ارے یہ کیا کیا۔ تمھاری سمجھ کہاں چلی گئی۔ اپنی لڑکی کو کہاں جھونکنے کا ارادہ کر لیا ہے"۔ ان طعنوں کے آگے ایک انسان کہاں تک کھڑا رہ سکتا ہے! بالیش کے پتا کو ان طعنوں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ بالیش کے کانوں میں بھی ان باتوں کی بھنک پڑی اور روپ کے ساتھ اس کی شادی نہ ہو سکی۔

بالیش نے اپنے خاوند کے ساتھ بڑے گھر میں قدم رکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک سنسان جنگل میں ڈالا گیا ہے جہاں اس کو کوئی پھول نظر نہیں آتا۔ اپنے دل کے پھول کو۔ ٹوٹے ہوئے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑی کو۔ وہ راستے میں بکھیرتی چلی آرہی تھی اور یہاں پہونچی تو اس کے دل میں جھک کا پتہ نہ تھا۔ بادِ خزاں آئی اور باغ کو اُجاڑ کر گئی۔

بڑا گھر — ہاں بالیش نے دیکھا کہ گھر تو لمبائی چوڑائی میں بہت بڑا ہے۔ تین منزلہ مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ صحن اتنا بڑا کہ ہزاروں آدمی اُس میں بیٹھ سکتے ہیں! کمرے بھی کافی بڑے تھے استنے بڑے کہ ان میں بالیش کی نظر بھی کھو جاتی تھی۔ غرض یہ کہ گھر تو واقعی بہت بڑا تھا۔!!

بڑے گھر کی سی کیفیتیں بھی بالیش کو ملیں

اس کے کانوں میں قہقہوں کی آواز بھی آتی تھی اور ان قہقہوں سے بلند ایک سریلی آواز بالیش کے سینے کو چیرتی پھاڑتی نکل جاتی تھی! ایسا تو بڑے گھروں کا قاعدہ ہی ہے نہیں تو بڑا گھر کیسے معلوم ہو!

"ساری بہت اچھی ہے" بالیش کہتی

"مگر آج کیسے خریدی جا سکتی ہے؟ دوستوں نے مجھے پارٹی پر مجبور کر لیا ہے اُس میں بھی تو روپیہ خرچ ہوگا پارٹی کے لئے روپیہ نہیں۔ مگر پارٹی نہ کریں تو ناک جو کٹ جاوے گی۔ بڑا گھر پھر کیسے رہے گا۔ دولت کو دونوں ہاتھوں سے صرف کرنا یہی تو بڑے گھر کی نشانی ہے۔ پارٹی کے لئے تو۔ روپیہ کہیں سے لانا ہی پڑے گا — ساری کے لئے نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو!

"گھر میں بارہ بجے کیوں آئے"

"ارے راستہ میں دوست روک لیا کریں تو کیا اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ آیا کروں — — — — اور "ایسا قاعدہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔ بڑے گھروں کے قاعدوں سے چلنا ہوگا۔ ہمارے گھر کو نہ ڈبو!! اسکی ساس کہتی

"ارے آج پیالے کس نے توڑ دئے" اور بالیش کی طرف نگاہ کرکے کہنے لگی۔"یہی ہوگی" پیالہ بالیش کے سامنے آکر گرا اور ایک ٹکڑا بالیش کے ماتھے سے لگا!

"پیالے روزانہ ٹوٹیں گے تو کہاں سے آویں گے"

"آج ہی تو پیالہ ٹوٹا ہے" اس کے بعد دو آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر گئے۔

"بس چپ رہ! میرے اوپر شیر ہوکر چڑھتی ہے! آج تک تیرے سسر بھی میرے اوپر شیر ہوکر نہ چڑھے! یہ بڑے گھر کی بہوؤں کا کام نہیں کہ پلٹ کر جواب دیں۔"

"ہاں بڑے گھر میں اتنے نوکر ہوتے ہیں وہ بھی تو جواب اُلٹ کر نہیں دیتے۔"

بالیش کا سینہ چیرتی ہوئیں یہ آوازیں نکل جاتیں اور وہ سرد آہیں بھر کر رہ جاتی۔ ان سرد آہوں کا خیال اُسکے پتا نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنا بڑا گھر ہے جہاں دولت کی بوچھار ہوگی۔ اتنے آدمی ہیں۔ لڑکی کے لئے ان کو سکھ ہی سکھ نظر آرہا تھا۔ مگر بالیش کا دل جانتا تھا کہ کتنا سکھ اُس کے پاس ہے۔

ایک لق و دق میدان جس میں ایک تھکے مسافر کی نگاہ کھو جاتی ہے۔ ایسا ہی وہ بڑا گھر تھا آدمیوں کی بھی اُس میں بھیڑ تھی۔ مگر وہ اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرتی جتنا وہ اس بھیڑ میں محسوس کرتی! دیکھنے کو تو وہ گھر کھچا کھچ نوکروں، رشتہ داروں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ مگر بالیش کے لئے وہ ایک ریگستان سے بھی زیادہ سنسان تھا اس گھر میں خلوص و محبت کا تو گزر تھا ہی نہیں، ہمدردی تو کوئی جانتا ہی نہ تھا! نوکروں کا قافلہ ادھر سے اُدھر حکم بجاتا ہوا نکل جاتا تھا۔ بالیش کو بھی اپنی ساس کا حکم بجالاتے سارا دن نکل جاتا تھا۔ حکم بجالانے میں پیار و محبت کہاں بالیش گم رہا کرتی! کچھ تکلیف ہوتی تو شکوہ شکایت کی بجائے دو آنسو آنکھوں سے ٹپکا دیتی۔ روتا دیکھ کر اس کی ساس اُس سے کہتی "کیسی مکار ہے آنسوؤں سے کام لینا چاہتی ہے!" نہ تو بالیش کو روتے ہی بنتا تھا نہ ہنستے ہی! اگر کبھی اکیلی کسی کونہ میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو بیشک وہ دل کھولکر رو لیا کرتی۔

اگر دل ایک ہی طرف جما ہو تو تکلیف تکلیف محسوس نہیں ہوتی! اگر ایک بہو کو ایک ہی گھر کا خیال ہو تو وہ یہ سوچ لیتی ہے کہ یہی میرا گھر ہے۔ چاہے دوزخ ہو چاہے جنت۔ اس میں کسی نہ کسی طرح سے اپنی زندگی گزارنی ہے ایسی حالت میں تکلیف بھی سہی جا سکتی ہے مگر جب تکلیف دیکھ کر اس کا دل کسی اور کا خیال کھینچ لاتا ہو تو تکلیف میں دونا دکھ معلوم ہوتا ہے! رات دن بالیش کو یہ خیال ستاتا کہ اگر وہ وہاں جاتی تو ایسا کیوں دیکھنا پڑتا۔ بالیش نے کبھی سوچا تھا "میں روپ سے سب حال کہہ دیا کروں گی۔ ارے۔ وہ تو پہلے ہی میرا سب حال جانتے ہیں" اُس کے منھ پر شرم کی لال جھلک دوڑ آتی! کبھی اُس نے انگلیوں پر مہینے شمار کئے تھے ہفتے شمار کئے تھے۔ دن گنے تھے کبھی وہ یہ خیال کرکے اُچھل پڑتی تھی کہ اب تو روپ سے ملنے کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ دن ہی کہاں ہیں۔ آہی گئے یہ

کبھی اُس نے یہ نہ جانا تھا کہ روپؔ بھی اُسے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا وہ اسے! " اوہ میری دلی مراد بن مانگے ہی مل! "
وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑتی تھی! مگر کیا معلوم تھا کہ اس کی خوشی کبھی تکمیل تک نہ پہونچے گی اور دنیا میں ایسے بہت
سے آدمی ہیں جو دوسروں کی خوشی سے حسد بھی کرتے ہیں۔ جب ٹیکے کی رسم ہوئی تو اس نے سوچا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب
ہمیں کون ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے۔ مگر لڑکیوں کو اپنے اوپر حق تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ خواہش پیدا ہوتی ہے انکے
دلوں میں اور پورا کرنے نہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے دوسروں کو۔ ان کو آنکھیں بند کرکے۔ ہونٹ دباکر۔ بے زبان
گائے کی طرح جس کے ساتھ باندھ دیا جاوے۔ چلا جانا چاہئے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ اور وہ بالکل تنہا تھی! غمگین انسان اپنے آپ کو تنہائی میں بھول جاتا ہے۔ بالیش نے
بھی اپنے آپ کو کہیں کھو دیا تھا۔ اس کا خاوند اندر آیا۔ ٹیڑھی نگاہوں سے اس نے بالیش کی طرف دیکھا اس کے
ماتھے پر جھریاں پڑ گئیں۔

" بالیش! " اس نے پکارا

بالیش نے آواز نہیں سنی۔ اس کے سامنے تو پیالہ چھینکنے کا منظر تھا۔

" بالیش، یہاں تو آ "

" آخر بات کیا ہے " اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا۔ بالیش چونک پڑی!

" مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو "

" آخر تو رات بھر کیوں رویا کرتی ہے "

بالیش چپ تھی۔

" میں جو ڈرتا تھا۔ وہی ہوا۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ تمھاری سگائی دوسری جگہ ہو گئی تھی "!

تھوڑی دیر سناٹا اور پھر گہری سانس اور پھر ۔۔۔ !

" ہاں " بالیش کے منھ سے نکل پڑا۔

" ماں ناراض ہو رہی ہیں "

" نہیں آؤں گی "

کمرہ میں اندھیرا ہو گیا ۔۔۔۔ اُس کے بعد وہی ہوا جو تمام بڑے گھروں میں غریب بہو کے ساتھ ہوا کرتا ہے
وہی تاریک رات! چاروں طرف اندھیرا۔ مگر اندھیری گلیوں کو پار کرتی ہوئی بالیش کہاں جا رہی تھی!
دوسرے دن ۔ بالیش کے پتا کھانا کھا رہے تھے۔ تھالی چھوڑ کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔
" ہائیں، بالیش تو یہاں کہاں! "

بالیش کے منہ میں زبان ہو تو بولے!

"نہ سر پر چادر، نہ پاؤں میں جوتا! یہ کیا ہے! بول تو سہی"

بالیش اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

"اور یہ تیرے منہ پر لال لال نشان کیسے ہیں۔ یہ تیرا منہ کس نے نوچ ڈالا ہے" بالیش کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"انھیں نے" اس سے آگے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ رو پڑی اور اپنے کمرہ میں کھاٹ پر جا گری۔ پتا دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئے۔ پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ بالیش چلا اٹھی۔

"پیٹھ میں کیا ہوا"

دیکھا تو وہاں نیل پڑے تھے!

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے چچا۔ بھائی۔ پتا اور محلہ کے پڑوسی سب بالیش کے چاروں طرف تھے! کبھی انھوں نے گلے لگا کر بالیش کو رخصت کیا تھا اور اشیرباد دیا تھا کہ سدا خوش رہے! اس وقت ان کے دلوں میں تسلی تھی کیونکہ بالیش بڑے گھر جا رہی تھی۔ لیکن اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بڑے گھر کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

بالیش چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور سب چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔

شنکر سروپ بھٹناگر

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۱ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر۔ (سنہ ۳۴ء) جنوری ۴ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) جنوری ۵ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) پورا فائل ۵ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

مخدوم کی شاعری

جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہونچ جاتی ہے پستی اور تنزل کے احساسات اسکا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبران سخن اُٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگاتا اور ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آیندہ بھی یونہی رہے گا۔ ادب جدید کے پیغمبر میکسیم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بے چارگی اور زندگی کی نوحہ خوانیوں سے روک کر یہ کہنے کے لئے مجبور کیا کہ " زندگی ابدالآباد تک رہے گی ہم اس کے کارساز حقیقی ہیں قیامت یہی ہوگی کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کردے"۔ گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت۔ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کردیا جائے۔ اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہد عمل کے لئے راہیں بھی تلاش کرے۔ اس کا یہ پیام زمانہ کے معاشرتی حالات سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا اسی لئے، اس کے پیام میں زندگی ہے۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگا رہی ہے اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزل وانحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لئے انقلاب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام کو پیدا کیا جو برائیوں کے اندھیرے خوفناک استبداد اور آتشکدہ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے۔ قاضی کی آتشیں گیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستان میں اپنے لئے جگہ کرلی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عبارت بنایا۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لئے ایک مرتفع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدرآباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے ہیں اور جدید ادب کے علم برداروں میں یا ترقی پسند شعرا میں حیدرآباد کی واحد نمایندگی کررہے ہیں ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء سے ہوا جبکہ یہ بی۔ اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ ادیب یا شاعر

جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانہ کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بنی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصہ میں مشق ہوتی رہی ــــ "پیلا دوشالہ" مخدوم کی پہلی شاہکار طنزیہ نظم ہے - یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے ملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہیں اور اُسی وقت کہتے ہیں جبکہ زندگی ان سے تقاضا کرتی ہے اور حیات انھیں اکساتی ہے۔ وہ اُسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے۔ یہیں اظہارِ حرفِ مدعا کی جرأت کرتے ہیں ــ سرور سرمدی سے معمور زندگی میں مئے دو آتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشکِ طور بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں

تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں　　بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں　　جو چھو لیتا میں اُس کو وہ نہا جاتا پسینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگین سحاب جب آتا دکھتے تو کہہ دیتے کہ:-

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جام شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مئے پلانے جھومتا مستِ شباب آتا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے سرِ قدم پر لغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لرزشیں منتشر ہو جاتیں جس سے شاعر کے ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی کسی کے انتظار میں وہ گداز بھری تانیں الاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن مخدوم چشم براہ اور نقشِ حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہہ دیتے ہیں کہ:-

صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے انگڑائی لی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
اب بھی آجا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پنہاں ہیں۔

کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید ادب انھیں متاثر کر رہا تھا ان کے تصور حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی انسانیت کا اندرونی اضطراب مسلسل غلامی ذہنی بربادی بھوک، غریبی، بے روزگاری، ظلم و استبداد زندگی کی قدامت اور پچھڑا ہوا پن یہ سب اپنی بپتا سنانے لگے۔ سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھیک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مسکن ہے جو رواینوں کا غلام ہے اور جس میں صدیوں کا جذام پرورش پا رہا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے ایک خون میں لتھڑا ہوا لقمہ ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ یہاں ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ

اس زمین موت پر در در کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

وہ اس دنیا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے وہی وطن جہاں کبھی

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی

ہاں اسی جگہ مخدوم کے دل زار نے یہ دیکھا کہ :-

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ وہ بدنصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو للکار کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اڑا دے اصلاح مرض کا صحیح علاج نہیں بلکہ انقلابی درد کا صحیح درمان ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمت کفر کو ایمان۔ سگ خونخوار کو انسان اور دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہا جا سکتا وہ کہہ اٹھے کہ

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا،
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
حور بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہوسکیں گے چونکہ یہ بہت کھیلے جا چکے وہ انقلابی اپنا مدعا بنا لیتے ہیں کہ :-

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزع کے عالم میں ہے۔ جس کے مکین مہاجن۔ امیر۔ کاشی کے برہمن اور کعبہ کے فقیر ہیں۔ جن کے ناخن کی خلش سے اقوام عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر — یہی خندہ و تبسم ہیں ان کی حویلیاں

رہزنوں کا قصر شوری قاتلوں کی خوابگاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ،

انھیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نان و بے پوشش گداؤں کا ایسا گروہ نظر میں آتا ہے :-

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کے

کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوس دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے۔ وہ انقلابی ہیں۔ وہ ایمان کے قایل نہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بنی نوع انسان کے ہر مسئلہ کو تاریخ نے استبداد سے طے کرایا ہے اس لئے ان کی حیات کا مدعا یہ ہے کہ

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ کاسۂ دہر کو معمور کرم کرکے اور قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کے ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں تباہیوں اور بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثبات قدمی سے دلیرانہ میدان میں آکر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ

دور ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روح انسان کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لئے اور ان کھنڈروں پر آزادی کے پرچم کھولنے کے لئے علمبرداران آزادی یعنے ہندی نوجوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چونکہ انہی کی نظر اور ذوق یقین سے زنداں کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔

ان کا نوجوان آندھیوں میں پلا اور طوفانوں میں پروان چڑھا۔ وہ مرد مجاہد ہے اس کی ٹھوکر سے گیتی لرزہ براندام ہوتی ہے ان کا نوجوان اس سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اُڑا دے گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔

مخدوم نشاۃ ثانیہ کے لئے سرمایہ داری کو ام الخبائث اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں وہ غدارانِ وطن اور ان کی نعشوں کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے قیامت کا جوش لئے ہوئے آتے ہیں :۔

خدا نے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

داور محشر اس کھیت کے خوشۂ گندم ہی کو جلائے گا۔ حکم کیوں دیتا ہے کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کر دیا جائے جس نے دہقان کو روزی میسر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سخنی سے ایک دور دراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دُنیا کی عمر کافی دراز ہو چکی۔ ہمارے تجربے پختہ ہو چکے اور سچ پوچھئے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہو چکی۔ اب یہ وعدہ اور سارے فرمان طاقِ نسیاں ہو جائیں گے۔ اب ہیں جہاں

قصرِ شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لئے

وہیں —— اسی دنیا میں احساسات کی بیداریاں جہد و عمل کے لئے آئیں گی اور کہیں گی کہ

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا کہ بنسیا بجے گی —— استبداد کا وہ دیوتا خوشۂ گندم کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بربادی اور فنائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آندھیوں، گرجدار گھٹاؤں اور جہنم کی ہواؤں کے شور محشر سے مددلیکر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ یہ پھر کبھی نہ اُبھر سکے ان کا انقلاب ایک قیامت صغرا کا نمونہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ کائنات کے لئے ایک متوازن نظام ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرہ بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے Theme (مرکزی تخیل) کے جوش اور اثر کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ایسے شعر مجسم ہیں، جس میں اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں، وہ ساحل پر ٹھہر کر دریا کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے۔ بلکہ تہ کی ساری ترکیبوں سے بطور خود واقف ہیں اس لئے ان کے کلام میں بلا کا جوش ہے

مخدوم کے راسخ عقیدے اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبۂ عمل کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے چونکہ وہ زندگی کے عمیق مسایل بیان کرتے ہیں، تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لئے راہ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ ابھی نوخیز ہیں ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لئے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کارانہ ضبط ہے جو ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لئے اثر پذیر بھی ہے وہ انقلاب کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنا دے گی — وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس مہم میں رہبری کے لئے سب سے ممتاز رہیں گے۔

محبوب حسین (عثمانیہ)

قصاص کی کرسی

امریکہ میں قاتل کا قصاص یوں ہوتا ہے کہ اُسے ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر برقی رو دوڑا کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال قایم کیا گیا ہے کہ ہلاکت کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے اور انسان کو بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس باب میں ایک افسانہ نویس، چارلس فرانسس پاٹر کا بیان پڑھئے، جس نے ایکبار خود اس منظر کو دیکھا تھا۔

مجھ سے ایک اخبار کے نمایندہ نے کہا کہ "آج گیارہ بجے کراؤلی کا قصاص ہونے والا ہے، چلو تمھیں نفسیات انسانی کے ایک خاص پہلو کے مطالعہ کا موقعہ ملیگا اور ممکن ہے کسی افسانہ میں تم اس سے کام لے سکو۔ لیکن ہمیں قیدخانہ میں ٹھیک نو بجے پہونچ جانا چاہئے"

ہم لوگ ٹھیک نو بجے قیدخانہ کے دروازہ پر پہونچ گئے۔ وہاں پچاس تماشائی اور موجود تھے، لیکن ان میں سے اکثر اخباروں کے نمایندے تھے۔ چونکہ دو گھنٹے باقی تھے، اس لئے یہ وقت باہم کرسی گفتگو میں بسر ہوا کہ قصاص کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی پھانسی کو بہتر سمجھتا تھا، کوئی زہریلی گیس کی رائے دیتا تھا اور کوئی بندوق کی۔ میرے لئے چونکہ یہ بالکل پہلا اتفاق ایسی صحبت میں شریک ہونے کا تھا، اس لئے خاموشی سے سن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ ایسے دردناک موضوع پر یہ لوگ کیسے ٹھنڈے دل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وقت قریب آیا تو نمایندۂ اخبار نے جو میرے ساتھ آیا تھا کہا کہ "آؤ قریب کے کمرہ میں چلیں" چنانچہ میں بھی سب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہاں پہونچکر سب نے اپنی اپنی جیب سے وہسکی کی بوتل نکالی اور مجھ سے بھی کہا کہ اس صحبت میں ان کا شریک ہوں۔ میں نے کہا کہ "میں شراب نہیں پیتا"۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ "اگر تم نہ پیوگے تو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکوگے۔ ہم سب لوگ کیا احمق ہیں جو شراب پی پیکر قصاص دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہاں کا منظر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب تک احساس کو کُند نہ بنا دیا جائے، برداشت مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ "میں پورے حواس کے ساتھ اس کو دیکھنا چاہتا ہوں، میں نہ پیوں گا"۔

تھوڑی دیر میں سپاہیوں کا ایک دستہ آیا اور ہم کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تاکہ ہماری جامہ تلاشی لی جائے۔ اس سے قبل کسی قصاص کے وقت کوئی نمایندۂ اخبار چھوٹا سا کیمرا چھپا کرلے گیا تھا اور اس نے تصویر لے لی تھی اس لئے اب یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اندر جانے سے پہلے ہر شخص کے کپڑے دیکھ لئے جاتے ہیں۔

ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قصاص کا پورا حال اخبارات میں لکھ کر شایع کیا جاتا ہے تو اسکی تصویر کی اشاعت میں کیا حرج ہے۔ تصویر دیکھ کر قدرتاً لوگوں کو اور عبرت حاصل ہونا چاہئے۔ بہر حال یہ موقعہ اس بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ میں بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہو گیا اور جب سب کی جامہ تلاشی ہو چکی تو ہم لوگ یکے بعد دیگرے قصاص کے کمرے میں پہونچے۔ لیکن ایک رپورٹر کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ یہ کہکر واپس آیا کہ پچھلے قصاص میں میری حالت خراب ہو گئی تھی، میں باہر جاتا ہوں، تم جو کچھ دیکھنا، مجھ سے زبانی کہدینا۔

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا، نہ اسے حقیقتاً اپنے تاثرات کے لحاظ سے بیان کر سکتا ہوں اور نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ اندر صرف ایک کرسی ہوگی جس پر قاتل کو بٹھا دیا جائے گا اور آناً فاناً برقی رو سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ لیکن اندر پہونچکر دیکھا کہ چاروں طرف پچاس کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور سامنے درمیان میں ایک بڑی کرسی مضبوط لکڑی کی رکھی ہوئی ہے اور کئی ایک تسمے چمڑے کے اس میں لٹک رہے ہیں۔

جب ہم لوگ بیٹھ گئے تو ایسا گہرا سکوت دفعتاً چھا گیا کہ مینے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند سکنڈ کے بعد پہلو کے کمرہ سے گارد کی حفاظت میں مجرم نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھا۔ میں اسوقت ایسا محسوس کر رہا تھا، گویا خود موت آہستہ آہستہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔ ایک پادری بھی ساتھ تھا۔

مجرم کرسی کی طرف بڑھا اور از خود بغیر کسی حکم یا ہدایت کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر بہت سے لوگوں کو حد درجہ مضطرب دیکھا ہے، لیکن اس شخص کے سکون کا عالم نہایت حیرتناک تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی فریضۂ زندگی کو ادا کر رہا ہے۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی ہاتھ اُٹھاکر گارد کے سپاہیوں سے کہا کہ "خدا حافظ" اور اس کے بعد ہی نہایت تیزی سے اس کے ہاتھ پاؤں تسموں سے باندھے جانے لگے۔ اس کا جسم کسا جا رہا تھا اور وہ خاموش نگاہیں نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس نے جیلر سے کہا کہ "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میری ماں کو میرا آخری سلام پہونچا دیا جائے۔"

اس کے بعد قصاص ہونے ہی والا تھا کہ اس نے جیلر سے کہا کہ داہنے پاؤں کا تسمہ ذرا ڈھیلا ہے، اسے کس دیا جائے چنانچہ تسمہ کس دیا گیا اور اس کے بعد ہی فوراً سگنل دیدیا گیا۔

مینے یہ تو دیکھا کہ کرسی کو غیر معمولی جھٹکا لگا، لیکن اس کے بعد جو کچھ نظر آیا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجلی کی رَو اس کے

ایک ایک ریشہ میں دوڑ گئی اور جسم کی اینٹھن کا یہ عالم ہوا گویا کوئی بڑا توحی جانور ہے جو چمڑے کے تسموں سے کسدیا گیا ہے اور وہ انھیں توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ تسمے چرچرا رہے تھے، کرسی جھٹکے کھا رہی تھی اور ہم لوگ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ تسمے ٹوٹ کر یہ ہم پر جھپٹنے ہی والا ہے۔

برقی رَو یکے بعد دیگرے برابر دوڑائی جا رہی تھی اور ہم لوگ ہر دفعہ اپنی کرسیوں پر پیچھے کی طرف ہٹ ہٹ جاتے تھے کہ کہیں یہ ہم پر نہ آگرے۔

ہم نے سنا تھا کہ اس طرح انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہونچتی اور فوراً ہلاک ہو جاتا ہے، لیکن اس قصاص کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سب غلط تھا۔ اس کی تکلیف کا یہ عالم تھا گویا اس کا ایک ایک ریشہ موت کا مقابلہ کر رہا ہے اور موت ہر مرتبہ اپنی گرفت میں لاکر جھٹکے پر جھٹکے دے رہی ہے، جھنجھوڑ رہی ہے اس کے ساتھ ہی پہنے اس کے جسم سے پسینہ ٹپکتے دیکھا۔ گویا بجلی کے چولھے پر کسی انسان کو بھونا جا رہا تھا اور اس کے جسم کا عرق نکل نکل کر لباس میں جذب ہو رہا تھا اس کے بعد وہ ناقابل برداشت منظر سامنے آیا جس کے ڈر کی وجہ سے لوگ شرابیں پی پی کر یہاں آسکتے ہیں۔ یعنی ایسی بُو محسوس ہونے لگی جو گوشت جلنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ چراہند ایسی تیز، ایسی متعفن اور اس قدر امتلا پیدا کرنے والی تھی کہ معاذاللہ!

ہرچند یہ منظر صرف پانچ منٹ سامنے رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں گزر گئے۔ جب قصاص کے بعد اسکے جسم کو لاشس کی گاڑی میں ڈالکر اسپتال پہونچایا جانے لگا، تو میں نے اسے پھر دیکھا۔ وہ بالکل پھول گیا تھا اور ایسا سرخ تھا گویا جسم کی کھال نکال لی گئی ہے۔

علم کی طیار کی ہوئی دوزخ

حال کی جنگ ہسپانیہ میں جب بارسلونا فتح ہوا اور جنرل فرانکو وہاں پہونچا تو اسے بعض تہ خانے ایسے نظر آئے جن سے تعزیر گاہ یا تعذیب گاہ کا کام لیا جاتا تھا اور جنرل فرانکو کے وہ سپاہی جو گرفتار ہو جاتے تھے ان میں سے بعض کو ان تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔

ان تہ خانوں میں نہ کوئی شکنجہ ہے، نہ زنجیر، نہ کوئی درّہ ہے اور نہ کوئی آلۂ تعزیر، لیکن پھر بھی وہ اتنی سخت تعذیب گاہیں ہیں کہ شاید ہی ذہن انسانی نے ان سے زیادہ ظالمانہ طریقے انسان کو تکلیف پہونچانے کے کوئی اور وضع کئے ہوں۔

نفسیات کا مسلّم مسئلہ ہے اور اس سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک خاص حد تک پہونچکر جسمانی تکلیف کا بڑھنا رُک جاتا ہے بلکہ شاید اس میں کمی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکیں تو اول اول یقیناً اسے بہت اذیت ہوگی، لیکن وہ اذیت ایک خاص حد تک پہونچنے کے بعد رُک جائے گی اور شاید اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ درد کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ بہر حال جسمانی اذیت کی ایک انتہا ہے، لیکن انسان کے حواس اور نفس کے ذریعہ سے جو تکلیف اس کو پہونچتی ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں اور یہ تہ خانے اسی علمی اُصول پر طیار کئے گئے تھے۔

یہاں نہ قیدیوں کو شکنجہ میں کسا جاتا تھا، نہ گرم لوہے سے داغا جاتا تھا، نہ ان کی آنکھیں نکالی جاتی تھیں، نہ ٹکٹکی میں باندھ کر دُرّوں سے جسم کی کھال اُڑائی جاتی تھی۔ لیکن جس عذاب میں وہ مبتلا کئے جاتے تھے وہ ان سب سے زیادہ سخت تھا۔

تہ خانوں کی دیواروں پر مختلف قسم کے رنگین دائرے اور دوسری ہندسی شکلیں بنائی گئی تھیں، مختلف رنگ کی تیز روشنیاں ڈالنے کا انتظام تھا، ایک ہی قسم کی آوازیں مسلسل پیدا کی جاتی تھیں اور یہی وہ عذاب تھا جس میں قیدی مبتلا کئے جاتے تھے، اور جس کا برداشت کرنا انسانی قوت سے باہر ہے۔

برسلونا کے تہ خانوں کی یہ تعمیر اور اس کی نقاشی ایک شخص الفانسو لارنٹ سک (Alfonso Laurent Cik)

لے کی تھی جو یوگوسلاویا کا ایک نہایت ذہین انجینئر و نقاش تھا اور اس کا بیان ہے کہ حکومت اسپین کی خفیہ پولیس نے بجبر اس سے یہ سب کچھ طیار کرایا تھا۔

دیواروں پر جو نقوش، دایروں، سیدھے ٹیڑھے خطوط اور دوسری ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں یہ سب حال ہی کے طیار شدہ ہیں اور تعذیب و تعزیر کی دنیا میں بالکل نئی چیز ہیں۔

ان نقوش کے ذریعہ سے تکلیف پہونچانے کا خیال اس اُصول پر قایم ہے کہ اگر خاص قسم کے دایرے یا نقوش مختلف روشنیوں میں نگاہ کے سامنے ہر وقت رہیں تو رفتہ رفتہ تکلیف برابر بڑھتی جاتی ہے حتےٰ کہ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت لغو و مہمل معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس صفحہ پر جو دایرے بنائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو آنکھ کے پاس لیجایئے اور جلدی جلدی نصف انچہ کے دایرہ میں ان کو برابر گردش دیتے رہیئے شاید چند سکنڈ بھی آپ اسے برداشت نہ کر سکیں گے اور اسی پر قیاس کیجئے کہ اگر اس قسم کی تکلیف مسلسل پہونچتی رہے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔
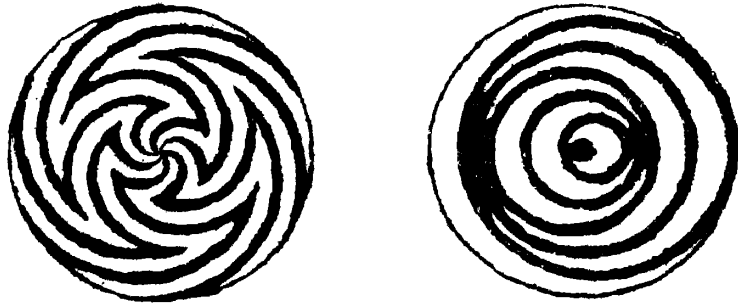
ان بصارت آزار تہ خانوں میں علاوہ دایروں کے کچھ نقوش مکعب قسم کے بھی بنے ہوئے تھے جن کو غور سے دیکھنے کے بعد کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خالی صندوقوں کے نقشے ہیں اور کبھی ٹھوس مکعب نظر آتے تھے۔ مثلاً:-

اسکا اثر بھی بصارت پر نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔
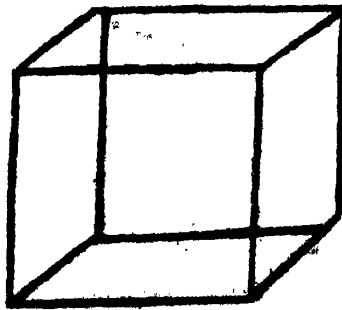
یوں تو آپ کو یہ کھیل نظر آئے گا، کیونکہ آپ کے اختیار میں ہے جب تک آپ چاہیں دیکھتے رہیں اور پھر آنکھیں بند کریں لیکن ان تہ خانوں کے قیدیوں کو یہ اختیار حاصل نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے پپوٹے کاٹ دئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں پپوٹے کے اوپر آہنی چھلے چڑھا دئے جاتے تھے تاکہ وہ بند نہ ہو سکیں اور چونکہ ہاتھ پاؤں قیدیوں کے باندھ دئے جاتے تھے اس لئے وہ ان کمانیوں کو ہٹا بھی نہ سکتے تھے۔ جس طرف دیکھتے تھے یہی دایرے اور نقشے انھیں نظر آتے تھے اور اگر اس طرف سے نگاہ ہٹتی تھی تو پھر نہایت تیز روشنیوں پر پڑتی تھی جو اور زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی تھیں۔

رنگوں کے ذریعہ سے بھی عذاب پہونچانے کا یہاں انتظام تھا۔ صرف سیاہ و سفید دایروں سے بھی نگاہ کو تکلیف پہونچتی ہے، لیکن اگر ان کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جائے اور بہت سی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں بھی مختلف رنگ کی نگاہ کے سامنے رہیں تو یہ تکلیف دوچند ہو جاتی ہے، چنانچہ ان تہ خانوں میں یہ بھی انتظام تھا کہ نہایت تیز روشنیاں مختلف رنگوں کی بدلتی رہتی تھیں اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دیواروں کے دایرے اور نقشے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر کے سامنے آتے تھے اور قیدیوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھوتوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔

اگر آپ سورج کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھتے رہئے اور پھر اُدھر سے نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو نگاہوں کے سامنے روشن دھبے ناچتے ہوئے نظر آئیں گے کیونکہ قرصِ آفتاب کی تصویر پردۂ چشم پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی حال رنگ کا بھی ہے آپ غور سے دیر تک کسی ایسی تصویر کو دیکھئے جو نہایت سُرخ رنگ میں بنائی گئی ہو اور پھر نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو دیوار پر وہی تصویر سبز رنگ کی نظر آئے گی کیونکہ سبز رنگ سُرخ رنگ کا معاون ہے ۔ اب آپ خیال کیجئے کہ ان تہ خانوں کے قیدیوں کا جو تیز روشنی میں ان تیز رنگوں کے نقوش کو مسلسل دیکھنے پر مجبور تھے، کیا حال ہوتا ہوگا اور اُن کی چکاچوند کتنی تکلیف کا باعث ہوتی ہوگی ۔ رنگوں کا انسانی دماغ کو متاثر کرنا یقینی ہے لیکن مختلف لوگوں کی دماغی حالت پر مختلف رنگوں کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا پورا حال ماہرِ نفسیات کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا، لیکن سُرخ اور بنفشی رنگ کا ہیجان انگیز ہونا ثابت ہو چکا ہے اور شاید سرخ رنگ کو خطرہ اور جنگ کا رنگ قرار دینا اسی لئے ہے ۔ جس طرح رنگ اور روشنی کے ذریعہ سے انسانی دماغ کو تکلیف پہونچ سکتی ہے، اسی طرح آواز سے بھی پہونچائی جا سکتی ہے اور ان تہ خانوں میں ایک خاص حصہ ایسا بھی تھا جہاں سامعہ کے ذریعہ سے قیدیوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا ۔ کئی ایک پنڈولم لٹکائے گئے تھے جن سے ٹک ٹک کی آواز ہر وقت پیدا ہوتی رہتی تھی، لیکن یہ قیدیوں کے کان میں اتنی اونچی ہو کر پہونچتی تھی گویا بہت بڑا ڈھول کان کے پاس بجایا جا رہا ہے۔ اور وہ رات دن ہر لمحہ ان آوازوں کو سننے پر مجبور تھے ۔

ایک حصہ اس قیدخانہ کا ایسا بھی تھا جہاں قیدیوں کو برابر سنگین فرش پر چلنا پڑتا تھا اور انکے قدموں سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ بعض آلات کے ذریعہ سے اتنی بلند و کرخت ہو کر ان کے کانوں میں پہونچتی تھی کہ وہ دیوانے ہو جاتے تھے ان قیدیوں کو ایک جگہ ٹھہرنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے کوڑے مار مار کر آگے بڑھایا جاتا تھا۔

مکتوبات نیاز

خط پہونچا، اب کیا پوچھتے ہو کہ کس ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہوں۔
" تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا "۔۔۔ صرف شاعری ہے، حقیقت نہیں ۔۔۔ حقیقت یہ ہے :۔
ہم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
سو، اب یہ دیکھو کہ " ہم " کیا ہیں ؟ کچھ نہیں ! ۔۔۔ میر علیہ الرحمۃ نے شاید اسی منزل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ
القصہ، نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم،
سو، بھئی اب تو معاملہ اسی " نہیں ہم " کا ہے۔
وہ گلیاں، جن میں ہم تم خاک چھانا کرتے تھے اب بھی وہی ہیں۔ لیکن جن ذروں کی طرف پہلے دل کھنچتا تھا، آج وہی آنکھیں دکھا رہے ہیں، آفتاب کا طلوع و غروب وہی ہے، لیکن پہلے غروب کی خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ اسکے بعد طلوع ہوگا، اب طلوع سے بھی رنج پہونچتا ہے کہ اس کے بعد غروب ہے۔ پہلے کائنات کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے چڑھتی ہوئی " ہوائی " کو دیکھتے ہیں، آج اس کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ " ہوائی " زمین کی طرف آرہی ہو۔۔۔ بے نور، بے رنگ !
لوگ کہتے ہیں، سمجھ چالیس کے بعد آتی ہے۔ لیکن اگر سمجھ اسی کا نام ہے تو شاید موت دنیا کی سب سے بڑی " سمجھ " ہے۔۔۔ جوان جینا اور جوان مرجانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔۔۔ پھول وہی ہے جو کھلتے ہی ٹہنی سے چن لیا جائے خشک ہونے پر زمین سے اس کی پنکھڑیاں کوئی چنتا بھی ہے تو پھول سمجھ کر نہیں بلکہ کیاری صاف کرنے کے لئے!
ابھی نہیں، کچھ دن اور گزر جانے دو، اس وقت تم اس کو بہتر سمجھ سکوگے۔۔۔ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا قایل نہیں، لیکن ہرزہ گردی کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں تمھارا ساتھ کیونکر دے سکتا ہوں۔

حضرت، آپ کے شکوۂ محبت کی قدر کرتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ واقعی مجھ سے سخت کوتاہی ہوئی۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ میری یہ سادگی بیان آپ کو اور زیادہ برہم نہ کردے۔

میں یہیں تھا، لیکن سچ پوچھئے تو نہیں تھا۔ ایک عزیز دوست کی علالت نے اس قدر سراسیمہ رکھا کہ دنیا کا کوئی کام سوائے ان کی تیمار داری کے کر ہی نہ سکا۔ گو، اب خطرہ باقی نہیں، لیکن میری فکر اب بھی وہی ہے، بیماری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن کی ضد کی وجہ سے!

بہر حال اگر اب بھی وقت ہو تو لکھئے، تعمیل ارشاد کے لئے آمادہ ہوں۔ وہ خود یہیں آتے رہتے ہیں، میرے جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر انھیں ماننا ہے تو یوں بھی مان لیں گے، میری نقل و حرکت سے کیا ہوتا ہے۔

یہ آپ نے خوب کہا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آپ کو کیا خبر کہ ابھی دل میں کیا کیا ہے!

نالہ بسیار و آہ بسیار ست

درد را دستگاہ بسیار ست!

نہ قسمت کا قایل ہوں نہ اس بات کا کہ "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے"۔ آپ نے نہ دیکھا ہو لیکن مینے تو بارہا تدبیروں سے قسمت کو اُلٹ جاتے دیکھا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ اب میں کیا کرنے والا ہوں۔ لیکن ابھی تک مجھے خود نہیں معلوم۔ ہاں مایوس نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آج نہیں تو کل نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ ارادہ ہے کہ آخر جنوری میں یہاں سے روانہ ہوں اور اسوقت تک واپس نہ ہوں، جب تک اُدھر یا اِدھر آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ کو البتہ تھوڑی سی مدد کرنا پڑے گی لیکن ابھی نہیں، عین وقت پر بتاؤں گا، تاکہ آپ کو بہانہ تلاش کرنے کی فرصت کم مل سکے۔

زندگی کے کھیل میں دلچسپی پیدا کرنا ہو تو پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھئے، ٹھوکریں کھائیے اور قدم آگے بڑھائیے، منزل تک پہونچ جانا، شاید اس قدر دلچسپ نہیں، جتنا منزل تک پہونچنے کا خیال۔ بہر حال دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔ ابھی آپ کی قیاس آرائیاں قبل از وقت ہیں۔

نیاز نوازیوں کا شکریہ، لیکن یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ سے دور ہو کر میں نے آپ کو بھلا دیا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ		مانندِ شعلہ حُسن ترا پشت و رو یکے ست

آپ سامنے ہوں یا نہ ہوں —		"عالم ہے وہی جلوہ گری کا!"

قدرت کی طرف سے جن کے لئے زخم کھانا اور تڑپنا مقسوم ہو چکا ہے۔ ان کے لئے آپ کو کیوں اتنی فکر رہتی ہے نگاہوں کے نشتر نہ سہی، جنگل کے کانٹے سہی۔ آپ نہیں آپ کی یاد تو ہے،

دل و صد آرزوئے خام، بدل

یار و چندیں فریب، و من تنہا!

یقیناً پچھلی بار آپ سے بہت رواروی میں ملنا ہوا۔ مجھے خدا جانے کیا کیا کہنا تھا لیکن نہ کہہ سکا، اور آپ نے بہت سی وہ باتیں بھی کہہ ڈالیں جو نہ کہنا چاہئے تھیں۔ چنانچہ آپ نے نئے پیدا ہونے والے تعلق کا بھی ذکر مجھ سے کیا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تکمیل کو پہونچا یا نہیں؟ تحریر کے سرورق پر جو پتہ درج ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک نہیں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ "اُدھر" ہو" اور اِدھر اس کا اظہار نہ ہو۔ دو دھاری تلوار کا کیا کہنا!

آپ میرے اس استفسار سے بدگمان نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی نہ پوچھیں کہ میں یہ کیوں پوچھتا ہوں۔ بس پوچھتا ہوں، یونہی پوچھتا ہوں — "چہ تواں کرد، مرا با تو سرے اُفتادست"

اگر فرصت ہو تو کبھی کبھی یاد کر لیا کیجئے۔ اور میری اس حسرت کو کبھی نہ بھولئے کہ

نہ با تو رفتم و نے بی‌تو در غمت مُردم
یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا

آپ کا خط، جسے "شہر آشوب" کہنا زیادہ موزوں ہے، پہونچا۔ یوں کہئے آپ کی جوانمردی کی تعریف کر دوں، لیکن "جوانمرگی" کی بات ہی اور ہے۔ آپ لطف و مسرت کی جستجو کرتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ

باز می جویم دلِ افسردہ را
آں دل و آں خاطرِ آزردہ را

آپ کو کیا خبر کہ "تنہا ملول بودن و تنہا گریستن" بھی ایک عالم ہے۔

انسان پر بعض اوقات دو حالتیں نہایت عجیب گزرتی ہیں، ایک، بغیر سوچے کام کرنے کی اور دوسری، بغیر کچھ کئے ہوئے سوچتے رہنے کی۔ آپ اُس عالم سے گزر رہے ہیں اور میں اس عالم سے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی نہ آپ کو اپنی سرگردانی سے کچھ ملنا ہے اور نہ مجھے اپنی حیرانی سے!

زخمہا دارد تفاوت درمیاں
ورنہ خار و نشتر و مژگاں یکے ست

مجھے وعدہ یاد ہے اور اس کے ایفا کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن آپ کے تقاضہ سے نہیں، اپنی خوشی سے۔ پھر ایسی جلدی کیا ہے۔ وقت آنے دیجئے، میں اور میری تمام "نارسائیاں" آپ کے لئے وقف ہیں۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں اور اس قدر خفا ہوں کہ بات کرنا پسند نہیں کرتا، پھر کس اُمید پر مجھ سے خط و کتابت کی جرأت کرتے ہو۔ تم نے جو صدمہ مجھ کو پہونچایا ہے وہ ایسا نہیں جسے میں آسانی سے بھول

جاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے پاس "عذر ہائے لنگ" کی کمی نہیں اور شاید اسی اعتماد پر تم نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں بھی اتنا احمق نہیں کہ آنکھ بند کرکے تمھاری ہر بات کو مان لوں!

"در توبہ" کبھی بند نہیں ہوتا یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے طیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمھارے "اعتراف" کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ "بت شکنی" کا کفارہ "تعمیر کعبہ" سے بھی نہیں ہو سکتا، تمھاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے!

قبلۂ محترم

آپ کا ادنیٰ اشارہ میرے لئے "فرمانِ خداوندی" ہے، چہ جائیکہ آپ کسی بات پر اتنا اصرار فرمائیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کیوں۔ مجھے کس قدر مسرت ہوتی اگر بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے، آپ میری طرف سے انھیں مطمئن کر دیتے۔

انھیں بھیجئے، میری ہر امکانی کوشش ان کے لئے وقف ہے، لیکن کامیابی کے لئے غالباً آپ کے روحانی تصرف کی بھی ضرورت ہوگی۔

کعبۂ مستمنداں، ایک زمانہ ہوگیا کہ آپ مجھ سے بے خبر ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ اس کا سبب ناخوشی تو نہیں — درگاہِ گرامی کے ساتھ مجھے لاکھ عقیدتمندیاں سہی۔ لیکن "ردو قبول" کا اختیار تو حضرت ہی کو حاصل ہے۔ اور میں شاید اس منزل سے ابھی دور ہوں جب "سجدہ" بے نیازِ "مسجود" ہو جاتا ہے۔

میری آشفتہ خیالیاں بدستور اپنی جگہ قایم ہیں اور اگر ان میں کوئی تغیر ہوا بھی تو یہ کہ اب نہ "نالۂ نیم شبی" میں کوئی لطف باقی رہا نہ "دعائے صبحگاہی" میں — حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اس کی تکمیل میرے اختیار میں نہیں۔ ہاں، اگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند!

سید صاحب قبلہ آج کل کہاں ہیں؟ اگر وہاں ہوں تو میرا اسلام قبول فرمائیں۔

شادی مبارک! عدم شرکت کا مجھے واقعی سخت افسوس ہے، لیکن تمھارا اصرار بھی کچھ یونہی سا تھا، نہایت کمزور قسم کا — ورنہ میرا نہ پہونچنا کیا معنی؟

"ہنی مون" کا زمانہ کہاں بسر کیا جائیگا؟ بنگلور میں؟ یہ میں تم سے نہیں پوچھ رہا، بلکہ کسی اور سے پوچھ رہا ہوں — جواب تمھیں دوگے لیکن وہ تمھارا نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آیندہ ماہ کی کسی تاریخ میں بمبئی جانا پڑے۔ اسلئے میری جو رائے ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے

سچ کہتا ہوں میں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ تم کو خط نہ لکھوں گا
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

تمھاری علالت کا حال سنکر دل بےچین ہوگیا۔ خدا کے لئے لکھو کہ معالجہ و مداوا کی کیا صورت اختیار کی ہے، وہ حرارت جگر ہو یا التہاب خون، ان میں سے کسی کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو تمھیں جگہ بدلنا چاہیئے اور گوشت یک لخت ترک۔

قدرت اگر بیمار ڈالتی ہے تو علاج بھی کرتی ہے۔ کھلی ہوئی صاف وخشک ہوا، پھلوں کا استعمال، مقررہ اوقات پر مقررہ ہلکی غذا اور دماغی سکون ـــ سب سے زیادہ ضرورت ان چیزوں کی ہے اور یہ تمھیں وہاں میسر نہیں آسکتیں۔ پہاڑوں پر جانے کا موسم نہیں ہے اس لئے کم مرتفع مقامات کا انتخاب مناسب ہوگا۔ اس صوبہ میں دیرہ دون، اور پنجاب میں کیمبل پور بہترین مقامات ہیں۔

اگر واقعی تم اس کے لئے طیار ہو (اور طیار نہ ہونا کیا معنی، ہونا پڑے گا) تو مجھے لکھو، میں خود تمھارے ساتھ چلوں گا۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا، ابتدا ہی میں اس کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس باب میں ضد سے کام نہ لوگے اور بواپسی ڈاک مجھے اطلاع دوگے کہ کس تاریخ تک جانے کا ارادہ ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے سے انتظام کیا جائے۔ میں تو تمھارے ساتھ ہوں، سب ہو جائے گا۔

یہ بالکل صحیح ہے موت کا ایک وقت مقرر ہے، لیکن وقت قدرت کا مقرر کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود انسان اُسے مقرر کرتا ہے اور ٹال بھی سکتا ہے اگر وہ چاہے۔ صحت کی حالت میں وہ طنطنہ اور ذرا سی بیماری میں یہ کم ہمتی! کس قدر شیوۂ مردانہ کے خلاف ہے۔ عزمِ انسانی کے معجزے تم نے ابھی دیکھے ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں آتا ہوں۔ تمھیں کافر بنا کے نہ چھوڑا ہو تو بات نہیں!

تم نے بالکل صحیح سنا ہے۔ واقعی ایک زمانہ سے میرے ان کے درمیان سلسلۂ مراسلت بند ہے، لیکن اسکا سبب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آخری بار ان سے دہلی میں ملنا ہوا تھا اور ایک ہفتہ تک برابر ساتھ رہا ـــ شاید تین چار سال کی بات ہے ـــ اس کے بعد وہ ایران چلے گئے اور وہاں سے عراق وغیرہ ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد واپس آئے۔ ان کے خطوط برابر آتے تھے ـــ واپسی پر انھوں نے ایک خاص معاملہ میں مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور وہ میں ان کی خواہش کے مطابق نہ دے سکا۔ اس کے بعد پھر انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور مجھے بھی کوئی موقعہ یہ سوچنے کا نہ ملا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔

بعد کو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور کافی نقصان اٹھایا۔ ہوسکتا ہے

کہ یہ حجاب اسی لئے ہو۔ بہر حال، میں انھیں لکھتا ہوں۔ اگر مان گئے تو خیر، ورنہ اس میں نقصان ہی کیا ہے۔

ابھی ابھی تمھارا کارڈ ملا ، میں تمھاری محبتوں کا معترف ہوں اور اسی اعتماد کی بنا پر تم کو کبھی خط بھی نہیں لکھتا۔ تم نے خواب بالکل غلط دیکھا۔ میں بالکل اچھا ہوں اور فی الحال پندرہ بیس سال تک بیمار پڑنے کا ارادہ بھی نہیں۔ تقدیروں کو پلٹ دینے والا انسان ہوں، تمھیں معلوم نہیں ؟

یہ مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل کی خبر مرگ مجھے کیوں سنائی۔ کیا کوئی بڑے مردِ معقول تھے ؟ میں تو اُن سے واقف نہ تھا۔ امسال عرس میں ضرور شریک ہوں گا۔ مولانا مرحوم کی خصوصیات جب وقت یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ سرزمین رامپور کا سب سے پہلا اور آخری انسان تھا۔

عرشی صاحب سے میرا سلام کہد و۔ مجھے اُن سے باوجود اُن کے مولوی ہونے کے بڑی محبت ہے۔

چند دن ہوئے اتفاق سے اسماعیل (ذبیح) ملنے آگئے۔ بڑی مشکل سے میں نے انھیں پہچانا، اب تو بھئی، وہ مکہ میں رہتے ہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔ دُہائی ہے کعبہ والوں کی !

مکرمی - آپ نے جو تجویزیں نگار کی ترتیب کے متعلق سوچی ہیں وہ یقیناً ملک کے لئے بہت مفید ہیں، لیکن کوئی ایسی تجویز بھی تو سوچئے کہ ملک، نگار کے لئے مفید ثابت ہو۔ خشک داد سے کب تک کام چلے گا۔ اٹھارہ سال کی جانکاہی کا صرف یہ نتیجہ کہ آپ "سبحان اللہ" کہکر خاموش ہو رہیں، اور میں خون کا سا گھونٹ پیکر رہ جاؤں کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔

بزم جم آخر شد و وقتِ صبوحِ ما رسید
طرحِ دیگری تواں انداخت دورِ جام را

لیکن یہ "طرحِ دیگر" کیا ہو سکتی ہے ؟ سوائے اس کے کہ جام و مینا کو چور چور کر دیا جائے اور بساط کو ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا جائے۔ اب تو یہی سوچ رہا ہوں۔

ایک غلطی کی تصحیح

جناب حمید سکریٹری بزم نظیر آگرہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ نظیر کی قلمی تحریر جس کا عکس نگار کی گزشتہ اشاعت میں شایع ہوا ہے، انھوں نے بھیجی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا اور ایک دوسرے صاحب کا نام درج ہوگیا۔ جناب حمید امید ہے معاف فرمائیں گے۔

نیاز

جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ

"ــــ اور سب سے بڑی بات، جس میں سمجھئے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری، ہمارے دلوں کی کیفیت ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کیجا سکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے۔ کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔"

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

جامعہ ملک کا وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں تعلیم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت دیجاتی ہے۔ چنانچہ دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ جامعہ کا سلوک بالکل مختلف ہے۔ عموماً ہمارے تعلیمی ادارے یہی اپنے فرض کی انتہا سمجھتے ہیں کہ سال بعد سال اپنے طلبہ کو کتابیں پڑھا کر ان میں بعض مہارتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور آخری درجوں میں اپنے طلبہ کو کسی پبلک امتحان میں شریک کراکے ان کے اہل یا نا اہل ہونے کا فیصلہ کرا دیں۔ گویا ان اداروں کا سلوک اپنے طلبہ کے ساتھ اس سوتیلی ماں کا سا ہے جو اگر بچوں سے پیار بھی کرتی ہے تو اس نیت کے ساتھ کہ وہ بد سے بدتر اور ناکارہ سے ناکارہ تر بنجائیں۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے یعنی جسوقت ہمارا طالبعلم فارغ التحصیل ہوکر دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو ایک اجنبی کی حیثیت میں پاتا ہے اور اپنے آپ کو اجنبی کیوں نہ سمجھے، مدرسہ اور سماج کے درمیان اسے ایک ایسی خلیج نظر آتی ہے جس کا کبھی اسے تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی باعث ہمارے طالبعلم کے دماغ میں ایک نہایت تکلیف دہ کشمکش پیدا ہوجاتی ہے اور بالآخر یا تو وہ اپنی تعلیم کو یکسر فریب اور اُستادوں کو فریب کار سمجھنے لگتا ہے یا پھر دنیا کے ہر مطالبہ کو ہیچ اور مہمل سمجھکر اسے ٹھکرا دینے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ دنیا کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ہمارا طالبعلم ہی خودکشی میں پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ تعلیم جو ان نتائج کی حامل ہو دنیا کے کسی ملک کے لئے سازگار ثابت نہیں ہوسکتی اور بالخصوص اس ہندوستان کے حق میں جس کی آزادی ہنوز ایک خواب بے تعبیر کی حیثیت رکھتی ہو، جس کی معاشرت تباہ اور جس کا تمدن برباد کیا جاچکا ہو یہ تعلیم پوری لعنت ہے۔ مروجہ تعلیم کے بانی نے چاہا تھا کہ اس تعلیم کے ذریعے غلام پیدا ہوں۔ چنانچہ غلام پیدا ہوئے اور پیدا ہورہے ہیں۔ آج میکالے کی روح اور سیاست کی روٹی کھانے والے انگریز کا دل اپنی کامیابی پر کسقدر نازاں ہو

فرحاں ہوگا!

ملک پر جامعہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس تعلیمی گرم گھر کے جس میں ہماری قوم کے دل و دماغ کو مفلوج و ماؤف بنایا جاتا تھا کچھ شیشے توڑ کر اس میں تازہ ہوا کے داخل ہونے کا راستہ بنا دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ خود اپنی جگہ تعلیم کے جھوٹے طلسم کے جواب میں ملک کے سامنے سچی تعلیم اور اس کی کامیابی کی وہ مثال پیش کی ہے جو معجزہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر مسٹر ای سالٹر ڈیویز (ڈائرکٹر تعلیم، کینٹ، انگلینڈ) نے جامعہ پر اپنی رائے کے دوران میں کہا ہے "۔۔۔۔ آپ سخت مشکلات کے باوجود ان اصولوں پر عمل کر رہے ہیں جنھیں نظری طور پر سب نے تسلیم کر لیا ہے مگر عملاً ہمارے مدارس بہت ہی آہستہ آہستہ اختیار کر رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ وہ کر رہے ہیں جو میں انگلستان میں کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔" کچھ دن ادھر کی بات ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا اس ڈیلیگیشن کے صدر مسٹر ایل زلیاکس کا بیان ہے کہ "جو اصول اس جامعہ کے پیش نظر ہے اور عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اس کی بدولت یہ دنیا کی بہترین تعلیم گاہوں میں جو میں نے آج تک دیکھی یا سنی ہیں جگہ پانے کی مستحق ہے"

جامعہ میں "نصاب بنانے والوں کا ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا مقصد محض بچہ کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بچہ کی خداداد قوتوں میں نشو و نما کا سامان کرے، اور اس میں متمدن زندگی کے فرائض اور مقاصد سے لگاؤ پیدا کر دے۔ جہاں تک کہ ۵ سے ۱۲ سال تک کی عمر میں اس کا امکان ہے۔ اسے اپنی قوتوں پر، محرکات عمل پر، جذبات پر رفتہ رفتہ قابو حاصل ہونے لگے کہ اخلاقی اور ذہنی ضبط کی بنیاد اس سے پڑتی ہے اس میں اپنے فرض کا احساس پیدا ہو چلے، اور اس کو پورا کرنے کا ولولہ، اس کا تخیل اور اس کی ہمدردیاں اس طرح وسعت پذیر ہوں کہ وہ اپنے فطری اور معاشرتی ماحول میں اجنبی نہ رہے بلکہ اسے سمجھے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ نصاب بنانے والوں کی آرزو ہے کہ جن بچوں کی تعلیم اس نصاب کے ماتحت ہو وہ تندرست ہوں اور ان کی چال ڈھال اچھی ہو۔ وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور فصاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ ان کی گفتار میں حسن اور وقار ہو۔ وہ صاف ستھرے رہتے ہوں، سچ بولتے ہوں، آپس میں مل جل کر کام کر سکتے ہوں، کام کا جو منصوبہ بنائیں اسے ختم کو پہنچاتے ہوں اپنے ماحول کی حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی پورے انسان ہوں"

میں تو اس وقت پانچ چھ سال کا بچہ تھا لیکن آپ میں سے اکثر نے وہ منظر دیکھا ہوگا یا اس کے حالات سنے ہوں گے جب چند "سر پھرے" نوجوانوں نے علیگڈھ میں چار قطاروں میں بیس خیمے لگا کر یہ اعلان کیا تھا کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اور اس کا کام مسلمان کو مسلمان اور انسان بنانا ہوگا، بعض لوگ ہنسے ہوں گے اور بعض خاموش رہے ہونگے

لیکن اس قلیل عرصے میں جامعہ اپنے نصب العین سے عملاً کس قدر معروف ہو چکی ہے

یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ قرول باغ میں گردوارہ روڈ پر شام کے وقت اکثر آپ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کچھ بچے دیکھینگے یہ بچے صاف ستھرے پن اور بھولے بھالے پن میں اس ماحول کے تمام بچوں سے مختلف ہوں گے۔ انھیں ذرا قریب سے دیکھئے ان میں سے ہر بچے کے دانت موتی کی طرح صاف ہوں گے، اس کے ناخون ترشے ہوئے ہوں گے اور گرد و غبار سے بچنے کے لئے اسکی جیب میں رومال ہوگا۔ آپ ان میں کسی بچے کو روکئے۔ بچہ بے خوف ہو کر رکیگا اور آپ سے کہیگا "فرمائیے" آپ اس سے کسی کا پتہ پوچھئے۔ وہ بہت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ آپ کو پتہ بتا دیگا اور اگر آپ نے ذرا پریشانی ظاہر کی تو یہ بچہ خود آپ کا راہبر بنجائیگا۔ آپ کو منزل تک پہونچائے گا، شگفتگی کے ساتھ "آداب عرض" کرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ ——— یہ جامعہ کا بچہ ہے۔

جامعہ کے بچے سے اس سطحی تعارف کے بعد آئیے میں آپ کو اس کی زندگی سے اور زیادہ قریب لئے چلتا ہوں۔ شہر کی زہریلی ہوا سے دور، شہری زندگی کی خامکاریوں سے الگ، اور مصنوعی تہذیب کی حدود سے باہر ——— اوکھلا میں جس جگہ ہماری موٹر رکتی ہے وہاں بائیں جانب ایک عالیشان دو منزلہ جرمن طرز کی سرخ عمارت نظر آئے گی۔ دور سے یہ عمارت قرب جوار کی ناہموار زمین پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے الٰہ دین کے چراغ والے جن نے کہیں سے اُٹھا کر اسے یہاں لا رکھا ہے۔ لیکن یہ کسی ہندوستانی "چراغ الہ الدین" کا محل نہیں ہے۔ یہ جامعہ کے بچوں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں ہندوستان کے سوا دو سو بچے ہندوستان کی زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں وہ گھر، جہاں کے بچے پروان چڑھکر استبداد کی گردن پر پاؤں رکھیں گے وہ گھر جہاں کے رہنے والے دولت کی لعنت اور موروثی کبر و خصومت کے گلے پر چھُری چلائیں گے ——— کیونکہ ان کا مشرب ہے "جاگو اور جگاؤ"

جوہر منزل، حالی منزل، اقبال منزل، انصاری منزل، محمود منزل اور اجمل منزل ——— اس عمارت میں چھ اقامت گاہیں ہیں۔ آپ ان ناموں سے سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ ابتدا ہی سے بچے میں کس حد تک اپنے قومی ورثے کو صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادت ڈالتی ہے۔ آئیے اب ذرا ایک اقامت گاہ میں چلیں۔ دیکھئے ان بچوں کے بستر کس سلیقے سے لگے ہوئے ہیں۔ بستروں کے درمیان ہر جگہ ایک سا فاصلہ ہے۔ گویا کل کمرے کی پیمائش کر کے بستروں کی جگہ قائم کی ہے۔ یہ کمرے کے پیچھے دیکھئے انکے استعمال کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اور یہیں ایک قطار میں سب کے جوتے رکھے ہوئے ہیں کونے میں دیکھئے پینے کا پانی ایک گھڑے میں رکھا ہے۔ صفائی کے لئے گھڑے میں ٹونٹی (ملٹم؟) لگا ہوا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوئی ہیں وہ اسی کمرے کے رہنے والوں کی تخیل کی ترجمان ہیں۔ یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بچے کے فطری رجحانات اور ذوق و شوق کی پذیرائی کے کیا مواقع ہیں ——— یہ بچے منھ اندھیرے اُٹھتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر دو ایک گھنٹہ کھلی ہوا میں ورزش کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک بڑے خاندان کی طرح ایک ساتھ بیٹھکر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرتے ہیں۔ جس نفاست کے ساتھ یہ بچے ناشتہ کرتے ہیں وہ آپ کو

دوسری جگہ کے بڑے طلبہ میں بھی کم نظر آئے گی۔ ڈائننگ ہال میں انتظام کرنے کے لئے ہر ماہ ہر جماعت اپنے دو نمایندے منتخب کرکے بھیجتی ہے جو ڈائننگ ہال میں کھانے کے وقت اپنی اپنی جماعت کی ضروریات پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ناشتے کے بعد سب بچے ترانے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اُس وقت جب اس عمارت کے ایک گوشے سے دو سو معصوم آوازیں

ہاتھ اُٹھائے، سر کو جھکائے

رحم پہ تیرے آس لگائے

گاتی ہوئی اُٹھتی ہیں تو دل کی رگ رگ میں ایک گونج پیدا ہو جاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے تو یقیناً انسان اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ "ترانے" کے بعد دن کے ضروری اعلانات ہوتے ہیں پھر کل کی کھوئی ہوئی چیزیں جن میں جوتے، ٹوپیاں تولیاں، چاقو، ربر، پنسلیں سب ہی کچھ ہوتا ہے بچوں کو واپس کردی جاتی ہیں اور پھر مدرسہ شروع ہوتا ہے۔

درجے میں بھی یہ بچے اپنے بچپن سے دور اور زندگی سے الگ نہیں ہونے پاتے بلکہ یوں کہئے کہ زندگی ہی ان کے لئے ذریعۂ تعلیم ہے۔ چنانچہ جامعہ کا بچہ زبان سیکھتا ہے، اس لئے نہیں کہ اسے زبان کا امتحان دینا ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حساب سیکھتا ہے اس لئے نہیں کہ حساب اسکے نصاب میں شامل ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے چڑیا خانہ، بچوں کی دوکان اور بنیک کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ وہ سائنس پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ سائنس کے کچھ اُصول رٹ کر اچھے نمبر حاصل کرسکتا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر اس سے کبھی (Swan ink) کی شیشی نہ کھلے تو وہ ایک دیا سلائی سے اس کا ڈھکن گرم کرکے اسے کھول سکے۔ وہ سماجی علم پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ریل کی کھڑکی میں کھڑا ہوکر دوسرے مسافروں کو دھکا دے بلکہ اس لئے کہ خود بھی آرام سے سفر کرے اور دوسروں کو بھی آرام سے سفر کرنے دے۔ وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ افیونی بن کر جنت و جہنم کے خواب دیکھنے میں اپنا وقت ضایع کرے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسروں کی مصیبت میں خدا کا ہاتھ بن کر کام آئے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کا بچہ زندگی اور دنیا سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ سماج میں اپنی جگہ پہچانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا سماج پر اور سماج کا اس پر کیا حق ہے۔

دوپہر کو کھانے بعد یہ بچے کچھ آرام کرتے ہیں۔ شام کو ان کے لئے ہر قسم کے کھیل کا انتظام ہے۔ زیادہ چھوٹے بچوں کے لئے جھولے اور سلائڈ موجود ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ریڈیو پر کچھ دیر گانا اور خبریں سنتے ہیں۔ پھر وقت پر سو جاتے ہیں۔

ان کھیلوں اور دلچسپیوں کے علاوہ جن کا مدرسے کی طرف سے انتظام ہے بچوں کی اپنی نجی دلچسپیاں بھی ہیں بنیک پھلوں کی دوکان، کتابوں کی دوکان اور چڑیا گھر کے انتظامات کے علاوہ ایک پندرہ روزہ "بچوں کا اخبار" بھی ان کا نجی معاملہ ہے۔ اس اخبار کے "عید نمبر" اور "دیوالی نمبر" بہت دلچسپ تھے اور اشتہاروں کے ذریعے باضابطہ طور پر ان نمبروں کا پروپاگنڈا کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف بچے اپنے لئے ایک موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ تصاویر اور معلومات البم کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ایک بچے نے، جس کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں آرہا ہے، بچوں ہی کی تصاویر کا ایک البم بنایا ہے

مجھے یہ البم سب سے زیادہ پسند ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس بچے کو اپنا بچپن کس قدر عزیز ہے! پتیاں، کیڑے مکوڑے، ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق تو عام ہے۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ ہر جماعت کی ایک یونین ہے جس میں باقاعدہ مختلف کاموں کے لئے وزیروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر ہفتے یونین کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں بعض مفید باتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

آیئے، اب میں اپنے چند دوستوں سے آپ کی ملاقات کراؤں۔ دیکھئے یہ ایک چھوٹا سا بچہ جو اپنی اونی ٹوپی اور گرم کوٹ میں اسکیمو معلوم ہو رہا ہے درجہ دوم کا طالبعلم ہے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال کی ہوگی اور اس کا نام قاضی اسرار ہے۔ جامعہ میں میری دوستی سب سے پہلے اسی بچے سے ہوئی تھی۔ اسے کہانیوں کا بیحد شوق ہے۔ ایک دن سحرگشت کے سلسلہ میں اس نے مجھے یہاں سے نہر تک چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ اس کا ہمیشہ تقاضا ہوتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں۔ میری انگلی پکڑ لیتا ہے اور ساتھ رہنے کے شوق میں تھوڑی دیر بعد بھاگتا ہے حتیٰ کہ اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ پھر میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں ایک اور بچہ دیکھئے۔ اس کا نام رضوان ہے۔ چہرہ کیسا گول گول ہے، آنکھیں کسقدر روشن۔ ہر بات سے بھولا پن برستا ہے گویا معصومیت کا دیوتا ہے۔ ورڈسورتھ نے ایسے ہی کسی بچے کے قدموں میں آسمان دیکھا ہوگا۔ اسے بھی میری گود میں چڑھکر مجھ سے باتیں کرنے کا اور میری انگلی پکڑ کر چلنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہاں وہ ایک بچہ بھی جس نے ہمیں دور سے سلام کیا، عجیب بچہ ہے۔ ذہانت اسکے چہرہ سے برستی ہے، گو لکھنے پڑھنے میں زیادہ تیز نہیں ہے۔ جب میں سب سے پہلی مرتبہ ڈائننگ ہال آیا تو انھوں ہی نے "السلام علیکم" کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ "آپ کس سیاسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں؟" تو میں کہ سیاست کو سیاست کی طرح سمجھنے کا عادی ہی نہیں، ذرا گھبرا سا گیا۔ اپنی ندامت چھپانی تھی اس لئے خاموش رہا۔ لیکن انھوں نے پھر بڑے شوق کے ساتھ مجھ سے کہا "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا" "میں کسی سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا" میرا جواب تھا۔ اس پر اس بچہ نے تیور بگاڑ کر مجھ سے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا، ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں مختلف چیزیں انتخاب کرنی ہوتی ہیں۔ اسلئے کوئی سیاسی ادارہ بھی آپ کا پسندیدہ ضرور ہونا چاہیئے۔" جامعہ میں یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک بچہ سے مجھے ملا۔ یہ ملاقات تو یہیں ختم ہو گئی لیکن اپنی اولین فرصت میں ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی، چائے پی پھل کھائے اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ان کا نام مصطفےٰ رشید صدیقی ہے۔ درجہ ششم میں تعلیم پاتے ہیں اور چڑیا گھر کے ناظم ہیں۔
— وہ ایک صاحب جو ابھی ابھی نظر بچا کر ادھر سے نکل گئے منیر الدین قادری ہیں خدا نے ذوق اور ذہن دونوں دئے ہیں مدرسے کے بہترین مصور ہیں۔ ہم دونوں کو ایک تعلیمی سفر کے سلسلہ میں قریب دو ہفتے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ کس حد تک جامعہ اپنی تربیت کے اثرات بچوں کے ذہن میں مستقل طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ میں روز اس بات کی تلاش میں رہتا تھا کہ دیکھوں منیر جامعہ کے اصولوں سے کس جگہ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن میری جستجو فضول تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ جامعہ کا بچہ ہر جگہ اپنی جامعہ بنا لیتا ہے۔ منیر کو اس کمسنی میں زبان پر تحیر کن قابو اور قدرت حاصل ہے سفر میں

میرے سامنے بیٹھ کر اپنی ڈائری کے صفحے کے صفحے بغیر نکالے لکھے چلے جاتے تھے اور مضمون کے تسلسل میں سرمو فرق نہیں آتا تھا۔ "بچوں کا اخبار" انھیں کی زیرِ ادارت نکلتا ہے ۔ عبداللہ نعیم اور محمود سے آپ کی ملاقات اور کراتا لیکن وہ اسوقت کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ جامعی بھائیوں میں یہ بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔

یہ تو چند وہ ستارے تھے جن سے بیشے اپنا آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ اب آپ پھر ایکبار مجموعی حیثیت سے جامعہ کے بچوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ یہ دوسرے مدرسوں میں تعلیم پائے ہوئے بچوں سے کس قدر مختلف ہیں۔ سب سے بڑی بات جامعہ کے بچے میں یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُستاد موجود ہو یا نہ ہو لیکن اسے اپنے کام میں لگے رہنا۔ اسکے علاوہ جامعہ کا بچہ آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے رہنا پسند کرتا ہے اسلئے اسکے نزدیک سماجی امتیازات اور پابندیاں لایعنی سی چیزیں ہیں اور وہ آن بان جسے کرائے کی آن بان کہئے اسکے یہاں حرام ہے ۔ یہ بچہ غریب گھر کا ہو یا امیر لیکن صاف رہنے کے لئے خود ہی اپنے جوتے پر پالش کرلیتا ہے اور خود ہی کپڑے بھی دھولیتا ہے۔ جامعہ کا بچہ وقت کی پوری قدر کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وہ دوسروں کے پاس جا کر ان کا وقت برباد نہیں کرتا۔ لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جامعہ کا بچہ عمر سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جب موقع ہوتا ہے تو یہ شور کرتا ہے اور خوب شور کرتا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے لڑ بھی لیتا ہے اور پھر جواب میں پٹ لینے پر روتا بھی ہے — ملک اور قوم کے بچوں کی اس خدمت کے باوجود کچھ لوگ جامعہ سے خفا ہیں اور وہ اس لئے کہ جامعہ انکے بچوں کی تربیت کا ذمہ نہ لے سکی۔ ہمارے ان بزرگوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے کے شوق کے ساتھ ساتھ جامعہ کی مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھیں۔ جامعہ ایک اقامتی درسگاہ ہے اور اسے اپنا طریقۂ تعلیم کامیاب بنانے کے لئے دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر ضرورت سے زیادہ کمزور کسی بچے کو یا کسی ایسے بچے کو جو بہ لحاظ عمر صحیح ذہنی استعداد حاصل نہیں کرسکا ہے داخل نہ کرے۔ جامعہ کا یہ رویہ والدین کے لئے ناگوار ہو تو ہو لیکن جامعہ والدین کو خوش کرنے کے لئے بچہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ کچھ اسی قسم کی غلط فہمیوں سے متاثر ہو کر بعض احباب نے جامعہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنا "شغلِ فرصت" بنا رکھا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ۳ نومبر سنہ ۳۹ء کو مینے بمبئی میں مکتبۂ جامعہ کی شاخ کے قریب دیوار پر یہ اشتہار لگا دیکھا "جامعہ کی کتب بائیکاٹ کرو۔ جامعہ بچوں کو مدینہ کی بجائے کاشی کا راستہ دکھاتی ہے۔ نیا قاعدہ صفحہ ۲۹" یہ اشتہار دیکھ چکنے کے بعد مینے اپنی سب سے پہلی فرصت میں نیا قاعدہ دیکھا صفحہ ۲۹ پر کچھ یہ جملے تھے، یادداشت سے نقل کرتا ہوں — "ریل میں بیٹھ۔ سفر کر۔ متھرا جا۔ پیڑے لا" آپ خود سوچئے کہ کیا یہی کاشی کی راہ دکھانا ہے؟ پھر ان معترضین کو اگر تعلیم سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا تو جانتے کہ ہندوستانی بچے کے لئے متھرا اور متھرا کے پیڑے زیادہ قریب کی چیزیں ہیں نہ کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ"۔ یہ اُصول کہ بچے کے لئے تعلیمی مواد بچے ہی کے ماحول سے لینا چاہئے اب اتنا نیا بھی نہیں ہے کہ بمبئی کے مسلمان اسے نہ جانتے ہوں لیکن جس قوم کے متعلق قدرت یہ فیصلہ کر چکی ہو کہ اسے مٹنا ہے اس کے لئے کوئی انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ جامعہ کا اگر کوئی قصور اور کفر ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک بیدار قوم بنا کر ہندوستان میں امن و سکون کے ساتھ رہنا سکھاتی ہے لیکن ہندوستان کے مسلمان کو ہندوستان میں رہنا ہی کب ہے۔ اسے تو افغانستان، ایران، عرب، فلسطین ترکستان اور مصر میں جا کر اُن آزاد مسلمانوں کی حمایت میں کٹ مرنا ہے جنھیں اس غلام مسلمان کی ضرورت نہیں یا ہندوستان میں سرائے کے ایک مسافر کی طرح زندگی کے دن پورے کرکے آسمان کا رخ کرنا ہے — جامعہ آپ کو تعجب ہوگا روپے سے نہیں بنی ہے۔ اسکی بنیادیں ایثار اور خلوص پر رکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ان بے شمار دشواریوں کے جو اس قسم کے اداروں کے سامنے آتی ہیں جامعہ روز بروز اپنے نصب العین سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ جامعہ کی مسلسل ترقی کا ایک ثبوت "اُستادوں کا مدرسہ" بھی ہے۔ "اُستادوں کا مدرسہ" امسال اپنی زندگی کا دوسرا سال پورا کر رہا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جس اُستادوں کے مدرسے کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور پروفیسر سعید انصاری صاحب جیسے اُستادوں کی سعی و کاوش وابستہ ہوں اسے جدید تعلیمی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کس معیار کے اُستاد تیار کرنے چاہئیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس ادارے کو ابھی اپنی نوخیزی کے باعث بعض سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جامعہ کا یہ ادارہ بھی اپنے ہمشیر اداروں کی طرح ہندوستان کے چوٹی کے ماہرینِ تعلیم سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے — اور یہ سب خلوص کا کرشمہ اور ایثار کا معجزہ ہے۔ اسی بھروسہ پر جامعہ کا کام چلا ہے اور چلیگا۔

فضل الدین اختر ایم۔ اے

باب الاستفسار

موجودہ جنگ کا نتیجہ

(جناب سید اسماعیل حسن صاحب - ناگپور)

آپ کے جو مقالے جنگ کے متعلق نگار میں شایع ہوتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سیاسیات عالم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن ہمیں تو آپ صاف صاف الفاظ میں یہ بتائیے کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا، آیندہ یہ کیا صورت اختیار کرنے والی ہے اور ہم لوگ کب تک اس مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔

(نگار) آپ ایسے مسئلہ میں مجھ سے پیشین گوئی کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آج کوئی نبی ہوتا، تو شاید وہ بھی اسکی جرأت نہ کرسکتا۔ بڑے بڑے انبیا نے متعدد لڑائیاں لڑی ہیں، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ ہمیشہ ان کے موافق ہوا ہے، اگر انھیں نتیجہ کا علم ہوتا تو وہ کیوں لڑتے اور کیوں انھیں شکست ہوتی۔

تاہم حالات کی بنا پر یہ ضرور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ حکومتوں کے نظام پر اس کا بڑا زبردست اثر پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ یا تو عالم میں ایک مستقل امن و سکون کی صورت پیدا ہوجائے، یا اس سے بھی زیادہ ہولناک جنگ کے اسباب رونما ہوجائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فرانس و برطانیہ کا عملی اتحاد اور امریکہ وغیرہ دوسری جمہوری حکومتوں کی اخلاقی ہمدردی۔ یہ اتنا زبردست محاذ ہے کہ جرمنی و روس کا باہمی تعاون اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آگے چل کر جمہوری حکومتوں کے مقابلہ میں لڑائی کا سارا بوجھ انھیں دو کے سر پڑ جائے گا اور یورپ و ایشیا کی کوئی اور حکومت ان کا ساتھ نہ دے گی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے تین سال تک لڑنے کا ارادہ تو کرہی لیا ہے۔ لیکن برنارڈ شا کے خیال کے مطابق اس میں ایک صفر اور بڑھانا چاہئے۔ جرمنی کی طیاریوں کا صحیح علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن اگر

اس کے بیانات سے مبالغہ کا حصہ علٰحدہ کر دیا جائے تو بھی وہ کم از کم ایک سال تو آسانی سے مقابلہ کر ہی سکتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس دوران میں بعض گتھیاں ایسی نہ پڑیں کہ ان سے وہ جائز یا ناجائز فایدہ اُٹھا کر اور کئی سال تک اس آگ کو مشتعل نہ رکھ سکے۔

میں نے اس اشاعت کے ملاحظات میں زیادہ تفصیل کے ساتھ جنگ کے مستقبل پر بحث کی ہے، آپ اسے پڑھئے اور پھر بھی اگر کوئی بات آپ کو تشنہ نظر آئے تو مجھ سے دریافت فرمایئے۔ بہرحال آپ اور ہم سب کو نہایت سخت مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس موقعہ کو محض توکل بخدا ایک بیکسانہ خاموشی کے ساتھ گزر جانے دیا تو پھر اس کے بعد جو دور ہندوستان پر آئے گا وہ ایک لازوال غلامی کا ہوگا اور اس سے صدیوں تک نجات ملنا مشکل ہے۔

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب تفضل حسین صاحب - رانچی)

معلوم نہیں اس سے پہلے جن حضرات نے استفسار کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، وہ آیندہ اس کو جاری رکھیں گے یا نہیں، لیکن اس خیال سے کہ مبادا وہ خاموش ہو گئے ہوں اور یہ سلسلہ منقطع ہو جائے، میں ذیل کے اشعار کا مفہوم دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

۱- غیر کو سینہ کہے سے سپر دکھلا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے ۔ کیا سپر اس جگہ متادی ہے۔ دکھلا دیا کا فاعل کیا ہے

۲- دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا — اس بت پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے؟

۳- دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب، — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

طالع ناساز اگر خود مومن کا تھا تو وہ اس کے حق میں سازگار کیونکر ہو گیا۔

۴- مت رکھیو گردِ تارک عشاق پر قدم — پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

۵- گور میں بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا ہائے ہائے — آپ ہی میں ہم نہیں جب کنج تنہائی ملا

۶- ہم بھی تو ناداں ہیں آخر پاسِ مطلب کس لئے — خضر، موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

۷- جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کس لئے — کیا دلِ گم گشتہ اسے ہنگام آرائی ملا

۸- واعظ بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

۹ - ہے ظلم کرم جتنا تھا فرق پڑا کتنا — مشکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا

۱۰ - کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے — پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا

۱۱ - مطلب ہے کہ وصلت میں ہو بوالہوس آفت میں — اس گرمیِ صحبت میں اے دل نہ پگھل جانا

۱۲ - محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا — رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

۱۳ - کس دن تھی اسکے دل میں محبت جواب نہیں — سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

۱۴ - جی طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا — روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا

۱۵ - از بس کہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری — عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا

۱۶ - تاثیر بیقرار رہی ناکام آفریں — ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھامنا

۱۷ - دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے — اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا

۱۸ - مضطر ہوں کس کا طرزِ سخن سے سمجھ گیا — اب ذکر کیا ہے سامعِ عاقل کو تھامنا

۱۹ - سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن — صیاد اب قفس میں عنا دل کو تھامنا

۲۰ - یہ زلف خم بخم نہ ہو، کیا تاب غیر ہے — تیرے جنوں زدہ کی سلاسل کو تھامنا

۲۱ - مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام — مومن، زبان بیہدہ سائل کو تھامنا

۲۲ - تھی کمیں میں غارتِ بوسِ دہن ہنگام خواب — شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہوگیا

۲۳ - زخم تو بھی مراہم زخم کہن ہے، چارہ گر — بند تیرِ یار سے سینہ کا روزن ہوگیا

۲۴ - رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

(نگار) مومن کے اشعار سمجھنے کے لئے سب سے پہلے آپ ان کی نثر کر لیا کیجئے، بہت سے اشعار تو اسی طرح حل ہوجائیں گے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو، تو پھر یہ غور کیا کیجئے کہ شعر میں محذوفات کیا کیا ہیں اور اگر کوئی خاص فارسی ترکیب ہو تو اس کے مفہوم اور محل استعمال کو بھی دیکھئے۔ آپ نے جتنے اشعار درج کئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو نثر کرنے کے بعد سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بعض البتہ زیادہ دقیق ہیں ۔ بہرحال اب سلسلہ وار انکا مطلب سنئے:۔

۱- پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوئی :- سیمبر کہے سے غیر کو سینہ دکھلا دیا۔ یعنی غیر نے جو تمھیں سیمبر کہا تو فوراً فخر و غرور سے سینہ دکھا دیا۔ دوسرا مصرعہ صاف ہے۔ سیمبر یہاں منادیٰ نہیں ہے، دونوں مصرعوں میں دکھلا دیا کا فاعل تمنے ہے جس سے دوسرا مصرعہ شروع ہوتا ہے۔

۲- ایمان بالغیب سے مراد خدا پر بے دیکھے ایمان لانا ہے، جو مومن کی صفت ہے۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اسے مومن

یہ تمہارا ایمان بالغیب اسی وقت تک ہے جب تک اس بت پردہ نشیں نے جلوہ نہیں دکھایا۔ یعنی اس کا جلوہ دیکھتے ہی خدا کو نہ بھول جاؤ تو سہی!

۳۔ دوسرے مصرعہ کی نثر محذوفات پُر کرنے کے بعد یوں ہوگی:۔

منجم کے لئے میرا طالع ناساز دیکھنا، اس کے لئے ساز گار تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب منجم نے میرے حالِ زار کو دیکھا تو اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس پر یہ جان دیتا ہے وہ واقعی بہت جمیل ہے اور اس طرح وہ میرا رقیب بن گیا۔ گویا میرا طالع ناساز دیکھنا ہی اسے ساز گار ہو گیا۔

۴۔ عاشقوں کی سروں کی خاک پر قدم نہ رکھنا ورنہ ان کے لئے یہ بات سرافرازی کا باعث ہو جائے گی اور یہ تم چاہتے نہیں کہ جو تمہارا پامال ہو وہ سرافراز ہو جائے۔

۵۔ جب تک زندہ رہے دنیا کے ہنگامہ کی وجہ سے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ گور میں بیشک تنہائی ملی تھی اور موقعہ تھا کہ خوب دل بھر کر رو لیتے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں خود ہمیں اپنا ہوش نہیں۔

۶۔ اس شعر میں تلمیح ہے موسیٰ و خضر کے ملاقات کی۔ مشہور روایت ہے کہ موسیٰ کو بعض باتیں معلوم نہ تھیں اور ان کو ہدایت ہوئی تھی کہ وہ خضر سے ملکر دریافت کریں۔ اسی پر قیاس کرکے شاعر کہتا ہے کہ میں بھی تو موسیٰ کی طرح نادان ہوں اس لئے مطلب کی طرف سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ممکن ہے مجھے بھی میرا خضر (محبوب) مل جائے۔

۷۔ اے ہنگامہ آرائی، کیا دل گم گشتہ تجھے مل گیا تھا جو اب ہنگامہ جستجو سے وصلِ دلبر کی تمنا کرتی ہے؟ یعنی جس طرح ہنگامہ آرائی سے دلِ گم گشتہ نہیں مل سکا، اسی طرح وصلِ دلبر بھی میسر نہیں آسکتا، مدعا یہ کہ سب مقدر پر منحصر ہے، کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

۸۔ یہ شعر نازک ہے۔ واعظ پر طعن کرتا ہے کہ اگر تیرے کہنے کے مطابق کافروں کو عذاب جہنم میں مبتلا کیا جائے گا۔ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ بتوں کو جہنم سے نکال کر خُلد میں لیجائیں گے۔ ورنہ اگر بُت بھی جہنم میں رہے تو کافروں کیلئے جہنم بھی بہشت ہو جائے گا۔

۹۔ کتنا فرق پڑ گیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اتنا ہی ظلم ہے۔ دفعتاً کسی کا مزاج اتنا بدل جانا بہت مشکل ہے۔

۱۰-۱۱۔ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں اُس سے سوالِ وصل کرتا ہوں تو وہ پانی پر کافور جلا کر دکھاتا ہے یعنی دیکھو بوالہوس یا غیر کا حال وصل میں اسی کافور کی طرح ہوتا ہے، سوائے دل تو ان باتوں میں آکر سوالِ وصل سے ہٹ نہ جانا، وہ تو یونہی باتیں بنایا کرتا ہے۔

۱۲۔ محو جفا (یعنی میں) کب اس کے الطاف کا متحمل ہوا تھا یعنی میں اس سے واقف ہی نہیں کہ اسکی عنایتیں کتنا بڑا ظلم ہیں، اس لئے اس کا اب میرے حال پر رحم کرنا قیامت ہے۔ کیونکہ اس نوع کی ستم رانیوں سے متحمل ہونیکا

موقعہ مجھے کبھی ملا ہی نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ میں انھیں برداشت نہ کر سکوں۔

۱۳- یہ شعر خاص مومن کے رنگ کا ہے۔ محبوب، عدو سے اس لئے خفا ہے کہ اس کی محبت کا یقین نہیں رہا۔ مومن یہ رنگ دیکھ کر محبوب سے کہتا ہے کہ عدو کو تم سے پہلے ہی کب محبت تھی جو اب نہیں رہی۔ اس لئے تمھارا اُس سے ناخوش ہونا بے سبب ہے۔

۱۴- روز جزا کے ذکر پر محبوب نے طعن کیا کہ تمھیں تو وہاں حوریں ملیں گی، پھر کیا فکر ہے۔ اس طعن کو سن کر مومن کہتا ہے کہ میرا جی کیا کیا جلا ہے۔

۱۵- مجھے وصل تو نصیب ہوا لیکن اس خیال سے کہ یہ تو صرف غیروں کی برابری ہوئی، سارا عیش خاک میں ملگیا۔

۱۶- اس شعر میں آفریں کا لفظ دھوکا دیتا ہے اور لوگ اسے ناکام کے ساتھ متعلق سمجھکر کوئی فارسی ترکیب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آفریں یہاں بالکل علحدہ ہے اور شاباش کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اپنی بیقراری ناکام سے طنزیہ لہجہ میں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شاباش، تو نے خوب اپنا اثر دکھایا یعنی بجائے اس کے کہ تو اس کو بیقرار کر دیتی، تو نے اس میں اور سکون پیدا کر دیا، سچ ہے ایسے شوخ شمایل کو تھامنا بھی آسان کام نہ تھا۔

۱۷- وہ (محبوب) چاندنی کی طرف دیکھ رہا ہے، اس لئے اے آسمان اپنے مہر کامل کو سنبھالنا کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر آ رہے۔

۱۸- سامع عاقل میری باتوں سے سمجھ گیا کہ میں کس کے لئے بیتاب ہوں، اسلئے اب اس کو سنبھالنا مشکل ہے۔

۱۹- "نالۂ نہ آسمان شکن" - یعنی وہ نالہ جو نو آسمانوں کو توڑ کر نکل جائے۔

۲۰- یہ محبوب کی زلف خم بہ خم نہیں کہ غیر سنبھال لے، بلکہ تیرے دیوانوں کی زنجیر ہے۔

۲۱- "زبان بیہدہ سائل" یعنی وہ زبان جو بے معنی سوال کرے۔ اے مومن اپنی بے معنی سوال کرنے والی زبان کو تھام۔ بتوں سے پناہ مانگنا حرام ہے۔

۲۲- یہ شعر مومن کا بہت اُلجھا ہوا ہے اور وہ معنے جو اس کے بیان کئے جاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر پہلے مصرعہ میں خواب کو وصل کے معنے میں لیا جائے اور دوسرے مصرعہ میں "شب کی بیداری" کے آگے "کے بعد" محذوف مانا جائے تو یہ معنے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وصل کی شب بوسۂ دہن لینے کی خواہش گھات میں تھی لیکن یہ رہزنی اس وقت پوری ہوئی جب رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے وقت معشوق سو گیا۔

۲۳- پہلے یار نے تیر چلایا تو زخم ہو گیا لیکن جب دوبارہ چلایا تو تیر اس زخم میں رہگیا اور اس کا روزن بند ہو گیا اسکو وہ مرہم زخم سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۴- محبوب کی عادت ہے کہ وہ ہر بات غیروں سے کہدیتا ہے۔ اس لئے اگر میرا راز نہاں آشکارا نہیں ہوا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا کوئی خط محبوب تک نہیں پہونچا، ورنہ وہ یقیناً غیروں سے ذکر کرتا۔

تنوعات

کرسیوں وغیرہ پر جس چیز سے وارنش کی جاتی ہے اسے لاکھ کہتے ہیں لاکھ میں ایک کیڑا ہے جو درختوں کی شاخوں میں لگ جاتا ہے اور اسی کو ہلاک کرکے وارنش طیار کی جاتی ہے، لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ جب ۵۰۰۰ کیڑوں کا خون ہوتا ہے جب کہیں جاکر ایک پونڈ لاکھ ہاتھ آتی ہے —— چیونٹی کی ایک قسم ہے جو بارش کے وقت پنکھڑیوں پتیوں کی چھتری اپنے سر پر لیکر چلتی ہے —— سمندر میں آپ ایک جہاز سے زائد از زائد دس میل دور کی چیز دیکھ سکتے ہیں۔ —— ہر درجۂ حرارت کے اضافہ کے ساتھ آواز کی رفتار فی سکنڈ ایک فٹ بڑھجاتی ہے —— چونکہ جاپانی موٹے آدمیوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہاں دوسرے ملکوں کے جتنے سفیر بھیجے جاتے ہیں وہ سب دبلے پتلے ہوتے ہیں —— روم کے پاپائے اعظم کی ڈاک کا جواب دینے کے لئے ۳۵ سکرٹری مقرر ہیں —— کلیفورنیا کی ایک بستی میں جہاں زیادہ تر معدنوں میں کام کرنے والے رہتے ہیں ایک ہوٹل کے دروازہ پر یہ نوٹس لگا ہوا ہے کہ "اگر تمھیں ہمارے یہاں کا بھنا ہوا گوشت سخت معلوم ہوتا ہے تو ہوٹل سے نکل جاؤ، یہ کمزور آدمیوں کی جگہ نہیں ہے" —— یوگوسلیویا میں ایک مقام ہے جس کا نام ورونکا ہے، یہاں کی مقامی حکومت نے قسم کھانا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے اسے تنبیہ کردیجاتی ہے، لیکن دوسری بار اس جرم کے ارتکاب میں اسکو جھاڑو لیکر سڑکیں صاف کرنے کی سزا دیجاتی ہے —— دنیا میں کوئی دو تیتریاں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں —— انسان کے اعصاب بالائی حصۂ جسم پر ہوتے ہیں اور کیڑوں کے اعصاب اندر ہوتے ہیں —— انگریزی زبان میں ۵ لاکھ لفظ پائے جاتے ہیں جن میں سے شیکسپیر نے ۲۴ ہزار استعمال کئے اور ۵ ہزار ایسے جنھیں مکرر استعمال نہیں کیا۔ ملٹن نے ۱۷ ہزار الفاظ استعمال کئے اور انجیل میں صرف ۷۲۰۰ الفاظ استعمال ہوئے ہیں —— ستر سال کی عمر میں ساڑھے چار سال انتظار میں ختم ہوتے ہیں اور تین سال نہانے دھونے میں —— اسوقت دنیا میں ۷ لاکھ ۵۰ ہزار کیڑے دریافت ہوئے ہیں جو انسان کی غذائی پیداوار کا دسواں حصہ ہضم کر جاتے ہیں —— جرمنی میں اب ایک دایرہ بجائے ۳۶۰ ڈگری کے ۴۰۰ ڈگریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس لئے وہاں کا زاویۂ قائمہ بجائے ۹۰ ڈگری کے ۱۰۰ ڈگری کا ہے —— دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے کم عمر چوہے کی ہے یعنی دو یا تین سال —— یوروپ میں سب سے زیادہ اوسط پیدایش روم کا ہے یعنی ۲۲۴ فی ہزار —— جلی فش (ایک قسم کی مچھلی) کی ساخت میں ۹۰ فی صدی حصہ پانی کا ہے —— بارش کے قطروں کو کبھی کبھی ایک گھنٹہ زمین تک پہونچنے کے لئے درکار ہوتا ہے —— سیام کے امراء کی نہایت مرغوب غذا سانپ کا اچار ہے جو سرکہ سے بنایا جاتا ہے —— انسانی زبان میں ذایقہ کے ۳۰۰۰ ہزار خلایا پائے جاتے ہیں، گائے کی زبان میں پندرہ ہزار اور ہرن کی زبان میں ۵۰ ہزار۔

معراجِ محبت

(سرمست تمکین حیدرآبادی)

تمناؤں سے حسن و عشق کی گودوں میں پلتے تھے
رہِ ہستی کی ہر منزل میں جادو بن کے چلتے تھے

نگاہوں کی طلب دل کا تقاضا بنکے رہتے تھے
نہ جانے اور ہم آپس میں کیا کیا بنکے رہتے تھے

ہمیں امکان کی حد سے گزر جانا بھی آتا تھا
سما کر آنکھوں میں دل میں اُتر جانا بھی آتا تھا

تمناؤں کا ہو جاتا تھا سودا آنکھوں آنکھوں میں
اکیلے ہی ہوا کرتے تھے ہم رہکر بھی لاکھوں میں

نظر بنکر مرے ارماں اُنھیں جب گدگداتے تھے
تو حوریں جھینپ جاتی تھیں ملائک مسکراتے تھے

حیاتِ شوق کی ہر سانس بس جاتی تھی خوشبو میں
خوشی سے جب دھڑکتا تھا مرا دل اُنکے پہلو میں

وہ میرا مست ہو جانا وہ اُن کا جھینپ سا جانا
وہ کھو جانا مرا وہ ہنس کے اُن کا مجھکو پا جانا

شگوفے سے چٹکتے تھے جوانی کی ترنگوں میں
رچا کرتی تھی ہولی رات دن دل کی اُمنگوں میں

متاعِ زندگانی بیخودی کی جان ہوتی تھی
گناہوں میں بھی اک معصومیت کی شان ہوتی تھی

اگر فکرِ غمِ فردا اُڑا دیتی تھی دونوں کو
محبت لوریاں دیکر سلا دیتی تھی دونوں کو

نشہ میں چور رہتے تھے اپنے سے باہر ہوکے جیتے تھے
محبت کے سوا ہم اپنا سب کچھ کھوکے جیتے تھے

خدائی سی کیا کرتے تھے جانِ بندگی بنکر
سما جاتے تھے ہم اک دوسرے میں زندگی بنکر

وفورِ بیخودی میں ایک ہو جاتے تھے ہم دونوں
محبت لوریاں دیتی تھی کھو جاتے تھے ہم دونوں

شباب و شعر کا مفہوم جب ہم سے عبارت تھا
اسے کیا ہو گیا وہ دورِ معراجِ محبت کا

غزل :

فراق گورکھپوری

راز کو راز ہی رکھا ہوتا — کیا کہنا گر ایسا ہوتا
لیکن کب تک پردہ کرتے — یعنی کب تک پردا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا
کم کم اُٹھتیں تیری نگاہیں — اکثر خونِ تمنا ہوتا
کٹتے کٹتے کٹتیں راتیں — ہوتے ہوتے سویرا ہوتا
رات کی رات دیارِ محبت — تیرا رین بسیرا ہوتا
میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے — تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا،
عشق نے مجھسے کمی کی ورنہ — مجھ پر تیرا دھوکا ہوتا،
پردہ داریٔ غم بھی ہے شاکی — تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آہ یہ درد یہ بیکس حالت — آج تو اُس کو پکارا ہوتا
ہم جو تجھے کچھ بھول سا جاتے — دردِ محبت دونا ہوتا
جان گنوا کر آنکھ اُٹھا کر — حُسن کا عالم دیکھا ہوتا
یہ مایوسی یہ بیزاری — عشق کو آج تو چھیڑا ہوتا
کچھ دلِ غمگیں کرکے دکھاتا — کچھ تو زمانہ بدلا ہوتا
منزل منزل دل بھٹکیگا، — آج تمھیں نے روکا ہوتا
دنیا دنیا عالم عالم، — ہوتا عشق اور تنہا ہوتا

ہم بھی فراق انساں تھے آخر
ترکِ محبت سے کیا ہوتا

فکر و نظر

(نجم آفندی اکبرآبادی)

پھر سانس کو آس اے دل ناکام ہوئی　　　پھر فطرتِ غم تشنۂ پیغام ہوئی
اِک شمع جلا کہ جھٹ پٹا وقت ہوا　　　نغمہ کو ذرا بلند کر شام ہوئی

کس سمت چلے درِ طلب کے مارے　　　قدرت بے انتہا بہت سہ پارے
بس ہیں فکر و نظر کی تسکیں کے لئے　　　مٹھی بھر پھول آسماں بھر تارے

دونوں جانب سے شمع جلتی ہے مری　　　اک رات سے کم بھی زندگی اچھی ہے
تشویش بجا کہ مختصر ہے صحبت　　　تسکین یہ ہے کہ روشنی اچھی ہے

دل کو ہمہ تن شمعِ فروزاں کردے　　　آ تکملۂ نگاہِ احساں کردے
یہ بھی کوئی روشنی ہے اے برقِ جمال　　　ظلمت کو جو کچھ اور نمایاں کردے

غزل :- آبد سرہندی

ترے حریم تجلی میں بار پا نہ سکا　　　میں چشمِ شوق کو جلووں سے جگمگا نہ سکا
میں کس طرح اُسے کہدوں خدائے عالم عشق؟　　　اُجاڑ کر مرے دل کو جو پھر بسا نہ سکا
مٹی نہ شورشِ تیز، کفر و ایماں کی　　　چراغ دیر و حرم کے کوئی بجھا نہ سکا
تو بھول کر بھی مجھے یاد کر سکا نہ کبھی　　　میں بھول کر بھی تری یاد کو بھلا نہ سکا
سیاہ تر تھیں مرے عہد ہجر کی راتیں　　　کہ چاند کیا کوئی تارا بھی مسکرا نہ سکا
نہ دی خودیٔ محبت نے رخصتِ سجدہ　　　میں آستاں پہ تمھارے جبیں جھکا نہ سکا
میں اپنے آپ کو خود بھی سمجھ سکا نہ کبھی　　　عجب نہیں جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

غزل : جگر بریلوی

ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
ابھی اے شدتِ غم زندگی محسوس ہوتی ہے

نہ جانے زخمِ دل کی آج گہرائی کہاں پہونچی
پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بنکر
یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

شبِ تاریک ہے ویرانہ ہے محویتِ غم ہے
عجب عالم میں قربت آپ کی محسوس ہوتی ہے

ازل سے موت نے ابتک کئی قالب بدلوائے
مگر جو چوٹ تھی دل میں وہی محسوس ہوتی ہے

جہاں وہ بیٹھ جائے گر کے منزل ہے وہی اُسکی
جسے ہر گام پر واماندگی محسوس ہوتی ہے

کسی کی یاد کو ہر دم بھلائے جاتا ہوں پھر بھی
کھٹکتی دل میں نوکِ خار سی محسوس ہوتی ہے

بیاباں کی کشش اب اے اڑیگی دل کے ذروں کو
کہ ہر ہر سانس پرواز فتگی محسوس ہوتی ہے

جہاں دل ضبطِ غم سے خون ہو جاتا ہے سینے میں
وہیں کچھ روح کو بالیدگی محسوس ہوتی ہے

اگر سینے میں دل رکھتے ہو تم تو آج بتلا دو
تمھیں بھی میری بیتابی کبھی محسوس ہوتی ہے

ہجومِ نامرادی سے یہ عقدہ کھل گیا آخر
جو ہوتی ہے تو غم میں زندگی محسوس ہوتی ہے

کوئی جینے کو سمجھے مایۂ عشرت بُرا کیا ہے
مجھے تو اک عبادت زندگی محسوس ہوتی ہے

غزل سے اے جگر اندازہ کر میری حقیقت کا
غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہے

طلوعِ ماہتاب

(انجم رضوانی)

وہ ہلکے ہلکے ابر ہیں
وہ سامنے پہاڑ پر
تجلیاتِ حسن ہیں کہ بارشیں ہیں نور کی
کہ اطلاع ہیں کسی حسین کے ظہور کی
کہ ہو رہی ہیں جلوہ پاشیاں چراغِ طور کی
وہ سامنے پہاڑ پر
وہ ہلکے ہلکے ابر ہیں
وہی وہ میرے روبرو
وہ ہولناک دشت ہیں
پہاڑ ہے کھڑا ہوا کہ نور کا مجسمہ
دلِ حزیں کے واسطے سرور کا مجسمہ

کہ سامنے نگاہ کے ہے طور کا مجسمہ
وہ ہولناک دشت ہیں
وہی وہ میرے روبرو

طلوعِ ماہتاب کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
نظر فریب کس قدر ہے اُف کرہ یہ نور کا
نظارہ سامنے کھنچا ہوا ہے کتنی دور کا
ہے خود پر اور کوہ پر گماں کلیم و طور کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
طلوعِ ماہتاب کا

صلاحِ کار

(خلیل اللہ قریشی)

یہ کیسی بے حسی چھائی ہوئی ہے آج محفل پر!!؟
یہ رندانِ بلاکش کس لئے خاموش ہیں ساقی!؟

سکوں کا دور ہے بیکیفیوں کی حکمرانی ہے
کہاں تک انتظارِ گردشِ مینا کریں ساقی؟

فضائیں مست۔ کہساروں پہ نشہ سا۔ جہاں بیخود
اور ایسے میں! ترے میخوار!! جور سے سہیں ساقی؟

نہ ہم بزدل سے بڑھتے حوصلوں کو پست ہونے دیں
نہ دیوانے کے "ضبطِ شوق" کا دعویٰ کریں ساقی

"سزا!" "عقبیٰ!" یہ سب اوہام باطل ہیں میرا ذمہ
یہ دوراز کار اندیشے ترے دشمن کریں ساقی

کہاں کی آبرو؟ کیسی خرد؟ سب غرقِ مے کر دیں
اُٹھیں۔ اُٹھ کر پئیں۔ پی کر گریں۔ گر کر پئیں ساقی

"شعوری کیفیت" تک جس نے سیکھی خود فراموشی
میری جانب وہی جھکی ہوئی نظریں اُٹھیں ساقی

زمانہ بھر میں لہرائیں علم جوش و مسرت کے
زمانہ بھر میں نالے ولوش کی دھومیں مچیں ساقی

اسرار

(نبی احمد بریلوی)

اعتبارِ محض یہ سارا جہاں پاتا ہوں میں　　اک فریبِ مستقل کون و مکاں پاتا ہوں میں
دہر کی ہر چیز کو وہم و گماں پاتا ہوں میں　　ذہنِ انسانی کو خلّاقِ جہاں پاتا ہوں میں
جو ودیعت کی گئی ہے سینۂ احساس میں　　وہ امانت اپنے سینے میں نہاں پاتا ہوں میں
کچھ خموشیہائے اُلفت کی نہ پوچھو لذّتیں　　دل ہی دل میں دل کو سرگرمِ فغاں پاتا ہوں میں
رہنے دو غرقِ مئے و مینا نہ چھیڑو دوستو　　اپنے کو کچھ برتر از سود و زیاں پاتا ہوں میں
سائے میں تاروں کے جب ہوتا ہوں پیمانہ بکف　　اس جہاں کے ذرّے ذرّے کو جواں پاتا ہوں میں
ہے خدا جانے کہاں تک اس تسلسل کا عمل،　　سارا عالم کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
علم و دانش سے کہیں کھلتے ہیں اسرارِ حیات　　ایک ذرّے کی حقیقت بھی کہاں پاتا ہوں میں،
مے پلا ساقی کہ ہیں عقل و خرد کی یورشیں　　اپنے کو پھر مبتلائے این و آں پاتا ہوں میں
یہ تصوّر ہے کسی کا یا وہ خود ہے، کیا خبر　　قلب کی گہرائیوں میں کچھ نہاں پاتا ہوں میں

تُرش روئی سے کسی سے جب کوئی کرتا ہے بات
اپنے دل پر اک عجب بارِ گراں پاتا ہوں میں

غزل : بہار کوٹی

بن گئی کافر نظر جزوِ رگِ جاں دیکھئے　　ٹوٹ ہی کر رہ گیا دل میں یہ پیکاں دیکھئے
ہر کلی شیشہ بکف ہر گل خمستاں در کنار　　پچھلی راتوں میں جمالِ شبنمستاں دیکھئے
اک نگاہِ فتنہ پرور اک ادائے برق پاش،　　مٹ نہ جائے کاہشِ زخمِ رگِ جاں دیکھئے
جاگ اُٹھا پھر درد پھر انگڑائیاں لیں شوق نے　　پھر پڑی دل پر نگاہِ فتنہ ساماں دیکھئے
دیکھنا ہی ہے اگر اندازِ استغنائے حسن　　اپنا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے

چن رہے ہیں دھجیاں وہ میرے دامن کی بہار
رنگ لایا ہے جنونِ فتنہ ساماں دیکھئے .

حادثہ

(انجم رضوانی)

بیندی نہ تھی پیشانیِ پر نورِ حسیں پر		تارا مری قسمت کا چمکتا تھا جبیں پر
بکھرا ہوا ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسم،		نکھرا ہوا سلجھا ہوا اندازِ تکلم،
اُٹھتی ہوئی چڑھتی ہوئی بھرپور جوانی		نشے میں جوانی کے وہ کچھ چور جوانی
رنگینیٔ گلزار وہ گالوں میں سمیٹے		تاریکیٔ شب زلف کے بالوں میں لپیٹے
آنچل کو سنبھالے ہوئے شرماتی لجاتی		ہر گام پہ سوتے ہوئے فتنوں کو جگاتی

دنیا کی تمنائیں کچلتی ہوئی گذری
تقدیر زمانے کی بدلتی ہوئی گذری

آنکھیں تھیں کہ تابندہ سرِ عرش کے تارے		تارے تھے کہ دو برق کے بیتاب شرارے
آنکھیں تھیں کہ دو جام مئے تند سے لبریز		پلکوں سے ٹپکتا ہوا اک کیف جنوں خیز
اللہ رے نگاہوں کا تصادم سرِ راہے		ناگاہ ہوئے ہوش و خرد گم سرِ راہے
وہ شوخ وہ گستاخ وہ بیباک نگاہیں		لبریزِ شرارت سے وہ چالاک نگاہیں
بجلی سی لرزتی ہوئی بیتاب نگاہیں		سرسبز جوانی کی وہ شاداب نگاہیں
اٹھیں بصد اندازِ تبسم سرِ راہے		اور مفت میں مارا گیا انجم سرِ راہے

اِس مرگِ حسیں کی کوئی فریاد نہیں ہے
فریاد کہ بیداد بھی بیداد نہیں ہے

میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی سوچئے

کہ کیا اس وقت ایک ایسے اخبار کی ضرورت نہیں ہے، جو صرف مسایل جنگ سے بحث کرے اور اعداد و شمار، نقشوں، کارٹونوں، تصویروں اور تحقیقی مقالوں کے ذریعہ سے ہر ہفتے لوگوں کو بتاتا رہے کہ جنگ کی موجودہ رفتار کیا ہے، آیندہ کیا کیا امکانات اس میں پوشیدہ ہیں اور ہم کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہئے

اگر آپ واقعی اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور کم از کم ایک روپیہ ماہوار اس پر صرف کر سکتے ہیں، تو فی الحال آپ اس تجویز کے معاونوں میں ایک کارڈ بھیجکر اپنا نام درج کرا لیجئے ——
(روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں) جس وقت دو سو ناموں کی فہرست پوری ہو جائے گی اسی وقت یہ اخبار جس کا نام "**جنگ**" ہوگا جاری کر دیا جائیگا اور آپ کو اپنا ماہوار چندہ بھیجنے کی زحمت دیجائے گی

آپ خود بھی غور کیجئے، اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے اور مجھے بتایئے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا

یہ اخبار میری ادارت میں شایع ہوگا اور زیادہ تر میرے ہی مقالات اس میں شایع ہوں گے۔ اس کا حجم ۱۶ صفحے اور سایز بڑا ہوگا

نیاز فتحپوری

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے شعرگاہ ایک درج ہیں۔ زبان قدرت بیان عالی تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی ادا بیلے ہی کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مقالے ایڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۲ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۷ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ ہے [illegible] کے تمام مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کا [illegible] خزانہ [illegible] آپ کے [illegible] ہے۔ قیمت مع محصول [illegible]

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

شمار ۴	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۴۰ء	جلد ۳۷

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳۷ | اپریل سنہ ۴۰ء | شمار ۴

ملاحظات

ہمارے سیاسی اجتماعات!

رام گڈھ میں کانگرس کا جلسہ بھی ختم ہوگیا، لاہور میں مسلم لیگ کا اجتماع بھی منتشر ہوگیا، فارورڈ بلاک کانفرنس بھی اپنی تجویزیں پیش کرچکی ـــــــ لیکن دنیا جہاں پہلے تھی اب بھی وہیں ہے اور ہندوستان، دور تذبذب و بے اعتمادی کی جس منزل سے گزر رہا تھا، ہنوز اسی جگہ ہے ـــــــ

ایک دفتر تدبیر و مصلحت پیش کیا گیا لیکن ایک ایسا دفتر جو اقدام عمل کی راہوں سے خالی تھا ـــ جرأت و مردانگی کے بڑے بڑے دعوے کئے گئے لیکن اس حال میں کہ دل گرمی سے اور دماغ عقل سے معرّا تھا ـــ آوازیں بلند ہوئیں لیکن ایسے صحرا میں جہاں ان کا سننے والا کوئی نہ تھا!

یہ تھا علے الترتیب ان تینوں سیاسی اجتماعات کا رنگ جن کا ذکر ابھی کیا گیا، لیکن آیئے اس اجمال کی تفصیل پر بھی اک سرسری نگاہ ڈال لیں

دفتر تدبیر و مصلحت

مولانا ابوالکلام آزاد نے صدر کانگرس کی حیثیت سے جو خطبہ دیا ہے وہ اپنے سنجیدہ لب ولہجہ اپنے مضبوط دلایل اور اپنے تجزیۂ تاریخی کے لحاظ سے یقیناً ایک ایسا پرخلوص لٹریچر ہے

جسے ہم ایک "دفتر تدبیر و مصلحت" تو ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن جس وقت ہم اس کے اوراق میں لائحۂ عمل کی جستجو کرتے ہیں تو ہمیں سخت ناکامی ہوتی ہے

مولانا آزاد نے جس اختصار و خوبی کے ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی اور برطانوی سامراج پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی سامراج کو چیلنج دیا ہے اس کے برمحل ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن علمی نقطۂ نظر سے مولانا آزاد کا یہ خطبہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ یہ بہت دل دکھا دینے والی بات ہے

مولانا، خطبہ کے اختتام پر ملک کو تین ہدایتیں کرتے ہیں - ایک اتحاد، دوسرے تنظیم، تیسرے گاندھی جی کی رہبری پر اعتمادِ کامل! اور چونکہ یہ تینوں باتیں ایک ہی سانس، ایک ہی فقرہ اور ایک ہی سلسلہ میں کہی گئی ہیں، اس لئے یہ تینوں ہدایتیں ملکر ایک ہی ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور مولانا اس پر راضی نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ہر ایک ہدایت پر علٰحدہ علٰحدہ غور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے معنے صرف یہ ہوتے ہیں کہ ملک کا اتحاد اور قوم کی تنظیم بھی بیکار ہے اگر اس مخصوص قیادت کو تسلیم نہ کیا جائے ــــ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب تک گاندھی جی کے "عصائے موسوی" کے پیچھے پیچھے قدم نہ اُٹھایا جائے ہم "بنی اسرائیل" کی نجات ممکن نہیں!

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا میں صرف اُصول و ضوابط نے کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ شخصیتوں ہی نے انقلاب پیدا کیا ہے، لیکن شخص پرستی کی یہ ارتجاعی شدت کہ کسی مخصوص فرد کی قیادت پر ایمان لانا ہی اُصول کار میں شامل کر لیا جائے، ایسی عجیب و غریب ذہنیت ہے جس کی تائید مولانا ابوالکلام ایسے آزاد انسان کی طرف سے بالکل گوسالۂ سامری کا معجزہ نظر آتا ہے اور جس پر جتنی حیرت بھی کی جائے کم ہے!

گاندھی جی کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کے خلوص و صداقت پر ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ عظمتوں کا اور نیتوں کے ساتھ صداقتوں کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے ــــ کل کا بڑا انسان آج چھوٹا ہے اگر اس نے وقت کا ساتھ نہ دیا اور آج کا چھوٹا انسان کل بڑا ہو سکتا ہے اگر وہ زمانہ کی نباضی کر سکتا ہے۔ پھر مجھے اس میں کلام ہے کہ گزشتہ بیس سال کے اندر دنیا اتنی آگے نہیں بڑھ گئی ہے کہ گاندھی جی کی ایک رُبع صدی قبل کی ذہنیت بدستور رہبری کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو، اور وقت کے تقاضہ کو شخصی اعتماد یا ذاتی اعتقاد کے سامنے یک لخت نظر انداز کر دیا جائے

اول تو گاندھی جی کا، کانگرس سے علٰحدہ رہنے کے باوجود کانگرس پر حکمرانی بجائے خود ایسی غیر آئینی بات ہے جس کا جواب نہ گاندھی جی دے سکتے ہیں نہ ارباب کانگرس، لیکن اگر اس بیسویں صدی میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی اجتماع سے علٰحدہ رہنے کے بعد بھی اسی اجتماع کا ایک فرد مانا جا سکتا ہے، یا اگر گاندھی جی کی ہستی کو تمام دنیاوی مصالح و تدابیر اور انسانی اُصول کار کی سطح سے بلند و برتر سمجھ لیا گیا ہے، تو بھی یہ بات مشکل سے یقین کی جا سکتی ہے کہ اگر آج تک

سالکنانِ ملاءِ اعلیٰ نوعِ انسانی کے مصائب کو دور نہیں کر سکے، تو اب گاندھی جی کی "فرشتہ خوئی" کیونکر ہمارے دُکھ درد کا علاج ہو سکتی ہے — اگر الہام کا دروازہ بدستور کھلا ہوا ہے تو ہم کو تاریخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ الہام محض سے کبھی دنیا کا انتظام نہیں ہو سکا !

گاندھی جی کا حقیقی مفہوم ہندوستان کی آزادی و جنگ آزادی سے کیا ہے۔ اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ شخص جو مکمل آزادی سے گھٹ کر مستعمراتی آزادی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، جو مستعمراتی آزادی کی طرف سے بھی مایوس ہو کر پھر آزادیِ کامل کا مطالبہ کرنے لگے، جو باوجود علمبردارِ حریت ہونے کے برطانوی دامن کا ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہ کرتا ہو، جو باوصف تمام ہندوستان کی نمایندگی کا دعوےٰ کرنے کے مذہبیت کی لعنت میں گرفتار ہو، جسے باایں ہمہ ادعائے رواداری دوسری قوموں کے جذبات کو صدمہ پہونچانے سے دریغ نہ آتا ہو اور جسکے ملہماتِ غیبی کا مولد و منشا، صرف چرخہ اور کھدر ہو —— اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کو غلامی کی لعنت سے آزاد کرا سکتا ہے، بنجر زمین میں تخم ریزی کرنا ہے اور ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس سال کانگرس نے صرف یہی کیا

کانگرس نے تو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر دیا کہ گاندھی جی کے ارشاد پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا ہی تنہا ذریعۂ نجات ہے، لیکن گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لئے پہلے چرخہ اور کھادی کی غلامی لازم ہے اس لئے سوال اب آزادی کا ہے نہ جنگ آزادی کا بلکہ صرف "ننھا کاتنے" کا اور ایک "کچے دھاگے" سے ملک کی قسمت وابستہ کر دینے کا !

اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک کی تمام آبادی کسی ایک بات پر متفق ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ بڑی بات نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی - چھوٹی جماعتیں ہی بڑھکر بڑی ہوئی ہیں اور جن آگوں نے قیصر و کسریٰ کے محلوں کو پھونک کر خاک کر دیا تھا وہ پہلے چنگاریاں ہی تھیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ سال جو حقیقتاً سب سے زیادہ سازگار سال تھا، کانگرس نے بالکل ضایع کر دیا اور نتیجہ کے لحاظ سے اس نے کوئی بات ایسی پیش نہیں کی جسے عملی اہمیت حاصل ہو

ہمیں یقین ہے کہ گاندھی جی پھر برطانوی حکومت سے مصالحت کی کوشش کریں گے اور اگر انھیں کسی غیر یقینی وعدہ کی بنا پر کوئی ہلکی سی توقع قایم کرنے کا موقعہ ملگیا تو وہ یہی مشورہ دیں گے کہ صوبوں میں کانگرسی جماعت پھر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیلے اور پھر وہی لوگ برسرِ اقتدار آجائیں جن کی آستینوں میں ہماسبھائی خنجر چھپے ہوئے ہیں اور جن کے نزدیک آزادیِ ہند کا مفہوم، برطانوی اقتدار کے سایہ میں ہندو راج سے زیادہ کچھ نہیں

سفیہانہ مطالبات

لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی اپنے اجتماع کے لحاظ سے بہت شاندار رہا اور اس میں بھی کانگرس کی طرح ایک ہی رزولیوشن پیش کیا گیا، لیکن فرق یہ ہے کہ کانگرس کے رزولیوشن میں عمل کا فقدان تھا اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میں عمل بعقل دونوں کا، مطالبہ دونوں جگہ

آزادی کا تھا، لیکن وہاں شخصیت پرستی میں تبدیل ہوگیا اور یہاں واہمہ پرستی میں - وہاں جرخہ اُسے کھا گیا اور یہاں اقلیت کا خوف!

مسلم لیگ کے اس یادگار رزولیوشن میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ وفاقی حکومت کے خیال کو بالکل ترک کردیا جائے، دوسرے یہ کہ جس وقت آئین جاریہ پر نظر ثانی کیجائے تو یہ سمجھ کر کیجائے کہ مسلمان کبھی اسے قبول نہ کریں گے اگر ان کے مشورہ و منظوری کے بغیر اسے نافذ کیا گیا اور تیسرے یہ کہ صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب اور صوبۂ بنگال کو (جہاں مسلم اکثریت ہے) علٰحدہ علٰحدہ آزاد و خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے اور دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کی قومی، مذہبی و اقتصادی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لیجائے

اس رزولیوشن کا اہمال اتنا کھلا ہوا ہے کہ معمولی دماغ کا انسان بھی اس کو کسی صحیح الدماغ انسان کا نتیجۂ فکر قرار نہیں دیسکتا۔ اگر بنگال و پنجاب کو علٰحدہ علٰحدہ خود مختار مسلم حکومت تسلیم کرلیا گیا تو جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے انھیں بھی خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح نصف سے زیادہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیگا۔ تو کیا مسلم لیگ اس مفاہمت پر راضی ہے کہ اگر نصف سے کم مسلمان اپنی جان بچاسکتے ہیں تو باقی نصف سے زیادہ مسلمانوں کو وہ جہنم میں ڈالنے پر راضی ہو جائے گی اور کیا اس مطالبہ کی بناء پر وہ تمام اسلامی ہند کی نمایندہ ہونے کا دعوے کرتی ہے - لیکن اگر یہ کہا جائے کہ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کی شرط ہی اس لئے لگائی ہے کہ ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر جبر و ظلم نہ ہوسکے تو پھر اس صورت میں خود مختار مسلم حکومتوں کا سوال بھی بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے کیونکہ اس طرح برطانوی اثر و اقتدار بدستور قایم رہے گا اور صورت بدستور وہی رہیگی جو اسوقت پائی جاتی ہے

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ رزولیوشن سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اقلیت کہنا صحیح نہیں - وہ ایک قوم ہے اور ایسی قوم جو تلوار سے فیصلہ کرنے سے کبھی نہیں ڈرتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ معاملہ کا انحصار رایوں پر ہے، اس لئے اگر کانگرس نے کانگرسی مسلمانوں کی رائے پر عمل کیا تو "سول وار" ہوجانا یقینی ہے - یہ ہے تقریر اُس شخص کی جو حکومت یو۔پی کے صدر مقام میں میونسپلٹی کا بڑا قانون داں چیرمین ہے، لیکن وہ یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ اس کے اس ایک جملہ میں کتنی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں

ایک طرف تو وہ تلوار کے ذریعہ سے فیصلہ کرنے پر طیار نظر آتا ہے اور دوسری طرف سول وار سے بھی ڈرتا ہے تو کیا "سول وار" کا تعلق کسی ایسی تلوار سے ہے جس کا بوجھ چودھری صاحب کی نازک کلائی برداشت نہیں کرسکتی۔ یا "سول وار" سے مراد صرف گالی گلوچ ہے - پھر اگر صورت، وہ ہے تو تلوار کا نام بھی ان کو زبان پر نہ لانا چاہئے اور

اگر صورت دوسری ہے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ اس باب میں کانگرسیوں سے زیادہ مشاق ہیں اور مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سب و شتم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے!

اس میں شک نہیں کہ کانگرس نے متعدد غلطیاں کی ہیں، سب سے پہلی اور بڑی غلطی تو یہ تھی کہ اس نے وزارتوں کے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری اتنی ہی نامعقول غلطی یہ تھی کہ وزارتوں پر مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والوں کو قابض ہو جانے دیا۔ پہلی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ملوکیت پھر ایک ربع صدی کے لئے اپنی جگہ مطمئن ہو گئی اور دوسری غلطی نے مسلمانوں کو کانگرس سے بالکل متنفر کر کے مسلم لیگ کے مُردہ جسم میں پھر جان ڈالدی

یقیناً مسلمانوں کو اپنے قومی تحفظ کے لئے منظم ہو جانا چاہئے، لیکن اگر یہ تنظیم غیر وطنی جذبات پر قایم ہوتی ہے تو اس سے انتشار ہی بدرجہا بہتر ہے اور میں مسلم لیگ کا صرف اسی لئے مخالف ہوں کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان اور ہندوستانی آبادی سے علٰحدہ رکھنا چاہتی ہے اور ہندوؤں کی اکثریت سے ڈر کر وہ ایسے بزدلانہ طریقوں سے کام لینا چاہتی ہے جو مسلمانوں کی روایات تاریخی کے بالکل منافی ہیں

مسلم لیگ کا یہ رزولیوشن، بہ الفاظ دیگر گویا قیام "پاکستان" کی تحریک ہے، جس میں قومی آزادی کی جدوجہد برطانوی سامراج کے سامنے دستِ سوال پھیلانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ اس نے بھیک مانگنے کا نام آزادی قرار دیا ہو

صدابہ صحرا

فارورڈ بلاک کانفرنس میں بھی حقیقتاً ایک ہی رزولیوشن پیش کیا گیا جس میں آیندہ معرکہ سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اب انتظار کا وقت ختم ہو گیا ہے اور جنگ آزادی کو ۶ر اپریل سے شروع ہو جانا چاہئے

اس قرارداد میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ جنگ شروع کرنے کے بعد بیچ میں راستہ میں دم نہ لینا چاہئے اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ سنہ ۳۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر کے اختیار کیا گیا تھا

میں اس کو صدابہ صحرا کہتا ہوں کیونکہ "گاندھی گردی" میں اس پامردی کو کون پوچھتا ہے

جنگ کے آیندہ امکانات

جیسا کہ خیال تھا، بہار کے شروع ہوتے ہی فنلینڈ کا قصہ ختم ہو گیا اور روس فنستان کے شمالی، مشرقی و جنوبی علاقہ پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ فن لینڈ کی شکست ایک تسلیم شدہ مسئلہ تھا، لیکن اتنی دیر صرف شدت سرما کی وجہ سے ہوئی جس نے یہاں کے علاقہ کو روسی افواج کے لئے ناقابل گزر بنا دیا تھا۔ بہرحال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب سوال یہ ہے کہ آیندہ نقشۂ جنگ کیا ہوگا

اس سے قبل جنگ کے تین محاذ خیال میں آتے تھے، ایک سرزمین بلقان، دوسرے سویڈن و ناروے، تیسرے ہالینڈ و بلجیم اور گمان تھا کہ جس وقت روس، فنلینڈ کی طرف سے فارغ ہو جائے گا تو ان محاذوں میں سے کوئی ایک محاذ ضرور متعین ہو جائے گا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور جو صبر آزما انتظار پہلے تھا وہی اب بھی باقی ہے اور دنیا کی دماغی اُلجھن و اعصابی کشمکش برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے

اس دوران میں ہٹلر اور مسولینی کی ملاقات نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جرمنی کے مقابلہ میں اتحادئیں کی یہ دوسری سیاسی شکست ہے۔ اس سے پہلے دنیا نے سمجھ لیا تھا کہ شاید مسولینی و ہٹلر کا اتحاد ختم ہو گیا ہے، لیکن ان دونوں کی آخری ملاقات نے اس کی پوری طرح تردید کر دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ سرزمین بلقان میں جنگ چھڑنے کا بہت کم امکان رہ گیا ہے

جرمنی اور روس کی طرف سے رومانیا کی آزادی کو قائم رکھنے کے معنے یہی ہیں کہ جرمنی یہاں لڑائی چھیڑ کر اپنے اس سرمایہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا جو کروروں پونڈ کی مقدار میں ریاستہائے بلقان کے اندر پھیلا ہوا ہے اور نہ اپنے اُن تجارتی و صنعتی فواید کو نقصان پہونچانا مناسب سمجھتا ہے جو بلقان سے صرف امن ہی کی صورت میں حاصل کئے جا سکتے ہیں

سویڈن و ناروے کی طرف کسی جنگ کا امکان تو نہیں ہے، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ جرمنی سویڈن کے بعض ساحلی مقامات کا مطالبہ کرے اور سویڈن بغیر جنگ کئے اسے دیدے، کیونکہ وہ پولستان و فنستان کا حشر دیکھ چکا ہے، علاوہ اس کے یوں بھی ہمیشہ سے اس کا رجحان جرمنی کی طرف رہا ہے اور وہاں کی حکومت جرمنی سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی

ہالینڈ و بلجیم البتہ ابھی تک خطرہ میں ہیں اور ہٹلر کئی بار ان پر حملہ کرتے کرتے رہ گیا ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان پر حملہ کرے گا یا نہیں اور کرے گا تو کب تک۔ لیکن روس کی شرکت نے چونکہ اس جنگ کو مشرق کے لئے بھی ایک حد تک خطرہ سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اگر ان خبروں پر اعتماد کیا جائے جو سرحد ایران پر روسی افواج کے اجتماع کے متعلق آئی تھیں، تو ایران کے ساتھ ہی ہندوستان تک اس آگ کی لپٹ کا پہونچ جانا ناممکن نہیں ہے۔ اول تو روس و ایران سے حال ہی میں ایک تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے، اس لئے اگر روس نے مشرق کا رُخ کیا تو ایران اس کا مزاحم نہ ہوگا اور اگر ہوا تو وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لا سکیگا، کیونکہ ایران کی فوجی حالت خراب ہے۔ اور میثاق سعد آباد کی رو سے افغانستان، ترکی و عراق کا اس کی مدد کرنا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ترکی اور عراق و ایران کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں اور ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ ترکی کا روپیہ ایران میں چل سکتا ہے، نہ ایران کا ترکی و عراق میں اور ان کے درمیان آپس میں کوئی تعاون نہیں پایا جاتا

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کا ایک مقصود تو اس جنگ سے یہ ہے کہ آرکٹک سے لیکر باسفورس تک اور رھائن سے لیکر ولاڈی واسٹک تک پھیلے ہوئے اقتصادی و تجارتی اثرات برطانیہ کے ختم کردے، دوسرا مقصود اسی کے ساتھ یہ ہے کہ مشرقِ ادنیٰ میں تمام برطانوی فوجی مستقروں کو تباہ کردے اور تیسرا مدعا یہ ہے کہ فرانس کو برطانیہ سے علحدہ کرکے غیر جانبدار رہنے پر مجبور کردے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ نے بھی اپنی جگہ یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ پولستان اور زیکوسلوویکیا کو دوبارہ زندہ کرکے نازی حکومت کے زور کو توڑنا ہے

اس لئے اس جنگ کے جلد ختم ہونے کے آثار نہیں ہیں، کیونکہ باوجود اس عزم بلند کے فریقین میں سے کسی نے اقدام کی جرأت نہیں کی ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ گھات میں لگے ہوئے ہیں

برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی کو صرف اپنی ناکہ بندی سے بیدست وپا کر دینا چاہتا ہے اور فوجکشی کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ فرانس کی پالیسی اس باب میں زیادہ تیز ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اگر جرمنی حملہ نہیں کرتا تو خود ہی حملہ کر دینا چاہئے، لیکن برطانیہ اس کے لئے آمادہ نہیں۔ دوسری طرف جرمنی کی اقتصادی حالت بھی ایسی خراب نہیں کہ برطانوی ناکہ بندی اس کو جلد سر جھکا دینے پر مجبور کرسکے۔ اول تو اس کے یہاں خود خام اشیاء کا ذخیرہ بہت کافی موجود ہے، علاوہ اس کے روس و بلقان کی طرف سے تمام اشیاء کی درآمد بدستور جاری ہے اور ناکہ بندی کی دسترس سے باہر ہے۔ اب فنستان پر روس کے اقتدار نے جرمنی کے ذرایع کو زیادہ وسیع کردیا ہے

الغرض اسوقت تک جنگ نے جرمنی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ فایدہ ہی میں ہے، برطانیہ کو اس وقت تک فایدہ کوئی نہیں ہوا اور نہ اس کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا موقف ہی مدافعانہ ہے۔ البتہ اگر مشرقِ ادنیٰ میں جنگ شروع ہوگئی یا ہندوستان پر حملہ کا خطرہ پیدا ہوا، تو برطانیہ کو اپنی موجودہ جنگی تدابیر میں تغیر کرنا پڑے گا اور اس کی تمام وہ بحری، بری و فضائی قوت جو جبرالٹر، بحر روم، اسکندریہ، عدن، خلیج فارس عراق، فلسطین اور بحر ہند میں پھیلی ہوئی ہے حرکت میں آجائے گی کیونکہ ۱۹۰۳ء میں لارڈ لینسڈون دار الامراء میں مشرق کے متعلق برطانوی پالیسی متعین کرچکے ہیں کہ خلیج فارس یا اس کے آس پاس برطانیہ کسی اور حکومت کا اقتدار دیکھ ہی نہیں سکتا جس کی تائید ۱۹۰۶ء میں سر ایڈورڈ گرے کی طرف سے بھی ہوچکی ہے

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ہٹلر نے مسولینی سے ملنے کے بعد صلح کی چند شرطیں پیش کی ہیں جن میں پولینڈ اور زیکوسلوویکیا کو بیس پچیس سال کے اندر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن جرمنی کی طرف سے اسکی تردید ہوچکی ہے اور اگر یہ تردید صحیح ہے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ اتحادیئین غالباً ان شرایط پر صلح کرنے کے لئے طیار ہیں اور انھیں جرمنی سے منسوب کرکے نازی حکومت کا منشار معلوم کرنا چاہتے ہیں ـــ اگر یہ خیال صحیح ہے اور واقعی جرمنی نے کسی وقت ان اصول پر صلح کا ارادہ ظاہر کیا تو اتحادیئین اسے منظور کرلیں گے۔ لیکن ابھی تک یہ تمام باتیں ظن و قیاس کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگ تیقنات اور تعینات کی حدود میں کب تک آئے گی۔

ازمیات Isms

(چند سیاسی اصطلاحیں)

پچھلے مہینے ایک صاحب کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے ایک فہرست ان سیاسی اصطلاحات کی پیش کی تھی جو انگریزی میں ازم (ism) پر ختم ہوتی ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ نگار میں ان سب پر روشنی ڈالی جائے گی چونکہ جنگ کی وجہ سے اسوقت بہت سے لوگوں کو سیاسیات کی طرف توجہ ہوگئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مزید تعویق کے اس سلسلہ کو شروع کر دینا مناسب ہے

ہوسکتا ہے کہ ازمیات کے ختم ہونے کے بعد اور سیاسی اصطلاحات بھی پیش کئے جائیں جن سے ہمیں روز مطالعۂ اخبار میں واسطہ پڑتا ہے

فہرست چونکہ پچھلے مہینے دیجا چکی ہے اس لئے اس کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان اصطلاحوں کو ردیف وار پیش کروں گا، لیکن انگریزی حروف ہجا کے لحاظ سے اور ہر ممکن اختصار کے ساتھ تاکہ فرہنگ سے بڑھکر یہ علمی تالیف کی صورت نہ اختیار کرے۔ ان اصطلاحوں کا مفہوم زیادہ تر والٹر تھیم کے تصریحات کو سامنے رکھکر متعین کیا گیا ہے

ا۔ Absolutism (استبدادیت) :۔

وہ طریق حکومت ہے، جس کے لئے کوئی آئینی یا قانونی حد نہ مقرر ہو۔ اس نظام حکومت میں جمہور کی نمایندگی بالکل نہیں ہوتی، یعنی نہ اُن کی رائے کو دخل ہوتا ہے، نہ وہ نظم ونسق میں کوئی حصہ لے سکتے ہیں

سولھویں اور سترھویں صدی کی استبدادی حکومتیں، گو مطلق العنان حکومتیں تھیں، لیکن ان کی قوت کا راز امراء و شرفاء کی مدد میں پنہاں تھا۔ اور اگر عوام پر کسی طبقہ یا فرد کی طرف سے کوئی ظلم ہوتا تھا تو ان کی فریاد بھی سنی جاتی تھی اور انصاف بھی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جب جمہور کے جذبات آزادی اور حقوق شاہی کے درمیان تصادم ہوا تو پھر رفتہ رفتہ استبدادیت کا وہ مفہوم قرار پایا جو آج کل آمرانہ حکومتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے جرمنی اور اٹلی۔

۲- Activism (عملیت):-

سیاسی جماعتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو صرف پروگرام بنایا کرتی ہیں اور عمل کی جرأت نہیں کرتیں، دوسری وہ جن کا مقصود صرف عملی اقدام ہے۔ انھیں لوگوں کا نظریہ عملیت کہلاتا ہے

۳- Anarchism (فوضویت)

اس سے مراد کسی حکومت کا نہ ہونا ہے بلکہ صرف ایک ایسی سوسائٹی کا قیام جو قوانین حکومت سے بے نیاز ہو۔ اس نظریہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ حکومت کی ہر قسم (ملوکیت، جمہوریت، جمہوری اشتراکیت) بُری ہے اور ظلم و استبداد کا سبب۔ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے قانون، فوج، پولیس، قید خانے وغیرہ سب مٹ جائیں اور سوسائٹی کا نظام صرف آپس کے معاہدوں پر قایم ہو

اس نظریہ کے بڑے بڑے علمبردار یہ تھے:-

(۱) ولیم گاڈون (William Godwin ۱۷۵۶ء - ۱۸۳۶ء)۔

یہ انگریز تھا اور حکومت و سرمایہ داری کا سخت مخالف تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی حکومت کے صرف سوسائٹیاں قایم ہوجائیں اور سوائے ضروری ملکیت کے کوئی اور سرمایہ کسی کے پاس نہ رہے۔ یہ کہتا تھا کہ صرف انصاف و اخلاق کی تبلیغ سے ہمیں امن پسند سوسائٹیاں پیدا کرنا چاہئے تاکہ کسی حکومت کی ضرورت دنیا میں باقی نہ رہے۔

(۲) میکس اسٹرنر (Max Stirner- ۱۸۰۶ء - ۱۸۵۶ء)

یہ جرمنی تھا اور معلمی کا پیشہ کرتا تھا۔ یہ فلسفۂ خودی کا بڑا زبردست علمبردار تھا، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں خودی و انفرادیت کو سوسائٹی سے زیادہ اہم ثابت کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اخلاق و اخلاقیات مہمل چیزیں ہیں اور کسی مقصد کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اچھا ہے یا بُرا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں خود اپنا مقصد ہوں اور میں نہ اچھا ہوں نہ بُرا۔

(۳) پیری جوزف پروڈھن (Pierre Joseph Proudhan ۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء)۔

یہ فرانس کا باشندہ تھا اور مزدوروں کا لیڈر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ہے "ملکیت کیا ہے" اور آخر میں ثابت کیا کہ "ملکیت چوری ہے"

اس کے بعد اس کی مخالفت صرف بڑے بڑے صاحبان ملکیت تک محدود ہوگئی اور چھوٹی چھوٹی ملکیتوں کی طرفداری کرنے لگا۔ وہ سکّہ کے رواج اور سود کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ضروریات انسانی صرف اشیاء کے باہمی تبادلہ سے پوری ہونا چاہئے، جو بینکوں کے ذریعہ سے ممکن العمل ہے۔ آخر عمر میں وہ فوضویت ترک کرکے وفاقی (Federalism) طرز کی حکومت کا قایل ہوگیا۔

(۴) میکائیل باکونن (Michael Bakunin) ۱۸۱۴ء - ۱۸۷۶ء

یہ روس کا نہایت مشہور انقلاب پسند فوضوی (انارکسٹ) تھا اس نے ایک آزاد غیر مرکزی اشتراکیت کو رواج دیا جو کارل مارکس کے نظریۂ "حکومتِ اشتراکی" کے خلاف تھی یعنی کارل مارکس تو یہ کہتا تھا کہ تمام ملکیت حکومت کے سپرد کر دینا چاہئے، لیکن باکونن کہتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں کے سپرد ہونا چاہئے جو باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے توازن کو قایم رکھیں، یہ پارلمانی (Parliamentary) طریق حکومت کو غیر مفید بتاتا تھا اور اس کا نعرۂ عمل تھا:-

فوضویت - اجتماعیت اور لامذہبیت (Anarchism, Collectivism, Atheism)

اس نے اپنے اطالوی، ہسپانوی اور روسی مقلدین کی ایک بین الاقوامی انجمن ۱۸۶۸ء میں قایم کی لیکن متبعین مارکس نے اس کی سخت مخالفت کی اور ۱۸۷۲ء میں یہ انجمن ٹوٹ گئی - اس کے بعد بیس سال تک فوضویوں نے بڑا ہنگامہ برپا کیا اور باکونن کے نائب نشایف (Netchayeff) نے قتل و خون کے ذریعہ سے فوضویت کو پھیلانا چاہا، چنانچہ روس کا زار اسکندر - اٹلی کا بادشاہ ہمبرٹ (Hamburt) - فرانس کا صدر کارنو (Carnot) آسٹریا کی ملکہ الزبتھ، اور امریکہ کا پریسیڈنٹ میک کنلی (MacKinley) سب انھیں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے

امریکہ میں فوضویت کے علمبردار بنجامن ٹکر (Benjamin Tucker) اور جان موسٹ (Johann Most) آخر الذکر جرمنی کا اشتراکی تھا - امریکہ کے فوضویوں نے ۱۸۸۳ء میں اپنی کانگرس منعقد کی لیکن ۱۸۸۶ء میں اس تحریک کو دبا دیا گیا اور ۱۸۹۱ء سے قانوناً ممنوع قرار دی گئی یہاں تک کہ اب کوئی شخص سرزمین امریکہ میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ یہ اقرار نامہ داخل نہ کرے کہ وہ فوضوی خیال کا نہیں ہے -

(۵) پیٹر کروپٹکن (Peter Kropotkin) ۱۸۴۲ء - ۱۹۲۱ء -

روس کا ماہر جغرافیہ تھا، اسنے "اشتمالی فوضویت" (Communist Anarchism) کو رواج دیا - چونکہ بڑے بڑے صنعتی ادارے فوضویت کے رواج میں حایل تھے اس لئے اس نے سب سے پہلے انھیں کی مخالفت کی اور کہا کہ صنعتی پیداوار چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں کے ذریعہ سے ہونا چاہئے اور ملکیت کو چھوٹے چھوٹے اداروں میں تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے ممبروں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے ذمہ دار رہیں وہ تقسیم محنت و عمل کا بھی مخالف تھا اور اجرت کی تعیین کا بھی - وہ کہتا تھا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اجرت ملنا چاہئے اور چار یا پانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کسی سے کام نہ لینا چاہئے -

آخر میں یہ بہت اعتدال پسند ہوگیا تھا، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں وہ اتحادیئن کا موافق تھا اور جب ۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب ہوا تو یہاں آگیا اور کرنسکی (Kerensky) کا طرفدار ہوگیا۔ اس کے بعد جب روس میں اشتمالیت پسندوں (Communists) کا غلبہ ہوا تو اس نے پرولتاری (مزدور پیشہ لوگوں کے) اقتدار کی مخالفت شروع کی اور یہیں ۲۱ء تک رہا

(۶) ٹالسٹائی (Count Leo Tolstoy) سنہ ۱۸۲۸ء تا ۱۹۱۰ء

یہ مشہور روسی مصنف تھا اور اس کی نوضویت کا رجحان زیادہ تر مذہب کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت و قانون کا جوڑ مذہب کے ساتھ کوئی ہئی نہیں۔ اور بجائے قانون کے وہ محبت کی حکومت کا قایل تھا۔ وہ امن پسندانہ عدم تعاون کا قایل تھا (جسے بعد کو گاندھی جی نے اختیار کیا)۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ فوجی ملازمت ترک کردیں، ٹیکس نہ ادا کریں، عدالتوں کو تسلیم نہ کریں تاکہ نظام حکومت از خود ٹوٹ جائے۔

۴۔ Anti Semitism (ضد سامیت) :- یہودیوں کے خلاف جو تحریک قایم ہے اسے اس نام سے پکارتے ہیں۔ پہلے یہ مخالفت یہودی مذہب سے تھی لیکن اب یہودی قوم سے ہے۔ نازی جرمنی اب اس تحریک کا مرکز ہے۔ اس سے پہلے روس میں بھی یہ تحریک پائی جاتی تھی لیکن ۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے ختم ہوگئی ہے۔

اس تحریک کا آغاز اُنیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے جب آرین یا نارڈک (Nordic) قوموں کی برتری کا نظریہ پیش کیا گیا (جس پر آئندہ دیگر سیاسی اصطلاحات کے سلسلہ میں روشنی ڈالی جائے گی) یہودیوں کے خلاف اس تحریک کا سبب زیادہ تر اقتصادی ہے۔ چونکہ یہودی قوم نے صنعت و حرفت اور تجارت میں غیر معمولی ترقی کرکے ایک بہت بڑی سرمایہ دار جماعت کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور سیاسیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے یورپ کی بعض یہودی قومیں ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جرمنی میں ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔

۵۔ Bolshevism (بالشویزم)۔ کمیونزم کا دوسرا نام ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں روس کی سوشل ڈیماکریٹک پارٹی دو جماعتوں میں منقسم ہوگئی تو انتہا پسند جماعت نے جس کا لیڈر لینن تھا کثرت رائے سے اقتدار حاصل کرلیا اور چونکہ اکثریت کو روسی زبان میں بالشنسٹو (Bolshenstoo) کہتے ہیں اسلئے اس جماعت کے لوگوں کو بالشیوکی (Bolsheviki) یعنی افرادِ اکثریت اور دوسری اعتدال پسند جماعت منشیوکی Menshiviki یعنی افرادِ اقلیت کہنے لگے۔

۶۔ Caesarism (قیصریت) - یہ اصطلاح، جولیس قیصر

(Julius Caesar) کے وقت کی یادگار ہے۔ یہ روم کا مشہور ڈکٹیٹر تھا۔ اس سے مراد فوج یا اہلِ سیاست میں سے بڑے بڑے لوگوں کی حکومت ہے اور جمہوریت کی ضد۔ اس زمانہ کی ڈکٹیٹری حکومتیں قیصریت ہی کی قسمیں ہیں۔

۷۔ Capitalism (راس المالیت) - اس کو سرمایہ داری بھی کہتے ہیں اور متاعیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد وہ اقتصادی نظام ہے جس کے تحت دولت کی پیداوار اور تقسیم پرائویٹ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے لوگوں کو سرمایہ دار کہتے ہیں اور ان کی کاروبار میں لگی ہوئی دولت جس سے بڑا نفع حاصل کرتے ہیں سرمایہ کہلاتی ہے اس کی ضد اشتراکیت (Socialism) ہے جو سرمایہ داری کے نظام کو مٹا کر دولت کو جمہور میں برابر برابر تقسیم کر دینا چاہتی ہے، تاکہ انفرادی فایدہ کے بجائے وہ پبلک مفاد کی صورت اختیار کرے۔

۸۔ Centralism (مرکزیت) - ایک سیاسی نظام ہے جس کی رو سے تمام سلطنت کا انتظام ایک خاص مرکز سے متعلق ہوتا ہے یہ اس وفاقی حکومت کی ضد ہے، جس میں ملک کے صوبوں کو اختیارات کلی دیدئے جاتے ہیں۔

۹۔ Chauvinism (شاونیت) پنولین اول کے ایک نہایت جوشیلے سردار کا نام شاون (Chauvin) تھا یہ اصطلاح اسی کے نام سے نکلی ہے جس سے مراد کسی خاص مقصد یا قومیت پرستی کی انتہائی طرفداری کرنا ہے۔

۱۰۔ Clericalism (کلیسائیت) کیتھولک مذہب والوں کی سیاسی تحریک کو اس نام سے منسوب کرتے ہیں۔

۱۱۔ Collectivism (اجتماعیت) - ان تمام اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا نام ہے جو آپس میں اتحادِ عمل اور مرکزیت کے ساتھ کام کریں۔

۱۲۔ Communism (اشتمالیت) - اس کی صراحت پچھلے مہینے ہو چکی ہے۔

۱۳۔ Fascism (فسطائیت) - اٹلی کی قومی تحریک ہے جس کو ۱۹۱۹ء میں مسولینی نے جاری کیا۔ اس کا ماخذ اطالوی لفظ (Fascio) ہے جس کے معنے ہیں لکڑیوں کے گٹھے، قدیم روم میں حاکم اعلےٰ کے آگے آگے لکڑیوں کا گٹھا اور کلہاڑی اظہار شان کے لئے لیکر چلتے تھے۔

فسطائی نظام حکومت، اشتمالیت اور پارلیمانی حکومت کا ضد ہے۔ یہ نہ سرمایہ دارانہ حکومت ہے نہ اشتراکی۔ یہ ذاتی ملکیت کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن اسے حکومت کے اقتدار میں رکھنا چاہتی ہے۔ تجارتی اور صنعتی ادارے سب فسطائی حکومت کے زیر اثر ہیں۔

اٹلی میں اسوقت صرف یہی ایک سیاسی پارٹی ہے جس کے ممبر مسولینی کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ سیاہ قمیص پہنتے

ہیں اور قدیم اہلِ رومہ کی طرح اوپر ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے ہیں۔ فسطائی تنظیم بالکل فوجی تنظیم ہے اور اس کا مقصود قدیم رومہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنا ہے۔ یہ جمہوریت کے بھی خلاف ہیں اور لبرل حکومت کے بھی۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے فوجی تعلیم لازم ہے اور ۱۸ سال کی عمر میں ہر نوجوان فسطائی جماعت کا ممبر ہو جاتا ہے۔ یہاں شاہنشاہیت قایم رکھی گئی ہے، لیکن برائے نام۔ تمام انتظامات فسطائی کونسلِ عظمٰی کے سپرد ہیں جسے مسولینی نے مقرر کیا ہے۔ اس کونسل کو مسولینی کا جانشین نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ کیتھولک مذہب کے اقتدار کو یہاں دوبارہ قایم کیا گیا ہے اور سنہ ۳۸ء سے یہودیوں کے خلاف بھی تحریک شروع ہوگئی۔

۱۴۔ Feudalism **(اقطاعیت)**۔ اس سے مراد یورپ کا وہ نظامِ حکومت ہے جو انقلابِ فرانس تک پایا جاتا تھا۔ اس سے مراد جاگیرداروں اور امراء کی حکومت ہے۔ یعنی بادشاہ کے یہاں انھیں لوگوں کا اثر ہوتا تھا اور یہی سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کے پاس فوج بھی ہوتی تھی اور حکومت کے مختلف عہدے بھی انھیں کے قبضہ میں ہوتے تھے۔

۱۵۔ Guild Socialism **(گلڈ اشتراکیت)**۔ گلڈ قرونِ وسطٰی میں اس ٹاؤن ہال کو کہتے تھے جہاں جلسے ہوا کرتے تھے۔ گلڈ اشتراکیت سے مراد وہ تحریک ہے جو سنہ ۱۹۰۶ء میں عہدِ وسطیٰ کے گلڈ کے نظامِ حکومت کو موجودہ ترقی یافتہ اُصولِ حکومت کے ساتھ ملانے کے لئے جاری ہوئی تھی، اس سے مقصود یہ تھا کہ حکومت کو مختلف تجارتی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت اپنی جدا کونسل مقرر کرے۔ یہ تحریک اس اشتراکیت کے خلاف تھی جس میں صنعت و حرفت حکومت کے زیرِ اثر مانی جاتی تھی۔

سنہ ۱۵ء میں ان کی ایک لیگ قومی گلڈ لیگ کے نام سے قایم کی گئی اور سنہ ۲۰ء میں ان کی کونسل مرتب ہوئی جس نے بڑے وسیع پیمانے پر جدید عمارتوں کے بنانے کا انتظام شروع کیا، لیکن یہ کام نہ چل سکا اور سنہ ۲۵ء میں یہ تحریک ختم ہوگئی۔

۱۶۔ Imperialism **(ملوکیت)**۔ جس حد تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے، ملوکیت سے مراد برطانیہ کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے مقبوضات برطانیہ کے درمیان تعلقات استوار کر کے ان کو سیاسی حیثیت سے انگلستان کا تابع قرار دیا گیا تھا اور جدید مقبوضات حاصل کر کے سلطنت کو اور وسیع کیا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۸ء تک اسی پر عملدرآمد ہوا، لیکن اس کے بعد اس تحریک کو نظرانداز کر دیا گیا۔

زیادہ وسیع معنے میں ملوکیت سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک فتح کر کے سلطنتوں کو وسیع کیا جائے۔ موجودہ ملوکیت کی ابتداء اُنیسویں صدی میں ہوتی ہے اور انھیں مختلف ملوکیت پسند حکومتوں کا تصادم جنگ عظیم کا باعث ہوا، اس ملوکیت میں خصوصیت کے ساتھ انھوں نے زیادہ حصہ لیا، جن کی تجارتی و صنعتی ترقیاں حال ہی میں ہوئی تھیں

(مثلاً جرمنی، اٹلی اور جاپان) اور دوسری بڑی سلطنتوں سے اس لئے خفا تھیں کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے اندر تقسیم کر رکھا ہے - چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے زیر اثر جاپان نے سنہ ۳۲ء میں چین پر حملہ کیا، اٹلی نے سنہ ۳۵ء میں حبشہ پر حملہ کیا اور جرمنی نے آسٹریا، زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر قبضہ کر لیا -

ملوکیت فی الحقیقت وہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے جو تجارت وصنعت کی ترقی کے سلسلہ میں مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے اور دولت کو ایک محدود جماعت کے لئے وقف کر دیتا ہے - عوام اور مزدوری پیشہ لوگوں کو اس سے کوئی فایدہ نہیں پہونچتا اور نہ تمدنی حیثیت سے نیچے درجے کے لوگ ترقی کر سکتے ہیں - موجودہ آمرانہ حکومتیں بھی، ملوکیت ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو جدا جدا ترکیبوں سے سرمایہ دارانہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں -

۱۷ - Isolationism (اجتنابیت) امریکہ کی ایک مخصوص سیاسی جماعت کا یہ نظریہ کہ یوروپ کے معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے - موجودہ لڑائی سے پہلے برطانیہ میں بھی کچھ لوگ اس خیال کے پائے جاتے تھے -

۱۸ - Marxism (مارکسیت) - اس سے مراد کارل مارکس کے نظریے ہیں - کارل مارکس سنہ ۱۸۱۸ء میں جرمن میں بمقام ٹریبن (Treves) پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۸۳ء میں لندن میں مرا - یہ یہودی تھا اور تعلیم پانے کے بعد اخبار نویسی کا پیشہ کرنے لگا تھا - اس کی رائیں چونکہ حکومت کو پسند نہ تھیں اس لئے جرمنی سے خارج البلد کر دیا گیا - یہ فرانس پہونچا اور یہاں بھی نہ رہنے دیا گیا - یہ سنہ ۱۸۴۸ء میں پھر جرمنی آیا، لیکن پھر ناکام رہا اور آخرکار لندن چلا گیا - موجودہ اشتراکی و اشتمالی تحریکوں پر مارکس کی تعلیم کا بڑا زبردست اثر ہے - اس کے اصول مختصراً یہ ہیں کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ صرف مزدوروں کی محنت ہے اور انھیں کو ملنی چاہئے - سرمایہ دار کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اسے بالکل محروم کر دینا چاہئے -

مارکس کے نظریہ نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر سیاسیات و اقتصادیات کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑا ہے -

لینن روس کا مشہور انقلابی اسی کے فلسفہ کا پیرو تھا اور روس کی اشتمالیت، مارکسیت ہی کی عملی صورت ہے -

۱۹ - Nazism (نازیت) دوسرا نام بلکہ مخفف ہے National Socialism (قومی اشتراکیت) کا - سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۴ء میں جرمنی کی لیبر پارٹی نے آسٹریا میں اس تحریک کو شروع کیا تھا - لیکن ہٹلر کا براہ راست اس پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا - ہٹلر کی پارٹی کی بنیاد ایک جرمن مزدور ڈریکسلر (Drexler) نے سنہ ۱۹۱۹ء میں قایم کی تھی - جب ہٹلر اس میں شریک ہوا تو اس کا نام (National Socialist Party) رکھا اور اس کے ۲۵ اصول مقرر کئے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں :-

تمام جرمن اقوام کا اتحاد ـــ معاہدۂ ورسائی کی تنسیخ ـــ حقوق و فرائض میں مساوات ـــ رومن قانون کی جگہ جرمن قانون کا قیام ـــ صحتِ جسمانی کی ترقی ـــ جبریہ فوجی تعلیم ـــ غیر جرمن اقوام اور یہودیوں کا اخراج ـــ بڑے بڑے تجارتی و صنعتی اداروں پر حکومت کا اثر ـــ کاشت کی اصلاح ـــ عام قومی تعلیم۔

لیکن جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسر اقتدار ہوا تو اس تحریک کا اشتراکی حصہ تو نظر انداز کر دیا گیا اور اسکی حیثیت صرف قومی تحریک کی سی رہ گئی۔ یہاں سرمایہ داروں کی حکومت تو نہیں ہے، لیکن سرمایہ داری کی ضرور ہے، یعنی ہر چند امراء اور صاحبانِ دولت کا اقتدار حکومت پر نہیں ہے لیکن دولت کی تقسیم بھی ایسی نہیں کہ واقعی اہلِ احتیاج کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

نازی پارٹی کا نظریہ ہے کہ صرف آرین قوم ہی دنیا میں حکومت کے لئے آئی ہے اور خالص آرین نسل کے لوگ وہی ہیں۔ یہودیوں سے نفرت کا سبب یہ ہے کہ وہ سامی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جرمنی کا اقتصادی نظام بالکل اُنکے ہاتھ میں تھا

۲۰- Nihilism (عدمیت) لاطینی لفظ (Nihil) سے ماخوذ ہے، جسکے معنے "کچھ نہیں" کے ہیں۔ سترھویں صدی میں روس کے اندر بعض لوگوں نے ایک ذہنی نظریہ یہ قایم کیا تھا کہ حکومت یا اقتدار کسی قسم کا بھی ہو ناقابل تسلیم ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے اور اپنے افعال کا مالک۔ اس تحریک کو ٹرگینو (Turgenyeff) کے ناول (Father & Son) کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

ہر چند اس تحریک نے انقلابی خیالات پیدا کرنے میں کافی مدد پہونچائی، لیکن یہ بجائے خود کوئی سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ صرف فلسفہ اور نظریوں تک محدود تھی۔

۲۱- Pacifism (امنیت)۔ دنیا سے جنگ کو ختم کر دینے کی تحریک اس نام سے موسوم کیجاتی ہے اس قسم کی سوسائٹیاں برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ ہر جگہ قایم کی گئیں اور ہر چند اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی لیکن اس کا اثر یقیناً دُنیا پر بہت پڑا، چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے ایک بین الاقوامی صلح پسند کانفرنس کا انعقاد اس کا نتیجہ تھا اور جنگ کے بعد مجلس اقوام کا وجود، بین الاقوامی عدالت گاہ کا قیام اور معاہدۂ کلاگ[1] (Kellogg) اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف معاہدوں اور تحریروں تک محدود رہیں اور عملاً بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔

۲۲- Pan Islamism (ہمہ اسلامیت)۔ اس سے مراد تمام مُسلم اقوام و مسلم حکومتوں کا اتحادِ عمل ہے۔ یہ تحریک سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۱۱ء میں ایک پان اسلامی کانگرس

[1] امریکہ کے وزیر خارجہ کا نام (Kellogg) تھا اس کی تحریک اور فرانسیسی وزیر خارجہ بریاں (Briand) کی تائید سے تقریباً دنیا کی تمام قوموں نے ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا تھا کہ آیندہ بین الاقوامی نزاعات لڑائی سے نہیں بلکہ آپس کے سمجھوتے سے ہونا چاہئے۔ لیکن اس پر عمل کسی نے نہ کیا۔ اس معاہدہ کا نام معاہدۂ کیلاگ ہے۔

کے انعقاد کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ سلطان عبدالحمید بہت کمزور انسان تھا اس لئے یہ تحریک کامیاب نہ ہوئی اور جنگ عظیم میں ترکوں کا ساتھ مسلمانوں نے نہیں دیا۔ اس کے بعد جب کمال اتاترک نے خلافت کا وجود ختم کر دیا تو اس تحریک کا مرکز سرزمینِ عرب قرار پائی اور خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے قاہرہ اور مکہ میں مسلمان جمع ہوئے، لیکن چونکہ ایک سے زاید دعویدار خلافت پیدا ہوگئے اس لئے کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میثاق سعد آباد کی رُو سے ایران، افغانستان، ترکی اور عراق میں بیشک معاہدہ اتحاد ہو چکا ہے اسی طرح مصر، عراق اور سعودی عرب میں بھی معاہدۂ اتحاد ہوا ہے، لیکن ان کو پان اسلامزم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان کا تعلق بجائے مذہب کے سیاسیات سے زیادہ ہے۔

۲۳۔ Socialism (اشتراکیت)۔ اس تحریک کا مقصود یہ ہے کہ دنیا کی ملکیت تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہونا چاہئے۔ عہدِ حاضر میں اس کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے، جب سر ٹامس مور (Sir Thomas moor) کے خیالی ہیئت اجتماعیہ (Utopia[1]) کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی فوریر Fourier (۱۷۷۲ء - ۱۸۳۷ء) نے سوسائٹی کا ایسا نظام تجویز کیا جس سے طبقات انسانی کفیل بالذات ہو جائیں اور پھر رابرٹ اوون Robert Owen (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء) نے اپنی ساری دولت صرف کر کے نمونہ کے طور پر ایک ایسی فیکٹری اشتراکیت کے اصول پر قائم کی لیکن سوائے اس کے کہ تجارتی اداروں میں اتحادِ عمل کا جذبہ تو ضرور اس سے پیدا ہو گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس تحریک کی سیاسی اہمیت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب پراؤڈھن (Proudhon) نے فرانس میں سکہ کا چلن موقوف کرنے کے لئے تبادلۂ اشیاء کے بنک اور اتحاد باہمی کی کمیٹیاں مقرر کرنے اور لوئی بلانش (Blanc Louis) نے ایک قومی دارالصنعت قایم کر کے صنعت و حرفت کو قومی اصول پر رواج دینے کی تجویزیں پیش کیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک انجلس (Frederick Engels) ان خیالی باتوں کے مخالف تھے اور اشتراکیت کو عملی حیثیت سے چلانا چاہتے تھے۔

اسوقت جرمنی اشتراکیت کا مرکز بن گیا تھا اور فرڈیننڈ لاسیل (Ferdinand Lasalle) ایک اور اشتراکی جرمن نے سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ مارکس اس کا مخالف تھا اور اشتراکی حکومت کا قیام چاہتا تھا جب ۱۸۶۴ء میں لاسیل (ایک واقعۂ محبت میں) قتل ہو گیا تو پھر اس کی پارٹی بھی مارکس کی پارٹی سے مل گئی اور اشتراکیت

[1] سر ٹامس مور کی کتاب کا نام ہے جس میں اس نے اپنی خیالی حکومت کو سامنے رکھ کر ایک فرضی جزیرہ کا حال بیان کیا تھا کہ وہاں کی ملکیت کس طرح سب لوگوں میں برابر تقسیم تھی اور وہ کیسی امن و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کتاب پہلے لاطینی میں شایع ہوئی (۱۵۱۶ء) اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا۔

کا اتنا زور ہوا کہ برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور روس ہر جگہ یہ تحریک پھیل گئی۔

۱۸۶۵ء میں مارکس نے ایک بین الاقوامی انجمن مزدوروں کی قایم کی جسے اصطلاح میں پہلی انٹرنیشنل (First International) کہتے ہیں۔ اس کے بعد اشتراکیت اور فوضویت میں تصادم ہوتا رہا اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت کرتی رہیں، تاہم اشتراکیت کی تحریک برابر جاری رہی اور مارکس کے انتقال (۱۸۸۳ء) کے بعد بھی لوگ اسے چلاتے رہے۔

۱۸۸۹ء میں انٹرنیشنل کی پھر تجدید ہوئی اور تمام دنیا کی اشتراکی جماعتیں اس میں شریک ہوگئیں۔ اس کو دوسری انٹرنیشنل کہتے ہیں۔ اسی دوران میں ایک اصلاحی جماعت اور پیدا ہوگئی جو اصولِ اشتراکیت کی تو قایل تھی لیکن تدریج کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہونچنا چاہتی تھی اور مارکس کی تعلیم یہ تھی کہ ہنگامہ کرکے فوراً انقلاب پیدا کرنا چاہئے۔

۱۹۱۲ء میں انٹرنیشنل نے جنگ کے خلاف تجویز پاس کرکے سرمایہ داروں کو ڈرایا کہ اگر انھوں نے جنگ میں حصہ لیا تو وہ بغاوت کردیں گے، لیکن جب ۱۹۱۴ء میں لڑائی شروع ہوئی تو اکثر اشتراکی اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگئے۔ تاہم انتہا پسند اشتراکیوں کی ایک جماعت ایسی موجود تھی جو اپنے خیال پر قایم تھی اور آخر کار اسی نے لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب پیدا کیا اور خود جرمنی میں بھی اسی تحریک نے لڑائی کو ختم کردینے میں بڑا حصہ لیا، کیونکہ جرمنی کی قیصریت و ملوکیت کو اشتراکی تحریک ختم کرچکی تھی اور ملک جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔

اس انقلاب کے بعد جرمنی میں تو اعتدال پسند اشتراکیوں کا غلبہ ہوا، لیکن روس میں انتہا پسندی کا وہ زور ہوا کہ اشتراکیت کمیونزم بن گئی۔

برطانیہ میں اشتراکیت کی نمایندگی ایک حد تک لیبر پارٹی کررہی ہے، لیکن کمیونزم کا وہاں پتہ نہیں۔ جرمنی میں البتہ اشتراکی ووٹوں کی تعداد ہٹلر کے سامنے ۳۰ فی صدی تک پہونچ گئی تھی۔ اس وقت صرف روس ہی ایک ایسی سلطنت ہے جہاں انتہا پسند اشتراکیت کی حکومت ہے اور اب میکزیکو (Mexico) میں بھی قایم ہوگئی ہے، ورنہ دوسری سلطنتوں میں اس وقت تک اس کا رواج نہیں ہوا ہے۔

۲۴۔ Syndicalism (صنعی اشتراکیت)۔ یہ مزدور طبقہ کی انقلابی تحریک ہے جسکا مقصود یہ ہے کہ تجارتی و صنعی اداروں کی تنظیم مزدوروں اور کام کرنے والوں کے مطالبات و اغراض کو سامنے رکھ کر کیجائے۔ ان کا خاص حربہ ہڑتال (Strike) ہے۔ جنگ کے بعد یہ تحریک اشتراکیت کا جزو بن گئی ہے۔

۲۵۔ Zionism (صیہونیت)۔ یہ یہودیوں کی تحریک ہے جسکا مقصود فلسطین میں یہودی حکومت قایم کرنا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۸۹۵ء میں ہوئی اور سب سے پہلی اسکی کانگرس کا جلسہ ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ڈاکٹر ہرزل (Dr. Herzl) اس کا بانی ہے اور اسوقت ۲۰ لاکھ یہودی اسکے ممبر ہیں۔

خلیفہ گلزار علی اسیر

خلیفہ گلزار علی اسیر میاں نظیر کے فرزند اکبر تھے مولفِ زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں نظیر ہی کے مکتب میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور باپ سے شاعری بھی ورثہ میں ملی تھی، میاں نظیر کی زندگی تک گلچھرے اُڑاتے رہے ۱۲۴۶ھ میں نظیر نے انتقال کیا تو اسیر (تیس سال کی عمر میں) مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی والا' اور مائی تھان والوں کو پڑھانے لگے، دو جگہ کی آمدنی ستر روپیہ ماہوار تھی، گوالیار میں ان کے دو گھوڑے بھی تھے وہاں سے فی گھوڑا بائیس روپئے آتے تھے جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے اور بتیس روپئے خلیفہ جی کو ملتے تھے۔ اس طرح سو روپیہ ماہوار سے زیادہ آمدنی تھی، میاں نظیر کی سی غربت اور بھلمنساہٹ ان کی طبیعت میں نہ تھی۔ مؤلف زندگانی بے نظیر کسی نوازش علی بیگ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ ۱۲۴۸ھ میں مہاراجہ بلونت سنگھ نے آگرے میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی اور بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہونے لگا چونکہ خلیفہ جی مہاراجہ کے نوکر تھے اس لئے مہاراجہ نے ان سے خواہش کی کہ مشاعرہ کے لئے غزل کہہ دیا کریں۔ انھوں نے کہا میں اس لئے نوکر نہیں کہ اپنی غزل تمھیں بخشا کروں تم خود کچھ کہو جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا، درست کر دوں گا، مہاراجہ نے مجبور ہو کر حاتم علی مہر کو بلوا لیا اور وہی غزل کہہ دینے لگے، مگر ان کے اس تیکھے پن کے باوجود مہاراجہ انھیں بھی مشاعرہ میں بلواتے اور اپنا اُستاد سمجھتے، مشاعرہ میں خلیفہ جی کو اپنی دہنی طرف بٹھاتے اور مہر کو بائیں طرف، دونوں کے آگے چاندی کا حقہ لگایا جاتا، مرزا حاتم علی مہر تو حقہ پر اکتفا کرتے مگر خلیفہ افیون کے رسیا اور بھنگ کے دلدادہ تھے حقہ سے بھلا کیا سیر ہوتے، ساقن جو دوسروں کو حقہ پلانے مقرر ہوتی اس کو بلاتے اور گرما گرم حقہ سے محفل مشاعرہ کو دھواں دھار بنا دیتے تھے، مہر ذرا مہذب آدمی تھے پہلی دفعہ انھوں نے خلیفہ جی کی یہ حرکت دیکھی تو کچھ حیرت کا اظہار کیا خلیفہ جی کب چوکنے والے تھے فوراً یہ مطلع سنایا:-

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی　　گو مسلماں ہوں پہ بول اُٹھتا ہوں جے کالی کی

خلیفہ کی تعلیم بھی نہایت معمولی ہوئی تھی میاں نظیر کی ولایت کے ثبوت میں مولف زندگانی بے نظیر نے ایک روایت نوازش علی کے حوالے سے بیان کی ہے کہ جب کبھی میاں نظیر خلیفہ جی کو ساتھ لے کر مکتب کی طرف روانہ ہوتے خلیفہ جی پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے مکان کو واپس ہو جاتے، میاں نظیر پر فالج کا حملہ ہوا اور تین روز کی بیہوشی کے بعد جو تھے رہ نہ ہوش آیا

توانھوں نے دریافت کیا کہ مکتب کون پڑھا رہا ہے اس کے جواب میں خلیفہ جی نے کہا آپ کے سوا بھلا کون پڑھا سکتا ہے میں نے تو ابھی تک گلستاں بھی ختم نہیں کی ہے مکتب کے طلبا طغرا اور ابوالفضل پڑھتے ہیں بھلا میں انھیں کیا پڑھا سکتا تھا اس لئے کوئی انتظام نہ ہوسکا، میاں نظیر نے کہا تم جاؤ بھی تو، چنانچہ خلیفہ کا بیان ہے کہ" ارشاد سے ان کے گیا اور اُن کی دعا سے کچھ ایسا بہرہ کھلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی حقیقتاً یہ بھی اُن کا ایک تصرف تھا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ بس یوں ہی خلیفہ بن گئے تھے پڑھے لکھے اسی قدر تھے کہ گلستاں تک نہیں ختم کی تھی۔

مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ خلیفہ کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور شاگردوں کا جم غفیر ہمیشہ لگے ساتھ رہتا تھا، شہباز نے خلیفہ جی کے دو دواوین کا تذکرہ کیا ہے ایک مطبوعہ اور دوسرا قلمی لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں ان کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جو سوز عشق کے نام سے مشہور تھی۔

خلیفہ جی نے ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا ان کے ایک شاگرد غلام محمد خاں رہا نے تاریخ وفات کہی تھی جو لوحِ مزار پر کندہ ہے

گفت اسیر دام ہستی شد رہا

اس میں چھ عدد کا تخرجہ ہے۔

یہ حالات تھے خلیفہ جی کے جو پروفیسر شہباز کی کتاب زندگانیِ بے نظیر سے لے۔ آیئے اب ہم اسیر کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کریں۔ ہمارے پیش نظر اسیر کا دیوان مطبوعۂ مطبع حیدری واقع دار الخلافہ اکبرآباد کٹرہ حاجی محمد حسن بماہ شعبان المعظم ۱۲۷۶ھ مطابق فروری ۱۸۶۳ء ہے جو رائل سائز اور (۱۳) سطری مسطر پر طبع ہوا ہے متن میں ۱۳ اور حاشیہ پر ۱۴ اس طرح فی صفحہ ۲۷ شعر ہیں ۱۷۰ صفحات ہیں بظاہر اس دیوان میں (۴۷۵۲) شعر ہیں، آخر میں دو ایک خمسے ایک آدھ مسدس چند رباعیاں ہیں مگر سب معمولی شروع سے ۱۶۹ صفحات تک غزلیات ہیں عموماً غزلیں بڑی بڑی ہیں اور دو غزلہ سہ غزلہ کہتے گئے ہیں جس سے ان کی پرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیوان پیشِ نظر خلیفہ جی کی زندگی ہی میں طبع ہوا ہے اس دیوان کی طباعت کے اُنیس سال کے بعد خلیفہ جی نے انتقال کیا ہے انیس سالہ شاعری جس دیوان میں تھی وہ پروفیسر شہباز کی نظر سے گزر چکا ہے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے کوئی اچھا انتخاب اس دیوان سے نہیں کیا صرف چند شعر اسیر کے نقل کئے ہیں جن میں سے اکثر اس مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ بقیہ چار چھ شعر ایسے ہیں جو اس دیوان میں نہیں مگر وہ شعر بھی کوئی خاص بات نہیں رکھتے، مثنوی جس کا ذکر سری رام صاحب نے کیا ہے ہمیں نہ مل سکی اور نہ پروفیسر شہباز ہی کو اس کا پتہ چلا ورنہ وہ ضرور مثنوی کا تذکرہ کرتے۔ اس دیوان کے مطالعہ سے ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں ان کی مفلسی پر روشنی پڑتی ہے اور ناقدری کا پتہ چلتا ہے، حب اہل بیت اور مذہبی توغل بھی ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ ژرف نگاہی بھی نظر آتی ہے باوجود اس کے کہ سو روپیہ ماہوار خلیفہ جی کی آمدنی تھی اور اس زمانہ میں سو روپیہ خاصی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ بڑے بڑے

شاعر بیس بیس روپیہ ماہوار پر زندگی بسر کر رہے تھے ملک الشعراء اُستاد ذوق پانچ روپیہ ماہوار پاتے تھے انکے مقابل میں تو آسیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی مگر متعلقین کی زیادتی کے علاوہ افیون نوشی اور اس کے لوازمات کی کثرت کی وجہ سے شاید یہ آمدنی ان کو کفاف نہیں کرتی تھی اسی وجہ سے مفلسی کا رونا روتے رہے اس سُبک وضعی کا احساس انکو بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں :۔

یہ سچ ہے نسب میں ہوں گراں قدر اسیر آہ لیکن میں سبک وضعی سے مطعونِ جہاں ہوں

اس کے ساتھ ہی ساتھ جادۂ پدری سے انحراف کا بھی انھیں افسوس تھا۔

افتادگی کی چال چلو تم بھی اب اسیر ا وضع پدر جو چھوڑے وہ فرزند کچھ نہیں

انھیں وجوہ سے فراغت نصیب نہ تھی اور روتے تھے کہ

سر میں بھی اُٹھاؤں جو ترے دور میں اے چرخ ہوگی کبھی کا ہے کو فراغت سے مجھے اتنی

مفلسانیم و ہوائے مئی و مطرب داریم کیونکر اس شہر میں اوقات گزاری ہوگی

افلاس میں ہو سیر تو دل سیر ہو کیا خاک دولت ہی کا سب میلہ ہے دولت کا تماشا،

اے لذتِ دُنیا تجھے کیا یاد کریں گے دو دن کے لئے ہم نے جو کی آن کے جا گرم

تس پر بھی نہ پیچھا کبھی افلاس نے چھوڑا پانی جو ملا سرد تو کھانا نہ ملا گرم

افلاس کا غلبہ ہوتا تو یہ کہہ کر تسکین دیلیا کرتے تھے کہ

مولیٰ کی اک نظر ہے فقط کیمیا اسیر کچھ غم نہیں جو آیا ہے افلاس اب کے بھر

مگر باوجود اس مفلسی کے گلچھرے اُڑاتے تھے

مفلسی میں تو یہ گلچھرے اُڑاتا ہے اسیر جانے کیا کرتا ترے پاس اگر زر ہوتا،

مفلسی میں انسان متمولوں سے متنفر ہو جاتا ہے اور یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ کسی متمول کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا،

ہو جو مقدور تو دنیا میں منادی کر دوں سامنے ہو کے نہ مفلس کے تونگر نکلے

باوجود اس مفلسی کے خودداری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ نودولتوں کی خوشامد یا مصاحبت کرنا پسند نہ کرتے تھے۔

سوداغِ مفلسی مجھے دل پر قبول ہیں، لیکن نہیں ہے صحبتِ نو دولتاں پسند

اسی مفلسی نے انھیں اپنی بدبختی کا احساس بھی پیدا کرا دیا تھا اور اپنے تئیں بڑا بیکس و بے بس تصور کرتے تھے۔

ہم کو ان کانوں نے جو جو کہ سنایا وہ سنا ہم کو ان آنکھوں نے جو جو کہ دکھایا دیکھا

پٹکا جو فلک نے تو زمیں نے دیا سرکا، میں اک گل بازی ہوں اِدھر کا نہ اُدھر کا

اسی سلسلہ میں یارانِ وطن سے بھی شکایت پیدا ہوگئی تھی،

بیڑیاں کاٹ جو صحرا کو نہ بھاگے گا اسیر — طوق پہنائیں گے یارانِ وطن گردن تک
یاں شمع کہاں ہے مرے ویرانے میں مجنوں — اک داغ ہے ہم صحبتیٔ اہلِ وطن کا،

اس کے باوجود اپنی پاک باطنی اور صاف دلی پر ناز تھا۔

باطن آباد ہے ظاہر میں خرابی ہے اگر — گنج لیجاتی ہے دنیا مرے ویرانے سے

شاعری سے متعلق نہ صرف خلیفہ جی کے فنی معلومات ہی اچھے تھے بلکہ ژرف نگاہی بھی ان میں پیدا ہوگئی تھی، دوستوں کی تعریف کو وہ حقیقی تعریف نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ لوگ منھ دیکھے کی کہتے ہیں۔

نازاں نہ ہو اسیر اب کچھ اپنے شعر پہ تو — کہتے ہیں یہ جو تیرے سب دوستدار اچھا
پر ہم تو اس کو اچھا کہتے ہیں جس کو سُنکر — دشمن کے منھ سے نکلے بے اختیار اچھا

شاعری میں بعید مضامین اور گتھیاں سلجھانے کے بھی وہ قایل نہ تھے صاف اور سیدھے شعر چاہتے تھے۔

معنیِ شعر جبکہ بدقت سمجھ میں آئے — تو شعر کاہے کو وہ ہوا چیستاں ہوا،

لوگوں کے مضامین لےکر اپنے رنگ میں باندھنے کے بھی وہ قایل نہ تھے بلکہ اُسے بُرا سمجھتے تھے

ہے اپنے قاعدے میں یہ شعر و سخن کی بات — نکلی ہوئی کہیں نہ کسی کے دہن کی بات

انھیں اس کا احساس تھا کہ بڑے سے بڑے اُستاد کی بھی پوری غزل مرصع نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی دو شعر ہر غزل میں اچھے نکلتے ہیں

کیوں اہلِ معنی دادِ سخن دیں نہ اے اسیر — اچھے ہیں اس غزل میں بھی اشعار ایک دو

معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ مشق میں ان پر اعتراض بہت ہوتے تھے کبھی توارد ہوجاتا تو لوگ سرقہ بتاتے تھے اور اگر غزل اچھی ہوتی تو کہتے کہ اُستاد سے کہلوالیا ہے غالبًا یہ باتیں نظیر کے انتقال سے پہلے کی ہیں اور یہ شعر بھی جب ہی کہے گئے ہیں۔

سخت مشکل ہے اگر ہووے توارد واقع — اس کو بس غیر کا مضمون بتاتا ہے کوئی
اور لکھتے ہیں جو ہم شستہ و رفتہ سی غزل — تہمت اُستاد کے شعروں کی لگاتا ہے کوئی

اس کے بعد چیلنج کرتے ہیں

شک ہو گر دل میں تو کر مصرعۂ رنگیں موزوں — کیوں نہیں طبع سے پھر طبع لڑاتا ہے کوئی
آج مرزا بھی ہیں منصف ابھی کھلجائے گا، — ہم چراتے ہیں غزل یا کہ چراتا ہے کوئی

غالبًا مرزا سے مراد مرزا حاتم علی مہر ہے، کیوں کہ ایک اور شعر میں انھوں نے اپنے چند معاصرین کو گنایا ہے جن

نجملہ تمہر بھی ہیں ۔

تمہر د مہ اعظم د آغا ہیں سخن سنج اسیر   شاعری چلے جو چند سے یہی صحبت رہ جائے

ر انھیں عیب جوئی اور خورده گیری کی عادت نہ تھی ۔

عیب جویان سخن ڈھونڈھتے ہیں عیب آسیر   جو ہنرمند ہیں وہ داد ہنر دیتے ہیں،
دلا تو عیب چھپا اور ہنر کو دیکھا کر   عدو کی چشم جو سوئے ہنر نہیں تو نہ ہو

علوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آگرہ میں شاعری کا زور شور تھا اور ہر شاعر طوطیٔ ہند بنا ہوا تھا، دیکھئے طنز کرتے ہیں
ر کتنا گہرا طنز ہے

جس کو سنئے وہ جواب بلبلِ شیراز ہے   طوطیوں سے کشور ہندوستاں خالی نہیں

ر اپنے کلام کی حقیقی قدر بھی آپ جانتے تھے اور آگرہ والوں کی ناقدری کے شاکی بھی تھے ۔

گاہک ہی آگرہ میں سخن کا نہیں اسیر   مدت سے ہے دکان ہماری کھلی ہوئی
آج شاخِ قلم خشک سے جز تیرے اسیر   اس طرح سے گلِ مضموں کھلاتا ہے کوئی
چپ رہنے کو تصویر ہوں برسوں بھی نہ بولوں   اور ریختہ کہنے کو سراپا میں زباں ہوں
اسیرِ سخن سنج کی کچھ نہ پوچھو   یہ جو کھا کے موتی اُگلتا ہے عاشق

یہاں کو یہ زعم بھی تھا کہ مرنے کے بعد آپ کی رنگینیٔ طبع سے گلِ احمر کھلیں گے، یہ مضمون تعلی میں بالکل نیا ہے :-

کیا کیا گلِ احمر مری مٹی سے کھلیں گے   رنگینی پہ آئے گی اگر زیر زمیں طبع ،

یہ سب جوانی کی باتیں تھیں جب بڑھاپا آگیا تو طبیعت بیٹھ گئی

پیری میں کہاں رونقِ ایامِ جوانی،   رنگِ رُخِ شمعِ سحر اچھا نہیں ہوتا
برجستہ شعر، بندشِ مضموں کہاں اسیر   ہم اپنی سرگزشت قلمبند کرتے ہیں
وہ گرمیٔ مضموں تو ہوئی سرد اسیر اب،   یہ دل کے نکلتے ہیں بخارات زباں سے

الد کے دیوان کی فکر بھی رہی ہے ممکن ہے کہ نولکشور کا پہلا اڈیشن جو بہت ضخیم تھا جس میں ہزلیات کا بھی
خاصا حصہ تھا خلیفہ صاحب ہی کا مرتبہ ہو

گرچاہو کہ ہوں صاحبِ دیوان اسیر آپ   شیرازۂ دیوان پدر کھینچ کے باندھو

معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں بالکل میاں نظیر کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا، پر عمل کرتے تھے۔

میں وہ ہوں دوست کہ دشمن کو بھی ناخوش نکروں   کچھ بجز لطف و مدارات سبھے یاد نہیں

ر کی طرح خلیفہ اسیر نے "مقامیات" پر کوئی مستقل نظم یا غزل نہیں کہی ہے مگر بعض شعر مقامی رنگ کے ضرور کہے ہیں

دیکھو تو آگرہ میں دیوالی کی روشنی ہر کوچہ ماہتاب ہے ہر خانہ آفتاب
اے جنوں چل کسی ویرانے میں سر پھوڑیں گے اکبر آباد میں شوخ ایک نہ لڑکا دیکھا
وہ رنگ زرد مرا دیکھ ہنس کے کہتے ہیں، اب آگرہ میں بھی ہوتی ہے زعفران پیدا

کسی نے کہا ہے :- "دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند"۔ مگر اس سے اچھی چیز نیم پاگل پن ہے جسے اردو میں اُلّو، گدھا وغیرہ کہتے ہیں اس کو ذرا پھکڑ قسم کے لوگ "چوتیاپن" کہتے ہیں اس قسم کی مخلوق دنیا میں بڑے مزے میں رہتی ہے خلیفہ جی نے اسی کو بے شعوری سے تعبیر کیا ہے :-

جو بے شعور ہیں دنیا میں چین سے ہیں اسیر خراب کرتا ہے کیا کیا مرا شعور مجھے

عاشقانہ شعر خلیفہ جی نے خوب کہے ہیں بعض شعر نزاکتِ تخیل کی بڑی اچھی مثال ہیں:

آیا جو چلتے چلتے تری زلف کا خیال آپ ہی اُلجھ اُلجھ کے کئی بار گر پڑا

دیکھئے کس قدر لطیف شعر ہے:

یاد آتی ہیں کسی کی غضب مہربانیاں سنتا ہوں جب کسی پہ کوئی مہرباں ہوا

اس شعر میں ایک سوز ہے جس کی جھلکیاں کہیں کہیں ملتی ہیں :

جب سے پڑا دل عشق میں تب سے قصہ خوانی بھول گیا اپنی کہانی یاد رہی اور سب کی کہانی بھول گیا

اسی غزل کے دو شعر اور سن لیجئے :-

جان پھنسی ہو آفت میں تے جیتے ہیں نے مرتے ہیں تم کیا بھولے مرگ بھی اب تو ہمکو جانی بھول گیا
ہائے رے اس نسیاں کا براہو رہ کر پچھتا تا ہوں دیدیا خط قاصد کو اور پیغام زبانی بھول گیا

شعر ملاحظہ ہو بعض لوگ اس کو تصوف کے رنگ میں سمجھیں گے، مگر یہ عاشقانہ شعر ہے، خوب کہا ہے :-

میری دو آنکھیں اس کے لاکھ جلوے نکالوں حسرتِ دیدار کیونکر[1]

کس قدر صحیح کہا ہے۔

جس کی گردن میں لپٹتی ہے سکھا دیتی ہے عشق پیچاں کہوں یا سنبلِ پیچاں ہو وہ زلف

چند شعر مختلف مضامین کے سنئے :-

سینے میں مرے آہ تو مدت سے ہوئی سرد اک نالۂ محزوں ہے سو محتاجِ اثر کا

---

[1] شاید انیس کی رباعی اسی سے ماخوذ ہے :-

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں، یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں،
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

جلے جو دل تو ہو آہِ شرر فشاں پیدا
لگے نہ آگ تو کس طرح ہو دھواں پیدا

شاید کہ ساتھ نالہ کے جاں ہو گئی رواں
مرغِ چمن جو کھول کے منقار گر پڑا

پھر کسی کا ہاتھ سے کھینچا ہے دامن غیر نے
پھر کسی کا چاک تا دامن گریباں ہو چلا

پھر کسی نے رُخ پہ اپنے چھوڑ دی زلفِ سیاہ
پھر کسی سودا زدہ کا دل پریشاں ہو چلا

حیف میں دیکھوں اور دل جائے
میری آنکھوں کے سامنے مارا

ظلمِ بتاں ہوا ستمِ آسماں ہوا
یک مشت استخواں پہ نہ کیا کیا یہاں ہوا

مرا فسانہ ہوا گوشِ زد خلایق کے
ہزار حیف تمہارے نہ کان تک پہونچا

دل ترا سینہ ترا سر ترا ساماں تیرا
پاس عاشق کے جو ہے سب ہے مری جاں تیرا

کب کے لے اُڑتی زمیں سے مجھے ساقی یہ شراب
کوئی معشوق بغل میں جو سبو کا ہوتا

میری وحشت نے رفوگر کو بھی حیراں کر دیا
جب تلک دامن سیا ٹکڑے گریباں کر دیا

سنیئے اسے کان لگا کر ذرا
قصۂ دل ہے یہ کہانی نہیں

اپنے میں پاؤں کی زنجیر ہلا دیتا ہوں
جبکہ حلقہ درِ زنداں کا ہلاتا ہے کوئی

بزمِ اغیار میں بیٹھا ہوا تو یاد آیا
گردِ گل کے نظر آئے جو چمن میں کانٹے

مجھے خبر نہیں دامن تھا یا گریباں تھا
گئے ہیں رات کو کچھ تار تارسے میں نے

دل پہ اللہ اختیار نہیں
ہو نہ مجبور اس قدر کوئی

عجب کچھ تفرقے سے شہرِ آب و گل میں پھرتا ہوں
مجھے ڈھونڈھے ہے دل میں جستجوئے دل میں پھرتا ہوں

بے دل کے جلے سوزِ جگر میں نہیں ہوتا
خوشبو کے لئے آگ پہ رکھتے ہیں اگر کو

میخواری سے توبہ ہے پر اس وقت ہوں معذور
جب شاخ پہ گل صورتِ پیمانہ بنے گا

بخت جاگا کیا جب تک کہ رہے ہم سوتے
ہم جو بیدار ہوئے بخت کو سوتے دیکھا

کچھ جامہ زیبیاں تو گل اندامیوں پہ ہیں ختم
جس رنگ کی پہناؤ بدن میں قبا کھلے

آگرہ پر ہمیشہ دلی کا اثر رہا ہے مگر خلیفہ جی کے کلام میں لکھنؤ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے:-

ستم سج دھج بنانا تھا بلا چوٹی گندھانا تھا
غضب مسی لگانا تھا قیامت پان کھانا تھا

تیری آنکھیں پھرتے ہی عالم کی آنکھیں پھر گئیں
بڑۂ آہو زیادہ شیرِ نر سے ہو گیا

چہرہ خورشیدِ درخشاں سے ہے تاباں تیرا
مشرقِ نور ہے کرتی کا گریباں تیرا

رہتا ہے خزاں میں بھی ہرا زخم بدن کا
پانی تھا تری تیغ میں کیا نہرِ چمن کا

تیری مجلس کی چلمچی سے چپے ہے خورشید
آفتابے سے ہے پانی مہ کامل ہوتا،

کاسہ سرکو بنایا جو مرے خاک انداز
اے فلک کرنا تھا سرپوش کسی سینی کا

کام بندوق دونالی کا کیا کرتا ہے
اے بتِ صید فگن خال تری بینی کا

حجام خطِ یار کو اصلاح دیتے ہیں
چھلتے ہیں تیرے ہاتھ کے پروردگار حرف

چار دم حقے کے جب غیر پلاتا ہے انھیں،
میرے اُٹھتا ہے کلیجے سے دھواں دو دو دن

چوکھٹ پہ رہی اپنی جبیں شام سے تا صبح
کنڈی نہ مگر اُس ستم ایجاد نے کھولی

نظیر کے مذہب کے متعلق میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر کے اجداد اہلِ تسنن تھے نہ جانے کس وجہ سے نظیر کے والد نے یا نظیر نے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا مگر نظیر کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں حُبِ اہلِ بیت کے علاوہ کوئی دوسری شیعی نشانی نہ تھی خلیفہ جی البتہ ذرا "اشد" معلوم ہوتے ہیں مقلدوں یعنی سنیوں پر ایک جگہ چوٹ کی ہے۔

خدا ہمیشہ مجھے اس مقلدی سے بچائے
کہ دل میں بغضِ علیؓ نام ہے غلامِ علیؑ

خلیفہ جی نے نعت اور منقبت میں بہت شعر کہے ہیں مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے، البتہ جریدتین کا مضمون اس کثرت سے باندھا ہے کہ کسی شاعر نے اس قدر شعر اس مضمون کے نہیں کہے ہیں اس موضوع کی حد تک خلیفہ جی جریدہ ہیں۔

بعد مردن بھی میرے دل کے پھپھولے پھوٹتے ہیں
چبھتے جاتے ہیں جریدوں کے بدن میں کانٹے

شاخ سدرہ کا نہ جبریل کا رستہ دیکھو
دو جریدوں کی جگہ رکھدو کفن میں کانٹے

تر رکھا جو اشکوں نے عصائے بغلی کو
شاخوں میں جریدوں کے لگے بیر لحد میں

خلیفہ جی کے دیوان کے مطالعہ سے ایک عجیب و غریب توارد کا پتہ چلا، ایک شعر بہت مشہور ہے:۔

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش

یہ شعر اس قدر مشہور ہے کہ بچے بچے کی زبان پر ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کس کا شعر ہے، یہ شعر حکیم مومن خاں کا ہے جو اُن کی تیسری مثنوی میں ہے، خلیفہ جی کے دیوان میں ایک غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

کون سنتا ہے فغانِ درویش
کون ہے مرتبہ دانِ درویش

چاہیئے بند زبانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش

خلیفہ جی کے پہلے مطلع کا پہلا مصرع اور دوسرے مطلع کا دوسرا مصرع مومن کا شعر بنتا ہے خلیفہ جی اور مومن معاصر ضرور ہیں مگر سرقہ نہ تو مومن نے کیا ہے نہ خلیفہ جی نے یہ بھی بڑے مزے کا توارد ہے۔

چونکہ خلیفہ جی پر لکھنؤ کا اثر بہت تھا اس لئے محاوروں کے استعمال کی کوشش بھی کی ہے اور بہت

محاورے استعمال کئے ہیں :

صاحب زکوٰۃ حسن کے ہم بھی ہیں مستحق — خیرات اپنی ہم کو بھی دو دار پھیر کر
تشنہ لب خوبیٔ قسمت سے تو رہتا ہے اسیر — ورنہ اے یار ترا یار تو ہے دل دریا

محاوروں کے شوق میں دل دریا جیسا بازاری محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔

چونکہ کالی بیگم (افیون) کے شیدائی تھے اس لئے مٹھاس پر جان دیتے تھے یہی وجہ ہے جو بعض میٹھے میٹھے شعر کہے ہیں :

خون میٹھا عشق شیریں کے اثر سے ہو گیا — بند بند اپنا زیادہ نے شکر سے ہو گیا

پینک میں بھی خلیفہ جی نے شاعری کی ہے شعر ملاحظہ ہو :-

دنیا خیال و خواب ہے اور میں بھی خواب ہوں — یہ دیکھتا ہوں خواب میں میں خواب دوسرا
دیکھا کوئی مکاں نہ کہیں آسمان پر — صاحب ہمیں زمیں پہ ہمیں آسمان پر

خلیفہ جی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن پر تصوف کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی کوئی بات نہیں۔

خلیفہ اسیر ایک پرگو صاحب مذاق اور واقف فن شاعر تھے زبان پر بھی خاصا عبور تھا درجۂ دوم کے شعراء میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے گو ان کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کلام اس قابل بھی نہیں کہ بالکل نظر انداز کر دیا جائے، نظیری کی ہمہ گیری اور روانی ان میں نہیں ہے مگر پھر بھی ایک اُپج ضرور ہے، چونکہ تریاکی قدیم تھے اسلئے پینک میں بڑی دور کی کوڑی لاتے تھے، سوزن اور رشتۂ سوزن ایک پامال مضمون ہے دیکھئے اس کو کس عمدگی سے باندھا ہے :

دامنِ دشت پہ ہر گام میں کم ہوتی گئی، — زندگی اپنی مگر رشتۂ سوزن نکلی

فلسفۂ رنج و راحت کو کس مزے سے بیان کیا ہے :

راحت بغیر رنج کے ملنا محال ہے — جنت میں جائے گا جو جہنم میں گھر ہوا

اس قسم کے بیسیوں شعر ان کے دیوان میں موجود ہیں مبتذل اشعار بھی ہیں اور ثقہ بھی، عمدہ بھی خراب بھی بہر حال اسیر کا دیوان ایک گلدستہ ہے جس میں "پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی" مگر "جو گل کے جویا ہیں انھیں کیا خار کا کھٹکا"

تمکین کاظمی

داستانِ ابرو باد
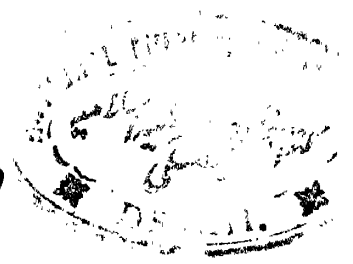
لاکھوں برس پہلے کی بات ہے کہ جب کرۂ زمین کے مشتعل معدنی اجزاء آہستہ آہستہ سرد ہونے لگے، تو وزنی عناصر (جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا) مرکز زمین کی طرف مایل ہوئے اور ہلکے عناصر (جیسے ہیلیم، ہائڈروجن، آکسیجن نائٹروجن) سطح پر رہ گئے جن کے امتزاج کا دوسرا نام فضا (Atmosphere) ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہوا کی موٹی تہ جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کا وزن ۶ ہزار ملین ٹن ہے (یعنی ۶ کھرب ٹن)

ہوا میں پھیل جانے کی صلاحیت، سو سال قبل مسیح ہی میں معلوم ہو چکی تھی اور اس کے دباؤ کا حال بھی گلیلو کے ایک اطالوی شاگرد کو معلوم ہو چکا تھا جس نے پارہ کا تھرما میٹر ایجاد کیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۷ر۱۴ پونڈ دریافت ہوا ہے، لیکن انسان اس دباؤ کو اس لئے برداشت کر سکتا ہے کہ خود اس کے جسم کا اندرونی دباؤ بھی اتنا ہی ہے اور وہ ہوا کے دباؤ کو سنبھالے رکھتا ہے۔

صاف ہوا، انسان کی صحت و زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ اس میں تھوڑا سا نم بھی ہونا چاہئے، کیونکہ خشک ہوا میں گرمی بالکل نہیں ہوتی اور تر ہوا میں گرمی پائی جاتی ہے۔ زمین سے متصل حصہ ہوا کا نسبتاً زیادہ گندہ اور بھاری ہوتا ہے، اس لئے خالص ہوا زمین سے ۲۶ فٹ بلندی پر میسر آسکتی ہے اور صحت گاہیں بلند مقامات پر قایم کی جاتی ہیں۔

شہروں کی ہوا خراب ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس میں مختلف چیزوں کے ذرات مل جاتے ہیں۔ جس چیز کا نام کُہر ہے وہ یہی ذرات ہیں جن میں آفتاب کی روشنی نفوذ نہیں کر سکتی۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ برطانیہ کے جزیرہ میں ہر سال ۱۵ لاکھ ٹن خاک کے خراب ذرات ہوا میں مل جاتے ہیں اور لندن کی فضا میں سالانہ ۵ لاکھ ٹن ذرات گندھک کے پائے جاتے ہیں۔

خشک ہوا میں ۷۸ فی صدی حصہ نائٹروجن پائی جاتی ہے، ۲۱ فی صدی آکسیجن، ۰.۹۳ فی صدی آرگن (Argon) اور ۰.۰۳ فی صدی کاربن۔ چند گیسیں اور بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار گھٹ کر ۱۸ ½ فی صدی رہجائے تو شمع گل ہو جائے اور اگر ۷ فی صدی رہجائے تو انسان دم گھٹ کر مرجائے۔

زمین کے دو پھیپھڑے ہیں، بایاں پھیپھڑا کناڈا ہے اور داہنا شمالی سائبیریا۔ جاڑوں میں یہ پھیپھڑے گرم ہوا کی بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سرد ہوا فراہم کرتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کا یہ عمل اُلٹ جاتا ہے۔

زمین کے چاروں طرف فضا کی تہ اتنی شفاف ہے کہ آفتاب کی روشنی برابر آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی گرمی ۴۰ فیصدی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔

اگر ہم زمین کی گہرائی کی طرف چلیں تو ہر سو فٹ پر ایک درجۂ حرارت بڑھتا ہوا نظر آئے گا اور اگر ہم اوپر چڑھیں تو ہر ۳۰۰ فٹ پر نصف درجۂ حرارت گرا ہوا معلوم ہوگا

کرۂ زمین کے چاروں طرف جو گیسیں پائی جاتی ہیں وہ بہت ہلکی ہیں لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے وہ بہت اوپر جا کر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پھر بھی بعض گیسیں ایسی ہیں (مثلاً ہائڈروجن اور ہیلیم) کہ وہ بھاگ ہی نکلتی ہیں اور زمین اُن پر پورا قابو نہیں رکھ سکتی۔

چاند کے چاروں طرف بھی کسی وقت گیسوں کی فضا پائی جاتی تھی لیکن اب وہ خلا میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی ہے۔ عطارد جو ہماری زمین کے بیسویں حصہ کے برابر ہے، کرۂ ارض کی طرح کوئی فضا نہیں رکھتا۔ زہرہ کے گرد البتہ ویسی ہی فضا پائی جاتی ہے جیسی زمین کے گرد، اس لئے اگر ہم وہاں پہونچ جائیں تو زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہوا جتنی گرم ہوگی، بادل اتنے ہی اونچے ہوں گے۔ یعنی اگر خط استوا پر جہاں کی ہوا زیادہ گرم ہوتی ہے بادل چھ میل کی بلندی پر ہوں گے تو منطقۂ باردہ میں (مثلاً گرین لینڈ) ان کی بلندی نصف میل سے زاید نہ ہوگی۔ شمالی یورپ میں جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے دوسرے موسموں میں بادلوں کی بلندی نصف میل سے ڈھائی میل تک ہوتی ہے اور بارش کے زمانہ میں آدھ میل سے سوا میل تک۔

انسان اسوقت تک زیادہ سے زیادہ چودہ میل کی بلندی تک پہونچ سکا ہے، لیکن غبارہ بیس میل کی بلندی تک گیا ہے۔ ۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر درجۂ حرارت صفر سے بھی ۶۲ درجے کم ہوتا ہے، ۱۲ میل کے بعد ۷۰ میل تک البتہ ہوا کی تہ میں

پھر گرمی شروع ہو جاتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پیرس پر لمبی مار کی توپوں سے گولہ باری کی ہے تو گولہ ۲۲ میل اونچا خم بناتا تھا لیکن کراکاتوا (Karaktoa) کے آتش فشاں پہاڑ کا مادہ ۳۰ میل کی بلندی تک اُڑ کر پہونچتا تھا۔

بڑی بڑی آندھیاں جو زمین پر آتی ہیں، ان کا سبب ہوا کے وہ تموجات ہیں جو ۲۵۰ میل اونچے پیدا ہوتے ہیں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۳۰۰ میل کی بلندی پر بھی ہائڈروجن اور نائٹروجن کے منتشر اجزا فضا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کی قیمتی چیزوں میں گیسوں کا بھی شمار ہوتا ہے بعض گیسیں تو سونے اور پلاٹنم سے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ ان میں موسم کا مقابلہ کرنے کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ یہ قیمتی گیسیں ہوا میں بھی پائی جاتی ہیں اور سمندروں کے پانی میں بھی بلکہ پانی میں ہوا سے زیادہ۔

ان گیسوں میں اس وقت ہیلیم (Helium) گیس کی بڑی قدر ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور آگ کو قبول نہیں کرتی۔ غباروں میں اب اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کا ذخیرہ سب سے زیادہ امریکہ کے پاس ہے۔

قطبین کے پاس، ہوا کے ذرات زمین کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت دوچند رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ آندھیوں کا تعلق ۵۲۰ میل بلند فضا کے تموجات سے ہے، اس لئے اکثر و بیشتر آندھیوں کا رُخ اوپر ہی کی طرف ہوتا ہے ورنہ تباہ ہو جائے۔

امریکہ میں بہت زیادہ آندھیاں آتی ہیں یعنی وہاں سالانہ ۱۳۰ آندھیوں کا اوسط ہے اور سیکڑوں جانیں ان سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ سنہ ۲۴ء میں آندھیوں کے سلسلہ نے لوئی سیانا (Louisiana) سے لیکر ورجینیا (Virginia) تک سیکڑوں آدمیوں کو ہلاک کیا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں سنٹ لوئی ([illegible]) کو آندھیوں نے ۲ لاکھ پونڈ کا نقصان پہونچایا اور سنہ ۲۰ء میں یہاں کی ۵۵۰۰ عمارتیں مسمار کر دیں۔ سنہ ۲۶ء میں ایک آندھی نے فلوریڈا کے بارہ سو اور گواڈلوپ کے ۱۲۷۰ آدمیوں کی جانیں لیں۔

یوروپ میں آندھیاں کم آتی ہیں لیکن سنہ ۲۳ء کی آندھی نے فرانس کے جنگلوں میں ۵۰ ہزار درخت جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دئے۔

یوروپ میں ہوا چکیوں کا رواج صلیبی جنگوں کے وقت سے ہوا ہے، جو ایران سے وہاں پہونچا تھا بلجیم میں ایک ہوا چکی بارھویں صدی کی ابتک پائی جاتی ہے۔ ہالنڈ میں ۵۰۰ ہوا چکیاں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں۔ چین میں بھی انکے ذریعے سے آبپاشی ہوتی ہے۔

بارش کے قطرے گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں، یعنی گرمیوں میں ان کا قطر ۱/۴ انچ سے ۱/۸ انچ تک ہوتا ہے۔ بارش کے قطرہ کا وزن اوسطاً ۰،۲ گرام ہوتا ہے۔ یہ ۲۵ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے زمین پر آتا ہے
بارش کا اوسط مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش، آسام کے پہاڑی مقام چرا پونجی میں ہوتی ہے جہاں کا سالانہ اوسط چار، پانچ سو انچ ہے۔

کُہر بھی ایک قسم کا بادل ہی ہے لیکن زمین سے متصل۔ جب زمین کے بخارات میں دھوییں کے اجزا ملجاتے ہیں اور وہ بخارات اوپر نہیں اُٹھ سکتے تو کُہر بنجاتے ہیں۔ کُہر سے بھی دنیا کو بہت نقصان پہونچتا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء کے کُہر نے انگلستان کو ایک کرور پونڈ کا نقصان پہونچایا۔ فروری سنہ ۳۶ء میں ایک دن ایسا آیا تھا جب سارے یوروپ کو کُہر کی چادر نے لپیٹ لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے تمام کام معطل ہو گئے۔

گرج کا طوفان بھی بادلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دو ہوائیں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں تو ٹھنڈی ہوا اوپر سے آکر گرم ہوا میں داخل ہوتی ہے اور اس سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہوا پانی کے قطروں میں انجماد پیدا کر دیتی ہے اور انھیں کا نام اُولا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین پر سالانہ ایک کرور ۶۰ لاکھ گرج کے طوفان آتے ہیں اور ۶ لاکھ بار بجلی کی چمک روزانہ پیدا ہوتی ہے۔ طوفان کے دوران میں بجلی ۲۰۰ مرتبہ فی گھنٹہ چمکتی ہے۔ بجلی فی الحقیقت ایک شعلہ یا چنگاری ہے جو زمین و بادل یا دو بادلوں کے درمیان تناؤ یا کشش کے دباؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ۵۰ کرور گھوڑوں کی قوت پنہاں ہوتی ہے اور اس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔

گرم ممالک میں گرج کے طوفان زیادہ آتے ہیں۔ جاوا سب سے بڑا مرکز ان طوفانوں کا ہے جہاں ہر سال اوسط ۲۲۳ طوفان آتے ہیں۔

بجلی سے فایدے بھی دُنیا کو پہونچتے ہیں اور نقصان بھی۔ فایدہ تو یہ ہے کہ اس سے سالانہ دس کرور ٹن نائٹروجن پیدا ہوتا ہے جو زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اور نقصان یہ کہ بہت سے درختوں میں اس سے آگ لگ جاتی ہے، فصلوں کو بھی نقصان پہونچتا ہے اور جانیں بھی ضایع ہوتی ہیں۔

گرج کی رفتار تقریباً ۵ سکنڈ میں ایک میل ہے، اس لئے اگر گرج چار میل دور ہو تو ٹیلی فون سے آپ تقریباً ۱۸ سکنڈ پہلے اس کی آواز کو سُن لیں گے۔ گرج کی آواز میں بازگشت پیدا ہوتی ہے ہوا کی اُن تہوں سے جو مختلف دبازت و تمپریچر رکھتی ہیں۔

موسم سے مراد فضا کی وہ کیفیت ہے جو کسی مخصوص حصۂ زمین میں کچھ عرصہ تک قایم رہتی ہے، خط استوا کے نیچے جتنے مقامات ہیں وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں، کیونکہ آفتاب کی کرنیں یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ زمین کے ٹمپریچر کا اوسط ۱۶ درجہ سنٹی گریڈ ہے لیکن ترکستان میں وہ ۵۵ تک بڑھ جاتا ہے اور گرین لینڈ میں صفر سے بھی نیچے ۹۰ درجے تک گر جاتا ہے مخلوقات میں صرف انسان اور کتا دو ہی جاندار ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف موسموں کا عادی بنا سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ سفید اقوام میں یہ اہلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر حصۂ زمین کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے، یعنے جو حصے پہلے گرم تھے وہ سرد ہوتے جا رہے ہیں اور جو سرد تھے وہاں گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب آفتاب کے تغیرات کو قرار دیا جاتا ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے زیادہ خشک مقام خرطوم ہے جہاں کی ہوا میں نمی کی مقدار صرف ۸ فیصدی ہے اور سب سے زیادہ مرطوب جگہ کیمرون پہاڑ کا دامن ہے جہاں کی ہوا میں ۹۲ فی صدی رطوبت پائی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ ابر آلود مقام روس کا جزیرہ نمائے کولا ہے جہاں تقریباً ہمیشہ بادل گھرے رہتے ہیں اور سب سے زیادہ صاف فضا چلی کے ایک شہر کلاما کی ہے جہاں ابر کبھی نظر نہیں آتا۔

جزائر جلوٹ (jaluit Islands) میں سال کے ۳۶۳ دنوں میں برابر بارش ہوتی رہتی ہے اور دریائے نیل کی وادی حلفہ میں دس دس برس تک پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوائی کا ایک مقام ویلیلی (Waialeale) میں ہوتی ہے، جہاں کا اوسط ۴۸۰ انچ ہے سب سے زیادہ تیز بارش جزایر فلپائن کے ایک مقام باگیو (Baguio) میں ہوتی ہے جہاں ایک بار چوبیس گھنٹے میں ۴۶ انچ بارش ہوگئی۔

زمین کو آفتاب سے جتنی گرمی پہونچتی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے یعنی آفتاب کی گرمی کو ہم ۴ سال فرض کرلیں تو اس میں سے صرف ایک سکنڈ ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے سیارے زمین سے دس گنا زیادہ حرارت حاصل کرتے ہیں اور باقی حرارت ضایع ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین تک فی صدی چالیس کے اوسط سے پہونچتی ہیں ۲۰ فی صدی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ۴۰ فی صدی واپس پلٹ جاتی ہیں۔

اگر آفتاب کی کرنیں جن کا درجۂ حرارت دس ہزار یقین کیا گیا ہے، دس فی صدی گرمی کھو دیں تو دنیا کے گرم تر مقامات بھی منجمد ہو جائیں۔

انقلاب پسندی اور اصلاح عالم

عہدِ حاضر کو اگر انقلاب کی پرستش کا دور کہا جائے تو حقیقت سے چنداں بعید نہ ہوگا۔ یوں تو اس کی حمایت و تعریف میں ہفتے ہی نہیں متعدد صحیفے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ خصوصاً انقلاب پسند جماعت نے اس خواب کو "رویا رصادقہ" بنا کر پیش کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک سنجیدہ غور و فکر کا تعلق ہے بہت کم حضرات اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ میری لب کشائی اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور میری غلطیاں مجھ پر روشن ہو جائیں۔

لفظ انقلاب کی عالمگیری نے اس کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا لفظ اپنے اندر اتنے مختلف و متضاد پہلو رکھتا ہو۔ لفظی معنی تو محض اُلٹ جانے یا گردش کھا جانے کے ہیں۔ دقت اس کی اصطلاحات سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً نظامِ معاشرت یا نظامِ حکومت کے دفعتاً بالکل بدل جانے پر لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جد و جہد کو بھی انقلاب کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ذہنی انقلاب تو بہرحال ہو ہی جاتا ہے۔ جب دو طبقے یعنی اعلیٰ اور ادنےٰ باہم متصادم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا غالب ہو جاتے ہیں تو اسے بھی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں تو ترقی کی ہر کوشش اور اس کے لئے باہم جنگ آزمائیاں بھی انقلاب کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر انقلاب کو اس کے وسیع ترین تخیل میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انقلاب ایک فطری تقاضہ ہے۔ انقلاب و ارتقا بظاہر دو متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ایک ہی واقعہ اگر آج اپنے جزئیات کی وجہ سے انقلاب معلوم ہوتا ہے تو کل یہی ارتقا کے نام سے یاد کیا جانے لگے گا۔ مثال کے لئے اپنے ہی دور کو لیجئے۔ کیا یہ دورِ انقلاب نہیں ہے؟ لیکن کچھ مدت کے بعد اگر ہماری یہی رفتار رہی تو آنے والی نسلیں یہی سمجھیں گی کہ ہم برابر ارتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے زمانۂ ماسبق کی رفتار ہم کو سوائے ارتقا کے دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن آج کی فرصت میں میرا روئے سخن اس قسم کے انقلاب کی طرف نہیں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں عوام بھی انقلاب سے یہ معنی نہیں لیتے۔ انقلاب کا نام لیتے ہی ذہن فوراً اس بغاوت و بدامنی، قتل و غارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو انقلاب فرانس یا روس کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور جس کی لازمی شرط ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ پر جبریہ غلبہ حاصل کر لینا ہے، اس کے انقلاب کہے جانے پر تو چنداں اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مابہ النزاع مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہماری رفتارِ ترقی کا معاون ہو!

مخالف - یہ ہماری ارتقائی منزلوں کا زینہ ہے یا راہ کا ایک سنگِ گراں۔

ماضی عموماً حال و مستقبل دونوں کی آئینہ داری کیا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس باب میں بھی ہماری رہنمائی کرے اور تاریخ کی ورق گردانی سے ہم کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ لیکن پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ انقلاب کیوں ہوتا ہے اور اسکی رفتار کا کیا رخ رہتا ہے۔ سوال کا پہلا جزو آسان ہے۔ دقت اس کے دوسرے حصہ سے شروع ہوتی ہے اور یہی ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

عوام میں اضطراب و بے چینی جب حد کو پہونچ جاتی ہے۔ جب مصائب کے برداشت کرنے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، خصوصاً اُسوقت جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ طبقہ جو نسبتاً خوشحال اور برسرِ اقتدار ہے ان سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتا اور اپنی رنگ رلیوں میں مست اور بے خود ہے تو بدبختی اور بدحالی کا احساس اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ یہ انتقام پر اُتر آتے ہیں اور شر و فساد اور قتل و غارت کا طوفان موجیں مارنے لگ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام الناس کی مصیبت اور افلاس تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انقلاب شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوئے؟ اس کے دو اسباب ہیں، ایک سیاسی اور دوسرا ذہنی۔ سیاسی یہ کہ اگر حکومت مضبوط رہی تو محکوم لاکھ بدحال، بدظن اور مضطرب ہوکر بھی کامیاب بغاوت نہیں کر سکے، ایک قوی اور رجوکس حکومت انھیں اُبھرنے کے قبل ہی دبا دے گی۔ عوام تو درکنار، خواص تک یہاں پر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انقلاب حکومت کو کمزور نہیں کرتا بلکہ یہ خود حکومت کی کمزوری کی علامت ہے۔ بدامنی اور بغاوت زوال پذیر حکومتوں کے لوازم میں داخل ہیں چنانچہ واقعاتِ تاریخ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک مضبوط حکومت کتنا ہی ظلم کر جائے اور عوام کے حقوق کی کتنی ہی پامالی کرتی رہے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اس کے برخلاف حکومت میں جہاں کمزوری آئی اور معمولی معمولی باتیں فساد برپا کرنے لگیں ــــ دوسری طرف جسے انقلاب کا داخلی یا ذہنی سبب بھی کہہ سکتے ہیں انقلاب اگرچہ عوام الناس کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن درحقیقت چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی کامیابی کے لئے ایک یا چند نباضِ فطرت انقلابیوں کا وجود بھی ازبس ضروری ہے محض عوام کی نکبت و پستی انھیں نہیں اُبھارا کرتی، بلکہ یہ اسوقت اُبھرتے ہیں جب انھیں اپنی پستیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ احساس پیدا کرنے والے یہی چند انقلابی ہیں اور اسکی ہولنائیوں کے ذمہ دار یہی چند اشخاص قرار دئے جا سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی حسی قوت بہت تیز ہوتی ہے اور اپنے ماحول سے یہ بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں وہی مصائب جو عوام پر کچھ اثر نہیں کرتے انھیں مضطرب کر دیتے ہیں ان کا اضطراب دوسروں کو اُبھارتا ہے پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ پہلے کے خوشحال اور برسرِ اقتدار طبقہ کی دنیا دفعتاً بدل جاتی ہے۔ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عنانِ اقتدار انقلابیوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ درحقیقت انقلاب کا مقصد پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی غرض محض تخریب ہے تو اس کے کامیاب ہونے میں کیسے شک ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ متداول انقلاب پسند جماعت کہا بھی کرتی ہے کہ تعمیری اقدام کے لئے موجودہ فرسودہ نظام کا انہدام ضروری ہے۔ بنابریں ایک کامیاب انقلاب کے لئے کشت و خون، قتل و غارت لازمی شرط ہے۔

مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہے اور اس پر ذرا وضاحت سے بحث نامناسب نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے کہ میرے اس قول پر کہ انقلاب اپنے تعمیری مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنوں میں اسے رجعت پسندانہ اقدام سمجھنا چاہئے، قارئین کو تعجب ہو۔ لیکن گزشتہ انقلابات کا مطالعہ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کررہا ہے۔ اسوقت میرے پیشِ نظر کم از کم پانچ ناکام انقلابوں کی روداد یں ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طبقوں کی نزاع باہمی کے نعرے محض عوام کو فریب دینے کے طریقے ہیں، جس سے ملک بجائے فایدہ کے سخت نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ عوام جو کچھ کرگزرتے ہیں وہ محض فوری جوش و خروش کا اثر ہوتا ہے۔ تخریب کے لئے تو یہ حربہ کارگر ہوسکتا ہے۔ لیکن تعمیری اقدام تاوقتیکہ بہت غور و فکر اور نہایت سنجیدگی سے کام نہ لیا جائے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت عوام نظامِ حکومت، نظامِ تمدن نظامِ معاشرت وغیرہ کو کامیابی کے ساتھ تاخت و تاراج توضرور کردیتے ہیں لیکن جب تعمیر کی نوبت آتی ہے تو ان سے بنائے کچھ نہیں بنتا اور ایک سربرآوردہ منظم جماعت کے ہاتھ پر انھیں بیعت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ چند نفوس محض اپنے تفوق کے لئے (Class Struggle) کے نعرے لگا کر عوام کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خود غرض جماعت ملک و قوم کا کتنا درد اپنے سینہ میں رکھتی ہوگی؟ اور اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ جو کچھ یہ کرتی ہے خلوصِ دل اور قوم کی محبت کے سبب سے کرتی ہے، پھر بھی اس کی نااہلی منزلِ مقصود تک اسے پہونچنے نہیں دیتی۔ اور نادانوں کی دوستی عقلمندوں کی دشمنی سے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ میں انقلاب کو رجعت پسندانہ تحریک کہہ گیا ہوں۔ پہلے اسی پر ایک نظرِ غایر ڈال لینی چاہئے۔

عوام میں اضطراب، ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی، حقوق کی پائمالی اور حکمران طبقہ کا ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کی بنا پر تقویت حاصل کرتا ہے اور انھیں شکایات کو دور کرنے میں وہ کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی تو حکومت ان کے کچھ مطالبات قبول کرکے ان کی اشک شوئی کردیتی ہے اور کبھی انھیں خاموش رکھنے کے لئے ان کا رویہ اور بھی جابرانہ ہوجاتا ہے۔ غرض یہ کہ حاکم و محکوم میں ایک طرح کا مول تول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ ہزار کچھ نہ ہونے پر بھی عوام کچھ نہ کچھ فایدہ اُٹھاتے ہی جاتے ہیں اور حکومت آہستہ آہستہ ان کے مطالبات قبول کرتی جاتی ہے کیونکہ ایک بار عوام میں پستی کا احساس ہوجانے کے بعد کوئی قوت بھی اسے نہیں دبا سکتی اور ذہنی انقلاب بڑی بڑی سلطنتوں تک کے پایۂ عزم و ثبات کو متزلزل کردیتا ہے لیکن اسی دوران میں قوم میں ایک ایسی جماعت بھی پیدا

ہوجاتی ہے جسے عام طور سے "گرم دل" کہتے ہیں اس کے افراد فطرتاً جوشیلے اور رجعت پسند ہوتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ جتنا بھی جلد ہوسکے ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاکر حکومت کا خاتمہ کردینا چاہئے جس کا طریقہ سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے انھیں دوسرا نہیں نظر آتا۔ عوام میں اتنی صلاحیت کہاں کہ تدریج و میانہ روی کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ ذرا شہ پاتے ہی یہ اُبل پڑتے ہیں، اگر حکومت میں کچھ دم خم ہوا تو بغاوت دبا دی گئی اور اس سختی سے انتقام لیا گیا کہ ایک زمانہ کے لئے ترقی کی ساری اُمیدیں خواب و خیال ہوکر رہ گئیں اور اگر حکومت کمزور ہوئی تو پورے ملک میں شر و فساد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور عوام الناس کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی گھن کی طرح پس جاتی ہے۔ نئی حکومت چونکہ خون کا دریا بہا کر اقتدار حاصل کرتی ہے۔ قیامِ حکومت اور انتظامِ سلطنت کے لئے بھی اسے کشت و خون ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے، شروع میں تو عوام کی مدد سے۔ عوام کے نام پر اور عوام کا ایک جزو بنکر یہ اُٹھتی ہے۔ لیکن قوت حاصل کرتے ہی اسکے اور جمہور کے درمیان پھر پہلا جیسا بعد المشرقین حایل ہوجاتا ہے ابتدا میں تو عوام اس تبدیلی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تازہ کامیابی سے ان کی آنکھیں چوندھیائی رہتی ہیں۔ اور وہ اس امیدِ موہوم پر بھولے رہتے ہیں کہ جب حکومت ہی ہماری ہوگئی تو پھر مطالبات کا کیا ذکر؟ جو چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے کرلیں گے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ من مانی کر بھی لیتے ہیں لیکن بہت جلد ان پر روشن ہوجاتا ہے کہ کوئیں سے نکل کر یہ کھائی میں جا گرے ہیں۔ انقلابی حکومت استحکام پاتے ہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پہلی حکومت میں تو خیر پشتہا پشت کے اشرافیت کی بعض خوبیاں بھی تھیں "ان نو واردوں" میں تو اس کا شمہ بھی نہیں ہوتا۔ ولولہ و جوش، عزم و ثبات کی تو فراوانی ہوتی ہے لیکن وہ محاسن جو شرفا کے طرۂ امتیاز اور انسانیت کے جزو لاینفک ہیں ان کے پاس مطلق نہیں ہوتے۔ دولت و حکومت کا نشہ انھیں کچھ اس طرح مخمور کردیتا ہے کہ دوسروں کو یہ بالکل بھول جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے ہر ممکن جبر و تعدی کو بروئے کار لانے میں نہیں چوکتے۔ عوام اس وقت چونکتے ہیں جب حکومت کی زنجیریں انھیں اچھی طرح جکڑ چکتی ہیں۔ مزید براں عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے عموماً حکومت کوئی ایسا کھلونا بھی پیش کردیتی ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر یہ اس میں محو ہوجاتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد چونکہ فوراً ہی ملک پر بیرونی حملے شروع ہوگئے تھے پورے ملک کو غنافی الجد و جہد ہوجانا پڑا۔ انقلاب روس کے بعد کچھ دنوں تک تو خانہ جنگی جمہور کو بہلائے رہی اور اس کے بعد جو لوگ ذرا چونکے تو اصلاحات کے بعض کھلونے ان کو دیدیے گئے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اتنی سخت پابندیاں بھی عاید کردی گئیں کہ یہ چوں چرا تک نہ کرسکے۔ پھر یہ تو ممکن ہے کہ اس طرح ان کی معاشی حالت کچھ درست ہوجائے۔ لیکن ذہنی موت تو یقیناً ہوجاتی ہے، شہری زندگی کا بالکل خاتمہ ہوجاتا ہے اور انسانیت کی منزل سے اُتر کر یہ حیوانیت کے قریب تر آجاتے ہیں۔ اور اس طرح انقلاب کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ ملک کی رفتار اگر پیچھے کی طرف مراجعت نہیں کرجاتی تو رک یقیناً جاتی ہے۔

انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے افسانے آج گھر گھر دہرائے جا رہے ہیں اور بنی آدم کے لئے انھیں ایک غیر مشروط چیز سمجھا جا رہا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انھیں کو بطورِ شہادت پیش کرتا ہوں:

تفصیلی بحث کی اس مضمون میں گنجایش نہیں ہے، انقلاب کے بعد واقعات کی طرف محض اشاروں پر اکتفا کرونگا لیکن اس کے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انقلابِ فرانس اور اس کے واقعات انقلاب پسند جماعت کے طفیل کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ حقیقت سے زیادہ ان میں جذبات کا اثر حلول کر گیا ہے۔ چند ناموں اور چند مقولوں کو اس طرح اُچھالا گیا ہے کہ ان میں ایک خاص کیفیت اور عظمت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ میرے خیالات جو عام اندازِ گفتگو کے بالکل برعکس ہیں، بعض حضرات کو مضحکہ خیز معلوم ہوں اور بعض طیش میں بھی آجائیں لیکن گزارش احوال واقعی ضروری ہے۔

اہلِ نظر سے انقلابِ فرانس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں گے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی طبقۂ امرا کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ شاید ہی کسی ملک میں عوام کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہو اس میں مطلق مبالغہ کو دخل نہیں ہے کہ سچ مچ انھیں جانور سمجھا جاتا اور یہی سلوک کیا بھی جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ فرانس کے لئے یہ بدحالی کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ لوئی شانزدہم کے زمانہ میں (جس کے عہدِ حکومت میں انقلاب ہوا) عوام کے مصائب میں کوئی خاص اضافہ ہی ہوا بلکہ اس دور میں تو حکومت انکے مصائب و افلاس کو دور کرنے کی تدابیر و ذرایع بھی تلاش کرنے لگ گئی تھی۔ پھر بھی انقلاب ہوا تو اس دور میں۔ جس کی وجہ وہی ہے جو مندرجۂ بالا سطور میں عرض کر آیا ہوں، یعنی ایک تو حکومت میں کمزوری آ گئی تھی۔ دوسرے روشو اور والٹایر کا جادو اسوقت تک عوام پر کافی اثر کر چکا تھا۔ ملک کو اپنی پستی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور عوام اپنی نکبت و بدحالی کے احساس سے مضطرب ہو رہے تھے اس میں جو کمی تھی وہ ۱۷۷۵ء کے سہ سالہ قحط نے پوری کر دی ٹرگوٹ (Turgot) کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تباہ کن قحط سالی بھی تھی۔ ورنہ اس کے اصلاحات سے طبقۂ امرا کی رعونت بہت کم ہو جاتی اور عوام الناس کے حقوق کافی حد تک محفوظ ہو جاتے لیکن ایک طرف پادریوں اور نوابوں کی مخالفت اور دوسری طرف قحط کے باعث حکومت کی مشکلات نے ٹرگوٹ کا ناطقہ بند کر دیا اس کے بعد نیکر (Necker) بھی انھیں مشکلات کی بنا پر اپنے اصلاحات کو بروئے کار لانے میں ناکام رہا۔ لوئی شانزدہم کو بھی اتنا موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا اس غریب کی خامی محض اس کی کمزوری تھی۔ ورنہ اگر امرا پر اس کا بس چلتا تو بات اتنی نہ بگڑتی۔ حکومت کے مالیات میں کمی اور محکوم کی بے چینی کے سبب سے یکے بعد دیگرے وزرا تبدیل ہو رہے تھے۔ اور کوئی بھی حکومت کی کشتی کو پار لگاتا نظر نہیں آتا تھا آخر کار ۱۷۸۸ء میں قلمدان وزارت پھر نیکر (Necker) کے سپرد کرنا پڑا۔ نیکر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کرنے سے یہ ڈوبتی ہوئی کشتی اُبھر سکتی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں اس نے باوجود شدید مخالفت کے Stat...

ا General) کا انتخاب کراہی لیا۔ پورے ملک میں اس کی مخالفت سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جگہ جگہ انجمنیں قایم ئیں اور حکومت کو کھلی ہوئی دھمکیاں دیجانے لگیں۔ پھر بھی امراء ہی میں ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو حکومت کی ور اندیشی کی قایل اور ہر طرح اس کی امداد پر کمربستہ تھی۔ ڈیوک آف اورلینس (Duke of Orleans) ں جماعت میں بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ (States General) نے آئین و قوانین ہی میں نہیں ملک کے (Constitution) تک میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اگر یہ قایم رہ جاتیں تو صدیوں کی چند سری حکومت (Oligarchy) فوراً جمہوریت میں مبدل ہو جاتی لیکن امرا کی مخالفت کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ ور لوئی نے ان اصلاحات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر بھی اس سے انکار ناممکن ہے کہ سب کچھ ہونے پر بھی حکومت جمہور کے مطالبات کے سامنے بہت جھک گئی تھی اور انھیں کچھ نہ ملنے پر بھی بہت کچھ حقوق مل گئے تھے۔ اس عہد کو اگر نصف صدی پہلے کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو حقیقت کھلے۔ لوئی چہاردہم کے قول L'etat, C'est moi (ریاست سے مراد میں ہوں) کا مقابلہ اس عہد کے نعرہ L'etat, C'est nous (ریاست سے مراد ہم ہیں) سے کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوام کی آواز کہاں تک پہونچ چکی تھی۔ امرا اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ اب ان کے اقتدار کے چند گنے ہوئے دن رہ گئے ہیں اور بہت جلد جمہور کے مطالبات کے سامنے انھیں سر تسلیم خم کر دینا پڑے گا۔

جب اہالیان شہر کو معلوم ہوا کہ (States General) کے مطالبات ٹھکرا دئے گئے ہیں اور نیکر (Necker) بھی برطرف کر دیا جانے والا ہے۔ تو ان میں آگ سی لگ گئی۔ جا بجا مظاہرے شروع ہو گئے اور محل شاہی کے سامنے ان کی ایک بہت بڑی جماعت اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ لوئی کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اگر اس کا دل عوام کی طرف تھا تو دماغ پر خواص قبضہ کئے ہوئے تھے۔ غرض عجیب کشمکش میں غریب کی جان تھی۔ بہرحال موقع کی نزاکت کو سمجھ کر (States General) کے مطالبات اسے قبول کرنے ہی پڑے ــــ لیکن اس کے سوا اب اور کیا کہا جائے کہ ناعاقبت اندیش امرا اور عوام کے جوشیلے اور عجلت پسند لیڈروں کا برا ہو کہ بات بنکر بگڑ گئی۔ ایک طرف امرا کی سازشیں نخوت و بد دماغی اور دوسری طرف خود غرض لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ کھلی ہوئی بغاوت کی تبلیغ۔ نفرت و بیزاری کی آگ پر تیل چھڑک رہی تھی۔ اگر ایک طرف غیر ملکی رجمنٹوں کی آمد کا انتظار تھا۔ تو دوسری طرف انقلابی رہنما بھی کسی بہانہ کے منتظر تھے۔ آخر قوم فروش امرا نے لوئی پر اتنا دباؤ ڈالا اور اس بدبخت کو اس طرح بہکایا کہ وہ نیکر کو برطرف کرنے پر رضامند ہو گیا۔ انقلابی تو موقعہ کی تاک میں تھے ہی۔ جولائی ۱۷۸۹ء کی بارہ تاریخ کو نیکر برطرف کیا گیا اور دفعتاً بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورے ملک میں بھونچال سا آ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی دنیا الٹ گئی ہے۔ انسان درندوں میں مبدل ہو گئے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ جب عوام کا جوش غضب ذرا سرد پڑا اور قتل و غارت کا

طوفان تھا تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہ کہیں عوام کے حقوق کا پتہ ہے اور نہ ان کے مطالبات کا ذکر۔ اگر ہیں تو چند فتنہ انگیز خطیب ولیڈر، حکومت ہے تو ان کی اور حقوق ہیں تو ان کے۔ غرض چند انفاس کی مکاریاں اور سفاکیاں مسلسل چھ سال تک پورے ملک پر چھائی رہتی ہیں۔ حکومت کے لئے آئین بھی بنتا ہے۔ نظم و نسق کے لئے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں لیکن جمہور کو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ فاقوں کا مارا جیسے کھانے پر گرتا ہے۔ یہ بھی آزادی پر ٹوٹ پڑے اور تمام پابندیوں سے آزاد ہوگئے اور ایک دفعہ فرانس میں (State of Nature) کا دور دورہ ہوگیا۔ لیکن یہ روشو (Rousseau) نہیں (Hobes) کا (State of Nature) تھا۔

۱۷۹۵ء تک فرانس پر کیا گزری۔ ہم لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ اسے انقلاب نہیں قتل و غارت کا گرداب سمجھنا چاہئے۔ چھ سال کی یہ خونچکاں داستان مشتمل ہے صرف سازشوں اور باہم ریشہ دوانیوں پر یا اسے قدرت کا انتقام کہئے کہ انقلابیوں کی ہر جماعت دوسری جماعت کی دشمن بن کر سامنے آئی اور سب کے سب آپس ہی میں کٹ مر کے رہ گئے جو پارٹی بھی غالب آتی اپنے پیش رو کو موت کے گھاٹ اُتارتی آتی۔ غرض یہ کہ مسلسل چھ سال تک فرانس میں پے درپے انقلاب ہوتے رہے (Robespierre) کی عبرت ناک موت کے بعد بدنصیب ملک کو طوفانِ انقلاب سے ایک گونہ نجات ملی اور فرانسیسی حیوانیت سے انسانیت کی طرف آہستہ آہستہ رجوع کرنے لگے۔ جون ۱۷۹۵ء میں گیارہ لوگوں کے کمیشن (The Commission of the Eleven) نے جو دستور العمل پیش کیا اور جس کی رو سے حکومت پانچ افراد کی ڈائرکٹری کے تحت میں آگئی۔ اس پر لفظ قانون کا اطلاق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہاں بھی ذاتیات اور خود پرستی، مآل اندیشی اور وطن پرستی پر غالب رہیں ۱۷۹۷ء میں ڈائرکٹری کی حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ پھر پہلا جیسا انراج (Anarchy) کا دور بہت قریب نظر آنے لگا۔ لیکن عین اسی وقت نپولین بوناپارٹ میدانِ کارزار سے فرانس کی سیاسی بساط پر آموجود ہوا اور جس طرح اس نے ملک کو تاج داران یورپ کے شعلۂ انتقام سے بچایا تھا، یہاں بھی خانہ جنگیوں کا قلع قمع کردیا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ فرانس کے لئے نپولین کی اٹھارہ سال کی حکومت رحمتِ ایزدی سے کم ثابت نہیں ہوئی، فرانس اس دور پر بجا طور سے ناز کرسکتا ہے۔ لیکن کیا انقلابِ فرانس کا مقصد یہی تھا کہ ایک نپولین پیدا کرکے خاموش بیٹھ جائے؟ کیا ۱۷۸۹ء میں انقلابیوں کا یہی مطمح نظر تھا کہ لوئی شانزدہم کی جگہ کسی نپولین کے قالب میں لوئی چہاردہم کی روح اپنی پوری شانِ رعونت کے ساتھ فرمانروائی کرنے لگے؟

تعمیر کو تو بالائے طاق رکھئے۔ اپنی تخریب تک میں انقلاب افسوسناک طریقہ سے ناکام رہا۔ اشرافیت جسے اسنے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہا تھا۔ نپولین کے دور میں پھر عود کر آئی۔ اگرچہ اس کے زمانہ تک اسے صلاحیت کی اشرافیت (Aristocracy of merit) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے بعد بوربون خاندان کے

دوبارہ تخت نشین ہوتے ہی پرانی اشرافیت اپنی تمام قدیم روایات کے ساتھ پھر ملک پر مسلط ہوگئی۔ ۱۸۳۰ء میں پھر انقلاب ہوا لیکن ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے مقابلہ میں اسے صرف حکومت میں تبدیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور حقیقی معنوں میں اسے فرانس کے جمہوری نظام کی پہلی ارتقائی سیڑھی سمجھنا چاہئے۔ لوئی فلپ چونکہ ہزار کچھ ہونے پر بھی بوربون خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ زمانہ کے بدلے ہوئے تیور نہ پہچان سکا۔ آخر ۱۸۴۸ء پھر ریپبلک حکومت قایم ہوئی، جو تاریخ میں دوسری ریپبلک کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اسے ریپبلک کہنا، ریپبلک پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا صدر، ایک ایسا شخص تھا جو اس وقت جمہوریت نہیں، شہنشاہیت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ بہرکیف اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عوام کی آواز اب بہت باثر ہوگئی تھی اور یہ ریپبلک ان کی شاندار فتح کہی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۲ء میں یہ ریپبلک شہنشاہیت میں پھر بدل گئی لیکن ضرور تھا کہ یہ ایسی شہنشاہیت تھی جسے جمہور خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ فرانس میں شہنشاہیت کا سنبھالا یا اس کی آخری ہچکی تھی جو ۱۸۷۰ء میں شاید ہمیشہ کے لئے دفن کردی گئی۔

مندرجہ بالا سطور سے مقصد صرف یہ دکھلانا تھا کہ ۱۷۸۹ء کا انقلاب نہ محض ناکامیاب ثابت ہوا بلکہ ملک کی رفتار ترقی اس کی وجہ سے اگر سو سال نہیں تو پچاس سال پیچھے ضرور پڑ گئی۔ اگر فرانس ۱۷۸۹ء میں انقلاب کی لعنت میں گرفتار نہ ہوتا اور اسکے رہنما انگلستان والوں کی طرح تدریجی ترقی کے قایل ہوتے، جیسا کہ ۱۸۳۰ء سے ان کا رویہ ہوگیا۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ۱۸۷۰ء کے بہت پہلے جمہوریت یا (Constitutional Monarchy) قایم ہوجاتی۔

Prevost نے خوب کہا ہے "اگر جرمنی میں اصلاحات کی ابتدا ہوئی تو انتہا میں یہ انگلستان تک پہونچی۔ لیکن فرانس نے انقلاب کے دعوے دنیا کے سامنے پیش کئے اور خود اس کی بے راہ روی کا شکار بنتا رہا"

سطور بالا میں عرض کر آیا ہوں کہ ہرچند انقلاب، عوام کے ذریعہ سے وقوع پزیر ہوتا ہے لیکن چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں، انھیں کی تحریر و تقریر عوام میں احساس پستی پیدا کرکے انھیں انتقام پر آمادہ کردیتی ہے اور یہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ ایسے لوگ عموماً دو قسم کے جذبہ سے متاثر رہتے ہیں۔ ایک تو محض انسانیت کی خدمت کا خیال یعنی عوام کی پستی کو دور کرنے کی کوشش اور دوسرا خود غرضانہ یعنی اپنے مفاد کے لئے عوام میں جوش پیدا کرنا اور اقتدار حاصل کرلینا، لیکن سنجیدہ نگاہی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ دونوں اپنے مقصد سے منزلوں دور رہجاتے ہیں۔ انقلابی نہ تو عوام کے درد کا درماں کرپاتے ہیں اور نہ خود اپنے اقتدار کی محافظت کرسکتے ہیں۔ اول الذکر کی ناکامی کا سبب تو یہی ہے کہ تخریب سے تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا اور وقتی جوش و ولولہ سنجیدہ و مفکرانہ اقدام کے مترادف

نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ انقلاب فرانس کے واقعات اس پر شہادت دے رہے ہیں کہ عوام کس بری طرح ناکام رہے اور ملک کو ان کی بے راہ روی کی بدولت کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن سب سے بڑی ناکامی اُسی جماعت کو ہوتی ہے جو اپنے اقتدار کے لئے عوام سے آلۂ کار کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں تو یہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن وہی حربہ جو یہ اپنے پیش رو کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ بہت جلد اس کے خلاف بھی اُٹھایا جاتا ہے اور جس طرح عوام کو ورغلا کر یہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتی ہے۔ اس کے مخالفین بھی اُسی طرح (Class Struggle) کے نعرے لگا کر اور اسے رجعت پسندی کا خطاب دیکر خود ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک دفعہ عوام کا شر و فساد اور بغاوت و بدامنی کی طرف مایل ہو جانے کے بعد، احترامِ قانون اور امن و آشتی کی طرف مائل راغب ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ عوام کے مطالبات خصوصاً اُس وقت جبکہ ایک غیر مطمئن جماعت انھیں اُبھارتی رہے لا انتہا ہی حد تک طویل ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لینا کہ جس جماعت نے انھیں اُبھارا تھا۔ ان کے دبا دینے پر بھی قادر ہوگی سخت غلطی ہے۔ انقلاب کی چنگاری جب ایک دفعہ بھڑک اُٹھتی ہے تو دم بہ دم اس کی آگ بڑھتی ہی جاتی ہے اور اُس وقت تک سرد نہیں پڑتی جب تک کہ ملک کے سامنے اس سے بھی مہیب تر کوئی دوسری آفت نہ آ کھڑی ہو، یا خود عوام میں انتہائی قتل و غارت کے بعد اس کا فطری ردِ عمل شروع نہ ہو جائے۔ غرض یہ کہ انقلاب کی لیڈر شپ بڑی تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ہر انتہا پسند جماعت کے بعد ایک انتہا پسند تر جماعت برسرِ اقتدار ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس انتہا پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کوئی حدِ فاصل متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار محض اُسی جماعت پر ہوتا ہے جو غیر مطمئن رہا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ مطمئن اور غیر مطمئن طبقہ کی تفریق تمام و کمال اضافی ہے، جس کی انتہا کبھی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے مقصد میں بھی انقلاب ناکامیاب رہتا ہے اور انقلابی اپنے اقتدار تک کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ روس میں تو ابتک انقلابی برسرِ اقتدار ہیں، لیکن اہلِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ لینن اور اس کے حواریین نے زار اور اس کی حکومت کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو اُس جماعت کو تہ تیغ کیا جس نے سرزمین روس سے زاریت کا خاتمہ کیا تھا۔

گلاب چاند

(نگار) میں گلاب چاند صاحب کے اس مقالہ کے جواب میں کوئی بسیط گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا "انقلاب" کی تحریک کوئی انفرادی حیثیت رکھتی ہے یا اجتماعی۔ اگر انفرادی نہیں ہے تو یقیناً اس کی بنیاد صرف جذبۂ اصلاح یا طلب مداوائے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اب رہا یہ امر کہ اس تحریک کی قیادت کرنے والے غلطی یا خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں، سو اس سے اصل تحریک کا نقص ثابت نہیں ہو سکتا ـــــ علاوہ اسکے ایک بات اور دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ انقلاب کا سبب زیادہ تر اقتصادی عدم توازن ہوا کرتا ہے اور اس کو دور کرنا آسان کام نہیں۔ ہزارہا سال کے جذبۂ ملوکیت و سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ابھی کم از کم سیکڑوں برس درکار ہیں اور ظاہر ہو کہ اس کوشش میں غلطیاں بھی ہونگی، خود غرض لوگ اس سے ناجائز فایدہ اُٹھانے کی بھی کوشش کرینگے خدا جانے کتنی مرتبہ صورتیں بن بنکر بگڑیں گی لیکن اس مد و جزر کو دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ "انقلاب" کی تحریک ہی بجائے خود غلط ہے، صحیح نہیں۔

راجہ منی

اس اقتصادی کشمکش، اس سیاسی اُلجھن اور اس علمی و انتقادی خشکی کے دور میں بعض وقت کتنا جی چاہتا ہے کہ کاشکے کبھی کبھی چند گھڑیاں اس زمانہ کی بھی میسر آجایا کریں جب انسان "رُوڑھا" نہ ہوا تھا اور ہر چیز کا مطالعہ طفلانہ سادگی سے کیا کرتا تھا۔ وہ پانی کو صرف پانی سمجھ کر اس سے کھیلتا تھا اور اس فکر میں مبتلا نہ تھا کہ اس میں آکسیجن کی مقدار کتنی ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی۔ وہ پھول کو محض پھول جان کر اس سے سرور حاصل کیا تھا اور اسے مطلق خبر نہ تھی کہ رات کے وقت اس کی خوبصورت پنکھڑیوں سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔ وہ چاند کی صرف ٹھنڈک سے لطف اُٹھاتا تھا اور یہ منحوس بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ یہ ایک مُردہ کرہ ہے۔

آج ہمارے فسانوں میں انتقاد و علمیت ہے، نفسیات و سیاست ہے، طبیعیات و ریاضی ہے اور خدا جانے کیا کیا اسی طرح کی بہت سی ثقیل چیزیں موجود ہیں، لیکن اُس "معصومیت" کا پتہ نہیں جو ہماری کہانیوں میں پائی جاتی تھی۔
آپ بھی میری طرح شاید گھبرا اُٹھے ہوں گے اس لئے آئیے ہم آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے اس "مشین و عقل" کی دُنیا کو چھوڑ کر پھر اس عالم کی سیر کریں، جہاں فقیر کی دُعا سے بادشاہوں کے اولاد ہوجایا کرتی تھی اور جہاں شاہزادے ہمیشہ چوتھا ممنوع راستہ اختیار کرکے پریوں کی بستی میں پہونچ جایا کرتے تھے۔
ہمارے عزیز دوست حیات اللہ انصاری کو خدا خوش رکھے کہ ان کی وساطت سے کبھی کبھی یہ بھولی ہوئی دنیا پھر یاد آجاتی ہے۔

گہے طفلے شود مستانہ می رقص !

نیاز

سات دریا پار ایک ناگ دیس تھا جہاں کے بسنے والے رات کو کام کاج کرتے اور دن کو سوتے تھے۔ یہاں ناگ راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا حکم سمندر کے گھڑیالوں جنگل کے شیروں اور آسمان کی چڑیوں پر بھی چلتا تھا۔ اس کے پاس دیوتاؤں کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک نہیں تھا تو لڑکا ہی نہیں تھا جو اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھتا اور اُس کے راج کا مالک بنتا۔ راجہ اسکے کارن ہر وقت اُداس رہتا اور سادھوؤں اور بیراگیوں کی سیوا میں لگا رہتا۔ ایک بار اس کی سیوا سے خوش ہوکر ایک سادھو نے دعا دی کہ "جا، نو مہینے کے بعد تیری رانی کے ایسا سندر پتر ہوگا جسے دیکھے چندرماں شرما جائے اور پریاں بل بل جائیں"

سادھو کا کہنا پورا ہوا اور نویں مہینے رانی ایسا لڑکا جنی جو خوبصورتی میں چاند کا ٹکڑا اور ہیرے کی مورت معلوم ہوتا تھا خبر سنتے ہی راجہ نے خزانوں کا منھ کھول دیا اور اتنا سونا چاندی لٹایا کہ رعایا میں کوئی غریب نہیں رہا۔

راجہ نے اس کا نام راجکمار ہنسی رکھا اور اس کے رہنے کو ایک گنگا جمنی محل بنوایا جہاں روشنی کو ہیرے اور لال کے چاند سورج جڑوائے اس میں ایک باغ لگوایا جس میں ساری دُنیا کے سدا پھل اور سدا بہار درخت تھے۔ پھر بدیس کے سندر سے سندر لونڈی غلام منگوا کے وہاں رکھے اور ان کو حکم دیا کہ خبردار میرے راجکمار کی کسی بات پر نہیں نہ ہو۔ راجکمار اس محل میں اس طرح پروان چڑھا جیسے کلی کی گود میں پھول یا سیپی کے سینے میں موتی پروان چڑھتا ہے۔ راجکمار جب دس برس کا ہوا تو وہ ایسا سندر نکلا کہ جہاں جاتا وہاں اُجالا ہو جاتا اس کی سندر آنکھوں سے ہیرے کی ایسی جوت نکلتی اور چہرے سے سورج کی ایسی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

راجکمار ہنسی کی کسی بات پر نہیں نہ ہوتی۔ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر آسمان سے تارے اور سمندر کی تہ سے موتی آسکتے تھے مگر اس پر بھی راجکمار اُداس اُداس رہتا تھا اور باغ میں ایک ہرسنگھار کے درخت کے نیچے دن دن بھر چُپ بیٹھا رہتا تھا۔ راجہ کو اس کی بڑی فکر تھی مگر وہ کسی طرح راجکمار کو خوش نہ کرسکا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ راجکمار ہنسی شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور ایک گاؤں کے پاس ٹھہر کر ان کے آنے کی راہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں گھٹا گھر آئی اور پیٹ پیٹ کر پانی برسنے لگا۔ راجکمار گھوڑے کو درخت کے نیچے باندھ کر آپ ایک جھونپڑے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس جھونپڑی میں رہتا تھا ایک چڑیمار۔ جس وقت راجکمار اس کی جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا اُس نے اندر اپنی بیوی سے کوئی کام کو کہا بیوی نے کہا میں نہیں کروں گی۔ اس پر چڑیمار نے اُس کو بُرا بھلا کہا بیوی نے بھی غصہ میں آکر برابر کا جواب دیا اور دیر تک دونوں میں جھگڑا ہوتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں چڑیمار کی بیوی اپنا قصور سمجھ گئی اور اُس نے اپنے شوہر سے معافی مانگ لی دونوں گلے مل گئے اور خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ راجکمار بھی ان کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس وقت راجکمار کے ساتھی اس کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے آپہونچے تھے اور یہ دیکھ کر کہ راجکمار کچھ باتیں سن رہا ہے ہاتھ باندھ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ راجکمار نے ان میں سے ایک کو پاس بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھی نے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا:

"مہاراج، یہ لوگ چڑیمار ہیں اور آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں"

راجکمار نے آج تک "جھگڑنے" کا لفظ ہی نہیں سُنا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ میں اتنا بڑا ہو گیا اور آج تک نہ کسی سے جھگڑا کیا اور نہ ملاپ کر کے چڑیمار کی طرح خوش ہوا۔ اب اس کے دل میں یہ سودا سمایا کہ ہم بھی کسی سے کوئی بات کہتے اور چڑیماروں کی طرح وہ بھی اس کے کرنے سے انکار کر دیتا۔ پھر ہم بگڑتے اور وہ بھی بگڑتا اور دونوں خوب جھگڑتے۔ پھر

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ملاپ کر لیتے اور چڑیا اور چڑیارن کی طرح خوش ہوتے۔ راجکمار کو اس کی لگن ایسی لگی کہ اُسنے محل پہونچتے ہی اپنے سب سے زیادہ سیوا کرنے والے نوکر کو بلایا جب وہ آیا تو اس سے کہا:

"جو میں کہوں وہ تو کرے گا"

اُس نے پاؤں چھوکر جواب دیا:

"اگر آپ کی آگیا ہو کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ ڈالوں تو میں اپنا سر کاٹ ڈالوں گا"، راجہ ایسی باتیں روز سنتا رہتا تھا۔ اس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہا " اچھا، تم ہم سے جھگڑا کرو"

یہ سنتے ہی وہ کانپ گیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہنے لگا۔ " مہاراج آپ کے غلاموں کی کیا مجال کہ وہ اس کا خیال بھی جی میں لائیں"

راج کمار نے اس کی بہت خوشامد کی مگر وہ ہاتھ باندھے گردن جھکائے بلا منھ سے ایک لفظ نکالے چپ کھڑا رہا۔ پھر راجکمار نے اس کو بہت ڈانٹا تب اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے مگر اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا

راجکمار نے بگڑ کر اس کو اپنے کمرے سے نکال دیا اور پھر ایک دوسرے نوکر کو بلایا جو راجکمار کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح چلتا تھا جب وہ آیا تو اُس سے کہا:

"جو میں کہوں وہ تو کرے گا"

اُس نے ادب سے پاؤں چھوکر جواب دیا:

" اگر مہاراج کی آگیا ہو کہ میں آگ میں کود پڑوں تو میں کود پڑوں گا"

راجکمار ایسی باتیں ہر وقت سنا کرتا تھا اُس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہنے لگا" ہم سے کسی بات پر جھگڑا کرو"

یہ حکم سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا اور رونے لگا۔ پھر گڑگڑا کر بولا:

" مہاراج آپ کے اس غلام سے کیا قصور ہوا ہے جو اس کو ایسی آگیاں ملی ہے"

راجکمار نے منت کی اور جب نہ مانا تو اُس کو ڈانٹا ڈپٹا وفادار نوکر ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑا رہا راجکمار نے غصے میں آکر اُس کو اپنے سامنے سے دور کیا اور ایک اور نوکر کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا جہاں مہاراج کا پسینہ گرے، وہاں میں اپنا خون بہا دوں راجکمار نے کہا:

" اچھا آؤ ہم تم جھگڑیں"

یہ سنتے ہی وہ پرانی دیوار کی طرح زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا:

"میری ایسی مجال کہاں"۔ راجکمار نے ایک ایک کر کے اپنی سب داس داسیاں بلائیں لیکن ایک نے بھی اسکی یہ اگیاں پوری نہ کی۔ اب راجکمار اتنا اُداس رہتا کہ نہ باغ جاتا اور نہ کھانا کھاتا، دن بھر سر جھکائے بیٹھا رہتا راجہ نے اس کا

دل بہلانے کے لئے مسخرے بھیجے کوئی مور کی طرح ناچتا تو کوئی کوّے کی طرح پھدکتا کوئی شیر کی طرح گرجتا تو کوئی مرغ کی طرح ککڑوں کوں کرتا یہ سب آئے اور اپنے کرتب دکھاتے رہے مگر راجکمار اسی طرح اُداس اپنے خیالوں میں کھویا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا زندگی ہے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ملتا ہے اور جو میں نہیں چاہتا ہوں وہ ملتا ہے،

ایک دن راجکمار کو کچھ خیال آیا اور اس نے دو چوبدار بھیج کر چڑیمار اور چڑیمارن کو بلا بھیجا۔ جب وہ دونوں آئے اور راجکمار کے سامنے کھڑے ہوئے تو ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور چہرے دھلے کپڑوں کی طرح سفید تھے۔ کیونکہ اُنھوں نے زندگی بھر نہ راج محل کو دیکھا تھا نہ کبھی راجکمار کو۔

راجکمار نے ان کی ڈھارس بندھائی اور کہا اگر تم میرا ایک حکم مانو تو میں تمھیں اتنا سونا چاندی دوں گا جو تمھاری سات پشتوں تک چلے۔ چڑیمار نے خوش ہو کر پوچھا مہاراج کی کیا آگیاں ہے۔ راجکمار نے کہا جیسے تم آپس میں جھگڑتے ہو ویسے ہی تم مجھ سے بھی جھگڑو۔

چڑیمار نے کہا کہیں پرجا راجاؤں سے جھگڑ سکتی ہے"

یہ سنکر راجہ ہنسی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سمجھ گیا کہ راجکمار بن کر میں اپنی خواہش نہیں پوری کر سکتا۔

اب راجکمار کا یہ شوق اتنا تیز ہو گیا کہ اُس نے طے کر لیا کہ چاہے جو ہو میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے اسکے کارن اپنا دیس اور راج پاٹ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

اسی دن آدھی رات رہے جب سارے محل میں سوتا پڑا تھا راجکمار ایک سپاہی کا بھیس بدل کر باہر نکلا۔ اور اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین کس راتی رات کسی دور دراز کے دیس کو چل کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے ایک شہر میں پہونچا جہاں کے بازاروں میں ایسی چہل پہل تھی اور لوگ ایسے ملنسار تھے کہ اسکا جی چاہا کہ یہیں رہ جاؤں اُس نے ایک اچھا سا مکان خریدا۔ اور وہاں ایک سوداگر بن کر رہنے لگا۔

پڑوس میں ایک کسان رہتا تھا جس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام کنول تھا جو مور کی طرح البیلی اور ناگن کی ایسی چنچل تھی۔ ایک دن وہ اپنے کوٹھے پر آئی تو دیکھتی کیا ہے اس کے پڑوس والا مکان جہاں پہلے دن کو چمگادڑ اور رات کو بھوت رہتے تھے اب آدمیوں سے بسا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اُچک کر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کمرے میں پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اُس نے کہا اہا اہا یہاں تو ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ کہکر اس طرف کو دگئی اور چپکے چپکے جا کر پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کوئی چادر تانے بے خبر سو رہا ہے اور اس کے پاس چوکی پر ایک کٹورے میں پانی بھرا رکھا ہے اور ایک تھالی میں پان پھول اور عطر رکھے ہیں۔ یہ دبے پاؤں اندر گئی اس نے کٹورے کا آدھا پانی پی لیا تھالی کے آدھے پان کھا لئے، شیشی کا آدھا عطر لگا لیا اور آدھے پھول ہاتھ میں لے کر اپنے گھر چلی آئی۔

سورج ڈوبنے پر راجکمار ہنسی کی آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ کوئی کٹورے کا آدھا پانی پی گیا ہے تھالی کے آدھے پان کھا گیا ہے شیشی کا آدھا عطر لگا گیا ہے اور آدھے پھول لے گیا۔ راجکمار کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس طرح چوری چھپے آیا ہو اور اس کی چیزوں کو بگاڑ گیا ہو۔ اُس نے بچا ہوا پانی پیا اور بچے ہوئے پان کھائے بچا ہوا عطر لگا یا اور بچے ہوئے پھول سونگھے تو اس کو ان میں ایسا مزا ملا جیسا آج تک ان چیزوں میں نہیں ملا تھا۔

دوسرے دن پھر وہی ہوا کہ کنول آئی اور آدھا پانی پی گئی آدھے پان کھائے آدھا عطر لگایا اور آدھے پھول ساتھ لئے اور لوٹنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ سونے والے کا ہاتھ پٹی سے لٹک رہا ہے اور اُس کی اُنگلی پر ایک انگوٹھی چمک رہی ہے کنول نے اپنی اُنگلی کی انگوٹھی اُتار کر اُس کو پہنا دی اور اُس کی انگوٹھی خود پہن کر چلتی بنی۔ جب سورج ڈوبا اور راج ہنسی کی آنکھ کھلی تو دیکھا آدھا پانی آدھے پان آدھا عطر اور آدھے پھول تو غائب ہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آج ہاتھ کی انگوٹھی بھی بدلی ہوئی ہے۔

راجہ ہنسی نے سوچا کہ کچھ ہو اس چور کو ضرور پکڑنا چاہیئے دوسرے دن جب سورج نکلا اور راجہ ہنسی کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تو اُس نے تلوار سے اپنی چھنگلیا کاٹ کر اس میں نمک مرچ بھر لیا کہ اس تکلیف سے نیند نہ آئے اور چادر تان کر سوتا بن گیا۔ جب دوپہر ہوئی تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک لڑکی پری کی ایسی چھریری مور کی ایسی البیلی اور ناگن کی ایسی چنچل چلی آرہی ہے۔

اس کے ہونٹ ایسے لال تھے جیسے طوطے کی چونچ اور آنکھیں ایسی بڑی بڑی تھیں جیسے کنول کے کٹورے وہ بلی کی طرح دبے پاؤں اندر آئی۔ اس نے چپکے سے آدھا پانی پیا، آدھے پان کھائے، آدھا عطر لگایا اور پھر اس کے سرہانے سے آدھے پھول اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ راجہ ہنسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے ایک جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور کود کر الگ کھڑی ہوگئی۔

راجکمار کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ آج تک اس کے ساتھ کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ راجکمار نے ذرا سختی سے کہا "میں تم کو آگیاں دیتا ہوں کہ ادھر آؤ"

کنول، یہ سنکر بگڑ گئی اور کہنے لگی :

"مجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا"

اس کا بگڑنا تھا کہ راجکمار پر چھائی ہوئی گھٹا چھٹ گئی اور اندر خوشی کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ اس نے منتیاں کر کے کنول کو روکا اور اسی دن سے کنول اس کی بیوی ہوگئی۔

راجکمار کے ماں باپ راجکمار کے کھو جانے سے بہت پریشان تھے ان کی بھوک پیاس جاتی رہی تھی اور رات دن ان کا یہی کام تھا کہ اپنے لڑکے کو یاد کر کر کے آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتے تھے۔ بڑے بڑے پنڈت اور جوتشی بلائے گئے

اور ان کو راجکمار کی کنڈلی دکھائی گئی اور بہت پوجا پاٹ کیا گیا۔

راجکمار کی ماں نے کچھ اور سوچا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ ہونہو راجکمار کسی خوبصورت لڑکی کے پھیر میں غائب ہوا ہے اور اس نے اپنے چکر میں اس کو ایسا پھنسا رکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے راج پاٹ کو بھلائے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر مہارانی نے بڑی بڑی کُٹنیاں بلائیں اور اُن سے پوچھا تم کیا کیا کام کر سکتی ہو؟

ایک بولی "میں آسمان میں چکتی لگا سکتی ہوں"

دوسری نے کہا "میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں"

تیسری نے کہا "میں سیپی کے پیٹ سے موتی چرا کر لا سکتی ہوں"

جو سب سے بڑھی تھی چلّا کر بولی "میں پرائی بہو بیٹیوں کو بہلا پھسلا کر لا سکتی ہوں"

رانی نے چوتھی کُٹنی کو بہت پسند کیا اور اس کو اپنے راجکمار کی پہچان بتائی اور روپیہ پیسہ دیکر راجکمار کی کھوج میں بھیج دیا بڑھیا شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلوں محلوں، جھونپڑوں جھونپڑوں، راجکمار کی کھوج میں گھومی گھومی پھری۔ چوہے کی طرح بڑے سے بڑے محل میں گھس جاتی۔ چرندوں کی طرح اونچے سے اونچے قلعہ میں پہونچ جاتی اور شہد کی مکھیوں کی طرح باغوں میں گھومتی آخر گھومتے گھومتے وہ اس دیس میں آئی جہاں راجکمار رہتا تھا اس نے ایک ایک کر کے سب گھر دیکھ ڈالے لیکن راجکمار کا گھر بچ رہا کیونکہ وہ صرف رات کو کھلتا تھا۔ بڑھیا نے جب بھی اس کو دیکھا اندر سے بند پایا۔ اس نے سوچا کہ کیسے لوگ ہیں جو گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی جیل خانے میں۔ اس نے پاس پڑوس والوں سے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے لوگوں نے کہا یہاں ایک سوداگر بچہ رہتا ہے جو صرف رات کو باہر نکلتا ہے۔ یہ سنکر بڑھیا کھٹکی اور سوچی کہ ہو نہ ہو یہی راجکمار ہے۔

جب رات ہونے لگی تو بڑھیا ایک بھکارن بن کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہی، رات گئے جب راجکمار باہر نکلا اور بڑھیا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو پوری وہی صورت پائی جیسی مہارانی نے بتائی تھی۔ بڑھیا دیکھ کر خوش ہوگئی۔

دوسرے دن اس نے چوڑی والی کا بھیس بنایا اور رنگ برنگی چوڑیاں ایک ٹوکری میں رکھکر راجکمار کے گھر کی طرف آئی۔ جب رات ہوئی اور راجکمار باہر چلا گیا تب اُس نے دروازے کے سامنے آکر آواز لگائی۔

"لے چوڑی۔ لے رنگ برنگی چوڑی۔ لے سنہری روپہلی چوڑی"

کنول کو راجکمار کے گھر میں رہتے مہینوں بیت گئے تھے۔ لیکن اس کے دروازے پر کبھی کوئی سودا بیچنے نہیں آیا تھا کیونکہ رات کو جب یہ لوگ جاگتے تھے تو سودے والے اپنے اپنے گھر جا کر سو رہتے تھے۔ اس وقت کنول نے جیسے ہی چوڑی والی کی آواز سنی وہ دوڑی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور چوڑی والی کو بلا کر اندر لے گئی اور جھٹ سے چوڑی پہننے کے لئے اپنے ہاتھ کو بڑھیا کے سامنے بڑھا دیا۔ بڑھیا نے دیکھا کندن کا ہاتھ سونٹے کی طرح بلا چوڑی

کے ہے تب تو وہ ہاتھوں کو دیکھ کر ہنکاری اور کہنے لگی کہ تمھارے میاں تم کو بالکل نہیں چاہتے۔

کنول نے کہا: "واہ واہ وہ تو ہم سے بہت پریم کرتے ہیں"

بڑھیا نے کہا میں نہیں مانتی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارے میاں تمھارا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں اور جھوٹا پانی پیتے ہیں؟

کنول نے کہا "نہیں، ان کی تھالی اور کٹورا الگ رہتا ہے اور میرا الگ رہتا ہے"

بڑھیا بولی: "واہ بچی کہاں پریم کرتے ہیں؟ تب جانوں کہ تم سے پریم کرتے ہیں کہ آج تم اُن کا جھوٹا کھاؤ اور وہ تمھارا جھوٹا کھائیں۔ کنول نے کہا "یہ بھی کوئی بڑی بات ہے؟ آج ہی اپنے میاں سے کہوں گی"

اس دن جب راجکمار اور کنول کھانا کھانے بیٹھے تو کنول نے کہا کہ آؤ آج ہم تمھارا جھوٹا پانی پئیں اور تم ہمارا جھوٹا پانی پیو، یہ سنتے ہی راجکمار کے کان کھڑے ہوگئے اور انھوں نے کہا: "کنول آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہاں کوئی آیا تھا اور اُس نے تم کو کچھ سکھایا پڑھایا ہے" کنول نے سمجھا کہ راجکمار اس طرح بات ٹالنا چاہتا ہے۔ اُس نے جھٹ پٹ کہا۔ نہیں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میں خود سے چاہتی ہوں۔" راجکمار نے اُسے سمجھایا کہ یہ نہ کرو لیکن اس سے جھگڑا نہیں ختم ہوا تب راجکمار نے اپنا کٹورا اُٹھا کر اپنے منھ سے لگایا اور اس طرح جھوٹ موٹ کے گھونٹ پیئے جیسے پانی پی رہا ہو لیکن اس نے پانی نہیں پیا۔ پھر وہ کٹورا کنول کو دیدیا اور اس کے کٹورے کا پانی خود پی لیا۔ کنول خوش ہوگئی۔

بڑھیا اپنے جی میں خوش تھی کہ کنول نے راجکمار کے منھ کا جھوٹا پانی پی کر جان دیدی ہوگی۔ لیکن جب وہ دوسری رات کو سرمہ مستی لئے راجکمار کے گھر آئی تو دیکھتی کیا ہے کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہے اور اُسے دیکھتے ہی تالی بجا کر کہنے لگی کہ دیکھو میں کہتی تھی کہ میرے میاں مجھے چاہتے ہیں۔ کل میں نے ان کا جھوٹا پانی پیا اور اس نے میرا جھوٹا پانی پیا۔

بڑھیا نے کہا: "واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی۔ تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ تم ان کے منھ کا اُگال کھاؤ اور وہ تمھارا اُگال کھائیں"

کنول نے کہا: "اچھا۔ آج یہی ہوگا"

بڑھیا چلی گئی اور اسدن جب راجکمار آیا اور کھانا پینا ہوچکا تب دونوں پان کھا کر باتیں کرنے لگے ویسے ہی کنول نے کہا "تب جانوں کہ تم مجھ کو چاہتے ہو کہ تم میرا اُگال کھاؤ اور میں تمھارا اُگال کھاؤں"

اب تو راجکمار یہ سنکر بڑا چکر میں پڑا کہ یہ بات کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی کنول کو سکھاتا پڑھاتا ضرور ہے۔ اس نے کنول سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کہ یہ باتیں کون بتاتا ہے۔

کنول نے اپنے دل میں کہا کہ میرا میاں مجھے ٹالنا چاہتا ہے اُس نے کہا: "یہاں رات کو مجھے کون سکھانے پڑھانے آئے گا۔ یہاں رات کو صرف چوہے بلی آتے ہیں۔ ان کے سکھانے سے کوئی سیکھے تو سیکھ لے۔ راجکمار نے بہت سمجھایا لیکن کسی طرح وہ نہ مانی۔

آخر راجکمار نے اپنا اُگال اپنے ہاتھ میں لیا اور کنول سے کہا کہ لاؤ اپنا اُگال دو جب کنول نے اپنا اُگال دیا تو اُسنے وہ بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اپنا اُگال آپ کھا لیا اور اس کا اُگال اُس کو دیدیا گیا۔ کنول سمجھی کہ اس نے ہماری بات مان لی اور خوش ہو گئی۔

دوسرے دن جب بڑھیا آئی اور اُس نے دیکھا کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہوئی ہے تو بہت گھبرائی کہ یہ کیا بات ہے کنول اس کو دیکھتے ہی ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ میں کہتی نہ تھی کہ میرے میاں مجھ کو چاہتے ہیں۔ کل ہم نے ان کا اُگال کھایا اور اُنھوں نے میرا اُگال کھایا۔

بڑھیا نے کہا " واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ وہ تم کو اپنی ذات بتادیں" بڑھیا چلی گئی۔ رات کو جب کھانا وانا کھا کر راجکمار اور کنول بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو کنول نے پوچھا کہ تمھاری ذات کیا ہے۔

یہ سنتے ہی راجکمار اُچھل پڑا اور بگڑ کر کہنے لگا دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ نہیں تو ہم تم بچھڑ جائیں گے۔

کنول نے کہا: "میں یہ کچھ نہیں سنتی۔ تم مجھے اپنی ذات بتاؤ"

راجکمار نے اس کی منتی کی گڑگڑایا۔ مگر کنول نے ایک نہ سنی۔ نہ ماننا تھا نہ مانی اور وہی رٹ لگاتی رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

ایک دن سے دوسرا دن ہوا، کنول اٹوار کھٹوار لیکر بھوکی پیاسی ایک کونے میں پڑی رہی راجکمار نے اس کے سمجھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی بار بار کہا کہ یہ بات تم کو کسی دشمن نے سمجھائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم تم بچھڑ جائیں مگر کنول کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے اپنی ذات بتادو، مجھے اپنی ذات بتادو۔

راجکمار نے اس کے لئے رنگ برنگی کپڑے اور طرح طرح کے زیور خریدے۔ موتیوں کے ہار جن کے موتی لال کے انڈے کے برابر تھے اور یاقوت کے بندے جو طوطے کی زبان کی طرح لال تھے لاکر کندن کے سامنے رکھدئے۔ مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور برابر یہی رٹ لگائے رہی کہ مجھے اپنی ذات بتادو۔ اپنی ذات بتادو۔

آخر راجکمار نے کہا میں اپنی ذات اس وقت بتاؤں گا جب میں کمر کمر پانی میں کھڑا ہوں۔ کنول نے کہا چاہے ندی میں کھڑے ہو کر بتاؤ چاہے سمندر میں لیکن مجھے اپنی ذات بتادو۔ میں بلا یہ جانے زندہ نہیں رہ سکتی"

دوسرے دن ڈولا منگوایا گیا۔ اس میں کنول بیٹھی اور گھوڑے پر ساتھ ہوئے راجکمار بنسی اور دونوں گھاٹ پر پہونچے۔ یہاں راجکمار نے کہا دیکھ کنول اب بھی مان جا۔ نہیں تو پچھتائے گی کندن بولی میں کچھ نہیں سنتی۔ راجکمار نے یہ سن کر غصہ سے کپڑے اُتارے اور کمر کمر پانی میں اُتر گیا۔ پھر کہا اب بھی مان جا۔ نہیں تو میرے تیرے بیچ میں سات سمندر ہوں گے۔ نہ تو وہاں جاسکے گی اور نہ پھر میں آسکوں گا۔ کنول بولی میں یہ کچھ نہیں سنتی، مجھے اپنی ذات بتادو۔ راجکمار

بلی یہ سنتے ہی تلملا گیا۔ اُس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور پھر کالا چمکتا ہوا چہرا اور شعلے کی طرح لپ لپ کرتی زبان دریا سے نکال کر بولا:۔

" یہ دیکھ میری ذات۔ یہ دیکھ میری ذات "

پھر پھن اندر کرلیا جہاں راجکمار نے غوطہ لگایا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے گھیرے پانی پر بنے اور دھیرے دھیرے کرکے مٹ گئے۔ راجکمار غائب ہوکر پھر باہر نہ آیا۔

جب راجکمار واپس نہ آیا۔ تب کنول کو معلوم ہوا کہ اُس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ جیسے ساون بھادوں میں کالی گھٹائیں جھڑی لگا دیتی ہیں ویسے ہی کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب روتے روتے اُسے کئی دن بیت گئے تو اُس کے جی میں آیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ اُٹھ کر دریا کی طرف دوڑی اور کود پڑی۔ دو چار ڈبکیاں کھاکر بے ہوش ہوگئی ایک مچھلی یہ سب لیلا دیکھ رہی تھی اُسے کنول کی بپتا پر ترس آگیا۔ اُس نے کندن کو اپنی پیٹھ پر لاکر سات سمندر پار ناگ دیس پہونچا دیا۔

کنول کی جب آنکھ کھُلی تو دیکھتی کیا ہے کہ میں ایک بہت بڑے جنگل میں پڑی ہوں۔ جنگل کے پیڑوں پر پھل پھول تمام ہیں مگر پتی ایک بھی نہیں اور ڈالیاں سانپ کی طرح بل کھاتی آپس میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کنول اُٹھکر ایک طرف چلی۔ چلتے چلتے ایک آبادی کے باہر ایک کنوئیں کے پاس پہونچی۔ جہاں چار پانچ سندر سندر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ کنول چلتے چلتے تھک کر چور ہوگئی تھی اور اس کا گلا پیاس سے سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ اُس نے جگت کے پاس جاکر ایک لڑکی سے کہا " بہن مجھے پانی پلادے "۔ اُس نے کہا " ہٹ تجھے اپنی پڑی ہے آج میرا راجکمار نہا رہا ہے جو برسوں کے بعد گھر آیا ہے پنڈت جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ ایک سو ایک گھڑوں سے نہ نہائے گا ہم لوگوں سے مل جُل نہیں سکتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ جلدی سے وہ نہالے تو ہم اس سے ملیں جلیں "

کنول کے کان کھڑے ہوئے اُس نے پوچھا تمھارا راجکمار اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے جواب دیا:۔

" اُسے ایک چالاک عورت نے اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اب ایک بڑھیا اُسے چھڑا کر لائی ہے "

کنول نے منتی کی کہ مجھے پانی پلادو پیاس سے مری جارہی ہوں۔ آخر ایک پانی والی کو ترس آیا اور اُس نے کہا " ادھر آ ۔۔۔ میں پانی پلادوں "

کنول نے پانی پینے میں اپنی انگوٹھی گھڑے میں ڈال دی پانی بھر کر سب لڑکیاں ایک ایک گگری سر پر اور ایک ایک کمر پر رکھ کے محل کی طرف چلیں۔ محل میں راجہ منسی ایک سونے کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ پانی بھرنے والیوں نے اپنے گھڑے لاکر رکھ دئے اور ایک ایک کرکے راجکمار کے سر پر ڈالنے لگیں۔ ایک گھڑے سے انگوٹھی نکل کر راجکمار کی گود میں گری راجکمار نے اُسے دیکھتے ہی چھپا لیا اور کہا:۔ " آخر کمبخت آ پہونچی "

نہا دھو کر ہنسی ٹہلنے کے بہانے محل کے باہر نکلا اور ادھر اُدھر کنول کو دیکھنے لگا۔ دیکھا تو وہ ایک درخت سے لگی کھڑی رو رہی ہے اس کے کپڑے میلے ہیں بال اُلجھے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہیں، اس بُری حالت میں دیکھ کر راجکماری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انھوں نے پاس جا کر اپنی ہتیلیوں سے کنول کے آنسو پونچھے۔ آنسو پونچھنے میں کنول کی آنکھوں کا کاجل ہتیلیوں میں بھر گیا اور اُسے اس کی خبر نہ ہوئی۔

راجکمار نے کہا دیکھ کنول، آج میں اپنی ماں سے کہوں گا کہ گھر میں جھاڑو دینے کو ایک عورت کو رکھ لو وہ پوچھے گی کون عورت ہے تو میں کہوں گا کہ مصیبت کی ماری کہیں باہر سے آ گئی اور یہاں ماری ماری گھوم رہی ہے۔ تب وہ تم کو رکھ لیں گی۔

یہ سُن کر کنول کو تھوڑی سی ڈھارس ہوئی اور وہ راجکمار کے ساتھ ساتھ محل کے پھاٹک تک آئی اندر جا کر راجکمار نے جو کچھ کنول سے کہا تھا اپنی ماں سے کہا: ماں نے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ کر کنول کو نوکر رکھ لیا۔ لیکن راجکمار کی بہنوں نے راجکمار کی ہتھیلیوں میں کاجل بھرا دیکھ لیا اور کھٹک گئیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہنوں نے ایک ڈلیا میں دھان نکالے اور ایک ایک گن کر کنول کو دئے اور کہا اس کو کوٹ لا مگر خبردار ایک چانول نہ ٹوٹے۔

کنول بچاری ڈلیا لئے باہر آئی اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آ نکلے راجہ ہنسی۔ انھوں نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ کنول نے سب حال کہا، یہ سُن کر راجکمار نے جنگل کی چڑیوں کو بلایا اور اُن کو حکم دیا کہ سب دھان کھٹک کر چانول باہر نکال دو چڑیوں نے بات کی بات میں کام پورا کر دیا اور کنول خوش خوش چانول کی ٹوکری لئے ہوئے اندر آئی۔

راجکمار کی بہنیں یہ دیکھ کر کنول سے کہنے لگیں :۔

"یہ تیرا کام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے"

دوسرے دن راجکمار کی بہنوں نے کنول سے کہا دیکھ ہمارے بھیّا کا بیاہ ہو رہا ہے ان کے رہنے کے لئے وہ سامنے والا کمرا جھاڑ بہار کر صاف کر دے۔

کنول جھاڑو لئے کمرے کی طرف گئی، وہاں دیکھتی کیا ہے کہ چھت میں بڑے بڑے سانپ لٹک رہے ہیں اور پھنکاریں مار مار کر آپس میں لڑ رہے ہیں۔

نیچے بڑے بڑے اجگر پڑے ہوئے ہیں اور کونوں میں بچھو اور کھنکھجورے رینگ رہے ہیں یہ دیکھ کر کنول ڈر کر بھاگ آئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آ نکلے راجہ ہنسی انھوں نے جو اُسے روتے دیکھا تو پاس آ کر پوچھا کیا بات ہے اُس نے سب قصّہ کہہ سنایا۔ انھوں نے اپنی انگوٹھی اُتار کر کنول کو دی اور کہا اسے جا کر کمرے میں ڈال دو۔

کنول نے ایسا ہی کیا انگوٹھی دیکھتے ہی سب اجگر سانپ بچھو اور کھنکھجورے بلوں میں گھس گئے۔ کنول نے سب جھاڑ بہار کر صاف کیا اور راجکمار کی بہنوں سے آ کر کہا کہ کمرہ صاف ہو گیا ہے۔

راجکمار کی بہنوں نے جاکر کمرہ دیکھا اسے صاف دیکھ کر حیرت میں آگئیں پھر کنول سے کہنے لگیں:

"یہ تیرا کام نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے"

ہوتے ہوتے راجکمار کی برات کا دن آگیا۔ بیاہ میں ہاتھی گھوڑے شیر اور ریچھ سب ساتھ ساتھ تھے۔ خوب باجے گاجے تھے اور طرح طرح کی آتشبازیاں تھیں۔ راجکمار کی بہنوں نے کنول کو بلاکر پوچھا کہ تم راجکمار کو کتنا چاہتی ہو اس نے جواب دیا کہ ان کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں بہنوں نے کہا ہمارے یہاں رواج ہے کہ جو دولھا کو بہت چاہتا ہے اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں میں کپڑا لپیٹ کر تیل چھڑک دیتے ہیں پھر اس میں آگ لگاکر مشعلچیوں کے ساتھ ساتھ دولھا کے گھوڑے کے آگے آگے رکھتے ہیں۔

بھولی کنول اس پر راضی ہوگئی اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں پر کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر ان پر گھی چھڑکا گیا اور ان میں آگ لگادی گئی اور اسے راجکمار کے گھوڑے کے آگے کردیا گیا جب برات چلی تو یہ بھی چلی۔ اتفاق سے اس کی انگلیوں سے اس کی ساڑھی میں آگ لگ گئی۔ اسے دیکھ کر کسی نے کہا:

"مشعلچن۔ دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں"

کنول اپنے دکھ میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے سنا بھی نہیں پھر کسی نے کہا:

"مشعلچن دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں"

اب کنول چونکی اور چونک کر بولی،

"کپڑے کیا یہاں تن من سب جل رہا ہے" اس کی آواز سن کر راجکمار چونک پڑا اور گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا کیا ہے کہ کنول کی دسوں انگلیاں مشعل بنی ہوئی ہیں اور اس کے بدن میں بھی آگ لگ چکی ہے۔

راجکمار نے جب کنول کو اس بری حالت میں دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک پھنکار ماری جس سے برات کے سارے چراغ مشعلیں اور بتیاں بجھ گئیں اور اندھیرا گھپ ہوگیا اس نے کنول کی بانہہ پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھالیا اور گھوڑے کو بھگاتا ہوا اپنے دیس سے نکل گیا۔ دیس کے باہر پہنچ کر اس نے اپنے بال کاٹ ڈالے جس سے اس میں ناگ بننے کی طاقت نہیں رہی اور وہ معمولی آدمی بنکر کنول کے ساتھ آدمیوں میں رہنے لگا۔

(نیا ادب) حیات اللہ انصاری

اخبار کمپنی کے عہدِ حکومت میں

ہر ملک کی حیاتِ ملی و قومی میں اخبارات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، ہمارا وطن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اگرچہ ہندوستانی اخبارات یہاں کی رائے عامہ کے اتنے پرزور ترجمان نہیں ہیں جتنا مغرب کے یورپ میں اخبارات اُنیسویں صدی کے آغاز ہی میں بہت زور پکڑ چکے تھے اور ان کی بڑی وقعت تھی اسی بنا پر نپولین کہا کرتا تھا کہ "چار مخالف اخبار ایک لاکھ سنگینوں سے زیادہ خطرناک ہیں" ہندوستان میں ایسے خوفناک حربے کی ابتدا اور نشو و نما کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا لیکن قبل اس کے کہ ہندوستانی اخبارات پر قلم اُٹھایا جائے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر مختصراً یہ بھی بتا دیا جائے کہ دنیا میں اخبارات کس طرح وجود میں آئے۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اطالیہ اخبارات کا مولد ہے "ایکٹا ڈای یرنا (Acta Diurna) جس میں روزمرہ کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا اور جس کا حوالہ سنیکا" (Seneca) نے بھی اپنی تصانیف میں دیا ہے دنیا کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ یہ اطلاعات نہایت معتبر اور مستند ہوتی تھیں کیونکہ یہ حکومتِ رومالی طرف سے شایع کی جاتی تھیں لیکن جولیس سیزر کی وفات کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا چامرس (Chalmers) کی تحقیق کے مطابق دورِ جدید کا پہلا اخبار ۱۵۳۶ عیسوی میں نکلا یہ ایک قلمی اخبار تھا اس کا مقصد اہلِ وینس کو وقت کے اہم سیاسی مسایل سے باخبر رکھنا تھا۔ اور ہر ماہ میں صرف ایکبار شایع ہوتا تھا سب سے پہلا انگریزی اخبار "دی ویکلی نیوز" ۲۳ مئی سنہ ۱۶۲۲ء کو نکلا۔

ان ابتدائی اخبارات کے متعلق ایک مدبرانی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے "یہ اخبارات مختصر اعد بودے کاغذ کا ایک پلندا ہوتے تھے۔ جن میں کبھی منگھڑت واقعات اور مشکوک قصوں کا ذکر ہوتا تھا یا لوگوں کی بیجا مدح و ستایش کی جاتی تھی یا مخالفین پر فحش و رکیک حملے ہوتے تھے اُن کی اشاعت پوشیدہ طریقہ سے ہوتی تھی ان کا مطالعہ زیرِ لب ہوتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ خفیہ طور پر ایک سے دوسرے تک پہونچتا تھا"

ہندوستان میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی یہاں نہ ان کی صورت آغاز ہی اس درجہ شکستہ تھی اور نہ ان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے کوئی خفیہ راہ عمل اختیار کرنی پڑی۔

یورپ میں اخبار کے اجرا کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد ہندوستان میں اس کا وجود ہوا اور اس عرصہ میں لوگوں کے زاویۂ نگاہ میں بین تبدیلی اور تغیر ہو چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مستحکم سیاسی قوت بن چکی تھی انتظامی اُمور اور جدید تجارتی مہمات کے لئے انگریزوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان آنے لگی۔

تینوں احاطوں کے صدر مقام کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزوں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی یہ لازمی امر تھا کہ یہ نیا عنصر بہت دور رس نتائج اور اہم تبدیلیوں کا حامل ہوتا۔ سرزمین ہند میں نئے خیالات اور اداروں کی تخم ریزی ہونے لگی اخباری پریس انھیں اداروں میں ایک تھا اس کی ابتدا انفرادی مساعی اور ہمت کی رہین منت ہے، کمپنی نے اس سلسلہ میں کوئی پیشقدمی نہیں کی۔

سنہ ۱۷۶۸ء میں ایک شخص مسمی مسٹر بولٹس ([illegible] Bolts) نے ایک اخباری مطبع قایم کرنیکی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ اس کے منصوبے عملی جامہ پہن سکیں فورٹ ولیم کی کونسل نے اس کو ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیدیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے شخص مسمی جے۔ اے ہکے (J. A. Hickey) نے ایک پریس قایم کیا جس کو پرنٹنگ (چھپائی) پر ایک رسالہ کلکتہ کے جیل میں ملگیا تھا وہ قرضہ کے عدم ادائیگی کے جرم میں ماخوذ تھا اُسنے اس الزام کی تردید کی لیکن وہ اس قدر تند اور جھکی مزاج کا تھا کہ کوئی وکیل اس کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا، بالآخر اس کے ہمنام دوست نے جو "تزک ولیم ہکے" کا مصنف بھی تھا اس کے مقدمہ کی پیروی کا بیڑہ اُٹھایا جسوقت وہ بحث کر رہا تھا، ہکے مجنونانہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اس وکیل کو کچھ نہیں آتا اور میں اپنے مقدمہ کی بحث اور پیروی خود کروں گا، اس صریح ہیجان نے وکیل کو بہت صدمہ پہونچایا اور اُس نے مزید بحث اور پیروی سے انکار کر دیا۔ دوبارہ استدعا پر اس نے مقدمہ پھر اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے دوست کو بری کرا دیا۔

اپنی رہائی کے بعد ہکے نے کلکتہ میں ایک پریس قایم کیا اور سنہ ۱۷۸۰ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ کے نام سے نکالا اس اخبار کے اب صرف دو نسخے موجود ہیں ایک وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں۔ یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول تھا اخبار ہندوستان میں بالکل ایک نئی چیز تھی اور اس لئے لوگ اس کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، طنزیہ قصے اور کلکتہ کے مختلف اشخاص کو جو عرفیتیں دیجاتی تھیں پڑھنے والوں کی دلچسپی کو دوبالا کر دیتی تھیں۔

ایک شخص مسمی مسٹر ٹی ریٹا (T[illegible]) پر جو کلکتہ ہی کے تھے ان کی خود نمائی اور بیجا طمطراق کی وجہ سے سخت حملے ہوتے تھے اس زمانہ میں جب ہندوستان میں معدودے چند انگریز تھے گورنمنٹ ہاؤس کی

محفل رقص و سرود میں ہر شخص شریک ہوتا تھا۔ مسٹر ٹی ریٹا ایسے مواقع پر کبھی نہ چوکتے اگرچہ جون کا مہینہ اور دم گھٹنے والی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔ یہ شخص موزوں قدوقامت کا تھا لیکن بدقسمتی سے ناک بہت بڑی تھی اخبار نے لکھا "نکلول" (Nosey jargon) نے سُرخ مخمل کے سوٹ میں اپنا سالانہ رقص دکھلایا" اس روز سے مسٹر ٹی ریٹا نکلول (Nosey jargon) کے نام سے پکارے جانے لگے۔

اس اخبار میں فحش حملے اور لوگوں کے متعلق بلا تفریق افترا پردازیاں ہونے لگیں اس کے اڈیٹر نے وارن ہیسٹنگز پر بھی جو اسوقت گورنر جنرل تھا حملہ کرنے کی جرأت کی حکومت نے محسوس کیا کہ اس بڑھتی ہوئی وبا کا تدارک کرنا چاہئے اور سرکاری ڈاکخانہ سے اس اخبار کی اشاعت بند کردی پھر بھی اخبار کی اشاعت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حوالی کلکتہ میں بھی چپراسیوں کے ذریعہ اخبار پہونچانے کا انتظام کرلیا گیا آخر کار ہکے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں گرفتار ہوگیا اور اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ہوا اس طرح وارن ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں اس اخبار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور اس شرمناک طریقہ پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ گو اس جابرانہ طریقہ پر یہ اخبار بند کیا گیا تھا لیکن ابھی تک احتساب و نظارت نہیں قایم ہوئی تھی پریس کی کمزور ابتدا اور سست نشوونما ابھی ان پابندیوں اور سختیوں کی متقاضی نہیں تھی۔

بنگال گزٹ کے امتناع نے مزید جرات آزمائیوں کا سلسلہ بند نہیں کیا ۱۷۹۱ء سے ۱۸۵۷ء تک بہت سے انگریزی اخبار جاری ہوئے اِن اخبارات میں جو احاطہ بنگال میں اسوقت جاری تھے کلکتہ جرنل۔ بنگال ہرکارو جان بل کلکتہ کوریر۔ انگلشمین۔ ریفارمر اور فرنڈ آف انڈیا جس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کرتے تھے قابلِ ذکر ہیں۔ ان اخباروں کے مالک و مدیر غیر سرکاری اشخاص تھے، حکومت بنگال کا اپنا ترجمان گورنمنٹ گزٹ الگ تھا دوسرے احاطوں بمبئی و مدارس کے اخباروں میں بمبئی ٹائمس بمبئی کوریر اور مدراس گزٹ قابل ذکر ہیں ان پُرانے اخبارات کے نسخے امپیریل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں اور مطالعہ کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں صرف تھوڑے سے اشخاص کسی انگریزی اخبار کا چندہ دیسکتے تھے۔ جان بُل جیسے روزنامہ کا چندہ چونسٹھ روپیہ سالانہ اور آٹھ روپیہ ماہانہ ہوتا تھا۔ چار صفحات سے زیادہ پڑھنے کے قابل مواد نہ ہوتا تھا اور اس میں بھی زیادہ تر کلکتہ کے آس پاس کی خبریں درج ہوتی تھیں کبھی کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامی پالیسی پر بھی رائے زنی ہوتی تھی اور گاہے گاہے انگریزی رسالوں اور مجلوں کے اقتباسات بھی نکلتے رہتے تھے۔ یہ بیرونی انگریزی پرچے ان لوگوں کے پاس مستقل طور پر آتے رہتے تھے جو ان کے خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے اوایل میں اخبارات ذاتیات اور گالی گلوچ میں بہت زیادہ حصہ لینے لگے ایک اڈیٹر دوسرے اڈیٹر پر حملے کرتا تھا، اس وقت کے سب سے زیادہ مقبول اخبار کلکتہ جرنل نے معاصر اخبارات سے گے

ماسن و معائب پر رائے زنی کر کے اپنے سر مصیبت مول لی اور اپنی بڑائی اور فوقیت کا سکہ جمانا چاہا معاصر اخبارات کے ڈیٹروں نے جے ایس بکنگھم اڈیٹر کلکتہ جرنل کے خلاف نہایت گندہ اور فحش پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا اس پر چار بیبیاں رکھنے کا الزام لگایا گیا اور مشہور تھا کہ اس کی ایک بیوی بمبئی پہونچگئی ہے ریورنٹ برائس نے جو ایشیاٹک مرر کا اڈیٹر تھا بکنگھم پر نہایت بیہیانہ حملے کئے سنہ ۱۸۱۹ء میں کلکتہ جرنل نے اینگلیکن چرچ کی ایک مٹنگ کی کاروائی شایع کی اور اس سلسلہ میں کمپنی کے ایک کلرک مسمی ڈارول کا بھی حوالہ دیا اخبار کی اس معاندانہ نکتہ چینی نے ڈارول کو بہت صدمہ پہونچایا ایکروز شام کے وقت جب بکنگھم سیر و تفریح کے لئے جارہا تھا اس سے ڈارول سے ملاقات ہوئی اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم کلکتہ جرنل کے اڈیٹر ہو، اس سوال کے ساتھ اس پر چند کوڑے بھی لگائے گئے بکنگھم نے اس کا جواب اپنی چابک سے دیا۔ ایک دوسرے موقع پر بکنگھم نے ایک شخص مسمی ڈاکٹر جیمسن کے بیک وقت تین عہدوں کے قبول کرنے پر شدید نکتہ چینی کی جیمسن کو یہ نکتہ چینی بہت ناگوار گزری اور اس نے اڈیٹر کو دویل (ڈیلکی) کی دعوت دی اس زمانہ میں (ڈیلکی) ڈوئل کا عام رواج تھا۔ ڈوئل سے انکار بزدلی کے مرادف خیال کیا جاتا تھا۔ درمیانی اشخاص نے معاملہ کو رفت و گزشت کرا دیا۔

ان حملوں اور جوابی حملوں کے علاوہ اخبار اشتہارات سے پُر ہوتے تھے ان اشتہاروں کا نرخ چار آنے فی سطر ہوتا تھا زیادہ تر نیلاموں اور قہوہ خانوں کے اشتہار ہوتے تھے جہاں ہر قسم کے فواکہات ملسکتے تھے بیرونجات سے آئی ہوئی نئی کتابوں کے بھی اشتہار دئے جاتے تھے کلیات بائرن گیمسیٹر کے اعترافات اور ایک مجرد شخص کے اعترافات کے قسم کی کتابیں انگلش سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں تھیٹر کی خبریں اور گھوڑ دوڑ کے اشتہار بہت نمایاں طور پر شایع کئے جاتے تھے۔ سال بھر لاٹریوں کا سلسلہ جاری رہتا اور لوگوں کے جوش و خروش کا باعث ہوتا تھا۔ ناس کے اعلانات اخبارات کی خصوصیت تھے ان کے علاوہ زیادہ تر اشتہارات نقالی، رقص اور ازدواجی رشتوں کے متعلق ہوتے تھے یہ نقالی رقص نوجوانوں میں بہت عام تھا اور اکثر اس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ ازدواجی رشتوں کے اشتہارات میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا کہ لڑکی کو کسی قسم کی جگر کی بیماری نہ ہو۔

اخباری پریس کی تاریخ میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ہندوستان کے انگریز صحافت نگار اپنے انگلستانی معاصرین کے نقش قدم پر چل رہے تھے انگلستان کا پریس جماعتی حملوں کا شکار ہو چکا تھا انیسویں صدی کے اوایل کے اخباروں کے افتتاحیہ مقالے دھینگ اور تو تو میں میں جھگڑوں سے پُر نظر آتے ہیں۔ اڈیٹروں کی باہمی جنگ اکثر اخباروں کے افتتاحیوں سے آگے بڑھکر عدالت کے اکھاڑوں تک پہونچ جاتی تھی بیشتر اوقات "ڈوال" سے کام لیا جاتا سنہ ۱۸۳۱ء میں "لندن میگزین" اور "بلیک وڈ میگزین" کے اڈیٹروں کے درمیان ایک

یادگار" ڈول" لڑا گیا اخبار نویس خواہ وہ کسی جماعت کے حامی ہوتے، کسی حالت میں بھی محفوظ و مامون نہ تھے۔
یقیناً انگلستان میں بمقابلہ ہندوستان کے بہت زیادہ اخبار نکل رہے تھے اُنیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال میں ہندوستان میں تیس اخبار سے زیادہ کا وجود نہ تھا برخلاف اس کے برطانیہ میں دوسو چون[۲۵۴] اخبار جاری تھے اور ان میں سے بعض کی صبح و شام دونوں وقت اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان میں چندے اور ڈاک کے محصولات کی زیادتی کی بنا پر بہت کم لوگ مستقل طور پر اخبار خریدتے تھے اس کے برخلاف انگلستان میں ایک ایک اخبار کی اشاعت ہزاروں تک پہونچ گئی تھی۔

اس طرح انگریزی سوسائٹی سے ہندوستان اور اس کے باشندوں نے ایک نیا ادارہ حاصل کیا، ہندوستانیوں نے بھی ایسے آلہ سے فایدہ اُٹھانے میں کوتاہی نہیں کی جو ان کے خیالات اور شکایات کی ترجمانی کرے اس وقت کلکتہ میں ہندوستانیوں کا ایک بڑھتا ہوا گروہ تھا جس کو مغربی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر بعض سربرآوردہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کوششوں سے ودالیہ یا اینگلو انڈین کالج قایم ہوچکا تھا ([illegible]) مسٹر ڈیوڈ ہیر اور راجہ رام موہن رائے دونوں جماعتوں کے سرگروہ تھے ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانیوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگی تھی اٹھارہ سو تیرہ عیسوی کے چارٹر ایکٹ کی اُس دفعہ کو جس میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی منظوری تھی عرصہ سے معرضِ التوا میں ڈال رکھا گیا تھا، اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ مشنریوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور درسگاہیں قایم کرنا شروع کردی تھیں اور خود کمپنی اپنے بڑھتے ہوئے حدود اختیار کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی خدمات حاصل کرنے کی خواہشمند تھی، حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کوئی مستقل طرزِ عمل اختیار کرنے میں کسی قسم کی تعویق برداشت نہ کی جاسکتی تھی، انگریز افسروں کی اکثریت اور ترقی پسند ہندوستانیوں کا گروہ انگریزی کو عدالتی زبان بنانے کے لئے بہت زور دے رہا تھا جیسا کہ بالآخر ۱۸۳۳ء میں ہوا۔ یہ ایک بالکل فطری اور قدرتی امر تھا کہ جس وقت ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور تعلیم کے لئے اس قدر آسانیاں بہم پہونچائی جارہی تھیں اہلِ ہند صحافت کی طرف مایل ہوجاتے سب سے پہلا ہندوستانی اخبار " درپن" تھا۔ لیکن اس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کے ہاتھ میں تھی - اور اس لئے اس کو خالص ہندوستانی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔ ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو اسکا آغاز ہوا اور لارڈ ہسٹنگز نے جو اسوقت گورنر جنرل تھا اس کی نشو و نما اور ترقی میں بڑی مدد دی اس نے ہندوستانی پریس کی نشو و نما میں بڑی دلچسپی لی اور ان لوگوں کے خیالی خطرات سے متاثر نہ ہوا جو ایک آزاد ہندوستانی پریس کی موجودگی کو بہت مخدوش سمجھتے تھے، لیکن ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما راجہ رام موہن رائے تھے وہ اپنے

وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی تھے اور ان کو بجا طور پر ہندوستانی قومیت کا بانی کہہ سکتے ہیں، ۱۸۲۱ء میں کلکتہ جرنل کی ایک اشاعت میں ہفتہ وار بنگالی پرچہ "سمبد کومودی" (Sumbad Kaumudi) کا کیفیت نامہ کلامس اس ڈی کالٹ (S. D. Collet) نے راجہ رام موہن رائے کی سوانح عمری میں اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ ایک خالص ہندوستانی پرچہ تھا جس کو مقامی باشندے مقامی زبان میں نکالتے تھے" اس اخبار کو ہندوستانی (ورناکیولر) اخباروں کا پیشرو اور راجہ موصوف کو ان کا بانی کہنا چاہئے۔ اس اخبار کے دوش بدوش اور بھی کئی بنگالی اخبار نکلنا شروع ہوئے ان اخباروں میں اقتصادی ادبی اور سیاسی مضامین کی بھرمار ہوتی تھی۔ سمبد کومودی کی ایک اشاعت میں کلکتہ کے مجسٹریٹوں کے نام ایک اپیل بھی شایع کی گئی تھی جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلکتہ کے ہندو باشندگان کی جان کی حفاظت کے لئے عیسائی عمال کی بے لاگ گاڑیبانی کے انسداد کے لئے سخت ترین قوانین مرتب کریں جو نہایت لاپروائی سے اپنی گاڑیاں بھگاتے ہیں اور بلا امتیاز عمر و جنس راہگیروں پر ہنٹر چلاتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار نکالا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک برہمنی میگزین جاری کیا۔ راجہ موصوف غیر متعصب "وسیع النظر" جماعت کے سرگردہ تھے اور ان ترجمانوں (آرگن) کے ذریعہ ہندو سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اسوقت بنگال میں ستی کا عام رواج تھا راجہ ممدوح اور انکے ہمشرب اس کے نہایت پرجوش مخالف تھے لیکن متعصب اور تنگ نظر گروہ اکثریت میں تھا اور ترقی پسندوں کی مخالفت میں انھوں نے اپنا ترجمان "چندریکا" نکالا جو اسوقت کے تمام ہندو مذہبی اداروں کا علمبردار تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے اخبار وجود میں آئے ۱۸۳۰ء میں صرف کلکتہ سے سولہ اخبار نکل رہے تھے دوسرے احاطوں اور کے صوبۂ متحدہ میں جو اس وقت نشیبی صوبہ کہلاتا تھا (لوور پراونس) بھی صحافتی جرات آزمائیاں شروع ہوگئی تھیں۔

ہندوستانی (ورناکیولر) اخبارات نہایت آزادی کے ساتھ ہر مسئلہ پر اظہار رائے کرتے تھے یہاں تک کہ برطانیہ کی یورپی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کرنے سے باز نہ آتے تھے اور کمپنی کی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا نہایت طنزیہ طریقہ پر اعادہ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مقالات سے انگریزوں کے احساسات کو چوٹ لگتی تھی اس لئے انکی یہ بے لگامی عرصہ تک جاری نہ رہ سکتی تھی انگلستان کا ٹوری پریس ہندوستانی پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا۔ اب ہم تاریخ صحافت و اخبار نویسی کے سب سے زیادہ اہم دور کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنے احتساب و نظارت کا قیام۔

۱۷۹۱ء کے قبل ہندوستانی پریس انگلستان کے قانون اہانت کے علاوہ کسی اور قانون کے ماتحت نہ تھا اس طرح ہندوستانی پریس انگریزی پریس کے ہمسطح تھا۔

گورنر جنرل "اجازت نامہ" ضبط کر سکتا تھا اس لئے نہیں کہ کمپنی کے حدودِ اقتدار میں پریس نہ چلایا جا سکے بلکہ اس لئے کہ کوئی انگریز ہندوستان میں سکونت پذیر ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان میں سکونت کے لئے "اجازت نامہ" کی ضرورت ہوتی تھی اور کسی قابل اعتراض حرکت کی پاداش میں ہندوستان بدر کئے جا سکتے تھے۔ ہکے کے گزٹ کے امتناع و ضبطی میں اسی حربہ سے کام لیا گیا تھا اور اس کے اڈیٹر کو مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ سنہ ۱۷۹۱ء اور سنہ ۱۷۹۸ء کے درمیانی وقفہ میں عسکری واقعات پر نکتہ چینی کرنے کے جرم میں دو اڈیٹروں کی شدید گوشمالی ہوئی اور ایک فوجی افسر جو کپتانی کے عہدہ پر فایز تھا انگلستان واپس کر دیا گیا اس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے فوجی ملازمین کے نام ایک نہایت اشتعال انگیز پیغام شایع کیا تھا۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں ایک شخص مسمی مسٹر میکلین صرف اس جُرم میں ہندوستان سے نکالا گیا کہ اس نے ایک جج پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ کمپنی کے بعض برہم ملازمین نے ان ہی اخبارات میں اپنے غم و غصہ کا اظہار شروع کر دیا تھا یہ "اقتدار اعلیٰ" کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اب کمپنی کا سیادتی اقتدار بڑھتا جا رہا تھا اور اسکے انتظامی شعبہ کے متعلق بے لگام نکتہ چینی کسی طرح برداشت نہ کی جا سکتی تھی کمپنی کو خوف تھا کہ ان حملوں سے پبلک کی نگاہوں میں اس کی وقعت کم ہو جائے گی۔

لارڈ ویلزلی نے اخبارات کے لئے نہایت سخت قوانین مرتب کئے اور ان کی نگرانی کے لئے احتساب و نظارت قایم کیا ان قاعدوں کی رو سے ہر اڈیٹر اخبار کے نیچے اپنا نام لکھنے پر مجبور تھا اسکے لئے ضروری تھا اپنے نام و پتہ سے گورنمنٹ کو باخبر رکھے، اتوار کے دن کوئی اخبار نہ نکلتا تھا، ان قواعد کی خلاف ورزی اور نظارت کے احکام کی عدم پابندی کی پاداش میں اجازت نامہ ضبط کر لیا جاتا تھا، ان پابندیوں سے انگلستان کی برسرِ اقتدار جماعت کے رویہ کا اندازہ ہوتا ہے اس وقت وہاں ٹوری جماعت برسرِ اقتدار تھی۔ اور اس کو ہندوستان میں آزاد پریس کی ترقی سخت ناپسند تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستانی عوام کی جہالت اور حکام کے اعمال کی علانیہ نکتہ چینی کی بندش ان دو ستونوں پر قایم ہے۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں حکومت بنگال کے حکم سے ایک سرکاری پریس قایم کرنے اور ایک سرکاری اخبار کا خاکہ (پلان) طیار کیا گیا آخرالامر پریس قایم ہوا اور اخبار کا نام گورنمنٹ گزٹ رکھا گیا یہ کارروائی اسوقت کے اخبارات کی مخالفانہ نکتہ چینی کے رد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

سنہ ۱۸۰۱ء اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے مختلف ضابطے اور قاعدے بنتے رہے، عسکری احکامات اور جنگ کی خبریں اسوقت سے شایع ہونا بند ہو گئیں سنہ ۱۸۱۱ء میں پریسوں کے مالکوں کو اخبارات میں اپنا نام لکھنے کا حکم ہوا۔ سنہ ۱۸۱۳ء میں مزید قیود اور پابندیاں بڑھا دی گئیں اخبارات اور ان کے ضمیموں کے تمام مسودوں کا چیف سکریٹری (معتمد خصوصی) کی نظرثانی کے لئے پیش ہونا لازمی قرار دیا گیا

دستی اشتہارات و نوٹسوں کے مسودے بھی نظرثانی کے بغیر شایع نہ ہو سکتے تھے۔ سابق قاعدے اور قانون بدستور اپنی جگہ پر تھے بلکہ اب ان پر پہلے سے زیادہ عملدرآمد ہونے لگا تھا مسمی مسٹر ایڈمس (Adams) جو اسوقت احتساب و نظارت کے عہد پر فایز تھا، ٹوری رائے کا نہایت بیباک حامی تھا اس کی سختی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ پریس کو پوری قوت کے ساتھ قابو میں رکھنا چاہئے پریس کے احتساب و نظارت کی تاریخ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بمبئی اور مدراس کے احاطوں نے پریس کے قوانین کے لئے بھی بنگال کی خوشہ چینی کی جیسا کہ اس سے قبل وہ اور امور میں کیا کرتے تھے۔ مذکورۂ بالا احاطوں میں پریس سے متعلق بنگال ہی کے ایسی پابندیاں رائج تھیں۔ اڈیٹروں کو اکثر تنبیہ کی جاتی تھی اور بعضوں کو ہندوستان سے نکال بھی دیا جاتا تھا۔

مارکوئس آف ہسٹنگز نے جو سنہ ۱۸۱۳ء سے سنہ ۱۸۲۳ء تک کمپنی کے سیاہ و سپید کا مالک تھا نظارت و احتساب کو سنہ ۱۸۱۸ء ہی میں منسوخ کر دیا اس کا خیال تھا کہ ایک آزاد پریس اچھی حکومت کے حق میں بہت حد تک ممد و معاون ثابت ہوگا کمپنی کی حکومت کا سب سے بڑا عیب اس کے عمال کی سستی و کاہلی تھی ایک شخص مسمی اسٹین ہوپ نے اپنے رسالہ ہندوستان میں "برطانوی پریس کے اثرات" میں لکھا ہے "حکومت مدراس کو معتمد عسکری سے کسی معمولی مراسلہ کا جواب حاصل کرنے میں اُسی قدر کاغذ روشنائی اور وقت صرف کرنا پڑتا تھا جتنا کہ لارڈ چانسلر کی عدالت کے کسی بہت بڑے مقدمہ کے تصفیہ میں ہوتا ہے"۔ پریس کی نکتہ چینی اور اعتراض سے معاملہ میں عجلت ہو سکتی تھی اس کے علاوہ ہسٹنگز کا ایک خیال اور بھی تھا۔ اسوقت تک یہ بے قاعدگی تھی کہ ہندوستانی اپنے قلم کو آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے کیونکہ ان کو ملک بدر کئے جانے کا کوئی خوف نہ تھا اور ان کو ہندوستان میں رہنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ پریس کو آزادی حاصل ہو گئی تھی تاہم اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ جملہ قیود و پابندیاں ہٹا دی گئی تھیں چند قاعدے ایسے بنا دئے گئے تھے جن کی پابندی ہر اڈیٹر کے لئے لازمی تھی۔

نمبر ۱۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کی کارروائی گورنر جنرل کے احکام کونسل کے ممبر اور جج گستاخانہ و بےباکانہ نکتہ چینی سے بالاتر تھے۔ نمبر ۲ فضیحت آمیز واقعات اور ذاتیات بالکل ممنوع تھی نمبر ۳ ہندوستانیوں کے احساسات کا پاس و لحاظ لازمی تھا نمبر ۴۔ بیرونی رسالوں کے ایسے اقتباسات کا شیوع ممنوع قرار دیا گیا جن سے تنفر اور خوف و ہراس پیدا ہو ——— ان قوانین کے نفاذ سے پہلے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں انکی رجسٹری لازمی تھی۔

کورٹ آف ڈائرکٹرس کو لارڈ ہسٹنگز کا یہ اقدام پسند نہ آیا اور وہ لارڈ موصوف کے احکامات کو منسوخ کرا کے از سر نظارت و احتساب قایم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک سرکاری مراسلہ کا مسودہ بھی طیار کیا گیا اور ۷ اپریل سنہ ۱۸۲۰ء کو وہ مراسلہ بورڈ آف کنٹرول کو اسواسطے ارسال کیا گیا کہ وہ اُس میں تحریر کردہ معروضات کے مطابق گورنر جنرل کے نام احکامات صادر کر دے لیکن بورڈ مذکور نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ جس سال نظارت و احتساب منسوخ کیا گیا کلکتہ

سے ایک اخبار کلکتہ جرنل نامی نکالا گیا اس کا مدیر ایک شخص مسمی مسٹر جے اس بکنگھم تھا۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے احتساب ونظارت کی تاریخ میں جو حصہ اخبار مذکور اور اس کے مدیر نے لیا قابل یادگار ہے احتساب ونظارت کی منسوخی پر تمام احاطوں میں اظہار مسرت کیا گیا اگرچہ مدراس میں اسوقت بھی اس کا نفاذ تھا کلکتہ جرنل کے افتتاحی مقالوں میں گورنر جنرل کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا اور حکومت مدراس کے رویہ کی سخت مذمت کی گئی یہ اخبار ابتداہی سے بہت مقبول ہوگیا اور اس نے نہایت جرأت آموز رویہ اختیار کیا۔ اخبار کا کافی حصہ انفرادی، شکایات کے رفع کرنے کے لئے وقف تھا حکومت کے مختلف احکامات پر نکتہ چینی کرنے کے لئے　تعداد میں مراسلے نکلنے لگے۔ ایک شخص مسمی کرنل رابنسن (Col: Robinson) نے جس نے اپنا اخباری نام "سیموئل سوبر سائیڈس" (Samuel Sober Sides) رکھ لیا تھا اشتعال انگیز مراسلات کا ایک سلسلہ شایع کیا جس کی پاداش میں اس کو اپنی فوجی ملازمت سے استعفا دیکر انگلستان واپس جانا پڑا اخبار کے اڈیٹر کو اس قسم کے مراسلات چھاپنے کی معذرت کرنی پڑی۔

مسٹر جے۔ اس بکنگھم نے اپنے سر دوسری مصیبت یہ لی کہ مسٹر ایلیٹ کی مدراس کی گورنری کی خبر کو چوڑے سیاہ حاشیہ کے ساتھ شایع کیا گویا یہ امر عمومی ماتم کا باعث تھا مدراس گورنمنٹ نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور حکومت بنگال نے بکنگھم کو معافی مانگنے پر مجبور کیا کلکتہ جرنل حکومت کی ہمدردی سے محروم ہوگیا مسٹر ایڈمس جو چیف سکریٹری کی حیثیت سے نظارت اور احتساب کے فرایض بھی انجام دیتے تھے جو اب سنیر ممبر کے مرتبہ پر پہونچ گئے تھے اس اخبار کے جانی دشمن تھے۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ہسٹنگز اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے اور ان کے منتخب جانشین لارڈ ام ہرسٹ کے پہونچنے تک گورنر جنرلی کے تمام فرایض بوجہ کونسل کے سنیر ممبر ہونے کے مسٹر ایڈمس کے سپرد ہوئے مسٹر ایڈمس نے اپنے عہدہ کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی ایک شخص مسمی ریورنٹ ڈاکٹر برائس کا جس کا ذکر ایشیاٹک مرر کی ادارت اور بکنگھم کے سلسلہ میں آچکا ہے بحیثیت اسٹیشنری فراہم کرنے والی کمیٹی کے کلرک کا انتخاب کیا اس تقرر کا اعلان گورنمنٹ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں ہوا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا اور کلکتہ جرنل کے اڈیٹر نے اپنی اشاعت مورخہ ۸ فروری سنہ ۱۸۲۳ء میں اس پر نہایت طنزیہ رائے زنی کی اس مقالہ نے قائم مقام گورنر جنرل کو بہت مشتعل کردیا اور ۱۲ فروری سنہ ۱۸۲۳ء کو مسٹر بکنگھم کا اجازت نامہ ضبط کرلیا گیا اور ان کو انگلستان واپس کردیا گیا۔ یہ غیر متوقع مصیبت تھی اخبار مذکور کے کافی خریدار تھے اور مسٹر بکنگھم کا کام بھی بہت فروغ پر تھا اس کو اپنا کاروبار اپنے ایک ماتحت کے سپرد کرکے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا کچھ عرصہ تک اخبار جاری رہا لیکن دوسرے اڈیٹر پر بھی عرصۂ حیات تنگ ہوگیا اور اس کے چلے جانے کے بعد پرچہ بند ہوگیا مسٹر بکنگھم کی مالی حالت بالکل خراب ہوگئی اس نے پریوی کونسل میں اپنے معاملہ کے متعلق ایک غیر جانبدارانہ تحقیقات کی درخواست دی کمیٹی مقرر ہوئی اور اس کی سفارشوں کی بموجب مسٹر بکنگھم کے نقصان کی تلافی بھی کردی گئی، لیکن ہندوستان کی واپسی کی درخواست منظور نہ ہوئی۔

ایڈمس کی گورنمنٹ نے پریس کی آزادی کو محدود کرنے کے لئے مزید قاعدے بنائے لیکن نفاذ سے قبل انکی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں رجسٹری ہونا لازمی تھی سر فرانسس میکناٹن نے جو اسوقت تنہا قایم مقام جج تھے، شاکی جماعت کو اپنا محضر نامہ (میموریل) پیش کرنیکی اجازت دی معترضین میں پیش پیش راجہ رام موہن رائے تھے، دو عرضداشتیں پیش کی گئیں، دوسری عرضداشت کو جو بالعموم راجہ موصوف کے زورِ قلم کا نتیجہ سمجھی جاتی تھی مس کالیٹ نے ہندوستانی تاریخ کے "ایریوپیگی ٹیکا" کے نام سے موسوم کیا ہے سر فرانسس نے جدید قواعد کی تائید کی اور معترضین کے خلاف فیصلہ دیا۔ راجہ ممدوح اور اُن کے حلیفوں نے شاہی دربار میں اپیل کی ان کا اپیل انگریزی مضمون نویسی کا ایک نادر نمونہ تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، راجہ رام موہن رائے نے احتجاجی طور پر "مراۃ الاخبار" کی ادارت بند کردی ان کا یہ اقدام کلکتہ کے انگریزوں کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔

لارڈ ام ہرسٹ نے حکومت کی باگڈور ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے ملازمین کو پبلک پریس سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی ممانعت کردی لارڈ موصوف کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ان کے جانشین لارڈ ولیم بنٹنک نے بھی وہی مروجہ طرزِ عمل اختیار کیا پریس کی آزادی اس سے زیادہ کبھی سلب نہیں ہوئی بنٹنک کے مالی ضابطوں اور بالخصوص "نصف بھتے" کی منسوخی نے فوجیوں میں سخت غم و غصہ اور اشتعال پیدا کردیا۔ مقالات کی بھرمار شروع ہوگئی اور بالآخر حکومت کو اُسے زبردستی بند کرنا پڑا گورنر جنرل نے تمام اخبارات کے نام احکامات صادر کردئے کہ "بھتے" کے مسئلہ پر مزید مضامین نہ قبول کئے جائیں کلکتہ جرنل کی ضبطی سے اڈیٹروں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور اس موضوع پر مزید مضامین نہیں نکلے۔

۱۸۳۵ء میں بنٹنک کی جگہ سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل ہوا، پریس کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام خاص طور پر قابل یادگار ہے اس نے احتساب و نظارت کو یکقلم منسوخ کردیا اس خیال کا موجد لارڈ میکالے تھا جو ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پہلا مشیر قانونی (لا ممبر) ہوکر آیا اور سر چارلس مٹکاف نے اس کو عملی جامہ پہنایا اس واقعہ کی یادگار منانے کے لئے کلکتہ میں ایک عظیم الشان ہال طیار کرایا گیا اور اس کا نام "مٹکاف ہال" رکھا گیا۔

کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس اقدام کو بہت ناپسند کیا گورنر جنرل کی کونسل کے بعض ممبروں کو شدید بدگمانیاں تھیں، انگلستان میں دار العوام کی رائے بھی ایسے اقدام کے قطعاً مخالف تھی ۱۸۱۱ء میں ایوان مذکور میں ہندوستانی پریس کی آزادی کے لئے بہت پرزور تقریریں ہوئی تھیں لیکن اب حالات بالکل بدل چکے تھے انگریزوں کو اپنے سامراجی مفاد ایک محکوم ملک میں آزاد پریس کے قیام کی بے آہنگی کا شعور بڑھتا جارہا تھا آزاد پریس اور آزاد ادارے لازم و ملزوم چیزیں خیال کی جاتی تھیں۔

۱۸۵۷ء تک پریس آزاد رہے اس تاریخی سال میں ہندوستان کے افق پر بدامنی اور خوف و ہراس کے

بادل چھانے لگے فوجوں میں بغاوت شروع ہوگئی اور حکومت نے خطرات کی بو باس پاتے ہی پریس کو قابو میں لا
کے لئے فوری اقدامات شروع کر دئے۔

۱۸۵۷ء کے ایکٹ ۱۵ نے بغیر لائسنس حاصل کئے ہوئے پریس کے قیام و استعمال کو ممنوع قرار دیا
حکومت اجازت نامہ دینے میں اختیاراتِ تمیزی سے کام لیتی تھی حکومت کو حق تھا کہ جسوقت بھی وہ چاہے اجازت نا
منسوخ کر دے اخباروں کی اشاعت کتابیں یا کسی قسم کی اشتعال انگیز تحریر ممنوع قرار دیجا سکتی تھی۔ یہ ایکٹ
ہندوستانی (ورناکیولر) اور انگریزی دونوں پریسوں کے لئے تھا یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ابتک ہندوستانی
(ورناکیولر) اور انگریزی پریس میں کوئی امتیاز نہیں تھا ۱۸۳۵ء کے ایکٹ سے پریسوں کو جو آزادی ملی تھی وہ دونوں
کے لئے یکساں تھی اسی طرح جب آزادی چھین لی گئی تب بھی دونوں یکساں طور پر متاثر ہوئے۔

پریس کی تاریخ اپنی اوایل عمر میں واقعات اور حادثات سے خالی تھی اسکے سنِ شعور کے پہونچنے تک آمیر
گونا گونیت اور مدوجزر پیدا ہونے لگا۔ لیکن اسوقت یہ دور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ذیل میں غیر آئینی دور کے ان احکام و قوام کا ضمیمہ درج ہے جو اخبارات کے متعلق وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے

نمبر شمار	سال عیسوی نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۱)	۱۷۷۲-۸۶ لارڈ ہیسٹنگ	اجازت نامہ	اجراء اخبار	۱۷۷۳ء میں بروئے ریگولیشن ایکٹ گورنر جنرل و عدالت العالیہ کا تقرر ہوا۔ اس کے سات برس کے بعد حکومت نے اپنا گزٹ شایع کیا و تیز دو اُردو اخبارات انگریزوں نے جاری کئے۔ کوئی خاص حکم یا قانون نہ تھا۔ +	(۱) گورنمنٹ بنگال گزٹ ۱۷۸۰ء (۲) " کلکتہ گزٹ ۱۷۸۴ء (۳) ہیکی گزٹ ۱۷۸۰ء دو برس کے بعد بند ہوگیا۔ (۴) بمبئی ٹائمس ۱۷۸۵ء
(۲)	۱۷۸۶-۹۳ کارنوالس	"	"		(۱) بمبئی ہیرلڈ ۱۷۸۹ء و بمبئی کوریر ۱۷۹۰ء ---

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۳)	۹۸-۱۷۹۳ سرجان شور	احکام	ہر اخبار سرکاری طور پر پہلے معائنہ ہو لیتا تھا تب شایع کیا جاسکتا تھا بصورت خلاف ورزی سزا جلاوطنی تھی۔	اسوقت تک کوئی اخبار ملکی زبان میں جاری نہ تھا اور نہ کسی ہندوستانی نے کوئی اخبار جاری کیا تھا۔ مگر متعدد اہالیان مغرب اخبارات جاری کر رہے تھے۔ انگریزوں کے سامنے اس زمانہ میں دو بہت بڑی مہمیں	۹۹-۱۷۹۱ تک متعدد انگریز و اہل یورپ ہندوستان سے بدر کر دئے گئے کسی سرکاری عملہ یا ملازم کے متعلق کوئی تنقید یا اعتراض جرم سمجھا جاتا تھا۔ بغیر کسی باضابطہ مقدمہ کے سزائیں دیجاتی تھیں۔
(۴)	۱۸۰۴-۱۷۹۹ ولزلی	"	"	تھیں (۱) نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا ٹیپو سلطان و افغانستان سے نپولین کی اعانت کے خطرات تھے جو ۱۷۹۹ء میں کم ہوئے۔ (۲) تیسری مرتبہ جنگ بھی چھڑ گئی تھی جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی۔	
(۵)	۱۸۲۳-۱۸۱۸ مارکوئیس ہٹنگ	"	سرجان شور و ولزلی کے زمانہ میں جو سخت قوانین تھے وہ منسوخ کردئے گئے۔	نپولین کی شکست واٹرلو ۱۸۱۵ء کے بعد کوئی بیرونی حملہ کا خدشہ باقی نہیں رہگیا تھا اور ہندوستانیوں سے کسی قسم کا خطرہ اسوقت تک نہیں تھا، اس لئے اب ولزلی کے وضع کردہ قوانین کی ضرورت نہ تھی۔	(۱) ۱۸۱۸ء بنگالی زبان میں سب سے پہلا اخبار سماچار درپن جاری ہوا جسکی ادارت ایک مسیحی مشنری کے ہاتھوں میں تھی۔ مقام اشاعت سیرام پور۔ (۲) ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار ایک ہندوستانی کی زیر ادارت بمبئی سماچار نامی بمبئی سے جاری ہوا۔ متعدد دیگر انگریزوں نے بھی اخبارات جاری کئے۔

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جنہیں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(٦)	۱۸۲۰ ایڈم	خاص حکم	سلک بکنگھم نامی ایک سولین نے اپنے مضامین میں حکومت پر اعتراض کئے	محض اسکی سزادہی کی خاطر حکم صادر ہوا اور وہ ملک بدر کر دیا گیا۔	ایڈم نے چند مہینوں تک بحالت غیر موجودگی لارڈ ہیسٹنگس کی قایم مقامی کی تھی۔
(٧)	۱۸۲۳ - ۲۸ لارڈ ایمہرسٹ	احکام	ہیسٹنگس کے قوانین و احکام کی تقلید		
(٨)	۱۸۲۸ - ۳۴ ولیم بنٹنک	”		چونکہ اس دور حکومت میں کوئی اندرونی جنگ یا بدامنی نہ تھی اسلئے ملکی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کی گئی اس زمانہ میں اکثر درشت قوانین منسوخ کئے گئے	سنہ ۱۸۳۴ء میں لارڈ بنٹنک پہلے گورنر جنرل ہندوستان کے تسلیم کئے گئے اور بغرض مشورہ ایک کونسل قایم کی گئی۔
(٩)	۱۸۳۵ لارڈ میٹکاف	”	اخبارات مطابع کیلئے نہایت ہمت افزایانہ احکام صادر ہوئے	یہ دور مطابع کیلئے دور آزادی کہا جاتا ہے ایکسال کے دور حکومت میں میٹکاف نے اکثر اصلاحات کی کوششیں کیں	سنہ ۱۸۳۵ء میں بمبئی ٹائمس جاری ہوا
(١٠)	....	....	....	....	۱۸۳۵ - ۵۷ تک کوئی خاص حکم یا قانون مطابع یا اخبار کے متعلق جاری نہیں ہوئے لارڈ میٹکاف کی ہمت افزائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً تمام بڑے شہروں میں مثلاً دہلی، آگرہ و گوالیار و لاہور میں اخبارات جاری ہوگئے۔ پریس کے متعلق پہلا قانون تھا جو حکومت نے جاری کیا۔ اسکے پہلے محض احکام و ریگولیشن سے کام لیا گیا۔ گیسگنگ ایکٹ صرف ایکسال تک جاری رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ غدر کے بعد انگریزوں نے جو سزادہی کی صورتیں اختیار کیں وہ اسقدر عبرت انگیز تھیں کہ مدتوں ہندوستانیوں کے دلوں پر ان کا رعب و خوف قایم رہا۔ بعد اختتام غدر ہندو اور مسلمان اخبارات میں اس امر کا مقابلہ رہا کہ کون حکومت کا زیادہ وفادار اور کاسہ لیس ہے اسلئے کسی خاص قانون کی مدتوں ضرورت محسوس نہیں ہوئی
(١١)	۱۸۵۸ لارڈ کیننگ	گیسگنگ ایکٹ	زبان بندی	غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عوام میں اخبارات و رسایل باغیانہ مضامین نہ اشاعت کریں اس لئے یہ قانون جاری کیا گیا۔	

(نوٹ) نمبر ۱ ضمیمہ اصل مضمون میں نہیں تھا۔ میں نے اس کو ذاتی محنت و تلاش سے فراہم کیا ہے — نمبر ۲- ترجمہ زیادہ تر آزاد ہے۔

مسٹر او۔ پی۔ بھٹناگر۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی — مترجمہ: سید محمد عبد العلیم ہاشمی۔ غازی پور

مکتوبات نیاز

بندہ نواز ، آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ، لیکن
غنچہ ناشگفتن با برگ عافیت معلوم !
میں آپ کے احکام کی تعمیل فرض جانتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کے اور فرائض مجھ سے کب ادا ہوتے ہیں کہ یہ ادا ہو سکے گا
آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری "طبعِ اندوہگیں" نے بہت سے احباب مجھ سے جدا کر دئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میرا یہ جواب آپ کو بھی مجھ سے متنفر کر دے۔ آپ کی محبت کی جو عظمت میرے دل میں ہے، اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ بغیر کسی پس وپیش کے آپ کے فرمان کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیتا، لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ذات سے دشمنی بھی تو ہے اور وہ شاید آپ کی محبت سے زیادہ دیرینہ سال ہے۔ پھر وہ شخص جس نے خودکشی پر کمر باندھ لی ہو اسکی جان آپ کہاں تک بچا پائیں گے

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز
مگزارید نہیں ، بلکہ ——— بگزارید کہ ناممردہ تنہا ماند !

معاف فرمائیے ، آپ جس زاویہ سے دنیا کا مطالعہ کر رہے ہیں ، وہ میرے زاویۂ نگاہ سے بہت مختلف ہے آپ کا زاویۂ حادّہ ہے یا منفرجہ ؛ ــــ یا ـــ اور میرا مستقیم ـــ یعنی یا تو آپ تفریط سے کام لیکر فشار کی انتہا کر دیں گے یا افراط کو مدِ نظر رکھکر حقیقت سے بھی روگردانی کر لیں گے لیکن میرے یہاں تو وہی ایک ۹۰ ڈگری والی نگاہ ہے۔ یعنی پہلے ایک رائے قایم کرنا اور پھر اسی کو سامنے رکھکر سیدھا راستہ اختیار کر لینا، خواہ وہ ترکستان جاتا ہو یا عربستان ! بالکل اسی قسم کا اختلاف میرے آپ کے درمیان اس معاملۂ خاص میں بھی ہے۔ آپ جہان بین کی اس منزل پر ہیں جہاں سوائے "کرکرا" کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا، میں فطرتِ انسانی کی لغزشوں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ سادہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ کی رائے میں وہ اصلاح کی حد

سے گزر گئے ہیں (جس سے میں متفق نہیں) تو بیشک مجبوری ہے، اور اس صورت میں مجھ سے کیا، سقراط و افلاطون سے بھی رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ایکبار اور غور کر لیجئے اور یہ سمجھ کر کہ انسان کی تمام تمنائیں پوری نہیں ہوا کرتیں اور پوری ہو بھی جائیں تو کوئی لطف نہیں !

کیا خوب ! آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھ سے ایک دن کی تاخیر ہو جائے تو میں نامعقول و بدتمیز، لیکن آپ میرے خط کا جواب کبھی نہ دیں تو آپ بدستور معقول و خوش تمیز بنے رہیں۔ کیا جونپور میں اسی قسم کی منطق پڑھائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کے قاضی اسی قسم کے استدلال سے مشہور ہوئے تھے!

میں جانتا ہوں کہ آپ کا خط، کوئی تفریحی چیز نہ تھی کہ میں اسے ہنس کر ٹال دیتا، بلکہ کاروبار سے متعلق تھا، آپ کی زندگی کی اس منزل سے تعلق رکھتا تھا، جس میں پیچھے مڑکر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کی تحقیق کے لئے مجھے کچھ وقت تو ملنا چاہئے تھا۔

خیر، یہ تو جواب تھا آپ کی خفگی کا، اب اصل معاملہ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اول تو اُن سے کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکی، باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کل واپس آئے تو گفتگو ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے آپ کی پیشکش کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا، لیکن جب میں نے تمام اعداد و شمار دکھائے تو انھوں نے بمشکل وعدہ کیا کہ وہ خود جا کر دیکھیں گے۔ اسلئے اب آپ ان کی آمد کا انتظار کیجئے۔ تاریخ کی تعیین انھوں نے ابھی تک نہیں کی ہے، لیکن میں اُن سے پوچھکر آپ کو مطلع کر دوں گا۔ جلدی نہ کیجئے ورنہ وہ بھڑک جائیں گے، نہایت سخت قسم کے "گرگ باراں دیدہ" انسان ہیں۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ کل کی خبر نہیں کیا ہوگا۔ آپ کو خبر نہ ہو، مجھے تو ہے۔ صبح سورج نکلے گا اور شام کو ڈوب جائیگا۔ اسی کا نام کل تھا، اسی کا نام آج ہے اور اسی کو فردا کہیں گے! آپ کا ریشمی گدوں پر سونا، میرا بوریہ پر کروٹیں بدلنا ان دونوں میں کوئی چیز اس نظام کو بدل نہیں سکتی، جو آفتاب صبح کو طلوع ہوا ہے وہ شام کو غروب ضرور ہوگا اور دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔

آپ دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ آپ اس کی پوری کُروی حیثیت کو سامنے رکھئے، جب تک ہم زندہ ہیں اس کے ساتھ گردش کرتے رہیں گے، ہمارے بعد جو آئیں گے وہ اسی چکر میں رہیں گے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ "بیم و رجا" کی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو جاتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ عمل محض عمل کے لحاظ سے خود اپنی جگہ زندگی کا ثبوت ہے۔ یعنی اگر دم آنکھوں میں ہو تو بھی "ساغر و مینا" کو سامنے رہنا چاہئے — یہ تو آپ کی پہلی بات کا جواب ہوا اب دوسری بات لیجئے۔ آپ نے مسلم لیگ کی جس بڑی ہستی کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا کہ جو کچھ وہ

کہتا ہے اسے نہ سنئے، بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسے دیکھئے۔ زبان پر نعرۂ آزادی اور ہاتھ میں برطانوی دامن لب پر ذکرِ پاک یزداں اور دل میں اہرمن!

پھر جناب یہ شراب تو ہے نہیں کہ "یا غفور" کہکر آپ چڑھا جائیں اور کام چل جائے۔ یہ معاملہ "دار و رسن" کا ہے جہاں "انا الحق" کہے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔

محمدؐ نے آزادی کا تخم بویا علیؓ نے اسے پروان چڑھایا لیکن آج محمد علی (جینا) کے نزدیک اس کی حیثیت "سمرقند و بخارا" سے بھی کم ہے کہ بجائے "خالِ ہندو" کے "زلفِ چلیپا" پر قربان کردینے کے لئے طیار ہے!۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس واقعہ کو تاریخِ اسلام میں بھی شامل کیا جائے گا اور ان بردہ فروشوں پر آپ کی اولاد فخر بھی کرے گی! معاذ اللہ!

کیا پوچھتے ہو ان کا کیا عالم ہے
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے!

آپ کا پیام سنکر ہنس پڑے، لیکن ایک ایسی سوگوار ہنسی کے ساتھ کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہیں! میں نے زیادہ گفتگو مناسب نہیں سمجھی، لیکن سنا میں نے بھی یہی ہے کہ تعلقات کی نزاکت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ صورت ـــ "دل گرفتار و یار بے پروا" کی تو نہیں ہے تاہم ـــ "دیرے ست کہ خاطرش بجا نیست" ابھی دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔

خدا کے لئے کبھی تو کوئی غلطی کیا کرو۔ آخر انسان ہو خدا تو نہیں ہو۔ پھر اس ہوشیاری و چالاکی کے کیا معنے! سچ کہتا ہوں، بعض وقت یہ سوچکر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ نہ میں تم کو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں، نہ تم کسی کی مان سکتے ہو آئینہ میں ذرا اپنی صورت تو دیکھو، کیسی "روڑھی" ہوتی جاتی ہے۔ حماقتوں کے "بھولے پن" کا کوسوں پتہ نہیں ہر وقت تمھارے چہرہ سے ایک ایسے خطرہ کا سا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے دشمن کے ہوائی جہاز بم برسانے ہی والے ہوں۔ لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے کہ انسان نہ کسی کے دھوکہ میں آئے، نہ کوئی اسے بیوقوف بنا سکے۔

بولو، کب آؤگے۔ واقعی مجھے تمھاری ضرورت ہے، میں جھوٹ نہیں بولتا اور بولوں بھی تو کس توقع پر؟

جناب من - جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے، تو غالب ہی کا سہی۔ بہر حال جس کا بھی ہو، بالکل لغو و مہمل ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ کچھ پوچھا نہیں، اس لئے تفصیل میں کیوں پڑوں اور آپ پوچھیں بھی تو میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا کہ مہمل ہے اور بلا دلیل مہمل ہے۔

خدا کے لئے کوئی اور مشغلہ اختیار کیجئے، یہ بالکل ذوق کی چیز ہے اور آپ منطق سے کام لیتے ہیں۔ عاقبت خراب ہونے کا تو اندیشہ نہیں، لیکن دماغ خراب ہو جانے کا ضرور ہے۔

باب الاستفسار

سوق الکساد ــــ علیٰ ہذا القیاس

(مولانا ابوالکمال اُمید امیٹھوی)

مُشتری کو، جوہری کو اندریں سوق الکساد
ہست بیجا صل کرد بہ شاہوار م کردہ اند

۱ ـ شعر مندرجۂ عنوان میں "سوق الکساد" کی ترکیب ایک معترض کے نزدیک محل نظر اور غلط ہے ۔ اعتراض یہ ہے کہ صفت موصوف میں مطابقت ہونا چاہئے اور یہاں نہیں ہے یعنی اسے "السوق الکساد" ہونا چاہئے ۔ الف لام سوق پر بھی داخل ہونا چاہئے ۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے، بلکہ ترکیب اضافی ہے، سوق مضاف، کساد مضاف الیہ ۔

۲ ـ یہی علامۂ عصر "علیٰ ہٰذالقیاس" کے املا کو بھی صحیح جانتا ہے اور دوسرے الف کو غیر ضروری سمجھتا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح "علیٰ ہذا القیاس" ہے ۔

براہ نوازش استفسارات کے سلسلہ میں جواب تحریر فرمایئے اور مثالیں معہ دلیل بیان فرمایئے، تاکہ طرفین مستفید ہو سکیں۔ ممکن تھا کہ میں زبانی آپ سے اس مسئلہ کو حل کر لیتا لیکن اس صورت میں معترض مطمئن نہ ہوتا ۔

(نگار) "سوق الکساد" صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے بلکہ کھلی ہوئی ترکیب اضافی ہے ۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہوتی تو "سوق کاسد" یا "السوق الکاسد" ہوتی ۔ یہاں تو کساد بھی اسم ہے اور سوق بھی اسم ۔

ہر چند شعراء فارسی نے "کساد" کو کبھی کبھی "کاسد" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ظہوری کہتا ہے:

شوقت نبرد بہ کار ما دست بازار رفوگراں کساد ست

لیکن بہ حالت ترکیب کساد، کاسد کے معنے میں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

عربی میں صفت و موصوف کے ساتھ الف لام کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ یا تو دونوں پر الف لام ہوگا جیسے ت المرٔۃ الحسناء (میں نے ایک خوبصورت عورت دیکھی) یا کسی پر نہیں جیسے "جاءنی رَجُلٌ قبیحٌ" میرے پاس ایک صورت مرد آیا۔

ترکیب اضافی میں مضاف پر کبھی الف لام داخل نہ ہوگا اور مضاف الیہ معرّف بہ لام بھی ہو سکتا ہے، جیسے: رۃ العین" (آنکھ کی سرخی) اور فرس زید (زید کا گھوڑا) لیکن فارسی والے اس کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے خاقانی کا شعر ہے:

دنیاست کمینہ چاکر انش، در دار الحکم داورانش،

اور شاعر کہتا ہے:

منت خدائے را کہ علی الرغم روزگار منصور گشت رایت خان بزرگوار

شعر میں حکم اور دوسرے شعر میں رغم مضاف ہے، لیکن الف لام دونوں پر داخل ہے۔ بات یہ ہے کہ دونوں شعروں میں پورے کلمۂ مرکب کو کلمۂ واحد خیال کر لیا گیا ہے، یعنی "دار الحکم" اور "علی الرغم" دونوں کو کلمہ یا لفظ خیال کر کے مضاف بنایا گیا ہے اور اس لئے مضاف پر الف لام داخل کرنے کا اعتراض دفع ہو گیا۔

گو اس کا تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں لیکن میں نے اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ آپ کا معترض الف لام کے میں بہت زیادہ سخت گیر معلوم ہوتا ہے، مبادا وہ فارسی کی اس قسم کی ترکیبوں پر بھی آئندہ اعتراض کی ت کرے۔

الغرض "سوق الکساد" کی ترکیب بالکل صحیح ہے اور معترض نے یا تو غلطی سے کساد کے معنے کاسد سمجھ کر صفت و موصوف قرار دیا یا سرے سے وہ اس ترکیب کو سمجھے ہی نہیں۔

"سوق الکساد" کی ترکیب بالکل ایسی ہی ہے جیسے "نار الحب" (محبت کی آگ) اور اگر یہ صحیح ہے تو اسے صحیح ہونا چاہئے۔ چند مثالیں عربی شعراء کے کلام سے ملاحظہ ہوں:

صلاح الدین لکھتا ہے:

یکفیک من ھولہ ان لست تبلغہ الّا اذا ذُقت طعم الموت فی السفر

ت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو اس کے ہول کا خیال بھی نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تو سفر میں موت کا مزہ چکھے)

اسی کا ایک شعر اور ہے :

واذا رایت بنیک فاعلم انہم قطعوا الیک مسافۃ الآجال

(جب تو اپنی اولاد کو دیکھے تو جان لے کہ انھوں نے موت کا راستہ تیری طرف بنا دیا ہے)

ابن ملیح لکھتا ہے :

طویت سماء المکرمات وکورت شمس المدیح

(انعام و اکرام کے آسمان لپیٹ دئے گئے اور مدح و ثنا کا آفتاب تاریک ہوگیا)

ایک اور شاعر السنجاوی کا شعر ہے :

ومن العجائب انني فی لج بحر الجود راکب

(عجیب بات دیکھو کہ میں دریائے جود و کرم پہ چلا جارہا ہوں)

ابوالمظفر مجدالدین کا شعر ہے :

لم القہ مذ تصاحبنا فحین بدا لناظری افترقنا فرقۃ الابد

(جب تک ہم وہ ساتھ ساتھ رہے کبھی میں نے اسے نہ دیکھا لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے)

ان اشعار میں طعم الموت (موت کا مزہ) مسافۃ الآجال (موت کا راستہ)۔ سماء المکرمات (انعام و اکرام کا آسمان) اور بحر الجود (عطا و بخشش کا سمندر)۔ فرقۃ الابد (ہمیشہ کی جدائی) یہ سب ترکیبیں سوق الکساد کی قسم کی ہیں اور عربی میں بکثرت مستعمل ہیں۔

۲۔ علیٰ ہٰذاالقیاس کا صحیح املا وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں، یقیناً درمیان میں دو الف ہونا چاہئے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ اگر بجائے ہٰذا کے "ہٰذہٖ" ہو تو کیا وہ ہٰذا کی طرح ہٰذہٖ کی (ہا) کو بھی اُڑا دیں گے اور اسے بھی علے ہٰذالقیاس لکھیں گے۔

الغرض آپ کا معترض دونوں باتوں میں غلطی پر ہے۔ انشاء بھی غلط، املا بھی غلط !

کلام ماہر لکھنوی

(مسلسل)
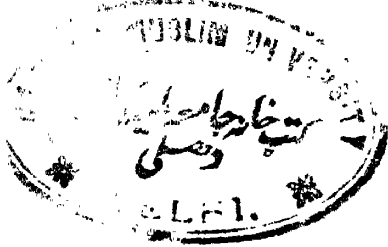
تصوف - ماہر کے کلام میں متصوفانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

حُسن قدرت کا تری ہی جلوہ گر تن میں مرے ——— ہوں ترا عاشق جو اپنا آپ ہی دیوانہ ہوں

جو آئینہ ہے وہ ترا صورت نما نہیں ——— یکتا وہ تو ہے جس کا کہیں دوسرا نہیں

مدام تشنۂ عرفان کردگار رہا ——— وہ مست ہوں کہ جو غفلت میں ہوشیار رہا

کیوں نہ فرقت میں بھی اب لطف ملیں وصلت کے ——— دل وہ پہلو میں ہے جس میں ہی محبت تیری

کس کس حجاب میں نظر آیا جمال دوست ——— کیا حُسن ہے حجاب میں دیدار عام ہے

کس طرح ڈھونڈیں یہ میں عشاق وحدت بانے سے ——— دے تجھے کوئی صدا بھی تو تری آواز سے

دیکھیں بشر جو چشم بصیرت سے اک ذرا ——— ہر رگ دکھائے معرفت حق کی راہ کو

رنگ صانع کا ہر اک گل سے نمایاں دیکھا ——— سبزۂ باغ کو خضر رہ عرفاں دیکھا

باغ سے صنعت صانع کو نمایاں دیکھا ——— ہر رگ گل کو رہ منزل عرفاں دیکھا

جو دیکھتے ہیں تامل سے ہر رگ تن کو ——— وہ راہ معرفت کردگار سمجھے ہیں

نہاں وہ نظروں سے سمجھے ہیں جو کہ بینا ہیں ——— وہ کور ہیں جو تجھے آشکار سمجھے ہیں

ہے تعدد بھی بتوں کا اُسکی وحدت کی دلیل ——— کب خدائی کا سماں دیر برہمن میں نہیں

مذہبی عقیدت - ماہر نے اکثر اشعار میں اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مرسلوں میں بھی دم حشر یہ غل ہے تہ عرش ——— سب ہٹیں امت محبوب خدا آتی ہے

نبی نہ کیوں خم ہوں مثل خاتم اُٹھائے ہیں سر یہ بار عالم ——— نہ کیوں تواضع سے ہوں مکرم نشان ہی پشت پر نگیں کا

میں لے کے نسخۂ اکسیر کیا کروں ماہر ——— جہاں میں خاک در بوتراب باقی ہے

ماہر کو قبر پیستی ہے یا ابوتراب ——— جلد آیئے فشار ہوا استخواں جلے

زمیں بھی ہے یہ شایق مہدی ہادی کے مقدم کی　　　　بنے ہیں دیدہ ہائے منتظر نقشِ قدم ماہرؔ

وسعت تخئیل - یہی وہ انفرادی رنگ ہے جس کا نمایاں طور پر ماہرؔ کے کلام میں مظاہرہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف اور متنوع اشیاء پر مختلف طرح سے نظر کی ہے اور اُس کے جداگانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اُس سے بوقلموں نتائج پیدا کئے ہیں۔

یوں تو بہت سے شعراء کے کلام میں جستہ جستہ اس طرح کا نمونہ ملتا ہے لیکن جس وسعت اور تجزیہ وتنوع کے ساتھ ماہرؔ نے ہر شے کو دیکھا ہے وہ اُنہی کا حصہ ہے۔

پہلو جن پر وہ نظر ڈالتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اخلاقی، فلسفی، نفسیاتی اور بعض بالکل شاعرانہ اور اسی میں تشبیہات کا ایک خزانہ ہے جو بڑی فیاضی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے۔ میں اُن اشیاء کو حروف تہجی کی ترتیب سے درج کروں گا اور اُن میں سے ہر ہر پہلو کے متعلقہ اشعار کو الگ الگ پیش کروں گا۔

(۱) آبلہ:

مثالِ آبلہ ادنیٰ کے دکھ سے دکھ ہے مجھے　　　　دیے جو پاؤں نے کانٹا کھٹک سی سر میں رہے

کہتا ہوں یہ تپک پہ ہر اک آبلہ کی میں　　　　دل سینکنے دیگا اے مرے پروردگارِ دل

عجب نہیں اس اشارے سے وہ چلے آئیں　　　　تپک تپک کے بلاتا ہے آبلہ دل کا

خارہائے دشت سے کہدو کہ لیں گے کب خبر　　　　آبلے بھی بیٹھے جاتے ہیں مرے دل کی طرح

دشتِ وحشت نے بڑھایا درد جب میرا کبھی　　　　آبلے پا کے بنے چھالے زبانِ خار میں

وحشی خجل ہیں پاؤں جو گھر سے نکال کے　　　　شیشے ہیں آبلے عرقِ انفعال کے

(۲) آسیا:

نہ جا صدائے فقیران آسیا خو پر　　　　یہ جتنا سیر ہوں اُتنا سوال کرتے ہیں

مستحق جان نہ تو سائل سرگرداں کو　　　　آسیا کا جو بھرے پیٹ تو چکر میں رہے

ہیں سخت جاں رقیب سوا آسیا سے کیا　　　　کوئی مرض نہیں ہے تو دورانِ سر تو ہو

(۳) آشیاں:

نظر گلچیں کی کیوں پڑتی اُجڑتا کیوں مکاں میرا　　　　چھپا لیتے جو برگِ نخل ملکر آشیاں میرا

وہیں سب ہمزباں ہیں، ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا　　　　چمن میں جس طرف اُجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

ہوا پر دیکھکر تنکے، قفس میں میں یہ کہتا ہوں　　　　کدھر ہو باغ والو، لٹ رہا ہے آشیاں میرا

قفس میں میں ہوں وان پھولوں بھری شاخیں گلستاں میں　　　　عوض میرے لگاتی ہیں گلے سے آشیاں میرا

صیاد کچھ تو اہل قفس کا نشاں رہے　　　　ہم ہوں نہ ہوں چمن میں مگر آشیاں رہے

اُسی کو ہوش ہیں دیکھا اُجڑتے آنکھوں سے　　　　جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کے لئے

(۴) آفتاب: طلسم تھا کہ شعاعوں میں آفتاب آیا　　　　ہزار ہاتھ پہ اک ساغر شراب آیا

کیوں شفق گوں ہو نہ رنگ حسن ایاغ آفتاب
ہیں شعاعیں موج صہبائے ایاغ آفتاب

ہیں شعاعیں یا نگاہیں ہول ہیں بیٹھے جاتی ہو تم
دست نازک پر یہ کس کے ہے ایاغ آفتاب

دیدے اپنے دست نازک سے مجھی کو لے شعاع
گر نہیں ہاتھوں سے تھم سکتا چراغ آفتاب

خوشبو کی طرح ہم تن میں جو داغ ہوں
سائے میں میرے خلق کو مشکل قیام ہے

وہ محو خواب ناز ہیں، نکلا ہے آفتاب
دکھلا رہا ہے آئینہ گردوں سحر نہیں

یہاں عربی کا یہ مصرع یاد کر لیجئے :- والشمس کالمرآۃ فی کف الاشل

(۵) آئینہ: جوہر سے آئینوں کا کلیجہ فگار ہے
پتھر میں کس نظر کا نشاں آشکار ہے

اڑ کر سے جذب دل اتر آئی شبیہ دوست
میری نظروں سے جو آئینے نے دیکھا سوئے دوست

آئینہ سامنے رکھکر کبھی کھلا کچھ نہ تمہیں،
اپنے گھر میں رہے یا غیر کے تم گھر میں رہے

آئینہ لیکے ہاتھ میں غیروں پہ طعن ہے
خود گر پڑے جو حسن پہ اُس کی خبر نہیں

صاف کر قلب تو ہو تنگی میں وسعت تجھکو
ایک آئینہ میں سو مردم محفل ٹھہرے

آئینہ لیکے کبھی بڑھتی نہیں حیرت تیری
دیکھ تو دیکھ رہی ہے تجھے صورت تیری،

اُن کو جب ہوتی ہے منظور نظر خود بینی
میری حیرت اُنھیں آئینہ دکھا آتی ہے

(۶) اسپند: مثل اسپند کبھی دی دل نے نہ آواز مجھے
ایسے جلنے پہ اور اس ضبط پہ ہے ناز مجھے

ایک نالے نے فنا مجھ کو کیا مثل سپند
ڈھونڈھتی کیوں نہ نکلکر مری آواز مجھے

ہر دو غیروں کے لئے دل کو جلا دیتے ہیں
صاف اسپند سر آتش پہ صدا دیتے ہیں

(۷) اشک: اشکوں سے کچھ سکون ہے مجھ پر گناہ کو
تنہا نہ بہ سکے لنگروں نے جہاز تباہ کو

کس طرح رونے میں لے آہ بھی الجھوں ہوئے دوست
آنسوؤں کے تار الجھے ہیں نگہ کے تار میں

کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو
آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں

کاندھا بدلتے آتے ہیں آنسو کبھی سوئے چشم
جاتی ہے لاش قبر میں، لخت جگر نہیں،

بیجاں کریں گے عشق میں اشک رواں مجھے
لوٹیگا رہزنوں کی طرح کارواں مجھے

اشک ہر ایک مثال در غلطاں نکلا،
دل کے ویرانہ سے گنجینۂ پنہاں نکلا

آہ دل سے جوش اشک چشم حیراں ہو گیا
لو ہوا سے آب آئینہ میں طوفاں ہو گیا

مرے دامن کو رنگیں اشک خوں سے دست ہوئے دیں
محبت میں لُٹیگا میرے ہاتھوں کارواں میرا

امنڈ آئے ہیں میری آنکھوں میں آنسو
حبابوں سے دریا بہا چاہتے ہیں،

ڈھل آئے ہیں آنکھوں سے مژگاں پہ آنسو جہازوں کے لنگر پڑا چاہتے ہیں

وہی نکلے ہیں بنکر اشکہائے سرمہ آلودہ بھرے تھے کوٹ کر موتی جو انکی چشم جادو میں

تری مژگاں نے کچھ ڈھلکا کے اشک سرمہ آلودہ لگایا قفل بھی طرفہ طلسم چشم جادو میں

(۸) اگر: جیسے جلتا ہے اگر پردۂ خاکستر میں چپکے چپکے یونہیں جل جاتے ہیں جلنے والے

وہ سلامت رہیں یارب کہ اگر کی صورت دفن جو مجھکو مری خاک میں کر دیتے ہیں،

(۹) برق: ابر میں برق کی یہ جلوہ گری کہتی ہے کوئی بے چین ہے پردہ سے نکلنے کے لئے

(۱۰) بگولہ: کیا ہوا سایہ فقیروں کی جو تربت پر نہیں، سر بگولا گنبد گور غریباں ہو گیا

دھوپ میں دشت نوردی کو جو نکلے وحشی کھولکر چتر بگولے سر منزل ٹھہرے

مجھ سے وحشی کا جنازہ جو اٹھا صحرا میں کاندھا دینے کو بگولے سر منزل ٹھہرے

بگولے پیچھے ہیں سر کو کھولے جنازہ آگے ہے مجھ حزیں کا،

(۱۱) بو: چمن دہر میں جمعیت خاطر ہے کسے بوئے گل کو بھی جو دیکھا تو پریشاں دیکھا

برنگ بو ہوں نہ پوچھو مرے سفر کا حال ہوا جدھر کی چلی اُس طرف روانہ ہوا

طایر بو کی طرح غیر سے بازو ہیں قوی، جنبش موج ہوا ہے پر پرواز مجھے

زور بازو نے لیا تھا بوئے غنچہ جب سے مجھے سو قفس تھے پر نہ اک بھی مانع پرواز تھا

(۱۲) پرکار: جامع مقام و کوچ کا پرکار دار ہوں اک پاؤں ہے حضر میں مرا اک سفر میں ہے

(۱۳) پیری: بڑھاپا آتے ہی بیگانہ سر بیگانہ ہوا سحر طلوع ہوئی قافلہ روانہ ہوا

فصل پیری میں کیوں نہ ہو دھڑکن دل میں یہ ماتم جوانی ہے،

تصویر انقلاب زمانہ ہوں شیب میں پاؤں میں ہے سکون حرکت جب سے سر میں ہے

تاثیر ضعف عالم پیری کو دیکھنا سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

تکلیف عدم جانے کی جب کرتی ہے پیری، کس عجز سے کرتا ہوں "نہیں" سر کو ہلا کے

پیری میں رووُں کو نسے عضو بدن کو میں دل مر چکا ہے آنکھ کا لبریز جام ہے

شب شباب کٹی خوف روز پیری میں تمام رات ہم اندیشۂ سحر میں رہے

عبث ہے ذکر اب کسی حسیں کا کہ پیری آئی شباب گزرا علاقہ ناز و ادا سے رکھا، وہ میں نہیں ہوں وہ دل نہیں ہے

عروق پیری میں جو عیاں ہیں انھیں میں دنیا کے سم نہاں ہیں کہاں کہ ہاتھوں کی جھریاں ہیں ہزار ہا مار آستیں ہے

سب چل بسیں گی دل سے بڑھاپے میں حسرتیں نکلے گا قافلہ بھی سرا سے سحر تو ہو،

(۱۴) **تسبیح:** حال رشتہ کا سرِ تسبیح سے آخر کھلا — کیوں نہ آتا اک زباں پر سو دلوں میں راز تھا

کہتے ہیں پھر کے دانۂ تسبیح وقت ذکر — کچھ ہو نہ نکلے ہاتھ سے دل انقلاب میں

گر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اسکو کھونا تو اُسکو پانا — ہزار پھیرا، ہزار بار فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

صورت دانۂ تسبیح رہے گردش میں — گو سفر ہم نے کیا پر نہ وطن سے نکلے

صفت دانۂ تسبیح ہوں، کیونکر ہو سکون — چین اُس ہاتھ سے پاؤں تو مرا دل ٹھہرے

(۱۵) **تصویر:** کوئی خوددار مصور سے کھنچا بیٹھا ہے — اب نہ کاغذ پہ گرے عکس تو کچھ دور نہیں

اُنکی تصویر کا کیوں رنگ نہ رہ رہ کے اُڑے — نچلے بیٹھیں کہیں بے چین یہ دستور نہیں

ضعف سے ہوں ہمہ تن صورت تصویر ضعیف — رنگ کے ساتھ خود اُڑ جاؤں تو کچھ دور نہیں

جن کی تصویر مرے پاس ہے کہدو اُن سے — آپ ہی اپنے سے تم دور رہو، ہم دور نہیں

تصویر کھنچ رہی ہے، نزاکت میں مست ہیں — کھنچ کر چلے کہاں سے کہاں کچھ خبر نہیں

ملگئے ہیں آج بے تابو جو وہ تقدیر سے — رنگ کیا کیا کر رہا ہے شوخیاں تصویر سے

خود بھی تصویر بنے ہو، یہ تماشا کیا ہے — منھ اُترتا ہی چلا جاتا ہے، نقشہ کیا ہے

مرغِ تصویر ہوں پوچھو نہ مری حسرت کو — پر تو ہیں بھی مگر آتی نہیں پرواز مجھے

(۱۶) **تگرگ:** واہ کیا خوب ہوا ختم سفر مثل تگرگ — ہمیں باقی نہ رہے جب سر منزل ٹھیرے

(۱۷) **جادہ:** خاکساروں کا سلوک اعجاز سے خالی نہیں — بے چلے جادہ رہا ہمراہی رہگیر میں

ہے کون مجھ غریب کی لے آ کے جو خبر — پھیلائے پاؤں سوتے ہیں جادے بھی راہ میں

سیراب آبلوں سے میں کس طرح کروں — جادے زبان خشک دکھاتے ہیں راہ میں

غربت ہماری ہے بصفت جادۂ طریق — صحرا میں جاکے بھی قدم اپنا وطن میں ہے

کس نے تھک کر راہ کو دیکھا تھا چشم یاس سے — صورت مژگاں ہر جادۂ منزل میں ہے

(۱۸) **جرس:** عبث لب ہے نالاں جرس راہ میں، — کوئی قافلہ سے جدا ہو گیا،

(۱۹) **جگنو:** بعد مردن فصل باراں کا یہ احساں ہو گیا، — جگنوؤں سے قبر پر میری چراغاں ہو گیا،

ذرا سے سن میں وہ ترجیح کس کے حسن کو دیں — فلک پہ نجم ہیں، جگنو ہیں اُن کے بستر پر

(۲۰) **حباب:** دیکھ مٹ جائے گا دم میں تو حبابوں کی طرح — بحر عالم میں جو سر بھولے سے بھی اُٹھ جائے گا

حباب آسا فلک کے دور میں مٹ کر یہ کہتا ہوں — کسی کا ذکر کیا ملتا نہیں مجھکو نشاں میرا

حباب بحر ہوں پوچھو نہ مجھ سے حال قسمت کا — یہ گردش ہے کہ میرے ساتھ پھرتا ہے مکاں میرا

ہوائے منزدی خانۂ حباب ہوں میں — رہے گا گھر بھی نہ باقی جو میں روانہ ہوا
بحر جہاں میں ہوں میں ہوائے تہِ حباب — گر میں نہ ہوں تو گھر کا بھی میرے نشاں نہ ہو
جب بلند اپنا ہوا نام و نشاں آپ سے آپ — بن گیا مثل حبابوں کے مکاں آپ سے آپ
جب کچھ کھلا نہ حال طلسمات دہر کا — موجیں کلید بن گئیں قفل حباب میں
یہ حباب آگے سر آب خبر دیتے ہیں — دم جو لیتے ہیں زمانہ میں وہ سر دیتے ہیں
مسکن کسی کا مثل حباب رواں نہ ہو — نکلے بدن سے سانس تو گھر کا نشاں نہ ہو
رواروی کا جو غل تا بہ گوش آتا ہے — حباب بحر میں خانہ بدوش آتا ہے
آ کے موجوں نے حبابوں کو طمانچہ مارا — اُن کا انجام یہ ہے جنکے ہوا سر میں رہے
دم بخود کیوں نہ رہوں دہر میں مانند حباب — سانس لیتا ہوں تو دم تن سے فنا ہوتا ہے

(باقی) ع - ن

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کمار پا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُنکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

تنوعات

روس میں پچھلی دفعہ سالانہ پریڈ کے وقت ہر سائکل سوار کے ساتھ ایک کُتا بھی پایا جاتا تھا۔ گویا جنگ کے دوسرے ضروری اسلحہ کے ساتھ کتے کا رہنا بھی ضروری ہے۔ اور وہاں اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ روس سے کوئی کُتا باہر جا ہی نہیں سکتا جب تک وہ فوجی خدمت کے ناقابل نہ سمجھ لیا جائے

گزشتہ سو سال کے اندر چھ لڑائیوں کا ایک دوسرے سے ریاضی کا عجیب و غریب تعلق پایا جاتا ہے یعنی ہر پچھلی لڑائی کے مختتم سال میں اس کے ہندسوں کو علٰحدہ علٰحدہ جمع کر دیجئے تو آیندہ لڑائی کے آغاز کا سال نکل آتا ہے ——— چین کی لڑائی سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۸۴۲ء تک جاری رہی۔ اب ۱۸۴۲ میں ۲، ۴، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۱۵) کو جوڑ دیجئے تو سنہ ۱۸۵۷ء ہو جائے گا، جب ہندوستان میں غدر ہوا ——— اب پھر دیکھئے کہ غدر ختم ہوا سنہ ۱۸۵۸ء میں۔ اس میں ۸، ۵، ۸، اور ۱ کے مجموعہ (۲۲) کو سنہ ۱۸۵۸ء میں جمع کیجئے تو ۱۸۸۰ ہو جائے گا اور یہی سال مصر کی لڑائی کا تھا ——— مصر کی لڑائی سنہ ۱۸۸۱ء میں ختم ہوئی۔ اس میں ۱، ۸، ۸، اور ۱ کے مجموعہ (۱۸) کو جمع کیجئے تو ۱۸۹۹ ہو گیا اور یہی سال جنوبی افریقہ کی لڑائی کا تھا۔ سنہ ۱۶۴۰ء سے انگریزوں کی سول وار شروع ہوئی بادشاہ قتل ہوا اور پہلی جمہوریت کرامول کی سیادت میں قایم ہوئی سنہ ۱۸۴۰ء میں یوروپ انقلابی سرگرمیوں کا شکار رہا اور زبردست قحط پڑا۔ اب دیکھئے سنہ ۱۹۴۰ء سے کس مصیبت کا آغاز ہوتا ہے

اظہار محبت کے خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط وہ ہے جو اسوقت برطانیہ کے عجائب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ خط ملکۂ الزبتھ کے ایک درباری نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط چار سو باریک لکھے ہوئے صفحات کو محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے ——— غالبًا اس کی شادی اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تو باتوں ہی باتوں میں مار ڈالتا۔

امریکہ کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک مرتبہ کسی ملک کا سفیر اس کے کمرہ میں ناگہاں داخل ہو گیا جہاں لنکن اپنا جوتا صاف کر رہا تھا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں"

لنکن نے جواب دیا "ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کیا کرتے ہیں ؟"

ایک سائنس داں نے نظریہ پیش کیا ہے کہ گوشت کا استعمال گلے کے اعصاب اور رگوں کی نرمی کو ضایع

کر دیتا ہے اس لئے گوشت کھانے والے اچھے گانے والے نہیں ہوسکتے۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش کرتا ہے جو بہت گوشت کھاتے اور بہت خراب گانے والے ہیں برخلاف اٹلی والوں کے جو گوشت بہت کم کھاتے ہیں اور عمدہ گانے والے ہیں۔

اس نے ثبوت میں اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ گانے والی چڑیاں جتنی ہیں سب گھاس پات کھاتی ہیں، برخلاف اس کے چیل، گدھ وغیرہ گوشت خوار طیور سب اس نعمت سے محروم ہیں۔

لڑکوں کی پیدائش جنگ کے وقت زیادہ ہوتی ہے یا اس کے بعد۔ پروفیسر پارسل تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمیشہ جنگ ختم ہونے کے بعد لڑکوں کی پیدائش زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی لڑائی کے بعد جب ۱۸۹۰ء میں بیس سال کے نوجوانوں کی بھرتی شروع ہوئی ہے، تو ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتخاب مشکل ہوگیا۔ اس کا سبب پروفیسر مذکور نے یہ بتایا ہے کہ مردوں کی زیادتی انحطاط کی علامت ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہترین تواناکے مرد لڑائی کے میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور صرف بیمار و کمزور آدمی رہ جاتے ہیں، جن سے بہ حالتِ امن مشکل سے عورتیں شادی کرنے پر راضی ہوسکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انھیں مجبوراً انھیں چھٹے ہوئے مردوں سے عقد کرنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ پیدا ہوجاتے ہیں جو مردوں کے انحطاط کی علامت ہے۔

الاما با میں عورتیں پاؤں میں کوئی زیور استعمال نہیں کرسکتیں۔

اُتاہ میں جوتے کی ایڑی کی اونچائی ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

بوسٹن میں ہر کُتے کی ٹانگ دس انچ سے کم ہونا چاہئے۔

مسیسپی میں بغیر جوتوں کا فیتہ باندھے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

نیویارک اسٹیٹ میں کوئی شخص گھوڑے کے پاس چھتری نہیں کھول سکتا۔

امریکہ کے کسی اخبار نے ایک ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کی لوگوں کو دعوت دی اور سب سے بہتر کہانی پر انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں نے حصہ لیا اور انعام ذیل کی کہانی کو ملا:-

الونیا کو اپنے بھائی کا ایک تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ افریقہ کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے:۔ "باب شیر کا شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا۔" الونیا بہت رنجیدہ ہوئی اور فوراً تار دیا کہ "اُسے گھر بھیجدو"۔ تین ہفتہ کے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہونچا، جس کے اندر شیر تھا۔ الونیا نے پھر تار دیا کہ:۔ "شیر پہونچ گیا، تم سے غلطی ہوئی، باب کو بھیجو"۔ اس کا جواب آیا کہ:۔ "غلطی نہیں ہوئی۔ باب، شیر کے اندر ہے"۔

رجسٹرڈ نمبر ا ۔ ۳۶۶
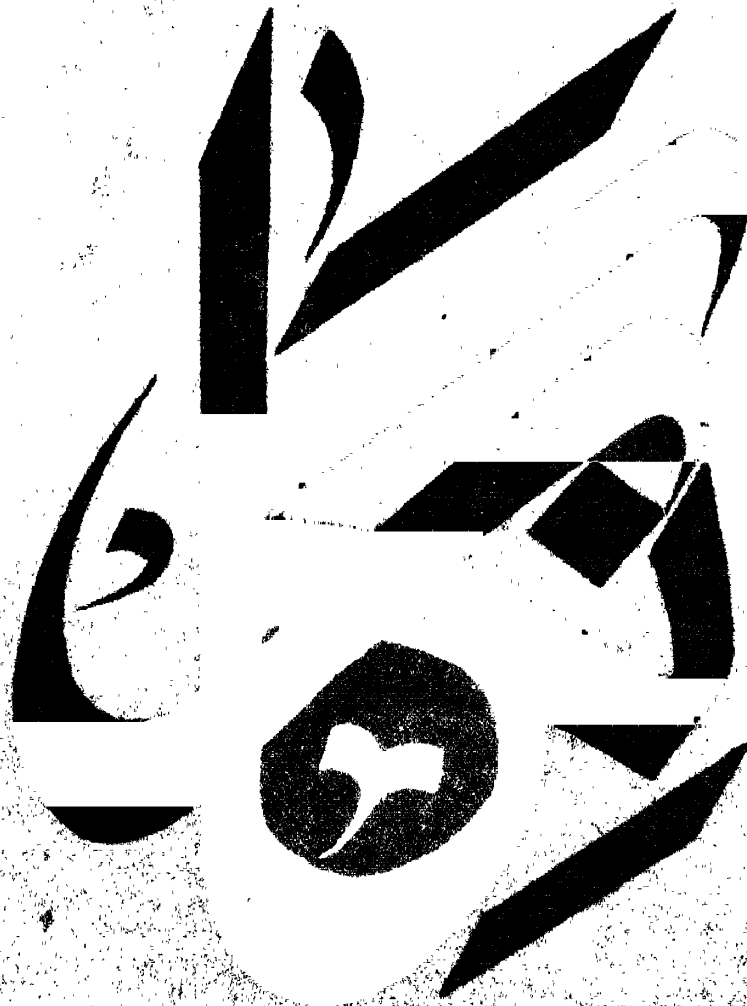
قیمت ۸/

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آ
دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس
قیمتاً یعنی ۸ ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

نگار اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۷ | فہرست مضامین مئی ۱۹۴۰ء | شمار ۵

ملاحظات

موجودہ جنگ۔ اور۔ برطانیہ کی سیاسی غلطیاں

عام طور پر ہر شخص یہی سوال کرتا ہے کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا حالانکہ سوال کی صحیح صورت یہ ہونا چاہئے کہ "جنگ کا رُخ کیا ہے" یوں تو پیشین گوئی جو بھی ہو غیر یقینی چیز ہے، لیکن جنگ کے متعلق پیشین گوئی کرنا غیر یقینی بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اس لئے لڑائی کے انجام پر کبھی غور نہ کیجئے بلکہ صرف یہ دیکھئے کہ اسوقت تک جو کچھ ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں از خود کوئی منطقی نتیجہ سمجھ میں آجائے تو مجبوری ہے۔ آج کی صحبت میں ہم یہی بتانا چاہتے ہیں کہ گزشتہ آٹھ مہینے میں کیا کیا ہو چکا ہے اور اس کو دیکھکر فریقین میں سے کس کو کامیاب اور کس کو ناکام کہہ سکتے ہیں

اس زمانہ کی کسی جنگ پر تبصرہ کرنے کے لے ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ کس فریق کے کتنے سپاہی ہلاک ہوئے، کتنے جہاز تباہ کئے گئے بلکہ صرف یہ غور کرنا چاہئے کہ سیاسی چالیں کس کی زیادہ کامیاب رہیں، کس کی گھاتیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور وقت و موقعہ سے کس نے زیادہ فائدہ اُٹھایا

چونکہ یہ جنگ فی الحقیقت گزشتہ جنگ عظیم ہی کا تتمہ ہے، اس لئے مختصراً پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پچھلی لڑائی نے یورپ کے نقشہ میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور اس سے وہاں کی بین الاقوامی سیاست پر کیا اثر پڑا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ پچھلی لڑائی میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی تھے، دوسری طرف روس، فرانس، جرمنی اور اٹلی۔ اسی کے ساتھ آپ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ سنہ ۱۴ء سے سنہ ۱۸ء تک جرمنی کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور انھیں کامیابیوں کا نتیجہ وہ عہد نامہ تھا جو

عہد نامہ برسٹ لٹوسک (Brest Litovsk) کے نام سے موسوم ہے

اس معاہدہ میں ایک فریق روس تھا اور دوسرا جرمنی و ترکی و بلغاریہ۔ چونکہ دوران جنگ میں روس کے اندر اشتراکی انقلاب پیدا ہو گیا تھا (جسے جرمنی ہی نے زیادہ کامیاب بنایا تھا) اس لئے روس نے ہتھیار ڈالدئے اور جرمنی نے نہایت سخت شرائط صلح پیش کئے۔ ان شرائط کی رو سے، لتھونیا، لیٹویا، اسٹونیا، روسی پولینڈ، اور بالٹک کے بعض جزایر روس کے قبضہ سے نکل کر جرمنی و آسٹریا کو مل گئے اور یوکرائن، فن لینڈ اور جارجیا کی آزادی بھی روس کو تسلیم کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی آبادی کا ۳۴ فی صدی حصہ صنعتی اداروں کا ۵۴ فی صدی حصہ اور کوئلہ کی کانوں کا ۹۰ فیصدی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معاہدہ ۳ مارچ سنہ ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا

لیکن اس کے تقریباً ایک سال بعد ہی حالات کا رُخ بدلا اور جرمنی کو شکست ہوئی، اسی کا نتیجہ معاہدۂ ورسائی (Versailles) ہے جس کو موجودہ جنگ کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ۲۸ جون سنہ ۱۹ء کو ہوا۔ اس معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

۱۔ آسٹریا ہنگری کی عظیم الشان سلطنت توڑ کر دو چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنادی گئیں، ایک آسٹریا (جس پر اب جرمنی قابض ہے) اور دوسری ہنگری

۲۔ آسٹریا ہنگری کا بہت بڑا علاقہ نکال کر ایک نئی حکومت زیکوسلوویکیا کے نام سے قایم کی گئی

۳۔ پولینڈ کی حکومت پھر قایم ہوئی اور رومانیا و سربیا (موجودہ یوگوسلویا) کے حدود کو بلغاریہ و ہنگری کے علاقے چھین کر اور زیادہ وسیع کر دیا گیا

۴۔ پولستانی کریڈور (Corridor) جرمنی سے لیکر پولینڈ میں شامل کر دیا گیا اور رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد بالائی سلیشیا کا معدنی علاقہ بھی بعد کو پولینڈ میں شامل ہو گیا

۵۔ شمالی سلسوگ (Sleswig) ڈنمارک کو دیا گیا

۶۔ میمل لتھونیا کی نئی وضع کی ہوئی حکومت کو دیا گیا

۷۔ زیکوسلوویکیا کو ہمبرگ اور اسٹٹن (Stettin) میں خاص حقوق دئے گئے

۸۔ بلجیم کو یوپن (Eupen) اور مالمڈی (Malmedy) کے اضلاع دئے گئے

۹۔ علاقۂ سار کی معدنیں کوئلہ کی پندرہ سال کے لئے فرانس کو دیدی گئیں

۱۰۔ لورین کا بڑا حصہ جس میں لوہے کی کانیں ہیں اور السا کہ جس میں پوٹاشس کی معدنیں ہیں فرانس کو دیدیا گیا

۱۱۔ رہائن لینڈ کا علاقہ بھی پندرہ سال کے لئے اتحادیوں کو ملگیا

۱۲۔ جرمنی نوآبادیاں جو افریقہ میں پائی جاتی تھیں سب کی سب اس کے ہاتھ سے نکل گئیں اور اسی طرح بحر پاسفک کے جزایر بھی

بحری و بری افواج کو کم کر دینے اور زبردست تاوان جنگ ادا کرنے کی شرطیں ان کے علاوہ تھیں۔

یوروپ کا نقشہ گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے سنہ ۱۴ء

یوروپ کا نقشہ جنگ عظیم کے بعد سنہ ۱۸ء سے سنہ ۳۹ء تک
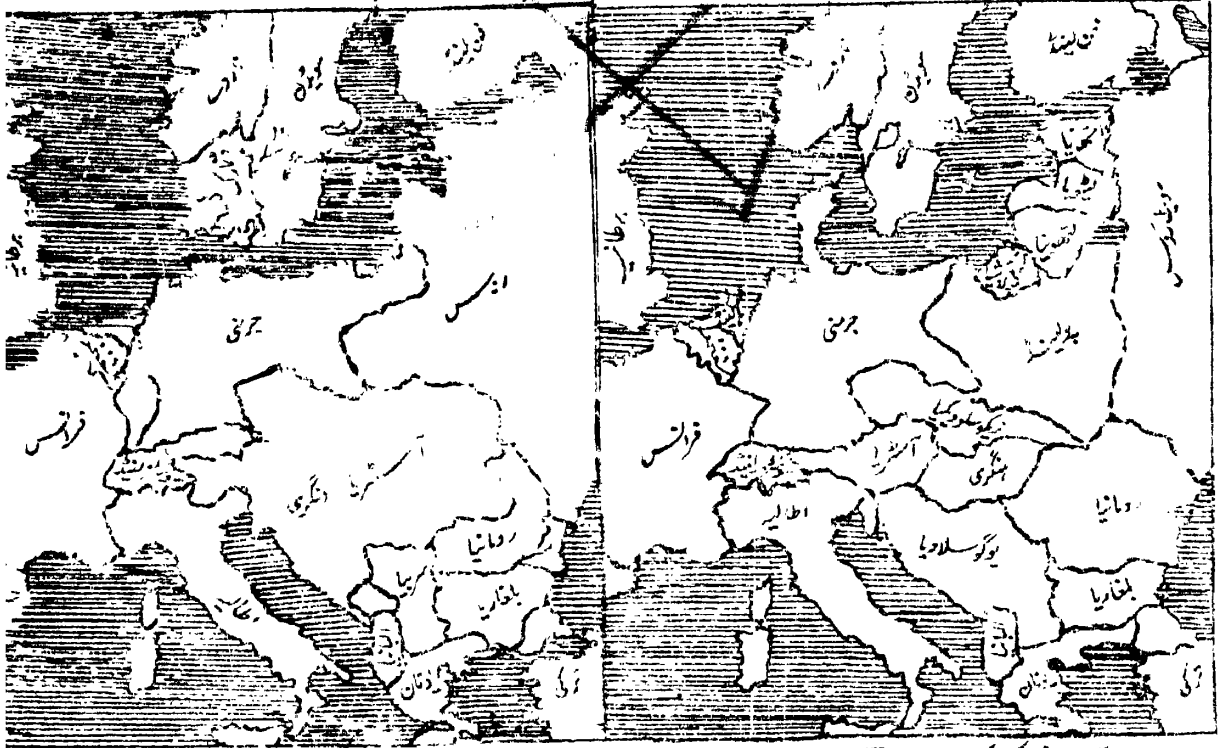
آپ نے دیکھا کہ معاہدۂ ورسائی نے جرمنی اور اس کے رفقاء کو بیدست و پا کر دینے کے لئے وسط یوروپ کے سیاسی و جغرافی نقشہ میں کتنی غیر معمولی تبدیلیاں کیں لیکن افسوس ہے کہ معاہدۂ ورسائی کی اسی غیر عاقلانہ تقسیم نے ایک دوسری لڑائی کا بیج بو دیا جس کا نتیجہ موجودہ جنگ ہے

گزشتہ جنگ عظیم نے دنیا کا اقتصادی نظام یونہی درہم برہم کر دیا تھا کہ معاہدہ ورسائی کی اس تقسیم نے اس کو زیادہ سخت بنا دیا، اور جرمن قوم مجبور ہوگئی کہ اپنے بقاء کے لئے ہر جائز و ناجائز کوشش صرف کر دے۔

چنانچہ تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ معاہدۂ ورسائی کی غلطی کو تسلیم کیا جانے لگا اور یوروپ میں توازن قوت کی پالیسی درہم برہم ہوتی نظر آنے لگی۔ اس احساس کا نتیجہ ۱۶ نومبر سنہ ۳۵ء کو معاہدۂ لوکارنو (Locarno) کی صورت میں نمودار ہوا

اس معاہدہ میں فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی اور بلجیم شریک تھے جس کی رو سے بلجیم، فرانس اور جرمنی نے وعدہ کیا کہ ان میں سے کوئی دوسرے ملک کی سرحد میں مداخلت نہ کرے گا۔ لیکن جرمنی نے اس کی بھی پابندی نہیں کی اور سنہ ۳۶ء میں رہائن لینڈ پر قبضہ کر کے اس معاہدہ کو بھی درہم برہم کر دیا۔ تاوان جنگ ادا کرنے سے اس نے سنہ ۳۱ء ہی میں انکار کر دیا تھا

میں نے ان تینوں معاہدہ کا ذکر اس لئے کیا کہ آپ کو موجودہ جنگ سے قبل کی یوروپین سیاست کا حال معلوم ہو جائے کیونکہ یہی اصل بنیاد ہے اس لڑائی کی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ جنگ عظیم میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی کو پہونچا، اس کے بعد روس کو، اور چونکہ اٹلی کو بھی کوئی فایدہ اتحادیئن کا ساتھ دینے سے نہ ہوا تھا اس لئے فی الحقیقت وہ بھی کچھ خوش نہ تھا۔ اب یوروپ میں ایک بلاک تو

وہ پیدا ہو گئی جو گزشتہ جنگ عظیم کے خساروں کو پورا کرنا چاہتا تھا اور جس میں جرمنی پیش پیش تھا، دوسری طرف برطانیہ نے معاہدۂ ورسائی کی غلطی کی تلافی اس طرح کرنا چاہی کہ جہاں تک ممکن ہو جنگ سے احتراز کرے اور جرمن قوم کو ایک حد تک پھیلنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ وہ یورپ کے امن و سکون کو تباہ کرنے پر مجبور نہ ہو جائے

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۳۵ء میں سار کا علاقہ اور سنہ ۳۶ء میں رہائن لینڈ جرمنی نے پھر واپس لے لیا۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ اس کے بعد جرمنی مطمئن ہو جائے گا اور ہٹلر کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ اس دوران میں نازی حکومت نے زبردست فوجی طیاریاں کر لی تھیں اور اٹلی کو بھی وہ اپنا طرفدار بنا چکا تھا، اس لئے اس نے اپنی جارحانہ پالیسی برابر جاری رکھی اور مارچ سنہ ۳۸ء میں نازی حکومت نے آسٹریا پر بھی قبضہ کر کے ۷۰ لاکھ آبادی اور فراہمی چوب و آہن کے وسیع ذرایع پر دسترس حاصل کر لیا۔ برطانیہ پھر بھی خاموش رہا اور ہٹلر نے دوسرا قدم زیکوسلوویکیا کی طرف اٹھایا کر ستمبر سنہ ۳۸ء کے معاہدۂ میونک کی رو سے جو خود برطانیہ کی پیدا کی ہوئی چیز تھی، زیکوسلوویکیا کی ۴۰ لاکھ آبادی پر بھی معہ اس کے تمام صنعتی اداروں کے قبضہ کر لیا اور آخر کار سنہ ۳۹ء تک بوہیمیا، سلوویکیا، میمل، ڈنزگ یہاں تک کہ نصف پولینڈ بھی نازی حکومت کے قبضہ میں آ گئے

ان فتوحات سے جرمنی کو جتنے صنعتی، اقتصادی و تجارتی فوائد حاصل ہوئے، ان کا صحیح اندازہ مشکل ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کی جو پوزیشن تھی اس سے اب کہیں زیادہ قوی ہے اور اسی پوزیشن کے بقاء و قیام کے لئے اس نے نہ صرف اٹلی سے سازباز کی بلکہ روس کو بھی اپنا طرفدار بنا لیا جو ہٹلر کی سیاسی چالوں میں سب سے زیادہ کامیاب چال سمجھی جاتی ہے

برطانیہ نے بھی اب تنگ آ کر اپنی صلح کوش پالیسی کو بدلا ہے لیکن وقت گزر جانے کے بعد۔ ایک ماہر جنگ کا خیال ہے کہ جرمنی کو روکنے کا صحیح وقت وہی تھا جب رہائن لینڈ میں اس نے اپنی فوجیں اتاری تھیں۔ اس کے بعد دوسری چیز جس نے برطانیہ کی ساکھ کو صدمہ پہونچایا اور جرمنی کی طرف سے تمام وسط یورپ و شمال کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو خائف بنا دیا، یہ ہے کہ برطانیہ نے نہ پولینڈ کی کوئی مدد کی اور نہ فن لینڈ کی، ہرچند پولینڈ کے باب میں برطانیہ یہ کہہ سکتا ہے کہ پولینڈ کا خاتمہ اتنی جلد ہو گیا کہ مدد کا کوئی موقعہ ہی ہاتھ نہ آیا اور فن لینڈ کی مدد اس لئے نہ ہو سکی کہ سویڈن و ناروے نے برطانوی فوجوں کو گزرنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن یہ توجیہیں خود برطانوی پالیسی کی کم بینی و کوتاہ نظری کی دلیل میں پیش کی جا سکتی ہیں، کیونکہ برطانیہ کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ جرمنی پولینڈ پر حملہ کرنے والا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ روس کے مقابلہ میں فن لینڈ کی شکست یقینی ہے۔ اور روس کی یہ کامیابی فی الحقیقت جرمنی کی کامیابی ہو گی۔ پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ اتحادیین نے فن لینڈ کے لئے سامان حرب اور فوجیں بھیجنے کا عزم تو کیا اور شاید تھوڑی بہت مدد بھی کی، لیکن روس کے خلاف اعلان جنگ اس وقت تک نہیں کیا گیا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ سویڈن و ناروے اس پر راضی نہ ہوئے تھے کہ ان کی حدود سے اتحادیین کی فوجیں گزر کر فن لینڈ پہونچیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ نے قصداً اس سے احتراز کیا کیونکہ اس صورت میں کھلم کھلا روس سے لڑائی ہو جاتی اور روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے ہندوستان کو خطرہ میں ڈالنا ہے جس کی حفاظت کے لئے برطانیہ، فن لینڈ کیا تمام دنیا کی قربانیوں پر آمادہ ہو سکتا ہے

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ سے اس دوران میں متعدد سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں، ان غلطیوں کا سلسلہ اسوقت
شروع ہوتا ہے جب جمعیت اقوام (League of Nations) کے کرتا دھرتا ہونے کی حیثیت سے اسنے
اول منچوریا کے مسئلہ میں جاپان کے سامنے سپر ڈالدی اور دوسری ضرب جس نے اس جمعیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اٹلی کا
… پر حملہ کرنا اور حبشہ کی فریاد کو نہ پہونچنا تھا۔ ان واقعات نے یورپ کی تمام چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو یقین دلادیا کہ جمعیت
…انیہ سے کسی مدد کی توقع رکھنا بیکار ہے اور ان میں پھر وہی اندرونی خفیہ معاہدوں کے ذریعہ سے اپنا اپنا بلاک بنانے کا
…ن پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خطرناک بلاک وہ طیار ہوا جسے روم برلن محور کہتے ہیں

دوسری غلطی برطانیہ نے یہ کی کہ وہ ہٹلر کی اندرونی سازشوں اور جارحانہ ارادوں کا صحیح علم حاصل نہ کر سکا۔ وہ یہی خیال
…ہا کہ رہائن لینڈ، آسٹریا اور زیکوسلوویکیا کے لقمے دے دیکر ہٹلر کو رام کرے گا، حالانکہ اسے سمجھنا چاہئے تھا کہ ایک
… [illegible]) انگلی تک پہونچنے کے بعد ہمیشہ پہونچا پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسٹر چمبرلین کا فرشتۂ امن
…دو دو بار ہٹلر سے ملنے کے لئے جانا اور اس کے قول پر اعتبار کرکے معاہدۂ میونک کی رو سے بغیر رائے عامہ حاصل کئے ہوئے
… کا علاقہ اس کے حوالہ کر دینا اتنی بڑی سیاسی غلطی ہے کہ برطانیہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے

تیسری اہم غلطی یہ تھی کہ برطانیہ، روس کو اپنے ساتھ نہ ملا سکا۔ جسوقت ۱۹۳۶ء میں روس کے خلاف جرمنی، اٹلی و جاپان
…میان (Anti Comintern Pact) ہوا ہے، برطانیہ کو چاہئے تھا کہ وہ اس سے فایدہ اٹھا کر
… کو ملا لیتا اور اس کے صنعتی اداروں کو تمام وہی آسانیاں بہم پہونچاتا جو جرمنی سے اسے پہونچ رہی تھیں، لیکن برطانیہ کی
عجیب وغریب پالیسی نے کہ باوجود ادعائے جمہوریت نہ وہ اشتراکیت کا حامی ہو سکتا ہے، نہ باوصف ملوکانہ انداز حکومت
…علم کھلا نازی و فاسسٹی قسم کی آمرانہ حکومت کا اعتراف کر سکتا ہے۔ اس میں بھی ناکامیاب رکھا اور ہٹلر اپنی موقعہ شناسی
…ام لیکر اسٹالین کو ملا لینے میں کامیاب ہو گیا

پھر روس و جرمنی کی اس سازباز سے برطانیہ کو اس کی ساکھ کے علاوہ کوئی نقصان پہونچا ہو یا نہ پہونچا ہو، لیکن جرمنی
…نا فایدہ پہونچا اس کے نتایج بہت دوررس نظر آتے ہیں

روس و جرمنی کے اس اتحاد کو فتح پولینڈ تک کوئی خاص اہمیت دینا چاہئے تھی یا نہیں، اس میں گفتگو ہو سکتی ہے لیکن
روس نے اسٹونیا، لیٹویا اور لتھونیا پر قابض ہونے کے بعد فن لینڈ پر حملہ کیا تو برطانیہ کو یقین کر لینا چاہئے تھا کہ یہ تمام واقعات
…نی حوادث نہیں ہیں کہ اتفاقاً رونما ہو گئے ہوں، بلکہ نتیجہ ہیں کسی خاص سمجھوتے کا جو روس اور جرمنی کے درمیان ہو چکا ہے
…، برطانیہ نے اس کو نہیں سمجھا یا سمجھنا نہیں چاہا اور اس طرح جرمنی کی کامیابی کے گرد ایک اور مضبوط حصار قایم ہو گیا

فتح فن لینڈ کے بعد ہٹلر ایک اور زبردست چال چلا یعنی بلقان میں وہ اٹلی اور روس کی دیرینہ مخالفت کو تو دور نہ کر سکا
…کم از کم وقتی مصالحت اس نے ضرور کرا دی اور اس طرح وسط یورپ میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں
…یا عجب ہے کہ اندرونی طور پر روس، اٹلی اور جرمنی کے درمیان ریاستہائے بلقان کی تقسیم کے متعلق بھی آپس میں کوئی
…دتا ہو چکا ہو اور برطانیہ آخر وقت تک اس سے بے خبر رہے

جس زمانہ میں معرکۂ فن لینڈ جاری تھا، اس وقت اس بات کے آثار نظر آرہے تھے کہ اس کے بعد جرمن اقدام کی باری

آئے گی اور بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ اقدام سویڈن و ناروے کی طرف ہو۔ برطانوی ارباب حل و عقد بھی غالباً اس سے بے خبر نہ تھے، لیکن وہ اس نئے فتنہ کا سد باب کرنے کی فکریں کر ہی رہے تھے کہ جرمنی نے دفعتاً ڈنمارک پر قبضہ کر لیا اور ناروے کے ساحلوں پر فوجیں اُتار دیں۔ جرمنی کا بیان ہے کہ برطانیہ خود ناروے پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھا، اور سواحل ناروے پر اسکا سرنگیں بچھانا اسی مقصود کے لئے تھا۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے صحیح باور کر لیں کہ واقعی برطانیہ کا ارادہ ناروے کو اپنی حفاظت میں لے لینے کا تھا، تو یہ کوئی گناہ نہ تھا، کیونکہ ناروے کا جرمن قبضہ میں چلے جانے سے بدرجہا بہتر یہ تھا کہ وہ برطانوی حفاظت میں آجائے، لیکن برطانیہ کا یہ گناہ سیاسی دنیا میں مشکل سے معاف کیا جا سکتا ہے کہ وہ جرمنی کے اس ارادہ سے باخبر ہونے کے باوجود اُس سے پہلے ناروے پر اپنا تسلط نہ جما سکا اور "الفضل للمتقدم" کا امتیاز جرمنی کو ملگیا

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ نے اس کا بڑا خیال رکھا کہ کسی غیر جانبدار حکومت کو اس کی طرف سے مداخلت کی شکایت کا موقعہ نہ ملے لیکن اس سے فایدہ کم ہوا اور نقصان زیادہ۔ فایدہ تو صرف اتنا ہوا کہ امریکہ نے برطانوی حکومت کے شریفانہ اخلاق کو بہت پسند کیا، لیکن نقصان یہ ہوا کہ برطانیہ کی گارنٹی کی وقعت کم ہوگئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو اس پر کوئی بھروسہ نہ رہا

اگر برطانوی سیاست زوردار ہوتی، تو کم از کم وہ سویڈن و ناروے کو راضی کر کے فن لینڈ کی مدد کو ضرور پہونچ سکتا تھا، کیونکہ اس حقیقت سے تو سبھی واقف ہیں کہ برطانیہ اپنی سلطنت بڑھانے کے لئے جنگ نہیں کر رہا اور جرمنی کا ایکبار کسی ملک کو اپنی عارضی حفاظت میں لے لینا بھی دائمی غلامی ہے

اتحادیئں کی پالیسی شروع سے اس جنگ میں مدافعانہ رہی ہے، یعنی انھوں نے پہلے ہی سے یقین کر لیا ہے کہ جرمنی ان کی سلطنتوں پر حملہ کرے گا اور وہ اس کی مدافعت کریں گے، حالانکہ بحالات موجودہ اُس کا مقصود تو صرف قرب وجوار کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ہضم کرجانا ہے اور اس کے جواب میں اتحادیئں کا مدافعانہ پہلو اختیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا

اتحادیئں کو یقین ہے کہ وہ ناکہ بندی کے ذریعہ سے جرمنی کو بیدست و پا کر دیں گے، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں بھی تین سال تک جرمنی پر ناکہ بندی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا، چہ جائیکہ اب، جبکہ وہ سالہا سال سے اس جنگ کے لئے ذخایر جمع کرتا چلا آرہا ہے اور آسٹریا، زیکوسلوویکیا، پولینڈ ایسے زرخیز اور صنعتی ملکوں پر قابض ہو دہاں کا غلہ، وہاں کے معدنیات اور دہاں کے صنعتی اداروں اور اسلحہ سازی کے کارخانوں سے پورا فایدہ اُٹھا رہا ہے اس میں اگر آپ روس، فن لینڈ اور ریاستہائے بلقان کو بھی شامل کر لیں، جہاں سے ہر قسم کی درآمد برآمد کا تعلق قایم ہے اور ڈنمارک کو بھی سامنے رکھیں جو دودھ، مکھن ذخیرہ فراہم کرنے میں خاص شہرت رکھتا ہے، تو ناکہ بندی کی طرف سے ہماری توقعات بالکل ختم ہو جاتی ہیں

اس میں شک نہیں کہ بحر اٹلانٹک اس کے لئے خطرناک تھا اور وہ سویڈن و ناروے کا لوہا اور لکڑی حاصل کرنے کے لئے ضرور کوئی راستہ بحر اٹلانٹک میں اپنے لئے کھُلا رکھنا چاہتا تھا، سو اس غرض کی تکمیل کے لئے اس نے ناروے پر حملہ کر دیا اور بندرگاہ ناروک تک پہونچ گیا، کیونکہ ناروے کی یہ بندرگاہ ایسا ہے جہاں سے بارہوں مہینے سویڈن و ناروے کا مال باہر بھیجا جا سکتا ہے، ورنہ دوسری بندرگاہوں کا پانی جاڑوں میں منجمد ہو کر ناقابل گزر ہو جاتا ہے

ناروے کے بعد جرمنی مجبور ہے کہ سویڈن پر قبضہ کرے کیونکہ اتحادئین نے سرنگیں بچھا کر براہ بحر شمالی و بحر اٹلانٹک اسکی آمد و رفت سواحل ناروے تک دشوار کردی ہے اور اب رہ صرف بحر بالٹک سے سویڈن ہو کر فوجی کمک پہونچا سکتا ہے علاوہ اس کے ناروے پر حملہ کرنے سے اس کا مقصود یہی سویڈن پر قبضہ کرنا ہے کیونکہ لوہے کی معدنیں یہیں پائی جاتی ہیں اور جرمنی انھیں سے سالانہ کثیر مقدار میں لوہا حاصل کیا کرتا ہے

اٹلی اس وقت جرمنی کا ہم آہنگ ہے اور ناروے کے حملہ کو حق بجانب ظاہر کرتا ہے۔ روس البتہ خاموش ہے اور یہ خاموشی بالکل اسی قسم کی ہے، جیسی جرمنی نے روس کے حملۂ فن لینڈ کے وقت اختیار کی تھی۔ لیکن نہ وہ بے معنی تھی نہ یہ بے معنی ہے، اُس خاموشی کا نتیجہ ڈنمارک وناروے، کو ہضم کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس خاموشی کا نتیجہ ممکن ہے بلقان کی قطع وبرید کی صورت میں رونما ہو

بہر حال وقت بہت نازک ہے اور اسوقت تک اتحادئین کا پوزیشن کمزور نظر آرہا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے اس جنگ کا نتیجہ اتحادئین کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے لئے یہ نہایت تلخ تجربہ ہوگا

لیکن چونکہ محض آرزؤں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں، اس لئے ہماری دُعائیں اتحادئین کے کچھ کام نہیں آسکتیں اگر خود انھیں کی پالیسی اور عسکری تنظیم لوہے کا جواب لوہے سے دینے کے لئے طیار نہیں۔

یوروپ کا موجودہ نقشہ جس سے جرمنی اور روس کے موجودہ حدودِ سلطنت کا پتہ چلتا ہے:
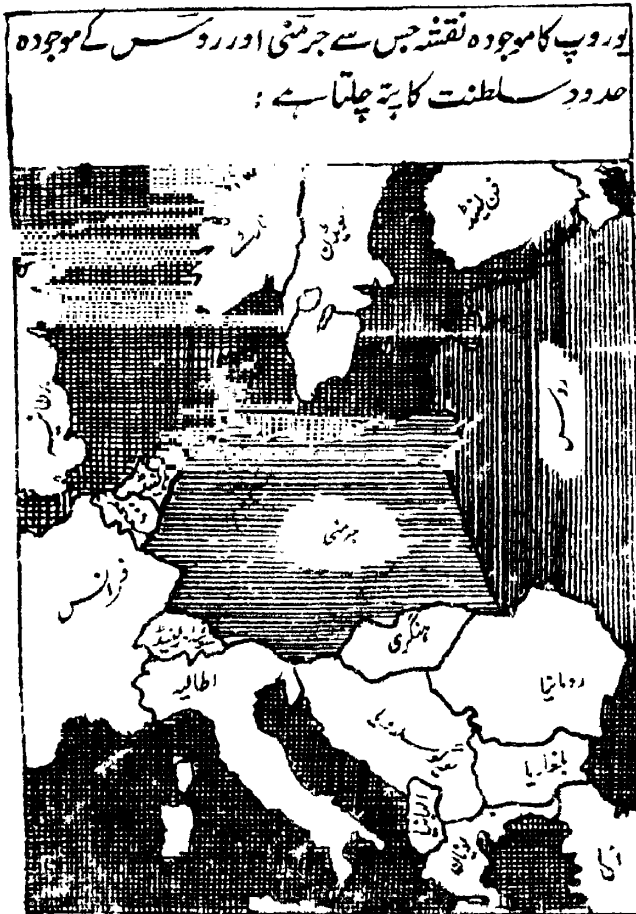
آپ کو پہلوکے نقشہ سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ گزشتہ آٹھ مہینوں میں جرمنی وسطِ یوروپ کے کتنے بڑے حصہ پر قابض ہوگیا ہے اور اگر اس لڑائی کا اختتام انھیں حدود پر ہوا تو یقیناً یوروپ کی توازنِ قوت اور اس کے ادعائے جمہوریت کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچے گا، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا جنگ کی موجودہ رفتار اور اتحادئین کی عسکری پالیسی زمانہ کو پھر آٹھ مہینے پیچھے لوٹا سکتی ہے اور اگر اس کا امکان ہے تو غالباً وہ زمانہ کو سکاٹلہء تک لوٹانے پر مجبور ہوگی اور اسکی اپنی خارجی پالیسی سے زیادہ داخلی پالیسی میں تغیر کرنا ہوگا جو شاید اس کی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔

اس گفتگو میں بحث کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ برطانوی حکومت کی موجودہ پالیسی کیا واقعی صلح وامن پر قایم ہے، کیا وہ فی الحقیقت کوئی جارحانہ پہلو اس لئے اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ اسے انسانیت کے ساتھ نہایت گہری ہمدردی ہے خواہ اس سے دشمن بھی

فایدہ کیوں نہ پہونچے، یا اسوقت کی بین الاقوامی سیاسی پیچیدگیاں جو غالباً خود اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اُسے خطرناک وادی میں قدم رکھنے سے روکتی ہیں؟

یقیناً برطانیہ کے مدبرین وارکانِ وزارت کم ازکم اس قدر تو سمجھتے ہی ہوں گے کہ اس لڑائی میں ان کی پوزیشن کیا ہے اور دشمن کی کیا، اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ اگر وہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی حفاظت کی ذمہ داری کو جس وجہ پورا نہیں کرسکتے تو اس کا سبب داخلی ہے یا خارجی، اس لئے ہم برطانوی حکومت کی موجودہ روش پر زیادہ سے زیادہ یہی نقد و تبصرہ کرسکتے ہیں کہ اگر اس کا سبب واقعی کوئی اندرونی کمزوری نہیں ہے تو اسے اپنی بیرونی پالیسی کو بھی مضبوط بنانا چاہئے اگر اسپین میں جمہوریت کی تباہیاں اور حبشہ میں فاسسٹی حکومت کی زیادتیاں اس کے ضمیر کو اجازت دے سکتی ہیں، لیکن اگر اس کا سبب کوئی اندرونی احساس ہے تو حکومت برطانیہ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اب زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکاتِ صلح کو تسلیم کرنے کے بعد بھی عملاً اُن کو مردود قرار دیدیا جائے اور دُنیا بدستور ملوکیت کے چنگل میں پھنسی رہے

یہ جنگ حقیقتاً آخری معیار ہے جس پر کھوٹے کھرے کو ہمیشہ علٰحدہ علٰحدہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اتحادیین نازیت کی بلا کو دُنیا سے دور نہ کرسکے تو اس کا سبب صرف یہ ہوگا کہ اس کسوٹی پر کسے جانے کے بعد ان کی جمہوریت کا سونا کھوٹا نکلا

ہم کو یقین ہے کہ اس جنگ میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو لیکن نازیت کو ضرور شکست ہوگی، لیکن یہ شکست نتیجہ ہوگی ایک ایسے زبردست انقلاب کا جو دنیا میں اکثر حکومتوں کی کارگاہ کو درہم برہم کرکے رکھدیگا اور سیاسی دسیسہ کاریوں کو ہمیشہ کے لئے ختم

گوشِ نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست !

ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا بہت مکدر ہے۔ مسلم لیگ کی پاکستان والی اسکیم کے خلاف خود مسلمانوں نے جتنا اور جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، وہ ایک سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ کے لئے بہت کافی ہے، لیکن گوشِ سخن شنو کجا ، دیدۂ اعتبار کو ؟

اس طفلانہ تحریک کے خلاف آزاد مسلم کانفرنس اپنا فیصلہ کرچکی ہے جسے جمہور مسلمین کا فیصلہ سمجھنا چاہئے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ "مسٹر جینا اینڈ کو" کا "مقتضائے طبیعت" کیا ہے اور وہ کبھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں گے۔ اس کے آگے نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہنے کی،

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

لارڈ زٹلینڈ کا فیصلہ آپ کے سامنے موجود ہے، ہندوستان بدستور غلام بنا رہے گا اور صرف اس لئے کہ مسلم لیگ یہی چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ کامیابی مسلم لیگ کی اور کیا ہوسکتی ہے !

ہفتہ وار جنگ کے اجراء کا خیال ترک کردیا گیا، کیونکہ اسکی موافقت کرنے والا حلقہ، ان مصارف کو دیکھتے ہوئے جو میرے سامنے تھے، تنگ ثابت ہوا، لیکن کوشش کیجائیگی کہ خود نگار میں جنگ و متعلقات جنگ پر ہر مہینے مفید مضامین شایع ہوتے رہیں چنانچہ اشاعتِ حاضرہ میں بھی علاوہ ملاحظات کے ایک ادر مقالہ آپ کو نظر آئے گا جس میں بتایا گیا ہے کہ ناکہ بندی سے جرمنی کو شکست دینے کا امکان بہت ضعیف ہے۔

"عربوں کی سیاسی بیداری" کا سلسلہ اسی قبیل کی چیز ہے جس کی آیندہ دو قسطیں بہت اہم ہیں۔ آیندہ مہینے سے، روس اور اسکی اشتراکیت پر بھی ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے گا۔

فنِ تحریر و صحافتِ عرب

فنِ تحریر و صحافت کا رواج تہذیب و تمدن کے لئے پہلا سنگ بنیاد ہے۔ یہ ہر زمانہ میں علوم و معارف کا سرچشمہ رہا اور انسان کی ذہنی اور دماغی ترقی کے لئے ہمیشہ نمایاں خدمات انجام دیتا رہا۔ اُس نے نہ صرف قدماء کے نتائجِ افکار اور اُن کے علمی سرمایہ کو محفوظ رکھا بلکہ ہمارے لئے اس نے ایسے اسباب مہیا کر دئے جن سے ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنے دائرۂ معلومات کو وسعت دے سکتے ہیں۔

اگر دنیا اس فن سے محروم ہوتی تو قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ انسان آج جہالت و وحشت کے کس تاریک گڑھے میں سرنگوں پڑا ہوتا۔ ہم میں چونکہ اس فن کا رواج کافی ہو چکا ہے اس لئے ہمیں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان نے جس قدر حیرت انگیز علوم و فنون ایجاد کئے ہیں، اُن سب میں نوشت و خواند کو جو اہمیت حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔

فنِ تحریر تحریر ایک آرٹ ہے جس سے حروفِ مفردہ کی صورت اور ترتیب ظاہر ہوتی ہے، جو بغیر کسی اشارہ لفظی و معنوی اپنے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تکوینِ عالم کے بعد انسان کے لئے باہم تبادلۂ خیالات کا وسیلہ صرف زبان تھی لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی اور قوتِ حافظہ انسان کے اُس علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے سے قاصر رہی جو اُس نے اپنے بزرگوں سے روایت و سماعت کے ذریعہ حاصل کیا تھا، تو وہ تحریر و کتابت کا طریقہ معلوم کرنے پر مجبور ہوا۔ جس کی وجہ سے ہزاروں برس کے علوم و فنون وجود میں آ گئے۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے عموماً مکان کی دیواروں پر کتابت کی جاتی تھی لیکن جب کوئی زبردست قوم دوسری کمزور قوم کو جبراً قہراً اُن کے ملک سے نکال دیتی تھی تو وہ حسرت سے در و دیوار پر اپنے نقوش دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ اسلئے لوگوں نے بعد میں مٹی کی خام سلوں، چوکوں اور ظروف پر لکھنا شروع کیا جن کو وہ آگ میں پکا لیتے تھے۔

اس قسم کا کلی ذخیرہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے پہلے مصر سے اُس کے بعد بابل سے بکثرت برآمد کیا۔ جس میں بڑا حصہ اینٹوں کا ہے، اگلی دور کے ختم ہونے پر جب زمین سے معدنیات کا خزانہ نکل آیا تو لوہے، تانبے، سیسے اور پیتل کے

پتھروں پر کتابت شروع ہوئی جس کے ہزاروں نمونے اب بھی موجود ہیں۔

لیکن جب حضرت قلم نے فلزات کی تختیوں پر چلنے سے انکار کر دیا اور بجائے سنگلاخ زمین کے نرم زمین کی ضرورت پڑی تو حکماءِ مصر نے تقریباً پانچ ہزار برس قبل مسیح کاغذ ایجاد کیا اور رفتہ رفتہ کتابت کاغذ ہی پر ہونے لگی

فنِ تحریر کی تاریخ یہ عجیب بات ہے کہ فنِ تحریر نے ہماری تاریخی اور قومی روایات محفوظ رکھ کر ہمارے ہاتھوں تک پہونچا دی مگر خود اُس کی صحیح تاریخ آج تک معلوم نہ ہوسکی، پیدایش زبان کی طرح فنِ تحریر کے نشو و نما کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

فنِ تحریر کے رواج نے کچھ ایسا حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ لوگوں نے ایجادِ تحریر کو انسانی طاقت سے بالاتر خیال کر کے اُسے خدا کی طرف منسوب کر دیا، ہر مذہب میں اس قسم کی روایات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ تحریر الہامِ ربانی سے انسان کو سکھایا گیا۔

مسلمانوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے علامۂ جلال الدین سیوطی نے اس قسم کی تمام روایات جو اس مبحث سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی کتاب "المزہر" میں جمع کر دی ہیں۔

بہرحال اس سوال کا جواب کہ "فنِ تحریر" کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی؟ مشکل ہے۔ علامۂ ابن ندیم کی روایت سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم صلعم نے پہلے اپنے "صحائف" کچی اینٹوں پر لکھے، پھر یہ اینٹیں آگ میں پکائی گئیں تاکہ یہ آسمانی ذخیرہ فنا ہونے سے محفوظ رہے۔ مگر حضرت آدم کا یہ گلی کتب خانہ طوفانِ نوح میں غرق ہوگیا۔ جس کا بعد میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔[1]

بعض محققین یورپ کی تصانیف سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے بعض کھنڈرات سے اس قسم کے گلی کتب برآمد ہوئے ہیں جن کے موجد در اصل حضرت آدم تھے۔

اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ظاہر ہے کہ فنِ تحریر دنیا میں اُسی وقت سے موجود ہے جب سے انسان کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے مگر اب بھی یہ بات غور طلب رہ جاتی ہے کہ وہ تحریر جو انسان کے اولین دورِ حیات میں پائی جاتی تھی اُس کی شکل و صورت کیا تھی؟

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ "فنِ تحریر" کی ایجاد ایکدم سے وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنے اس اعلیٰ مرتبہ کو پہونچی ہے تاریخ کی اوراق گردانی بھی یہی بتاتی ہے کہ شروع میں انسان نے انتہائی غور و فکر کے بعد نقاشی سے کام لیا اور حالات و جذبات کی ترجمانی کے لئے اُس نے ہزارہا تصویریں بنا ڈالیں، جس طرح آج کل بھی

---

[1] کتاب الفہرست لابن ندیم، مقالہ اول صفحہ ۲ مطبوعہ جرمنی

کارٹون وغیرہ سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ اس سادہ وقائع نگاری کو "دورِ صوری" کہتے ہیں۔

بعدازاں دنیا جیوں جیوں تہذیب و تمدن میں ترقی کرتی گئی اُسی قدر یہ جدت طرازی ناکافی ثابت ہوتی گئی۔ اس لئے مجبوراً انسان نے "حروفِ ہجا" ایجاد کئے اور اُن کی ترکیب سے الفاظ بننا شروع ہوئے۔ یہ زمانہ "دورِ حرفی" تھا، جس نے تصویرکشی کی زحمت کو بھی ختم کر دیا۔

تصاویر کے ذریعے سے جو خط جاری ہوا تھا اُس کا نام "خطِ ہیروغلیفی" تھا۔ بعد میں اُس کی دو قسمیں ہوگئیں "ہیراطیقی" (Heretic) جس کا تعلق مذہب سے تھا۔ دوسری قسم "دیموطیقی" (Jeotonic) اُس کا تعلق عام کتابت سے تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں قسموں کی بھی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایڈوگرافک (Ideographic) یعنی خیالات کا ظاہر کرنے والا۔ جس سے تصویر کی جسامت روز بروز کم ہوتی گئی اور خط رواں ہوتا گیا۔ دوسری قسم فونک (Phonic) یعنی کاشف الصوت جس کی وجہ سے ابھری، دُہری آوازوں کے الفاظ جداگانہ لکھے جانے لگے اس آخری قسم سے "حروفِ ہجا" کی اصلیت وابستہ ہے۔

"حروفِ ہجا" کی ایجاد ہوتے ہی خطِ عبرانی، سریانی، نبطی اور حمیری بہت سے خطوط پیدا ہوگئے اور اپنے اپنے زمانہ میں کچھ نہ کچھ اصلاح کے بعد ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ عربوں نے "خطِ کوفی" ایجاد کیا اور خطِ کوفی سے موجودہ "خطِ نسخ" تیار ہوا۔ یہ ہے فنِ تحریر کی مختصر تاریخ۔

حروفِ ہجا حروفِ ہجا کی تعداد اٹھائیس ہے لیکن اگر "لام الف" کا اضافہ کر دیا جائے تو کل اُنتیس ہوجاتے ہیں۔ یہ دراصل چوتھی صدی عیسوی کا اضافہ ہے، علماءِ ادب نے حروفِ ہجا کی ترتیب مندرجۂ ذیل رکھی ہے۔

ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ظغس۔ یہ ترتیب بچّوں کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ابنِ مقلہ نے سہولت کے خیال سے اس قدیم ترتیب کو بدل دیا، اُس نے تمام حروف کو علٰحدہ علٰحدہ لکھا اور باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اُن پر نقطے بھی لگا دئے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "حروفِ ہجا" کے موجد "فنیقی" ہیں مگر اُنھیں خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انھوں نے اہلِ مصر سے سیکھا ہے پر ہم جب مصر کا بابلی عروج سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مصر سے ہزاروں برس پہلے فنِ تحریر آخری منزل طے کرچکا تھا اس اعتبار سے اہلِ بابل کو سب پر تفوق حاصل ہے۔

اہلِ بابل کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ درحقیقت وہ قوم عاد یعنی "عرب" کے ابتدائی باشندے تھے۔ اس لئے اہلِ عرب ہی "حروفِ ہجا" کے جو "فنِ تحریر" کے لئے "اجزائے لایتجزیٰ" ہیں موجد قرار پاتے

ہیں اور یہ قوم عرب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

شانِ تحریر سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں جانب سے لکھے جاتے ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہے اس لئے کہ حرکت طبعی دائیں جانب سے بائیں جانب کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ہندی، قبطی، رومی اور مغربی اقوام میں کتابت کا رواج بائیں جانب سے دائیں جانب ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ خون کا دوران قلب سے شروع ہوتا ہے جو بائیں جانب ہے۔

عربوں میں فنِ تحریر کے اسبابِ ترقی فنِ تحریر، تہذیب وتمدن کے لئے ایک لازمی چیز ہے، اسلام سے پہلے دولِ عرب یمن، حیرہ اور شام، تمدن وتحضر سے خالی تھیں لیکن افسوس ہے کہ ان اقوام متمدنہ کے کسی مکتوب سے ہمیں واقفیت نہیں۔ تاریخ سے دولت حیرہ کے صرف ایک کاتب "عدی بن زید" کا پتہ چلتا ہے، زمانہ جاہلیت کے مکتوبات بھی ہم تک نہیں پہونچے، اس لئے ہم صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ اُن کا طرز تحریر کیا تھا، لیکن عام طور سے عرب خطِ نبطی اور سریانی میں لکھا کرتے تھے۔

عہدِ اسلام کے اوایل میں لوگ فنِ تحریر سے زیادہ واقف نہ تھے، آنحضرت صلعم چونکہ خود امی تھے اس لئے نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہونے پر اُنھیں کاتبوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں غزوۂ بدر ہوا، قیدیوں میں ستر اشخاص ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسول خدا نے ان قیدیوں کو رہا کر دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ ان میں سے ہر ایک دس دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیوے، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں میں اس فن سے واقفیت رکھنے والے سات سو کاتبوں کا معتدبہ اضافہ ہوگیا۔

یہ گویا "فنِ تحریر" کا پہلا مدرسہ تھا جو مدینہ منورہ میں قایم ہوا اس دور کے کاتبوں میں زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر، سعد بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث خاص شہرت کے مالک تھے جنھوں نے مصاحف عثمانی بھی لکھے تھے۔

خلافت راشدہ میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا اور تمدن نے غیر معمولی ترقی کی تو ایک ربع صدی کے اندر سیکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہو گئے۔

عہدِ بنی اُمیہ میں فنِ تحریر نے اور ترقی کی اور وہ بجائے خود ایک مستقل فن بن گیا۔ یوں تو ہر لکھنے والے کو کاتب کہہ سکتے ہیں لیکن جب اُس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرلی، تو لفظ "کاتب" سے ایک خاص قسم کی قابلیت رکھنے والا شخص مراد ہونے لگا۔ جیسا کہ مفسر، محدث، فقیہہ وغیرہ سے ایک خاص علم کا ماہر مراد ہوتا ہے۔

اس عہد میں ایسے ماہرِ فن، کاتبین کی تعداد اچھی خاصی گزری ہے جن میں سے "عبدالحمید بن یحییٰ" بہت

مشہور کاتب گزرا ہے، جو ایک خاص طرز کا موجد بھی تھا۔ اس کو فنِ تحریر کا اُستادِ اول مانا جاتا ہے اور اُس کا نام بطور ضرب المثل مشہور ہے۔

خلافت بنی اُمیہ کے زوال کے بعد جب اسلامی حکومت عباسیوں کے قبضہ میں آئی تو اس عہد میں علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ فنِ تحریر نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔

"ابوالعباس سفاح" کے عہد میں جو دولت عباسیہ کا بانی تھا "ضحاک بن عجلان" شامی ایک نامور خوشنویس گزرا ہے جس نے قدیم رسم الخط میں بہت کچھ اصلاح کی۔ اُس کے بعد خلیفہ "منصور عباسی" کے زمانہ میں "اسحاق بن حماد" ایک مشہور خطاط پیدا ہوا۔ اُس نے ضحاک کے اصلاح کردہ رسم الخط میں اور بھی خوبصورتی پیدا کی پھر خلیفہ "مہدی عباسی" کے زمانہ میں "خلیل ابن احمد" نحوی، ایک نامور فاضل پیدا ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر سب سے زیادہ توجہ کی اور تکمیل کے درجہ تک پہونچا دیا۔

خطِ کوفی کچھ عرصہ کے بعد علامہ "علی بن حمزہ" کسائی نے اس فن پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور خلیل نحوی ہی کے اصلاح کردہ رسم الخط میں حسنِ کتابت کی ایسی شان پیدا کر دی جس سے اس کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی، اُس کے اصلاح کردہ رسم الخط کو "کوفہ" والوں نے بہت سراہا اس لئے اُس کا نام "خطِ کوفی" پڑ گیا۔

کسائی نے سنہ ۱۸۲ھ میں انتقال کیا۔ وہ خلیفہ "مامون الرشید" کا اُستاد تھا۔ مامون کو قدیم خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اُس کی لائبریری میں عہد قدیم کے جملہ خطوں کے نمونے موجود تھے۔

خطِ نسخ باوجود ان تمام ترقیوں کے زمانہ کو "ابن مقلہ" کی شدید ضرورت تھی، اس فخر روزگار کاتب کا نام "ابو علی محمد بن یحییٰ" تھا۔ لقب "ابن مقلہ" تھا۔ اُس کی ولادت سنہ ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ عالم شباب میں تکمیل علوم و فنون کے بعد جب اقبال یاور ہوا تو خلیفہ "القاہر باللہ" عباسی کا وزیر مقرر ہوا، اور جب ادبار آیا تو ہاتھ کے ساتھ زبان بھی کاٹ ڈالی گئی اور قید کر دیا گیا۔ اسی حالت میں سنہ ۳۲۹ھ میں انتقال کر گیا۔

اُس کے زمانہ تک گو "خط کوفی" میں غیر معمولی ترقی ہو چکی تھی مگر اس خط میں نمایاں شان اور دلفریبی "ابن مقلہ" ہی کا حصہ تھا۔ اُس نے کسائی اور متاخرین کی وصلیوں سے فائدہ اُٹھا کر سنہ ۳۱۰ھ میں "خطِ نسخ" ایجاد کیا جس نے تمام قدیم رسم الخط کو مٹا کر اپنا سکہ جما دیا۔

موجودہ حرکات و سکنات زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین، ابن مقلہ ہی کی ایجاد ہیں۔ رفتہ رفتہ ان حرکات و سکنات کا رواج عام ہوتا گیا، حتیٰ کہ اب ان کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس قسم کی غلطی طباعت کا بڑا نقص سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی دنیا میں ابن مقلہ کا ایجاد کردہ "خطِ نسخ" اس قدر مقبول ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر قلم پھیر دیا۔

اُس کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب اُس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالا گیا تو وہ کہنی میں کھیچی باندھ کر لکھا کرتا تھا، اس حال میں بھی اُس نے جو کچھ لکھا تھا وہ بجائے خود لاجواب تھا۔

ابن بوّاب ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً چوراسی سال بعد ایک اور نامور کاتب "ابوالحسن علی" پیدا ہوا اس کا باپ "ہلال" امیر آل بویہ کے دروازہ پر چوکیدار تھا، اسی نسبت سے وہ "ابن بوّاب" کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ کس کو خبر تھی کہ بعد میں "ابن ہلال" آسمان شہرت پر بدر کامل بنکر چمکے گا اور دنیا اُس کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

ابن بوّاب دراصل ابن مقلہ کا معنوی شاگرد تھا اس لئے کہ اُس کو سمسانی اور محمد بن اسد سے شرف تلمذ حاصل تھا جو ابن مقلہ کے شاگرد رشید تھے، اسی وجہ سے ابتدا میں اُس کی بھی شانِ تحریر ابن مقلہ کی جیسی تھی لیکن بعد میں اُس نے خطِ نسخ میں جو خامیاں رہ گئیں تھیں اُن کی اصلاح کی اور اُس میں وہ حسن پیدا کیا جو سب پر فوقیت لے گیا۔

ابن خلکان اور امام یافعی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی کاتب ابن بوّاب کے مرتبہ کو نہیں پہونچا۔ ابن مقلہ اگرچہ خطِ نسخ کا موجد ہے لیکن اُس کی تہذیب اور حسن وجمال کا سہرا ابن بوّاب ہی کے سر رہا۔

یہ مشہور روزگار خطاط ۴۱۳ھ میں فوت ہوا آج دنیا میں جہاں سے جہاں تک "خطِ نسخ" جاری ہے وہ سب طفیل ہے ابن مقلہ اور ابن بواب کی کوششوں کا۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا عرب پر ان دونوں کاتبوں کا ایک ایسا احسان ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

صحافت زمانۂ جاہلیت میں نہ کوئی علم مدون ہوا اور نہ کوئی کتاب تصنیف کی گئی، عربوں کی سب سے قدیم کتاب "قرآن پاک" ہے۔ کچھ معاہدات و فرامین اور وہ خطوط بھی آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جمع کر لئے گئے تھے جو آپ نے مختلف سلاطین و امراء کے پاس روانہ فرمائے تھے۔

خلفاء راشدین کے عہد میں اسی تحریری ذخیرہ کے اندر "احادیث" کا کچھ اور اضافہ ہوا، لیکن کسی قسم کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اُسوقت سوائے "کتاب اللہ" کے کسی اور کتاب کا وجود نہیں تھا

عہدِ بنی اُمیہ میں سب سے پہلے "عبید بن شریہ" نے قدماء کی تاریخ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" افسوس ہے کہ یہ کتاب ضایع ہوگئی جس کا اب کہیں پتہ نہیں۔

عبید بن شریہ کے بعد عہد اُموی میں اور بڑے بڑے اہل قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے جو ہمیشہ سلاطین و امراء کے دربار سے وابستہ ہوتے تھے، اور اُمور مملکت میں ہمیشہ ان کی طرف سے قوم وملک کے

سامنے پروپگنڈہ کرتے رہتے تھے۔ "عبدالحمید بن یحییٰ" جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اس دور کا آخری صاحبِ قلم اور فنِ صحافت کا ماہر اُستاد تھا۔

ابومسلم خراسانی نے جب بنوعباس کے لئے پروپگنڈہ شروع کیا تو عبدالحمید نے دور اموی کے آخری تاجدار "مروان" کی طرف سے اُس کو ایک طویل خط لکھا اور مروان سے کہا کہ میں نے ابومسلم خراسانی کو ایسا خط لکھ دیا ہے کہ جب وہ اُسے پڑھے گا تو اُس کی ساری تدبیریں بیکار ہو جائیں گی۔ لیکن یہ خط جب ابومسلم کے پاس پہونچا تو اُس نے بغیر پڑھے جلوا ڈالا اور مروان کو لکھ بھیجا :-

محا السیف استار البلاغۃ دانحیٰ،
علیک لیوث الغاب من کلِ جانب

دورِ عباسیہ میں بے شمار علماء و فضلاء، بڑے بڑے اہلِ قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے تصنیف و تالیف کا باقاعدہ محکمہ قایم ہوا۔ جس میں علوم شرعیہ اور علوم لسانیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ علم تاریخ کی بھی تدوین ہوئی، علوم یونانی کے بھی ترجمے کئے گئے اور علوم عقلیہ و نقلیہ کی ہزارہا کتابیں تصنیف ہو گئیں جو آج تک ہمارے لئے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔

جلیل الرحمٰن اعظمی

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۸ء) پورا فایل صہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

سوویٹ ادبیات میں اشتراکی "واقعیت"

یہ سلسلۂ مضامین خود روسی مصنفین کے مضامین سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے اس مطالعے سے ہمارے "پرانے اسکول" کے ادیب "واقعیت نگاری" کا منشا سمجھ سکیں اور "نئے لکھنے والے" محسوس کر سکیں کہ خود سوویٹ مصنف بھی اپنے پرانے ادب کو ترک نہیں کر سکا اور اسوقت وہ جو کر رہا ہے "انقلاب" کے بعد کر رہا ہے، قبل انقلاب اُس کی حالت بھی ہماری موجودہ حالت سے مختلف نہ تھی۔

ل - احمد

بورژوا[1] طبقے کا پُرانا عقیدہ تھا کہ پرولتاریا[2] جماعت تخریب تو کر سکتی ہے لیکن تعمیر کی اہل نہیں۔ لیکن روس کے پہلے پنجسالہ پلان کی کامیابی نے اس روایتی عقیدے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

چنانچہ ۱۹۳۳ء میں سنٹرل کمیٹی اور سنٹرل کنٹرول کمیٹی کے عام اجلاس میں اسٹالن نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ:-

"پنجسالہ پلان کے نتائج نے ثابت کر دیا ہے کہ محنتی طبقہ نئی تعمیر کا اُسی قدر اہل ہے جتنا کہ پرانی عمارت کو ڈھا دینے کا۔"

ہمیشہ سے بورژوا طبقہ اس خیال (عقیدہ) پر اڑا ہوا تھا کہ محنتی طبقہ اقتصادی اور حرفتی تخلیق ہی کی استعداد سے محروم نہیں بلکہ وہ کلچر، صناعت اور ادب میں بھی کوئی تخلیقی اہلیت نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس "روایتی" عقیدے کے باوجود محنتی طبقے نے (کسانوں مزدوروں ہی میں سے) اپنی سولہ سال کی ڈکٹیٹرشپ کے زمانے میں بہت سے اہلِ قلم اور ادیب پیدا کر دکھائے ہیں اور سوویٹ یونین میں ایک نیا ادب جو متمول ہونے کے ساتھ متنوع بھی ہے، پیدا ہو گیا ہے یہ ادب پرانے "انقلابی" ادب اور نئے بورژوا ادب، دونوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ انقلاب سے قبل روس کا ادب یعنے اُس بورژوا روس کا ادب جس میں "سرفیت" (کسانوں کی موروثی غلامی) جاری تھی، اگر دیکھا جائے گا اور اُس زمانے کے مصنفوں کی کتابوں پر سے رائے قایم کی جائے گی تو صاف نظر آئے گا کہ وہ ادب تمام

---

[1] Bourgeois یعنے سرمایہ دار جماعتیں اور [2] Prolitaria یعنے محنتی جماعتیں۔

جماعت کے عندیات کا ترجمان ہے۔ یہ صناعت ادب اگرچہ حکمراں طبقوں کی پالیسی پوری کرتی تھی، لیکن اس کے اندر بورژوا طبقے کی فنا بھی جھلکتی تھی۔ کیونکہ قبل انقلاب کا یہ بورژوا ادب آخری حد تک قنوطی (Pessimistic) ہوگیا تھا۔ اس ادب کو مستقبل پر مطلق عقیدہ نہ رہ گیا تھا۔ وہ انسانیت کے صرف منفی پہلو کو دیکھ سکتا تھا اور اسی ادب کی یہی خصوصیت تھی جس کے باعث قبل انقلاب کے ذہین طبقے میں سب سے زیادہ محبوب شاعر (Leonidandreyev) سمجھا جاتا تھا۔

انقلاب سے پہلے کا اشرافی (Aristocratic) اور بورژوا ادب زندگی سے کس قدر مایوس تھا، اس کے جواب میں (Pablok) کا ایک شعر سنا دینا کافی ہے:

"بیس سال کی عمر میں، میں ایک روغن کی ہوئی لاش تھا"

یہ وہ ادب تھا جس کے اندر حقیقی اور زندہ جذبات کی جگہ ایک نہایت مصنوعی و مردہ احساسات پیش کئے جاتے تھے اور ادیب ان احساسات کو بیان کرنے میں "زندگی" کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ عندیات کے اعتبار سے یہ ادب روز بروز دیوالیا ہوتا جا رہا تھا: (V. Brusov) مختصر یہ کہتا ہے کہ اُس نے:

"بہتوں سے غداری کی" اور اس نے "میدان جنگ میں جھنڈے کو چھوڑ دیا"

ایسے بورژوا ادب میں جس کا کوئی نصب العین نہ ہو، جو زندگی سے رشتہ توڑ چکا ہو، جو بناوٹی احساسات کا ادب ہو، اُس ادب میں اگر غلاف "واقعیت" صناعت کو اتنی زبردست قبولیت ملجائے تو حیرت کی بات نہیں۔

قبل انقلاب کا بورژوا ادب "واقعاتی مرقعوں" کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اور اُس ادب کے روایت پرست تعلیم دے رہے تھے کہ دُنیا کا بیان اس طرح ہونا چاہئے کہ اُس کی فہم دشوار ہو۔ چنانچہ ایک مبہم قسم کی بعید المعانی انشا وجود میں آرہی تھی۔

لیکن اس مسموم ماحول میں چند اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے ادب کی جڑیں محنت کش اور مظلوم انسانوں کی زندگی کے اندر پھیل رہی تھیں اور جو آیندہ ایک بہتر زندگانی پالینے کی جد وجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ان پرولتاری مصنفوں میں سب سے پہلا نام میکسم گورکی کا ہے۔ ان چند ادیبوں نے اُس وقت بھی وہ ادب پیش کیا جو سمجھ میں آتا تھا، جو عوام سے قریب تر تھا اور سچے احساسات کی بنا پر زندگی کے تجربوں سے مالا مال تھا۔

سوویٹ ادب، طبقاتی جد و جہد کے ماحول میں پھلا پھولا اور طاقتور بنا۔ اور انقلاب کے ابتدائی سالوں میں بہت سے اہل قلم اپنے ادب کو اُن خیالات و عقائد کے خلاف صرف کرنے میں لگے رہے جو انقلاب کے لئے مضرت رساں تھے۔ ادب کے اندر یہ طبقاتی جنگ تو ہنوز جاری ہے۔ مگر اب مزدوروں کا یہ دشمن کھل کے سامنے نہیں آتا بلکہ ادب کے اندر مار آستین بن گیا ہے۔ حال ہی میں شاعر (Zabolotsky) نے طنزیہ اشعار میں

اشتراکی تعمیری زراعت کا مضحکہ اُسی طرح اُڑایا ہے جیسے زمیندار طبقہ (Kulak) اُڑاتا تھا۔ اسٹالن نے ایسے اہل قلم کو "اندر ہی اندر (خون) چوسنے والا" کہا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اب حالات واسباب پرولتاریا کے زیادہ موافق ہوگئے ہیں۔

سوویٹ طاقت کے وجود میں آنے کے بعد سے، مزدوروں اور کسانوں کی جماعتوں میں اہل قلم کی بڑی تعداد پیدا ہوگئی اور ہو رہی ہے۔ علاوہ بریں ذہین طبقے کے اُن اہل قلم کی بڑی تعداد جو کسی پارٹی میں شامل نہ تھے اشتراکی تعمیر کی جد وجہد میں شریک ہوگئی ہے۔

C. P. S. U. کی مرکزی کمیٹی ادبی پیداوار کی طرف سے کسی وقت غافل نہیں رہتی اور اُسے ہر امکانی مدد پہونچاتی رہتی ہے اور یہی مقصد ہے کہ کمیٹی نے سوویٹ اہل قلم کی تنظیم کو بھی اشتراکی تعمیر کے کام میں ضروری قرار دیا، اور مصنفین کی ایک "یونین" قایم کردی۔

چنانچہ آج سوویٹ مصنفین کی بہت بڑی تعداد اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ ان کی دماغی وقلمی پیداوار نئے سماج کی تعمیر میں کار آمد ثابت ہو اور سوویٹ ادب کو محنتی جماعتوں اور اشتراکیت کے اعلیٰ اصول سے جو تعلق حاصل ہے، اُس نے اس ادب میں ایک شدید قسم کی زندگی پیدا کردی ہے۔ چنانچہ قبل انقلاب کے ادب سے اس نئے ادب کا جب کبھی مقابلہ کیا جائے گا تو اس کی یہ خصوصیت نمایاں نظر آئے گی کہ اس کے اندر زندگی کے ساتھ ایک خاص نشو و نما کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے۔

ایک بلند پایہ سوویٹ ادیب اس حقیقت پر فخر کرتا ہے کہ اُس کے ادب میں لکھوکھا مزدوروں اور کسانوں کے ولولوں اور آرزوؤں کا، اُن کی جد وجہد اور فتحمندیوں کا، اظہار ہے۔ سوویٹ ادب "زندگی" کا جتنا پیاسا ہے، اس کا اندازہ کرسکنا دشوار ہے۔ اُس کی ہر گھڑی زندگی پر رہتی ہے اور وہ ہر وقت زندگی سے سبق لیتا رہتا ہے اور کسی سوویٹ مصنف کا قلم ایسے موضوع پر نہیں چلتا جس کی نوعیت اشتراکی نہ ہو یا اُس موضوع پر اس کا مطالعہ کامل نہ ہو۔

اور یہ مصنف زندگی کا یہ علم خود اُس زندگی میں شامل ہوکر حاصل کرتے ہیں۔ تعمیری کاموں میں، زراعت میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں، کام کرکے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے اور سوویٹ ادب کے اس قدر بشاش اور زندہ دل ہونے کا راز یہی ہے کہ لکھنے والا اُس جم غفیر کی زندگی سے رشتہ جوڑ لیتا ہے جو اپنی زندگی کو نئے سرے سے منظم کر رہا ہے۔

اس پرولتاریا ادب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے رجائی (Optimistic) پہلو کو دیکھتا ہے اور اس طرح یہ دنیا کے حزنی ادب کی مشکلوں کو بھی حل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر موت ہی کے مسئلہ کو لیجئے کہ پچھلے زمانے کے ادب میں اس سوال نے بے حد مایوسی کا اظہار کرایا ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والی آہ و زاری نے زندگی کو بے معنے ٹھیرا دیا ہے۔ موت ہی کا ڈر تھا کہ ٹالسٹائی سا زندگی کا پجاری انسان، دنیا کی خوشیوں کو تیاگ کر

گوشہ نشین ہوگیا!

سوویٹ ادب اس بات کو مانتا ہے کہ مرنے والے کی موت اس کے دوستوں عزیزوں کے لئے واقعی رنجدہ ہے، کیونکہ یہ فطرت ہے، لیکن موت اس کے سامنے ایک جدوجہد کی صورت میں آتی ہے۔ اس ادب کی نظر میں ایک ایسی موت جو نوعِ انسان کے لئے جلد سے جلد مسرت حاصل کرنے کی فکر میں لاحق ہو وہ ایک "ذہین موت" ہوگی! اور ایسی موت، موت نہیں زندگی کا اثبات ہے! تصدیق حیات کی ایک علامت ہے! اس بات کی علامت ہے کہ زندگی کے لئے بہترین نظام کو ممکن العمل بنالینے کی کوششوں کو چند در چند کردیا جائے۔

چنانچہ فیڈائیف کے ناول میں حامی انقلاب جماعت کا بہت بڑا حصہ سائبریا میں اسی نصب العین پر قربان ہوجاتا ہے۔ وشنفسکی کی کتاب (Optimistic tragedy) یا کولڈونوف کی (Post script) بھی اسی ذیل کی تصانیف ہیں۔

سوویٹ ادب کا مقصود یہ ہے کہ اشتراکی مسئلے کے حل میں صناعت ادب کارآمد ثابت ہو۔ چنانچہ اسی مقصود کے تحت سوویٹ ادب کی "واقعیت نگاری" انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ اس اشتراکی واقعیت نگاری کو اس "واقعیت" سے مماثل سمجھنا ایک غلطی ہوگی جو فقید المثال اور منفرد باتیں پیش کرتی ہے۔ اشتراکی "واقعیت" اپنے ہیرو کو اسی کے ماحول میں پیش کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ افراد کی حرکت و عمل تاریخ کو بدل دینے میں کس درجہ موثر ہوسکتی ہے۔

ایسی کامیاب تصانیف میں شلوخوف کا ناول (Quite Don) روس میں سول وار کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ اُسی کا دوسرا ناول (Soil upturned) "سب ل" کھیتی کا ماحول پیش کرتا ہے۔ مزدوروں کے اندر "اشتراکی مقابلہ" یعنے سبقت لے جانے کی کوشش کا پورا مرقع کٹائیف کے ناول (Time forward) میں نظر آتا ہے۔ اور بھی بہت سی تصانیف ہیں جو اسی قسم کے ماحول اور حالات کی تصویریں کھینچتی ہیں۔

نیا سوویٹ ادب تاریخی موضوع کو بھی نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر ماضی کو وہ عوام کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے جن کے خیالات و نظریات کا وہ حامل ہے! سوویٹ مصنف جب تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کے سامنے اُس زمانہ کے جفاکش عوام کی حالت اور اُن طبقوں کا "سماجی منصب" بھی آتا ہے۔ اس کے برخلاف بورژوا ادب بالعموم اس پہلو کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔

حال میں جو تاریخی ناول شایع ہوئے ہیں، اُن میں (Tolstoy) کا "پیٹر اول" پیرو توئی کا "سیما" اور السوولیف کا "کمپلیٹ اُدرہال" بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ آخرالذکر کے اندر قبل انقلاب روسی بیڑے کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

"اشتراکی واقعیت نگاری" جسے سوویٹ ادب قایم کر رہا ہے، وہ اُنیسویں صدی کی "واقعیت نگاری" سے بالکل جدا چیز ہے میکسیم گورکی کی باریک بین نظر نے اِس فرق کو جس طرح دیکھا، وہ اُس نے انشا پردازوں کے مجمع سے گفتگو کے دوران میں ان لفظوں میں پیش کیا تھا:۔

"اُنیسویں صدی کی واقعیت نگاری تنقیدی تھی جس کا مقصد سماجی خرابیوں پر طعنہ زنی کرنا یا عیب دکھانا تھا، اسکے آگے وہ کوئی قطعی بات پیش نہ کرتی تھی۔ اشتراکی واقعیت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قطعی اور اثباتی پہلو کو پیش کرتی ہے، اور ہماری واقعیت نگاری کا قطعی اور اثباتی ہونا اُسے سوویٹ زندگی کے عیبوں کے خلاف جدوجہد سے باز نہیں رکھتا!"

چنانچہ سوویٹ ادب اعلےٰ اشتراکی عندیوں پر مبنی ہے اور یہ عندیے حقیقی صورت اختیار کر رہے ہیں، سوویٹ ادب حقیقی اور سچے ہیرو پیدا کرتا ہے، جو پُرانے ادب کے ہیرو کی طرح محض اخلاقی نظریات کے پتلے یا صرف معدوم کرنے والے ہیرو نہیں ہوتے بلکہ وہ خود "معمار" ہوتے ہیں، خلاق ہوتے ہیں، ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک ایسی سماج کو منظم کر رہا ہے جس کے کردار، خیالات کی اُپج اور دولتمندی کا ثبوت ہوتے ہیں۔

بایں ہمہ، سوویٹ روس کے لکھنے والوں میں بورژوا مصنفین کی طرح اعلےٰ دادنے، قوی دکمزور لکھنے والے بھی ہیں۔لیکن چونکہ سوویٹ مصنف کا رشتہ محنتی عوام اور اشتراکی حقیقتوں سے ہوتا ہے اور ہر سوویٹ مصنف ان حقیقتوں کے اظہار کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کسی درجے کا بھی مصنف ہو اس کے اندر "نیا" ہونے کا وصف ضرور ہوتا ہے! لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سوویٹ مصنف ادبی مشکلات سے دوچار نہیں ہوتا اور اُس کا کام سہل ہے۔

دنیا کے "روایتی" ادب میں بالعموم بادشاہ، اشراف، بورژوا یا انفرادیت پرست [illegible]) ذہین انسان ہیرو ہوتا ہے، لیکن سوویٹ ادب کا ہیرو ایک بالکل ہی نئی ہستی ہے (کوئی مزدور یا کسان، ہے جسنے استحصال بالجبر کی جھول اُتار پھینکی ہے) اور یہ حقیقت ہر سوویٹ مصنف سے ایک ایسا "نیا" کردار پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے جس کی مثال پہلے سے موجود نہیں۔ چنانچہ یہی وہ خصوصیت ہے جو سوویٹ ادب کو "نیا ادب" بناتی ہے۔سوویٹ ادب محض اس بنا پر "نیا" نہیں کہ اس کے اندر انشاء و بیان کی ندرت یا فنکاری ہے، بلکہ وہ "نیا" ہے اس لئے کہ اس میں نیا نظری و موضوعی مسالا ہے جو اس وقت تک کی تاریخ ادب میں مفقود تھا۔ اس ادب کے کردار سے دنیا اسوقت تک ناواقف تھی۔

سوویٹ ادب اپنے عیبوں یا کمیوں کی طرف سے کبھی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ بولشویک "خود تنقیدی" بھی سوویٹ ادب میں اتنی ہی ضروری شرط ہے جتنی دوسرے کاموں میں سوویٹ ادب کی بڑی کمی یہ سمجھی جا رہی ہے کہ

وہ ابھی تک سوویٹ زندگی کے دوش بدوش چلنے سے عاری ہے، وہ سوویٹ تعمیر اور اشتراکی کاموں کے ہیرو کو پوری طرح صناعانہ تکمیل کے ساتھ نہیں دکھا سکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ سوویٹ زندگی جتنی تیز رو ہے انکا ادب اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ سوویٹ مصنفوں کو احساس ہے کہ ابھی تک ان کے ادب میں "ذہین طبقے" (Intelligentsia) کے ہیرو کو بڑی جگہ ملی ہوئی ہے، حالانکہ اصل زندگی یعنے تعمیری کاموں میں طبقاتی جنگ میں، "سب مل" مزدور اور کسان چھایا ہوا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں محنتی طبقہ جو کارخانے اور فیکٹریاں قائم کر رہا ہے، "سب مل" کسان جو زراعت کر رہا ہے، آگے آگے ہے اور یہی لوگ ہیں جو زندگی کی سب اچھی چیزیں پیدا کر رہے اور دنیا کو روٹی کھلاتے اور کپڑا پہناتے ہیں، جو اپنے اعلےٰ واشرف کام کے بارے میں زبان بھی نہیں کھولتے۔ یہ لوگ نئی زندگی کے ڈھالنے والے ہیں اور یہی سچے ہیرو ہو سکتے ہیں۔

"سب مل" زراعت کے (Kolkhozniks) کی آل یونین کانگرس میں استالن نے اسی بات پر زور دیکر کہا تھا کہ:-

"یہ نئی زندگی کو پیدا کرنے والے ہی اصل ہیرو ہیں ـــــ ہمارے ادب میں انھیں کو جگہ ملنا چاہئے۔"

سوویٹ کسان مزدور اپنے ادیبوں اور انشاپردازوں سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ دوسرے پنجسالہ پروگرام میں یہ کمی باقی نہ رہنا چاہئے ـــ چونکہ اشتراکی تعمیر کے عنصر سوویٹ ادب کے ملہم ہیں اس لئے یہ ادب [illegible] جفاکش انسانوں کا محبوب بن گیا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اس محبت کا مستحق بھی ہے۔ کیونکہ سوویٹ ادب نکمے آدمیوں کا ادب نہیں بلکہ ایک ایسا ادب ہے جو اشتراکی تعمیر میں اپنا پورا فرض ادا کر رہا ہے۔

آل یونین کمیونسٹ پارٹی نے اپنی سترھویں کانگرس میں اپنی کامیابیوں اور اپنے کاموں کے نتیجوں کا جائزہ لیکر دوسری پنجسالہ اسکیم اور اُس کے اقتصادی وکلچری پروگرام پر تصدیق کی مہر لگا کر پھر ایکدفعہ لینن کے اُصول کی روشنی وہدایت میں آیندہ کی فتح وکامیابی کا راستہ دکھا دیا ہے ـــ اس عظیم الشان اور مشترک کام کی انجام دہی اور اسکی اہمیت کو سمجھ کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں، سوویٹ مصنف کو وہ ولولہ مل جاتا ہے جو "سب مل" اسپرٹ اور اشتراکی تخلیق کا ولولہ ہے اور جو پارٹی اور اُس کے مقتدر لیڈر استالن کی بلند خیالیوں سے حاصل ہوتا ہے۔

سوویٹ ادب اپنے پڑھنے والوں کو شخصی ملکیت اور انانیت پر فتح پالینے کے لئے طیار کرتا ہے، استحصال بالجبر کے پنجے سے نکلی ہوئی انسانیت کو 'برادرانہ اتحاد' کے نام پر' ملکیت اور انانیت کے شعور کو زیر کرلینے کے لئے طیار کرتا ہے۔

نئی فتوحات کا یہ زمانہ یعنی سوویٹ یونین کے میدانوں میں مقام رکھنے کا زمانہ، بلاشبہ سوویٹ ادب کے لئے بھی نئی فتوحات کا زمانہ ہوگا۔

ل۔ احمد

عندلیب شادانی وحسرت موہانی

جناب پروفیسر عندلیب شادانی نے مولانا حسرت موہانی کے کلام پر بعض اعتراضات کئے ہیں، جو میرے نزدیک بالکل غلط ہیں۔ میں اس مضمون میں انھیں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا کا شعر ہے:

یوں شکر جور کرتے ہیں تیرے اداشناس، گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

اس پر جناب شادانی کا اعتراض یہ ہے کہ فعل حال جب مثبت سے منفی بنایا جاتا ہے تو اس کے آخر سے "ہے" "ہوں" اور "ہیں" کو گرا دیتے ہیں اور اس کے پہلے علامت نفی لگا دیتے ہیں۔ شادانی صاحب نے اس قاعدہ کو کلیہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ منفی حالت میں ہے اور ہیں وغیرہ کا حذف کر دینا جایز ہے ضروری نہیں۔ چنانچہ تمام اساتذہ کے کلام نظم ونثر سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہاں تک کہ بعض غزلوں کی ردیف ہی "نہیں ہے" یا "نہیں ہیں" ہے۔ میر کی ایک غزل کا شعر اسی زمین میں ملاحظہ ہو:

مری آنکھوں میں قدر ہستی نہیں ہے پسند ایک، دم کی یہ مستی نہیں ہے

میر انیس فرماتے ہیں:

کی عرض میرے جسم پہ جو وقت تک ہے سر ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بدگہر

شادانی صاحب کے اُصول کے مطابق میر کی غزل کی ردیف ہی غلط ہے اور میر انیس نے بھی نہیں کے بعد ہے کا استعمال غلط کیا ہے۔

حسرتیں وقف طرب ہیں آرزو محو سرور بخت نے کھولا ہے روئے شوق پر باب نشاط

شادانی صاحب کا اعتراض ہے "حسرتیں" جمع اور "آرزو" واحد لکھنا درست نہیں۔ اس اعتراض کا سبب یہ ہے کہ معترض نے ہیں کا فاعل آرزو کو بھی قرار دیا ہے، حالانکہ ایسی صورت میں آرزو کا فعل "ہے" محذوف مانا جائیگا یعنی نثر کرنے پر صورت یہ ہوگی کہ "حسرتیں وقف طرب ہیں، آرزو محو سرور ہے۔"

سب آئے پر اک تو نہ آیا نہ آیا   تیرا دیر دیکھا کیے راستہ ہم   (مولانا حسرت)

اعتراض :- مصرعۂ ثانی محل نظر ہے اگر اس کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی "ہم دیر تیرا راستہ دیکھا کئے"، مگر اُردو میں اس طرح نہیں بولتے "دیر تک راستہ دیکھا کئے" یا "بہت دیر راستہ دیکھا کئے"، کہنا چاہیے تنہا "دیر" صحیح نہیں۔

اس وقت کے محاورہ کے لحاظ سے اعتراض درست ہے، لیکن حسرت نے اکثر جگہ اساتذۂ قدیم کے تتبع میں اس قسم کی ترکیبوں کو جایز قرار دیا ہے۔

میر کا شعر ہے :

خوش سرانجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے   ہمتو اے ہمنفساں دیر خبر دار ہوئے

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ   دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ

ملا اب تو نہ وہ ملتا تھا اس کا   نہ ہم سے دیر آنکھ اس کی ملا کی

مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے   بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے   (مولانا حسرت)

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی   بغرورِ دلربائی بیقین دل پسندی   (")

"سب" اور "سارا" پر اعتراض ہے لیکن یہ وہ نکتہ ہے کہ پروفیسر صاحب کے علاوہ کسی نے اس کا لحاظ نہیں کیا!

جب یہ نہ ہو تو کیوں نہ ہو دنیا و دیں خراب   سارے لگاؤ رہتے ہیں دل کی لگی کے ساتھ   (داغ)

مجھے ساری (سب) بلائیں ہجر کی شب دیکھنی ہوگی   جگا دے لیکے چٹکی درد دل جس وقت غافل ہوں   (")

ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہہ چلے منھ پر   ہمارے کام سارے (سب) دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے   (میر)

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم   اتنی نادانی جہاں کے سارے (سب) داناؤں میں تھی   (اقبال)

آبلہ پہلے پڑا پھر زخم اس کے بعد داغ   مختصر یہ ہے یونہیں سب (سارا) گھر ہمارا جل گیا   (عزیز لکھنوی)

شام ہو یا کہ سحر یاد انھیں کی رکھنی،   دن ہو یا رات ہمیں ذکر انھیں کا کرنا   (حسرت)

اعتراض یہ ہے کہ : "یا" اور "کہ" کی یکجائی صحیح نہیں کیونکہ دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ اس کے جواب میں اقبال کے چند اشعار پیش کرتا ہوں :

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور تیرا ہے یا کہ میرا   مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد،   سالک رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے   ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن   کہ ہم ہو گئے جسمِ خاکی سے نوری

لفظ "جسم" پر اعتراض ہے اور ارشاد ہے کہ "زندہ انسان پر مطلق جسم کا اطلاق صحیح نہیں" حالانکہ اساتذہ نے جسم

کا استعمال اس معنی میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جسم سے نکلی تو پہونچی کعبۂ مقصود کو ۔۔۔ بے لباسی بن گئی ہے جامۂ احرام روح (خواجہ وزیر)

بتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ ۔۔۔ کس قدر ہمدرد سارے جسم میں ہوتی ہے آنکھ

خود جناب پروفیسر صاحب کا شعر ہے:

کیا مرے خواب میں بھی آنیکا قدغن ہے تمھیں ۔۔۔ قید ہے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں،

آگئی کس کے جمالِ عرق آلود کی یاد ۔۔۔ رات بھر ہجر میں گنتے رہے تارے عاشق (مولانا حسرت)

اعتراض یہ ہے کہ "جمالِ عرق آلود" کی ترکیب معنوی اعتبار سے محض مہمل ہے پسینہ چہرے پر آتا ہے جمال پر نہیں یہاں "جمال" سے "شخص جمیل" مراد لینا بھی ممکن نہیں کیونکہ "کس" اس کے منافی ہے "جمال" کی جگہ چہرہ۔ عارض رُخ کوئی لفظ ہونا چاہئیے۔

عرض ہے کہ "جمال" سے یہاں مجازاً چہرہ ہی مراد ہے۔ اس لئے غلط نہیں۔

شوق لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر ۔۔۔ حسرت جو نقد جان نہ ٹھہرے بہائے ناز

اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں ۔۔۔ تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آجکل

مجھکو معلوم ہے پیمانۂ مئے میں ساقی، ۔۔۔ تو نے جو کچھ کہ مری آنکھ بچا کر چھوڑا

پہلے شعر میں اعتراض، اعلانِ نون پر ہے، دوسرے شعر میں (ہے آجکل) پر اور تیسرے میں (کہ) پر۔ اس کے جواب میں خود شادانی صاحب کے دو شعر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اسکا علاج ۔۔۔ نالہ رکا تھا کہ یہ پردہ در راز نہ ہو،

پہلے مصرعہ میں خون کا اعلانِ نون ضروری تھا اور دوسرے مصرعہ میں "یہ" بالکل بیکار ہے صرف اتنا کہنا کافی تھا "نالہ رکا تھا کہ پردہ درِ راز نہ ہو" لیکن صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے "یہ" اضافہ کیا گیا۔ نونِ غنہ بہت آسانی سے یوں دور ہوسکتا تھا: "خونِ دل آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج"

شادانی صاحب کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

ہو کے مایوس بھی ہم جیتے ہیں ہاں ہم جیتے ہیں ۔۔۔ وائے وہ زیست اجل پر بھی جسے ناز نہ ہو

پہلے مصرعہ میں بقول پروفیسر صاحب ہم جیتے ہیں کی تکرار غلط ہے۔ اور "ہم" تو بحر سے دامن چھڑا چکا ہے۔

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھکو کہ آج کل ۔۔۔ تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

روح نے پائی ہے تکلیفِ جدائی سے نجات ۔۔۔ آپ کی یاد کو سرمایۂ راحت کر کے

اعتراض یہ ہے کہ "تکلیف" عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "طاقت سے زیادہ کام لینا" اور فارسی

میں مطلق "کام لینا" کے معنی میں آتا ہے لیکن اُردو میں اس کے معنی ہیں دُکھ، رنج، ایذا، مصیبت، بپتا، دشواری۔ ان معنوں میں اگر استعمال ہو تو "تکلیف" اُردو کا لفظ ہے مذکورۂ بالا اشعار میں بمعنی "ایذا" استعمال ہوا ہے لہٰذا "تکلیف اضطراب" اور "تکلیف جدائی" کی ترکیب غلط ہے۔

حسرت نے تکلیف کا استعمال اس کے اصل معنی میں کیا ہے۔ اُردو کے مستعملہ معنی کے لحاظ سے نہیں کیا۔

اک جو ملے دیکے مجھے شیوۂ یاری آیا وہ بھی کچھ کام نہ خدمت میں تمھاری آیا (حسرت)

اعتراض۔ "یاری" فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بمعنی "مدد و نصرت" مستعمل ہے ظاہر ہے کہ اس شعر میں یاری بمعنی مدد و نصرت استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا "شیوۂ یاری" کی ترکیب نادرست ہے۔

اس کے جواب میں میر کا شعر ملاحظہ ہو:

واں سے خشم و عتاب و ناز و ادا یاں سے اخلاص و دوستی، یاری

نازبردارِ الم لکھا ہے نامہ میں مرے اُس سراپا نازکی منشیِ دل نگاری دیکھئے (حسرت)

اعتراض۔ نازبردار فارسی میں مستعمل نہیں فارسی کا محاورہ نازکشیدن ہے اس لئے نازبردارِ الم کی ترکیب معیوب ہے۔

اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نازبردارِ لب ہے جاں جب سے تیرے خط کی خبر کو پاتی ہے (میر)

نازبردارِ جنوں حسن حسیناں کیوں نہیں شمع کے سر پہ ہے روشن داغ سودا دیکھئے (زکی دہلوی تلمیذ غالب)

وصل کی جب سے گئی ہے چھوڑ دلداری مجھے ہجر کی کرنی پڑی ہے نازبرداری مجھے (میر)

اُردو زبان کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کا نام لیکر خطاب کرتے ہیں تو پھر اس کے لئے "آپ" کا استعمال نہیں کرتے حسب اقتضائے سن و مرتبہ "تو" یا "تم" کہتے ہیں مثلاً:

اصغر! تم کلکتے کب جاؤ گے؟ - یا - اصغر! تو کلکتہ کب جائے گا؟

حسرت! جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

تم سے گدا کو اس شہِ خوباں کی آرزو حسرت! یہ اور کیا ہے جو دیوانگی نہیں

یہ کوئی نہ کہے گا! کہ اصغر! آپ کلکتہ کب جائیں گے؟ اظہار احترام مقصود ہو تو پہلے نام کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیتے ہیں تب "آپ" کا استعمال کرتے ہیں مثلاً اصغر صاحب! آپ کلکتہ کب جائیں گے۔ لیکن "بادشاہِ متغزلین مشرق" کے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح کسی آئین کے پابند نہیں۔ ان کی زبان قانون ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

حال کھل جائے گا بیتابیِ دل کا حسرت بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

حسرت! اس کوچہ کا پھیرا روز روز اچھا نہیں رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی،
نہاں نہ ہو کرم یار میں ستم حسرت بہت نہ کیجئے اظہار شادمانی کا

مجرد نام کے ساتھ خطاب ہے تو "کیجئے" کی جگہ "کرو" یا "کر" چاہئے ۔" اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

(۱) وفا وہ کریں داغ یہ کس نے مانا مگر آج کا زعم باطل یہی ہے، (داغ)
(۲) یہ داغ قدح خوار کے کیا جی میں سمائی سنتے ہیں کئے بیٹھے ہیں وہ رات سے توبہ ،،
(۳) داغ پھر جھانک تانک کرتے ہیں، اب گھر سے اب پھنسے کہیں نہ کہیں ،،
جلال آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے جواب جگر کا خون کیا ہے اُسے چھپاتے ہو (جلال لکھنوی)
(۴) کہئے ہزاروں ناز تھے جس دل پہ لے جلال دل کیا ہوا وہ آپ کا وہ ناز کیا ہوئے ،،
بند کر دیگا لب یار کو بوسوں کا ہجوم، آج بھی ہم سے جو وہ بر سر انکار آیا ، (حسرت)
عمر کیجئے صرف یادگیسو و رخسار میں یوں بسر کیجائے لیل و نہار انتظار
پھر کہئے کس امید پہ ہم زندگی کریں جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے
کامیابی جلد ہو گی آکے پابوس امید کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار اک برس
تیری خوشبو کے بعد روح مری گل جنت بھی ہو تو بو نہ کرے
کب بر آئے گی سکون جان مضطر کی امید کب بسر آئے گا یارب یہ زمان اضطراب
ہجر ساقی میں بھلا کس کو خوش آئیگی شراب ہمنشینو! طلب ساغر و میناہے عبث
بادۂ عیش سے میناے تمنا نکلیں، ساغر شوق مئے ذوق سے گلنار آیا
کچھ نہیں شوق جبّہ و دستار دل سر ساغر و سبو نہ کرے
میں اس بت بدخو کی اس آن پہ مرتا ہوں کھینچا نہ کبھی جس نے اندوہ پشیمانی ،
لگی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا

پروفیسر صاحب کو ان تصرفات پر اعتراض ہے ۔ ممکن ہے وہ حضرات جو تاریخ اُردو سے واقف نہیں وہ عندلیب صاحب کی نکتہ رسی کی داد دیں لیکن جو بالغ نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے اپنے ذہن سے نہیں پیدا کی ہیں بلکہ بہت پہلے آزاد مرحوم "آب حیات" میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ملاحظہ فرمائیے :۔

" ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جایز نہیں ۔ مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی اُٹھ گیا اور اپنے کارآمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں

دیکھے انھیں کبھی بجنسہ اور کبھی ترجمہ کرکے لے لیا" برآمدن،، اور " بسرآمدن" ہندی میں اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہلِ زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین کرلیا۔ سودا نے کس خوبصورتی سے کہا"

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ برآئے | بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے
رکھ دیو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آئے | وہ زلف سیاہ اپنی اگر لہر پہ آئے

یہ تو آزاد مرحوم کی عبارت تھی اس کے بعد تمام اساتذہ کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جن میں محاورہ تصرف کرکے لیا گیا یا علی حالہ لکھا گیا ہے چند اشعار درج کرتا ہوں:

(۱) خوش نمی آید — مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ناکامیِ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ | اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا (میر)

بو کردن = سونگھنا۔ (سودا)

دیکھوں نہ کبھی گل کو تیرے منھ کے بیں ہوتے | سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

گوش کردن = سننا۔ (سودا)

کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال | یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

زنجیر کردن = قید کرنا

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے | اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

ایسے کافی تصرفات کا ذکر آزاد نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی میر صاحب نے کافی اشعار اس قسم کے تصرفات کے ساتھ لکھے ہیں:

چمن کا نام سنا تھا و لے نہ دیکھا ہائے | جہاں میں میں نے قفس ہی میں زندگانی کی
اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوے کرنے | شب ہائے ماہ چندے تجھکو چھپا رکھیں گے
ایذا بھی کھینچ چکئے جو تئیں عشرے کی ہو | اس طرح مرتے رہئے اسے میر آہ تا چند
ہجراں میں اسکی زندگی کرنا بھلا نہ تھا | کوتاہی یہ ہوئی نہ اس عمرِ دراز سے
زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا | ہزار مرتبہ دل کو مرے جگر آیا
کیونکہ سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر | اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار آیا

غرض اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں زیادہ سے زیادہ پروفیسر صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ اب یہ سب متروک ہیں۔ لیکن متروکات کا استعمال اپنی خوشی پر ہے۔

اثر گلشن آبادی

معراجِ تمدن

متذکرہ عنوان سے ایک مقالہ گزشتہ دسمبر کے نگار میں میری طرف سے شایع ہوا تھا۔ اُس سے قبل دو مقالے میرے فاضل دوست گلاب چند کے قلم سے نگار کے صفحات کی زینت بن چکے تھے۔ میں نے اپنے مضمون میں اشتراکیت اور جمہوریت۔ دونوں کے سیاسی، مجلسی اور معاشی پہلوؤں پر مختصراً بحث کی تھی جس سے متاثر ہوکر انھوں نے ایک کھلا خط فروری کے نگار میں شایع کرایا ہے۔ جواب الجواب کے قائل آپ نہیں ہیں، شاید اسی لئے جواب الجواب کی زحمت آپ نے گوارا بھی نہیں کی۔ بلکہ اصل موضوع سے ہٹ کر اشتراکیت اور اُس کے مداحوں کو کوسنے کے علاوہ سوویٹ روس کے خلاف پست الزامات اور بہم شبہات کا اظہار کرکے اپنی بیچارگی کا ثبوت دیا ہے۔ جوشِ رقابت میں پست سے پست الفاظ استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔

آپ کا گزشتہ اسلوب بیان۔ عالمانہ اور محققانہ انداز تحریر دیکھ کر سیاسیات کا ہر غیر جانبدار طالب علم آپ کو سیاسی تعصب سے پاک سمجھنے پر مجبور تھا۔ لیکن ایک ہی نشتر سے فاسد مواد بہنا شروع ہوگیا اور آپ اپنے اصلی روپ یعنی روس کے خلاف زرخرید مبلغ کی صورت میں ظاہر ہوگئے۔

آپ کو شکایت ہے کہ ننانوے فیصدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے معلمانہ انداز گفتگو اختیار کرلیتے ہیں۔ کیا یہی طرز نگارش اظہار فضل وکمال کی علامت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت میں اکثریت غریب اور محنت کش طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کوئی اشتراکی اعلےٰ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو نمایش اور ظاہرداری سے گریز کرتا ہے۔

اعلےٰ تعلیم کا مفہوم متعین کرنے میں میرے اور آپ کے درمیان بنیادی اختلاف ہے۔ دارالعلوم کی اعزازی ڈگریاں ہی عالم متبحر ہونے کی کافی دلیل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک دردمند دل نازک احساس۔ اور بین الاقوامی صورت حالات سے ہمہ گیر واقفیت کی ضرورت ہے۔ ایسی تعلیم جو انسان کے دل اور دماغ کو مفلوج اور ماؤف بنادے زندگی کے حقایق کا آئینہ دار بنانے کی بجائے اُس میں قومیت اور وطنیت کے لحاظ سے اجنبیت سی پیدا کردے۔ تعلیم نہیں میرے نزدیک مہذب قزاقی ہے۔ اگر میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ تو یہ اعلےٰ تعلیم یافتہ گروہ سیرت و

صورت دونوں حیثیت سے قطعی الگ شے بن گئی ہے، جس کو نہ ہندوستانی کہہ سکتے ہیں اور نہ یوروپین بلکہ ایک تیسری ہی مخلوق ہے جس کا کوئی نام ابھی تک نہیں رکھا گیا۔

آپ کا بیان ہے کہ گارنر کا خواب جمہوریت آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کی ریاستیں بھی صحیح معنوں میں جمہوری ریاستیں نہیں ہیں۔ گویا اس لحاظ سے آپ ایک ایسی چیز کا ذکر کر رہے ہیں، جو ابھی تک دنیائے تخیل سے عالم وجود میں نہیں آئی۔ جمہوریت کا مفہوم آپ کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ حکومت کا ہر کام عوام کی مرضی سے عوام کے فایدہ کے لئے اور عوام کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے۔ معاشری اصلاح بھی اور مذہبی تخیل بھی۔

لیکن اشتراکیت، اصلاح کا ایسا قدم اُٹھانا چاہتی ہے کہ پھر کسی اصلاح کی گنجایش نہ رہے۔ آپ رائج الوقت نظام سے مطمئن بھی ہیں۔ اس کی تخریب بھی گوارا نہیں کرتے۔ صرف موجودہ اقتصادی و سیاسی انتشار سے عارضی نجات حاصل کرنے کے لئے اس میں تھوڑی سی ترمیم چاہتے ہیں۔ آپ بھی مانتے ہیں کہ براہ راست عوام حکومتی کارروائیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اُن کو صرف اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار ہے اور تاوقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم وشعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح حکومت اور انتخاب کے معنی کو سمجھ سکے، عام رائے دہندگی ایک لایعنی چیز ہے۔ عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے۔ اشتراکیت چونکہ عوام کو جاہل اور عام تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے، ناقابل قبول ہے اور اسی ہمہ گیر واقفیت پر آپ دوسروں کو جاہل سمجھ رہے ہیں، حالانکہ اشتراکیت کا اولین پروگرام نہ صرف عام تعلیم بلکہ عام سیاسی تربیت بھی ہے۔

واقعی کارل اور انجلس کو سمجھنے والے اشتراکیوں کی تعداد قلیل ہے، لیکن جمہوریت کے نغمہ سراؤں میں کتنے ہیں جو آپ کی طرح گارنر اور روسیو کو جانتے ہیں۔ کتنے ہندو ہیں، جو ویدوں کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ کتنے مسلمان قرآن شریف کے حافظ ہیں؟ فلسفۂ عدم تشدد کے بانی مہاتما گاندھی ابھی تک عدم تشدد کا صحیح مفہوم اپنے تخیل میں متعین نہیں کر سکے۔ ہریجن کا مقالہ افتتاحیہ عدم تشدد کی نت نئی تاویلات سے مزین ہوتا ہے۔

کسی نظریہ یا اُصول کی پیروی کے لئے یہ لازم نہیں کہ پیروی کرنے والے اُس کے موجد کے شجرۂ نسب سے بھی واقف ہوں۔ ایک گنوار بھی اپنے ذاتی نفع ونقصان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ گو اشتراکیت ایک خالص اقتصادی مسئلہ ہے۔ تاہم وہ عوام کے مجلسی، سیاسی، اور مذہبی حقوق کا کفیل وضامن بھی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دائرۂ اثر اور حلقۂ عمل وسیع سے وسیع تر نہ ہوتا جائے۔

نفس اشتراکیت پر آپ نے صرف دو جزئی اور سطحی اعتراض کئے ہیں اول اعتراض یہ ہے کہ انسان کبھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا کہ اُسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ساری دنیا بیک وقت فلسفہ کارل مارکس

کی معتقد نہیں ہو سکتی۔

میری عرض یہ ہے کہ ریاست بجائے خود کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے ہے کہ باقی ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ اگر دیگر ضروریات بغیر اس کے پوری ہو سکیں۔ تو اس کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ برعکس اسکے ذاتی ملکیت جھگڑے کی بنیاد ہے، کیونکہ ہر شخص اپنی ریاست پر قانع نہیں رہتا یہیں سے انفرادی مقابلے کا باہم سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور انسان ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں انسانی اوصاف کو چھوڑ کر درندگی و وحشت پر اتر آتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ساری دنیا بیک وقت فلسفۂ کارل مارکس کی معتقد نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی طرز کا قطعی اعتراض ہے۔ اس طفلانہ استدلال کی بغیر کسی احساس خجالت کے آپ مندرجۂ ذیل الفاظ میں تردید بھی کر دیتے ہیں۔

"(Legislation) لیجسلیشن کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے ذریعے ہیں۔ اور جب ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔" میں صرف اتنا اضافہ کر دیتا ہوں۔ کہ ابھی کل تک اشتراکیت کا نام لینا بھی اس ملک میں مسلح بغاوت کے مترادف تھا، جمہوری دستور العمل میں جتنی زیادہ اشتراکی اصطلاحات رائج کی جا دیں گی اقتصادی مشکلات کا حل اتنا ہی نزدیک تر ہوتا جائے گا۔

یہ اعتراض کہ پستی کا موں سے ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے اس لئے بلند و پست کی تفریق کو مٹایا نہیں جا سکتا لغو ہے۔ کیونکہ جسمانی مشقت اور شب و روز کی مصروفیت سے ذہنی پستی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کی محنت کے سہارے عیاشی اور تنعم پسندی کی زندگی بسر کرنا اخلاقی انحطاط اور ذہنی خلفشار کا موجب ہوتا ہے۔ شہر اور دیہات میں جنس عصمت کی ارزانی و گرانی کا بین تفاوت اس کا مظہر ہے۔ اگر خوش رفتار اور خوش گفتار ہونا ہی مہذب ہونے کی دلیل ہے تو یہ اوصاف حسن فروش طبقہ میں بافراط ہوتے ہیں۔ شعبۂ تنظیم کے معاوضہ میں امتیاز سے طبقہ بندی شروع ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا خیال اسی طبقہ بندی کی پیداوار ہے۔

روس کے متعلق آپ کی ہمہ دانی جمہوری ممالک کے منظم پراپاگنڈا پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں نہ شخصی املاک رکھنے کی اجازت ہے اور نہ عوام پر بزور حکومت کی جاتی ہے۔ فروری کے نگار کے مقالہ افتتاحیہ میں ذیل کے الفاظ آپ کے شکوک کی تردید کر دیتے ہیں۔ "روس کے جنرل سکریٹری جنرل ڈیمی ٹروف نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن یہی ہماری

ترکیب ہوگی۔ جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا۔"

کسی ملک کا سیاسی انقلاب سیاسیات عالم پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انقلاب روس کے بعد عوام کو احساس ہوا کہ جمہوری طرز حکومت نہ تو عوام کے مفاد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ اکثریت کو مطمئن رکھ سکتا ہے۔ جرمنی اور روس میں تقریباً بیک وقت شہنشاہیت کا خاتمہ کیا گیا، اسی دور اضطراب میں نازیت و فسطائیت ظہور میں آئے۔ یعنی ہٹلر و مسولینی نے اشتراکیت کی متجانس اصطلاحات سے معاشری توازن قایم کرنے کی کوشش کی لیکن برائی کی جڑ یعنی نظام سرمایہ داری اور شخصی مقابلہ پھر بھی جاری رہا۔ مشینوں کی بنی ہوئی اشیاء کی نکاسی اور خام پیداوار کی طلب کے لئے منڈیوں کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ اٹلی نے حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کرلیا اور جرمنی نے آسٹریا زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر۔ روس پر بھی فن لینڈ کی آزادی سلب کرنے کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روس کا یہ اقدام توسیع مملکت کے لئے نہیں بلکہ حفاظت خود اختیاری کے لئے ہے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ "کوئی حکومت محض اچھے اُصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہوسکتی" عجیب منطق ہے۔ حالانکہ اچھے اُصول وہی ہوتے ہیں جو قابل عمل ہوتے ہیں۔

"رام"

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس:۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کماریا لتا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی:۔ اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

کوڑھی بھکارن

حال کی بات ہے۔ بہت زمانہ نہیں گزرا، اودھ کے ایک ضلع میں ایک بزرگ تھے کہ زمانہ کا رنگ دیکھے ہوئے ویسے اب کم دکھائی دیں گے۔ قوم کے ہندو تھے اور پیشہ وکالت تھا، عمر ساٹھ باسٹھ برس کی ہوگی۔ آدمی دبلے پتلے تھے لیکن بدن میں سکت بہت تھی رنگ سرخ و سپید تھا چہرہ سے شرافت و متانت ٹپکتی تھی، بردبار لیکن خوش مزاج معلوم ہوتے تھے گو اپنے ضلع کے وکیلوں میں اُن کا درجہ سب سے اونچا تھا اور آمدنی کافی تھی ویسے بھی گھر سے خوشحال تھے لیکن وضع سیدھی سادی اور رہنا سہنا معمولی تھا۔ کر و فر سے اُنھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ عام طور سے کھادی کی دھوتی، کُرتہ اور اُس پر جاکٹ پہنتے تھے۔ کچہری کے وقت پائجامہ اور اچکن پہن لیا کرتے تھے۔ مہمان نوازی میں خاص لطف آتا تھا۔ آئے دن عزیز۔ دوست۔ احباب اُن کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جاتی تھی۔ سادھو سنتوں کی صحبت کا شوق تھا۔ ایک دو ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں مہمان رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں انھیں کے ساتھ ساتھ۔ ہردوار۔ رشی کیش بلکہ جمنوتری اور گنگوتری تک کا دھاوا لگ جاتا تھا۔ جڑی بوٹیوں کی بھی تلاش رہا کرتی تھی۔ بیسیوں نسخے معلوم تھے اور ہومیوپیتھک علاج میں بھی دخل رکھتے تھے۔ غریب غربا یا دوست احباب میں جس کسی کو جسوقت ضرورت ہو علاج اور تیمار داری کے لئے حاضر تھے۔ آمدنی کا کافی حصہ خیرات اور غریبوں کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ موکلوں سے گھر پر صبح اور کچہری میں دوپہر کو بات چیت کرتے تھے شام کو کبھی دفتر میں نہیں بیٹھتے تھے۔ لیکن کوئی عزیز دوست یا مریض اگر آدھی رات کو بھی بلا بھیجتا تو دوڑے چلے جاتے۔ بالعموم شام کو ہوا خوری کے لئے ٹہلنے جایا کرتے۔ راستہ میں فقیر۔ بھکارن۔ لنگڑے۔ لولے۔ اپاہج اگر پیسے کا سوال کرتے تو کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر ضرور دیدیتے۔ اگر کسی کو زیادہ قابل رحم دیکھتے تو گھر ساتھ لے جاتے۔ کھانا کھلاتے اوڑھنے پہننے کو کپڑا کمبل دیدیتے۔ یا بازار ہی میں دوکان سے پوری اور مٹھائی خرید کر کھلا دیتے۔ دماغ سلجھا ہوا تھا اُس پر تعلیم کی جلا تھی پوجا پاٹ یا کسی اور ایسے ڈھکوسلے کے قریب نہیں جاتے تھے، نہ چھوت چھات کے قایل تھے، لیکن دل میں کچھ ایسا درد پایا تھا کہ اس سے بیچین رہتے اور اس درد کی دوا ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت وکیل صاحب ٹہل کر واپسی پر بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے کے قریب سڑک پر پٹری اور نالی کے لگ بھگ

دیکھا کہ ایک کوڑھی بھکارن بے کسی کی حالت میں پڑی روٹی کے دو ٹکڑوں کا سوال کر رہی ہے۔ قدم وہیں ٹھٹک گئے اور اُس کی حالت زار پر ایک نگاہ ڈالی۔ بھکارن ادھیڑ عمر اور بھاری بدن کی عورت تھی، رنگ کوئلا کا سا کالا، سر گھٹا ہوا، چھاتیاں ڈھلی ہوئی، ایک ہاتھ پر سوجن تھی لیکن جھریاں پڑی تھیں، اُنگلیاں آدھے سے زیادہ کٹ کر گر گئی تھیں۔ اُنگلیوں اور ہاتھ پر سپید داغ تھے۔ دوسرے ہاتھ کی بھی کم وبیش یہی کیفیت تھی، گو اُس کی اُنگلیاں ثابت معلوم ہوتی تھیں لیکن پوریں اور ناخن اس کے بھی گھس گئے تھے۔ ایک ٹانگ صحیح و سالم تھی دوسری اس طرح سوجی ہوئی جیسے فیل پا، پنڈلی اور جانگ پر بڑے بڑے زخم تھے اور کوڑھ ٹپکتا تھا تمام بدن پر تیل کی مالش کی ہوئی تھی۔ لیکن زمین پر پڑے پڑے آدھے جسم پر دھول جم گئی تھی جس نے سیاہی کی چمک کو دھندلا کر دیا تھا تاہم اسکے زخم تیل کی مالش اور بہے ہونے کی وجہ سے اس طرح چمک رہے تھے کہ جیسے چولھے یا بھٹی میں انگارے دہکتے ہوں سارا بدن ننگا تھا۔ صرف کمر اور کولھوں کے گرد ایک سڑے سے ٹاٹ کا میلا کچیلا چیتھڑا لپٹا ہوا تھا اور اس پر سوت کی ایک ڈوری کسی ہوئی تھی۔ ہاں سر پر ایک کنٹوپ بھی تھا جو کمر کے چیتھڑے سے کم میلا کچیلا نہ تھا، خدا کی مارسے ترائی ہوئی آنکھیں نیم باز تھیں۔ ہر دو منٹ بعد آدھے دھڑ کو اُٹھاتی، ہاتھوں سے زمین ٹٹولتی دو ٹکڑے روٹی کا سوال نہایت دردناک لہجہ میں کرتی اور پھر کراہتی ہوئی مردہ ہو کر زمین پر پڑ جاتی۔ وکیل صاحب کو اس کی یہ حالت دیکھکر دل پر چوٹ لگی اور ترس آیا۔ بولے

وکیل صاحب ۔ لے مائی (پیسہ سامنے ڈال کر) یہ پیسہ لے۔

بھکارن ۔ (زمین ٹٹول کر اور پیسہ اُٹھا کر) لا بابا! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔ اس اندھی اپاہج کا دو ٹکڑے روٹی کا سوال ہے۔ اللہ جانتا ہے دو روز سے ایک دانہ بھی اناج کا جو منھ میں گیا ہو۔

وکیل صاحب ۔ اچھا یہیں بیٹھی رہ ۔ روٹی بھی ملجائے گی۔

بھکارن ۔ جُگ جُگ جیو بابا جُگ جُگ جیو۔ ایسے مائی کے لال کہاں جو اس اندھی اپاہج کو دو ٹکڑے روٹی دیں اللہ تمھارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب ۔ یہیں بیٹھی رہنا، روٹی ابھی آتی ہے (یہ کہکر وکیل صاحب نان بائی کی دوکان کی طرف بڑھ گئے)

بھکارن ۔ اچھا، بابا بیٹھی ہوں (یہ کہکر بھکارن پھر اپنے دو ٹکڑوں روٹی کی صدا لگانے لگی) پانچ ہی منٹ بعد وکیل صاحب ایک پیالے میں شوربا اور چار چپاتیاں ہاتھ میں لئے آئے۔

وکیل صاحب ۔ لے مائی، روٹی لے کھالے۔

بھکارن ۔ لاؤ بابا، لاؤ۔ بھوکی کی آتما تمھیں دعا دے گی۔ اللہ تمھارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب نے چپاتیاں اور شوربے کا پیالا بھکارن کے سامنے رکھدیا اُس نے ہاتھ سے ٹٹولا اور چپ لگائے

بیٹھی رہی۔ وکیل صاحب نے کہا مائی کھالے اب کیا سوچتی ہے۔ بھکارن بولی کہ "بابا یہ روٹیاں ان انگلیوں سے ٹوٹیں گی نہیں ٹکڑے کر دو تو اُٹھا کر کھالوں گی"۔ وکیل صاحب نے روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے کر دے۔ تب وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگی۔ وکیل صاحب کچھ سوچ میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ برابر ہی سوداگری کی ایک دوکان تھی۔ دوکاندار ایک سیٹھ جی تھے جو وکیل صاحب کے جان پہچان اور موکل بھی تھے وہ یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے بولے "وکیل صاحب کھڑے کب تک رہئے گا۔ آیئے بیٹھ جایئے۔ مجھے حکم دیجئے کیا چاہتے ہیں"

وکیل صاحب ۔ اہا سیٹھ جی۔ بندگی، معاف کیجئے گا میں نے آپ کی طرف دھیان نہیں کیا، ہاں بیٹھا جاتا ہوں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بھکارن کو ایک کلھڑ میں پانی بھی لا دیتا۔

سیٹھ جی ۔ آپ بیٹھیں آپ نہ تکلیف کریں۔ پانی میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔ جگو جگو ارے چل۔ بازار سے ایک بدھنا لے کر ٹھنڈا پینے کا پانی لے آ۔ (نوکر پانی لینے گیا اور سیٹھ جی اور وکیل صاحب میں باتیں ہونے لگیں)

وکیل صاحب ۔ کہئے سیٹھ جی مزاج تو اچھا ہے۔

سیٹھ جی ۔ دیا ہے آپ کی مہاراج۔ بال بچے تو سب اچھے ہیں۔

وکیل صاحب ۔ شکر ہے۔ سب خیریت ہے۔ اور کہئے سب کاروبار اچھا چلا جاتا ہے۔

سیٹھ جی ۔ ہاں چلا ہی جاتا ہے۔ مہاراج۔ زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے غنیمت ہے بہت غنیمت ہے۔۔۔۔۔

وکیل صاحب پھر وہ زمین کا معاملہ ویسا ہی کا ویسا رہ گیا آپ نے کچھ دھیان نہیں دیا۔

وکیل صاحب ۔ ارے بھائی، اونے پونے مل جل کر طے کر لو، عدالت میں جانے سے کس کا بھلا ہوگا۔

سیٹھ جی ۔ اجی تو فریق ثانی بھی مانے۔ اب تو عدالت جائے بغیر کام چلتا نہیں۔ نالش دائر کر دیجئے۔

وکیل صاحب ۔ آپ کی مرضی۔ تو صبح کاغذات لے کر آیئے گا۔ بات چیت ہو جائے گی۔

سیٹھ جی ۔ جو حکم۔

جگو ۔ پانی لے آیا حضور۔

وکیل صاحب ۔ اس بھکارن کے سامنے رکھ دو (بھکارن سے مخاطب ہو کر) کیوں مائی پیٹ بھرا۔ یہ لو پانی رکھا ہے پی لو۔

بھکارن ۔ (پانی اُٹھا کر) ہاں بابا۔ پیٹ بھر گیا۔ میری آتما دعا دیتی ہے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ اندھی لولی کی خبر لی۔ جگ جگ جیو، اللہ بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب ۔ تمہارے ان زخموں میں درد بھی ہوتا ہے۔

بھکارن ۔ ہاں۔ بابا۔ ٹیستے رہتے ہیں۔ تڑختے رہتے ہیں۔

وکیل صاحب ۔ تو تم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں۔ وہاں علاج ہو جائے گا، ہم تمھیں اسپتال پہونچا دیں؟
بھکارن ۔ ارے بابا۔ اس کا علاج تو اب اللہ ہی کرے گا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسپتال میں کب تک پڑی رہونگی۔
سیٹھ جی ۔ اجی یہ کبھی نہیں جانے والی اسپتال کو تو یہ لوگ جیل سمجھتے ہیں۔
وکیل صاحب ۔ (بھکارن سے) اچھا تو ہم تمھیں دوا دیں، دوا کرو گی؟
بھکارن ۔ ہاں، بابا کر لوں گی۔ پر دوا سے کچھ ہوتا نہیں۔
وکیل صاحب ۔ (سیٹھ جی سے) میرے پاس ایک بوٹی ہے۔ آزمائی ہوئی۔ دو تین آدمیوں کو فایدہ ہوا ہے کمال کی دوا ہے۔
سیٹھ جی ۔ ہاں مہاراج آپ تو ساتوں و دیا ندھان ہو۔ ایسے غریب پرور لوگ اب کہاں
وکیل صاحب ۔ واہ سیٹھ جی۔ آپ تو شاعری کرنے لگے۔ اچھا تو اب چلدئے میں اس کے لئے کل دوا لا دونگا اگر مجھے ذرا دیر ہو تو اسے ٹھراے رکھئے کا چلی نہ جائے۔
سیٹھ جی ۔ آپ اطمینان رکھئے۔ اُس کی چار چھ آنے روز کی شام کو یہاں سے آمدنی ہوتی ہے۔ چھوڑ کر کہاں جائیگی

دوسرے روز شام کو وکیل صاحب حسب وعدہ سیٹھ جی کی دوکان پر پھر آئے اور نوکر کے ہاتھوں کھانا پانی دوا سب ساتھ لیتے آئے۔ بھکارن بھی حسب معمول وہیں پڑی اپنے دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی تھی۔ وکیل صاحب نے پہلے تو اُسے کھانا کھلوایا۔ پانی پلوایا۔ پھر وہیں دوکان کے آگے والے برآمدے کے پتھر کے فرش پر اطمینان سے بیٹھ کر اس کوڑھی بھکارن کے زخم اور ٹانگ گرم پانی سے دھوئی۔ جڑی بوٹی کی کوئی لیپ سا جو لائے تھے وہ خود ہاتھوں سے اُس کے زخموں پر لگائی۔ بھکارن نے سیکڑوں دعائیں دیں اور پھر تھوڑی دیر اطمینان سے چپ لگائے پڑی رہی وکیل صاحب سیٹھ جی کی دوکان پر بیٹھ کر صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگے۔

سیٹھ جی ۔ دھن ہے مہاراج دھن ہے۔ اب ایسے راج رشی کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔
وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی آپ پھر وہی کل کی سی شاعری کرنے لگے۔ پانچ منٹ دوکان پر بیٹھنے دیجئے گا یا نہیں
سیٹھ جی ۔ مہاراج آپ خوشامد سمجھتے ہیں مگر میں تو سچ کہتا ہوں کہ ہم تے تو ایسے سخی داتا اور دیالو دیکھے نہیں۔
وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ ہر شخص اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔
سیٹھ جی ۔ پر ایک بات ہے وکیل صاحب۔ راہ چلتے ایسے بھکاری اور بیراگیوں کو پیسہ دینا کہ جنھوں نے بھیک مانگنا ہی اپنا پیشہ کر لیا ہے۔ ہمیں تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس میں تو بڑی دھوکا دھڑی ہوتی ہے۔ میں اس لولی اپاہج کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ پر آپ تو راہ چلتے سدا برت بانٹتے ہیں۔ پھر اب آج کل کے زمانہ میں تو یتیم خانے، محتاج خانے، کوڑھی خانے سب ہی قایم ہو گئے ہیں۔ ہماری رائے میں تو جو خیرات کرنی ہو

انہیں کے ذریعہ سے کرے۔

وکیل صاحب ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے چندہ میں بھی دیتا رہتا ہوں پر سیٹھ جی اُس سے تسکین نہیں ہوتی۔ اول تو دولت کا نشہ آدمی کو ویسے ہی بہت رہتا ہے پھر جب دروازے پر لوگ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اور ہاتھ اُٹھا کر دینے کی عادت پڑ جاتی ہے تو آدمی کا گھمنڈ اور بڑھ جاتا ہے لیکن اگر آپ دُکھ درد اور دلدر کی دنیا میں جائے اور اس سے دو چار ہوئیے تو گردن جھک جاتی ہے اور ایشور یاد آتا ہے پھر اگر اپنے سے کچھ خدمت بن پڑے تو دل کو بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔

سیٹھ جی ۔ مہاراج بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، یہ تو ہمارے کچھ سمجھ میں آتا نہیں، پر یہ آپ کے صابن سے ہاتھ دھونے سے ہماری بھی تسکین نہیں ہوتی۔ میں لائسول (ایک دوا کا نام ہے) کی شیشی کھولے دیتا ہوں مہربانی کرکے اُس سے ہاتھ دھو ڈالیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے، اگر کہیں لگ لگا گئی تو غضب ہو جائے گا۔

وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی کیا وہم کی باتیں کرتے ہو۔ ان ڈھکوسلوں سے کیا ہوتا ہے۔ صابن سے ہاتھ دھو لئے، کافی ہے۔ اچھا اب چلد ئے۔ دیکھئے گاہک آئے ہیں، اُن کی سنئے ان باتوں میں خواہ مخواہ نقصان ہوگا۔

یہ کہکر وکیل صاحب چلد ئے۔

چار پانچ روز بعد سیٹھ جی اپنے مقدمہ کی ضرورت اور عدالت کے کام سے وکیل صاحب کے دفتر میں صبح حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے توجہ کرکے اُس کا کام آدھ گھنٹے میں نبٹا دیا، سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔ لیکن ابھی دروازے تک پہونچے نہیں تھے کہ کچھ یاد آیا واپس ہوئے اور بولے:۔

سیٹھ جی ۔ یہ لیجئے وکیل صاحب میں بھول ہی گیا تھا آپ کو ایک ضروری خبر سنانی تھی۔ وہ آپ کی مریض بیچاری کوڑھی بھکارن کل رات گزر گئی۔

وکیل ۔ ہیں کیا ہوا۔ بیچاری مر گئی!

سیٹھ جی ۔ ہاں آپ کے یہاں آتے ہوئے میں پہلے دوکان چلا گیا تھا تو وہاں دیکھا کہ وہ بیچاری مری پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو سردی کھا گئی، یا فالج گر گیا معلوم نہیں کیا ہوا۔ جہاں وہ پڑی ہے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا کھڑا رو رہا تھا اور ایک اور فقیر بھی تھا اُسی کے محلہ کا۔ جب رات کو بہت دیر ہو گئی اور وہ اپنی جھونپڑی میں نہیں پہونچی تو اُس کا یہ نواسہ اور وہ آدمی اُسے دیکھنے نکلے۔ یہاں اُسے مردہ پڑا پایا۔

وکیل صاحب ۔ اچھا ہوا بیچاری عذاب سے چھوٹی۔

سیٹھ جی ۔ اُن کے محلے کا فقیر جو اُس کے پاس کھڑا تھا جنگی کے جمعدار سے کہہ رہا تھا کہ اُس کو اُٹھوا کر کہیں پھکوا دو تو میں نے کہا ایسا مت کرو، اس کے کفن اور مٹی دینے کا کچھ نہ کچھ انتظام کو دیا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ آپ سے کہدوں

وکیل صاحب ۔ ضرور ضرور۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھسے کہدیا (جیب سے روپیہ نکال کر) یہ لیجئے چار روپیہ تو جیب میں پڑے ہیں۔ لیتے جایئے۔ اگر اور ضرورت ہوگی تو پھر دیدوں گا۔

سیٹھ جی ۔ پانچ سات روپیہ میں سب کام ہو جائے گا۔ دو روپیہ میں دیدوں گا۔ ہمارے برابر میں شیخ جی کی دوکان ہے کچھ وہ دیدیں گے، ہو ہی جائے گا۔

وکیل صاحب ۔ تو پھر تکلیف کرکے آپ اس کا کچھ انتظام کرائیے۔ میں بھی کچہری جاتے ہوئے اُدھر سے ہوتا جاؤں گا۔

وکیل صاحب کچہری جاتے ہوئے جب سیٹھ جی کی دوکان پر پہونچے تو دیکھا کہ اُس بھکارن پر ایک ٹاٹ کسی نے ڈالدیا ہے۔ ایک لڑکا اُس کے برابر بیٹھا ہوا رو رہا ہے اور دوسرا فقیر بھی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ شیخ جی اور دو ایک اور دوکانداروں نے چندہ کرکے دس روپیہ کی سبیل کرلی ہے اور بھکارن کے مٹی دینے کا انتظام اُسی فقیر کے ذریعہ سے کرایا جا رہا ہے۔ وکیل صاحب کا اطمینان ہوگیا اور وہ کچہری چلے گئے۔

پانچ سات روز بعد ایک دن شام کو وکیل صاحب پھر بازار سے گزر رہے تھے۔ جب سیٹھ جی کی دوکان کے قریب پہونچے تو سیٹھ جی نے دور ہی سے بڑے تپاک سے سلام کیا اور بولے۔

سیٹھ جی ۔ وکیل صاحب، ذرا ادھر تشریف لائیگا آپ سے ایک بات کہنی ہے۔

وکیل صاحب ۔ کہئے کیا بات ہے؟

سیٹھ جی ۔ اجی بڑے مزے کی خبر آپ کو سنانی ہے۔ آپ سنکر بڑے خوش ہوں گے وہ کوڑھی بھکارن جو مرگئی تھی اور جس کے مٹی دینے کے لئے ہم نے اور آپ نے چندہ کیا تھا وہ پھر جی گئی۔

وکیل صاحب ۔ جی گئی کیا معنی؟

سیٹھ جی ۔ (ہنسکر) اجی وہ جیتی جاگتی، اچھی خاصی، چلتی پھرتی موجود ہے۔

وکیل صاحب ۔ کیا باتیں کرتے ہو، سیٹھ جی، کچھ دھوکا ہوا ہوگا۔

سیٹھ جی ۔ دھوکا تو ہوا ہی مہاراج اور دھوکا بھی کیسا دھوکا۔

وکیل صاحب ۔ واقعی؟ تم سے کس نے کہا؟ کس نے دیکھا؟

سیٹھ جی ۔ اجی، میرا شوفر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہے۔ وہ اُسی کے محلہ میں رہتی ہے۔ اب اُس نے ادھر کا آنا جانا چھوڑ دیا اب صدر ہی کی طرف دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگاتی ہے۔

وکیل صاحب ۔ میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں۔

سیٹھ جی ۔ وہ دیکھئے موٹر آگیا۔ ابھی اپنے شوفر سے آپ کو سب حال سنوائے دیتا ہوں (موٹر آکر کھڑا ہوا)۔ اے میاں رمضان، ذرا وکیل صاحب کو اُس بھکارن کا حال تو سنادو۔

شوفر - حضور میں اُسے یہاں پڑا دیکھا کرتا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ مر گئی۔ لیکن تیسرے ہی دن دیکھتا کیا ہوں کہ صدر بازار میں سڑک پر پڑی دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ دھوکا ہوا۔ پھر قریب سے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی ہے۔ وہیں بستی ہی میں رہتی ہے۔ اُس کا تو بڑا کارخانہ ہے۔ ایک نان بائی کی دوکان ہے۔ ایک کباڑ خانہ ہے۔ کئی نوکر چاکر ہیں، نصیبن نام ہے۔ آس پاس کے لوگ سب جانتے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم ہو کر بڑا تعجب ہوا تو میں نے سیٹھ جی سے آکر کہا۔

وکیل صاحب - تم ہمیں وہاں لیجا کر اُسے دکھا سکتے ہو۔

شوفر - ضرور، ابھی چلیں حضور۔

وکیل صاحب - کیوں بھئی سیٹھ جی چلو ذرا دیکھ آئیں۔ موٹر تو ہے ہی دس منٹ لگیں گے۔ چلتے ہو۔

سیٹھ جی - چلئے، ابھی چلئے۔

وکیل صاحب - تمھاری دوکان کا کچھ حرج تو نہیں ہوگا

سیٹھ جی - نہیں حرج کیا ہوگا، لڑکا موجود ہے۔ چلئے سوار ہوئیے۔

سیٹھ جی اور وکیل صاحب موٹر پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ صدر بازار پہونچے تو موٹر نان بائی کی دوکان پر جا کر ٹھہری۔ دوکان پر ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ کچھ لنگڑے، لولے، فقیر، بھکاری تو دوکان کے اندر بیٹھے شوربا چپاتی کھا رہے ہیں اور کچھ دوکان کے سامنے بھیک لگائے کھڑے ہیں۔ کئی آدمی دوکان میں کام کر رہے ہیں۔ کوئی آٹا گوندھ رہا ہے۔ کوئی روٹی بنا رہا ہے۔ کوئی گاہکوں کو کھلا رہا ہے۔ کوئی پیسے لیتا جاتا اور شوربا چپاتی دیتا جاتا ہے۔ پھر آگے چلکر گلی میں دوکان کے پیچھے ایک بڑے پرانے ٹوٹے پھوٹے کچے پکے مکان میں پہونچے جس میں کئی ایک تنگ و تاریک کوٹھریاں اور کمرے تھے۔ کئی دالان تھے اور صحن بہت وسیع تھا۔ کوٹھریوں میں دال، آٹے اور مسالے کی بوریاں چنی ہوئی لگی تھیں۔ کمرے کنستر الگ رکھے تھے۔ ہر طرح اور وضع کے پرانے کپڑے، ٹوپیاں، جوتے، لحاف، کمل گدے، لکڑیاں، لاٹھیاں وغیرہ سب ہی کباڑ خانہ جمع تھا۔ ایک تخت پر بی نصیبن یعنی وہی کوڑھی بھکارن بڑے رعب داب سے بیٹھی تھی۔ اُس کا بدن اسوقت نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ ایک سپید چادر تمام بدن پر لپیٹے ہوئے تھی، آنکھیں کھلی اور چمک رہی تھیں۔ جو لوگ مکان میں چل پھر رہے تھے اُن کو تحکمانہ لہجہ میں ہدایتیں کر رہی تھی، وکیل صاحب کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ بلا ارادہ اُٹھ گیا اور بولی -

بھکارن - وکیل صاحب سلام

وکیل صاحب - کہو بی نصیبن۔ تم تو مر گئیں تھیں پھر جی اُٹھیں -

بھکارن - وکیل صاحب۔ اللہ ہی مارتا ہے اللہ ہی جلاتا ہے۔ اُس کا عجب کارخانہ ہے -

وکیل صاحب ۔ مگر تم نے تو حد کر دی۔ ڈھو کا دھڑی بھی تو کیسی۔
بھکارن ۔ بابا پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ اور دنیا کا چلن ہے، تم بھی وہی کرتے ہو میں بھی وہی کرتے ہوں، تم کچہری اور عدالت میں سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کر کے دکھاتے ہو، میں کوچہ و بازار میں بازی گری کرتی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمھارا کارخانہ بڑا اور اُجلا ہے، میری دوکانداری نیچ اور میلی کچیلی ہے ورنہ مکاری تو ہم سب کا چلن ہے۔ دنیا کا چلن ہے۔ پیٹ بڑا مکار بابا! پیٹ بڑا مکار!
وکیل صاحب ۔ بی نصیبن وکالت کا روپیہ بڑی گاڑھی کمائی کا روپیہ ہوتا ہے۔ بڑی دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، تب چار ٹکے ملتے ہیں۔
بھکارن ۔ تو بابا ہمیں کیا مُفت میں ملجاتا ہے۔ جلتے تپتے جیٹھ کی دھوپ اور لُو لگتی ہے۔ جلتی زمین پر پڑے رہتے ہیں۔ برسات میں پانی کیچڑ میں بھیگتے اور جاڑے میں ننگے بدن ٹھٹھرتے ہیں۔ دن بھر چیختے چیختے گلا لگ جاتا اور زبان تھک جاتی ہے۔ تب کہیں چار پیسے پیدا کرتے اور دو ٹکڑے روٹی کے نصیب ہوتے ہیں۔ اوپر سے تم جھوٹا اور مکار بتاتے ہو۔ نہ تم مکار نہ ہم مکار۔ بس پیٹ بڑا مکار! بابا! پیٹ بڑا مکار۔ وکیل صاحب نے یہ سب کچھ سنا۔ لمحہ بھر کے لئے اُن کی گردن جُھک گئی اور چُپ رہگئے۔ پھر بولے:۔

"تو تمھارا تو یہ سب اتنا بڑا کارخانہ ہے تم یہ ڈھونگ کیوں رچتی ہو؟"

بھکارن ۔ بلا مشقت کئے بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنی حرام ہے اور بابا یہ سب کارخانہ میرا تھوڑی ہے یہ تو بھائی بندوں کا ہے۔ مجھسے چلائے جانے کو کہتے ہیں، میں چلائے جاتی ہوں اس میں سب کا بھلا ہوتا ہے، اللہ میرا بھی بھلا کرے گا۔ یہ سمجھو کہ سیکڑوں لولے، اپاہج، ننگے بھوکے، اندھے دھوندے روز یہاں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ دونوں وقت پیٹ بھر شوربا چپاتی اور صبح چائے اور کلچے اور یہ سب پانچ پیسے میں۔ وکیل صاحب بازار میں تین چار آنہ سے کم میں پیٹ بھرنا مشکل ہے یہاں آدھے داموں میں کام چلتا ہے۔ اسی طرح کپڑا لتّا مل جاتا ہے۔
وکیل صاحب ۔ بہت سے ایسے بھی آتے ہوں گے جو پورے دام دیسکتے ہیں لیکن آدھے داموں لیجاتے ہیں۔
بھکارن ۔ ہاں۔ شاید۔ سو یہ کہاں نہیں ہوتا۔ تمھارے بھنڈاروں، آشرموں، اور یتیم خانوں میں کیا نہیں ہوتا وکیل صاحب، یہ دنیا فرشتوں کی نہیں آدمیوں کی ہے۔ آدمی کچھ بنا ہی ایسا ہے کہ گناہ کرنا اور پھر توبہ کرنا۔ توبہ کرکے پھر گناہ کرنا اور گناہ کرکے پھر اپنے دامن کے داغوں اور دھبوں کو دھونے کی کوشش کرنا جو یہ نہیں کرتا اُس کی حالت البتہ افسوس کے قابل ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ ہم اور آپ کچھ خدائی فوجدار تو ہیں نہیں کہ خدا کی خدائی کو بھی نکلا نہ بیٹھنے دیں۔ رہا جھوٹ اور فریب تو بابا میں تو پہلے ہی کہہ چکی کہ پیٹ بڑا مکار! بابا پیٹ بڑا مکار!

وکیل صاحب - سچ کہتی ہو بی نصیبن!

بھکارن - وکیل صاحب آپ نے جو اُس دن دوا لگادی تھی اُس سے فایدہ معلوم ہوتا ہے، اگر اور دیدو، لگالوں گی، بھلا ہوگا۔

وکیل صاحب - تو کسی کو ہمارے گھر بھیجدینا، دوا بھیجدیں گے۔ اچھا جاتے ہیں۔

بھکارن - اللہ بھلا کرے گا۔ وکیل صاحب آئے ہو تو کچھ غریب غربا کو دیتے بھی جاؤ۔

وکیل صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپئے نکال کر بی نصیبن کے ہاتھ رکھے۔

بھکارن - جُگ جُگ جیو، بابا، جُگ جُگ جیو۔ ایسے سخی داتا نہیں دیکھے۔ اللہ بھلا کریگا بابا، اللہ بھلا کریگا۔

جب وکیل صاحب چلنے لگے تو سیٹھ جی جو سب باتیں کھڑے سن رہے تھے اور یہ تماشہ دیکھ رہے تھے حیرت زدہ ہو کر بولے:-

"آخر سیدھے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، وکیل صاحب۔ آپ تو اندھیر کرتے ہیں۔"

وکیل - بھائی تم سمجھے نہیں۔ یہ اس سے کہیں زیادہ کی مستحق ہے۔ میرے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں!

کشن پرشاد کول

عربوں کی سیاسی بیداری

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک

عربوں کی قومی تحریک و سیاسی بیداری کے متعلق اردو کیا انگریزی میں بھی کوئی مستقل تالیف نہیں ملتی۔ اس کا ایک سبب تو مغربی سیاست کی مصلحت اندیشی ہے اور دوسرے یہ کہ ان ذرائع تک دسترس بھی مشکل ہے، جن سے اس تحریک کی صحیح تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

عربی لٹریچر میں جو کچھ موجود تھا اس کا بڑا حصہ تو ضائع کر دیا گیا اور کچھ حصہ ان لیڈروں کے خاندانوں کے پاس محفوظ چلا آ رہا ہے جنھوں نے اس سیاسی انقلاب میں کام کیا تھا۔

جارج انطانی ایک شامی عیسائی کو اتفاق سے برسوں کی محنت و کاوش کے بعد یہ پوشیدہ کاغذات ہاتھ آئے اور اس نے ایک مستقل تصنیف اس موضوع پر پیش کی جس کا نام "بیداری عرب" The Arab Awakening ہے۔ یہ سلسلۂ مضامین اس کتاب سے اخذ و اقتباس کا نتیجہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلا حصہ جو اس اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے ان حالات و واقعات پر مشتمل ہے جو سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک عربستان میں ظاہر ہوئے۔ دوسرے حصہ میں دوران جنگ کی عرب سیاست سے بحث کی جائے گی اور تیسرا حصہ جو نہایت اہم حصہ ہے "عرب سیاست بعد از جنگ" سے متعلق ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ سلسلۂ مضامین جو اردو میں بالکل نئی چیز ہے، دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا، کیونکہ جب تک خود ہمیں عربوں کی سیاست کا تدریجی ارتقاء نہ معلوم ہو، ہم مشرق ادنیٰ کی سیاسی پیچیدگیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ نیاز

---

(۱)

عربوں کی قومی تحریک مصریوں کے دور اقتدار کے ساتھ شروع ہوتی ہے یا ان کے نکلنے کے بعد؟ اس کا فیصلہ ذرا دشوار ہے۔ یوں تو ایک تحریک مصریوں کی آمد سے پہلے ہی ملک میں شروع ہو چکی تھی جس نے بہت جلد منظم عسکری صورت اختیار کر لی تھی اور عرب صوبوں میں بڑی حد تک سلطان کی خلافت کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ یہ تھی وہابی تحریک لیکن یہ کوئی سیاسی چیز نہ تھی بلکہ خالص مذہبی تھی۔ اس تحریک کا سر کچلنے کے لئے سلطان نے محمد علی پاشا والی مصر کو سنہ ۱۸۱۱ء میں مجبور کیا۔ محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی اور کئی سال کی کوششوں کے بعد محمد علی کو کامیابی نصیب ہوئی۔

سلطان نے ۱۷۹۹ء میں ایک فوج نپولین کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مرتب کی تھی اور محمد علی کو بھی اس فوج کا ایک افسر مقرر کیا تھا۔ نپولین نے اس فوج کو تو بآسانی پسپا کر دیا، لیکن اس شکست نے محمد علی کی ترقی کے لئے دروازے کھولدیئے۔ دو سال کے بعد جب فرانسیسی فوجوں نے مصر خالی کیا تو محمد علی وہاں پوری فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس موقعہ سے اُس نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور خوب خوب سیاسی و عسکری جوہر دکھلائے۔ ۱۸۰۵ء میں وہ مصر کا فوجی بادشاہ بن بیٹھا۔ وہابی تحریک کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُس کے ذہن میں 'عرب حکومت' کے قیام کا تصور پیدا ہوا۔ شام پر تسلط ہو جانے کے بعد اُس نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کی۔ اس کے بھی بہت کافی شواہد موجود ہیں کہ محمد علی خلافت کا بھی خواب دیکھ رہا تھا۔

'عرب حکومت' کی تحریک کے سلسلہ میں محمد علی اور ابراہیم پاشا کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ عرب نہ تھے۔ ابراہیم پاشا نے تو کچھ عربی سیکھ بھی لی تھی مگر محمد علی عربی زبان سے بالکل ناآشنا تھا۔ باپ بیٹے کے دماغ میں مستقبل کی حکومت کا یکساں تخیل نہ تھا۔ اس خیال سے تو دونوں متفق تھے کہ تمام عرب صوبوں کی ایک متحدہ حکومت بنائی جائے اور وہاں اُن کے خاندان کی حکومت ہو لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خواب اُسوقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک عربوں میں عملی طور پر اُن کے ساتھ ہمدردی نہ پیدا ہو۔ محمد علی عربوں سے قطعًا مانوس نہ تھا۔ وہ عربی بولنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ برخلاف اس کے ابراہیم کو اس کا پورا احساس تھا کہ اگر اُس کے باپ کی حکومت کی بنیادیں عرب قوم کی تجدید کے خیال پر استوار ہوں تو پائیدار ہوں گی۔ چنانچہ ابراہیم نے اپنی گورنری کے ابتدائی دو سال میں پوری طرح عرب قومیت کے خیالات کی تبلیغ شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا۔

لیکن ابراہیم پاشا کی حکومت کا یہ دور زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا۔ مشرقی ایشیا میں ابراہیم پاشا کے بڑھتے ہوئے وقار نے ایک طرف یورپ کی طاقتوں کو اور دوسری طرف سلطان کو خایف کر دیا۔ انھیں حالات نے محمد علی کو فوجی طاقت بڑھانے پر مجبور کیا۔ ابراہیم پاشا بھی اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور تھا۔ اُس نے جبریہ فوجی بھرتی شروع کی اور ملک پر طرح طرح کے نئے ٹیکس لگائے، جس کی وجہ سے ایک طرف اُس نے اپنی ہر دلعزیزی کھوئی اور دوسری طرف لوگوں کے دلوں میں اُس کی حکومت کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال بعد جب ابراہیم نکالا گیا تو اُس کا ایک بھی خیر خواہ یا ہمدرد وہاں نہ تھا۔

یوں تو محمد علی کی ناکامی کے بہت سے اسباب تھے مگر اصل سبب پامرسٹون کی مخالفت تھی۔ پامرسٹون اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۳۳ء میں لکھتے ہیں:

> "اُس (محمد علی) کا مقصد تمام عربی بولنے والی قوموں کی ایک متحدہ حکومت کا قیام ہے۔ یوں تو اس میں کوئی ایسی خرابی نہیں، مگر ترکوں کا اقتدار اس سے عرب میں ختم ہو جائیگا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں کیونکہ ہندوستان کے راستے کا بہترین محافظ ترک ہے"

ابراہیم پاشا کی رواداری نہ دورِ حکومت نے عیسائی مبلغین کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی اور امریکی مبلغین کے ادارے قابل ذکر ہیں، جو آگے چلکر قومی تحریک کا گہوارہ بننے والے تھے۔ ملک کی تعلیمی اور ادبی ترقی انھیں کی مرہون منت ہے۔ ۱۸۳۴ء میں چار قابل ذکر باتیں ہوئیں اول تو بیروت میں ایک کالج کھولا گیا جسنے آگے چل کر بہت بڑی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرے امریکی مبلغین نے اپنا پریس مالٹا سے بیروت منتقل کیا۔ تیسرے مسٹر ایلی اسمتھ اور اُن کی بیوی نے لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا۔ چوتھے خود ابراہیم پاشا نے لڑکوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ کھولے۔ ابراہیم پاشا کی اسکیم تو زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی اور مصریوں کے اخراج کے ساتھ وہ اسکیم بھی ختم ہوگئی مگر اُس نے ملک میں عمومًا اور مسلمانوں میں خصوصًا انقلاب پیدا کر دیا۔

(۲)

۱۸۴۰ء میں مصریوں کے اخراج کے وقت ملک کی جو سیاسی حالت تھی اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ملک میں ہر طرف بے اطمینانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ابراہیم پاشا نے عیسائیوں کے ساتھ جو غیر معمولی مراعتیں کی تھیں، مسلمانوں دروزی مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت منافرت پیدا کر دی تھی۔ جس سے یورپ کی تمام طاقتوں نے خاص کر انگلستان نے پورا فایدہ اٹھایا۔

۱۸۴۱ء میں سلطان نے ان حالات کے پیش نظر انتظامی امور میں تبدیلیاں کیں۔ لبنان کو دو اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ ایک میں عیسائیوں اور دوسرے میں دروزیوں کی آبادی تھی۔ مگر اس تقسیم نے صورت حالات کو بد سے بدتر بنا دیا دوسری طرف فرانس اور انگلستان لبنان میں اپنا اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس چیز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ فرانس نے عیسائیوں کی اور انگلستان نے دروزیوں کی پشت پناہی شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں فساد ہوا اور دونوں نے خوب داد بہیمیت دی۔

اس کے بعد یورپ کی قوتوں نے فلسطین کا رخ کیا جہاں اُس وقت مختلف عیسائی فرقوں میں مقامات مقدسہ کے تحفظ کا اعزاز حاصل کرنے کے سلسلہ میں کشمکش جاری تھی۔ یہاں بھی یورپی طاقتوں نے اپنی عیارانہ سیاست کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جس کا نتیجہ آگے چل کر جنگ کریمیا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر سلطان نے اپنی عیسائی رعایا کو بہت کافی حقوق عطا کئے۔

یوں تو ملک میں امن و امان قایم ہو گیا مگر اب بھی دو طاقتیں ایسی موجود تھیں جن سے ہر وقت خانہ جنگی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ایک تو عیسائی کسانوں کی جماعت تھی جو جاگیردارانہ نظام سے عاجز آ چکی تھی اور اپنی گردن سے غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے مضطرب تھی۔ (یہ جاگیردار بھی عیسائی ہی تھے) دوسری طرف عیسائی پیشواؤں کا گروہ تھا جو اُن حقوق سے مطمئن نہ تھا جو سلطان نے عطا کئے تھے۔ ان دونوں گروہوں کے مفاد میں یوں تو کوئی چیز بھی جنس مشترک کا درجہ نہ رکھتی تھی مگر چونکہ دونوں کا مقابلہ ایک ہی حریف سے تھا اس لئے وہ متحد ہو گئے۔ مگر آگے چل کر ان مذہبی پیشواؤں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ان کو غلط راہ پر لگا دیا۔ جس وقت ۱۸۶۱ء میں کاشتکاروں اور جاگیرداروں کے درمیان لبنان میں فساد شروع ہوا تو ان مذہبی پیشواؤں نے اُس کا رُخ بدل کر اُس فساد کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا اور پھر تو اس فرقہ وارانہ فساد کی آگ لبنان سے دمشق تک پہونچ گئی جو شام کی تاریخ کا سب سے بڑا فرقہ وارانہ فساد تھا۔

فساد کے اختتام پر سلطان نے اپنے قابل وزیر فواد پاشا کو روانہ کیا۔ جنھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ اس موقعہ پر یورپ کی طاقتوں کے نمایندے بھی وہاں موجود تھے، ان لوگوں کے مشورہ سے لبنان کی حکومت کے لئے ایک نیا خاکہ تیار کیا گیا۔ شام کو دو حصوں میں تقسیم کر کے لبنان کو علٰحدہ کر دیا گیا۔ شام کا تعلق مرکزی حکومت سے ہو گیا اور لبنان کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنائی گئی اور وہاں کا گورنر ایک عیسائی مقرر کیا گیا۔ بین الاقوامی سیاست پر اس کا یہ اثر پڑا کہ یورپ کی قوتوں کو شام کی سیاست میں دخل اندازی کا موقعہ مل گیا جس سے وہ پورے پچاس سال تک فایدہ اُٹھاتے رہے۔ اس سے قطع نظر ۱۸۶۰ء کا حادثہ شام کی تاریخ میں اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے جس نے اہل ملک کے دماغوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور پورا احساس پیدا ہو گیا کہ ملک کی غلامی و اخلاقی پستی کا اصل سبب فرقہ وارانہ تعصب اور قومی جہالت ہے۔

اس دور میں دو قابل ذکر ہستیاں پیدا ہوئیں، ایک ناسف یازجی اور دوسرے بطرس بستانی۔ عربوں کی قومی اور ذہنی زندگی کی تشکیل میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ دونوں عیسائی تھے۔

ناسف یازجی ۱۸۰۰ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ گاؤں کے مکتبوں میں

میں اُن دنوں جو ناقص تعلیم رائج تھی اُن کو بھی ملی تحصیل علم کے شوق میں گھر سے باہر نکلے۔ خانقاہوں کے کتب خانوں میں جو قلمی کتابیں ملیں اُن کو پڑھا، اکثر کتابوں کی نقل بھی کی جو آج تک اُن کے گھرانے میں محفوظ ہیں۔

دو سال تک ایک خانقاہ کے سکریٹری رہے، پھر لبنان کے امیر بشیر کی ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں ابراہیم پاشا کے اخراج کے ساتھ امیر کو جلا وطن کیا گیا تو یہ بھی ملازمت سے برطرف ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد امریکی مبلغین نے اپنے شعبۂ تصنیف و تالیف کے لئے اُن کی خدمات حاصل کرلیں۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ عربی زبان سے ناسف یازجی کو عشق تھا اور اپنی پوری زندگی اسی زبان کی ترویج و اشاعت پر صرف کردی۔ اُن کا ایمان تھا کہ عربوں کی نجات کی واحد شکل یہی ہے کہ عربی زبان اور عربی تمدن کا احیاء ہو۔ ناسف یازجی مسلمانوں اور عیسائیوں کو مخاطب کرکے کہتے کہ عربی زبان تم دونوں کی مشترکہ وراثت ہے اور اسی چیز کو تم لوگ دائمی اتحاد کا سنگ بنیاد بناؤ۔

پطرس بستانی سنہ ۱۸۱۹ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا، اس لئے تعلیم بھی اُن کو بہتر قسم کی نصیب ہوئی۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی اُن کو سکھائی گئیں۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں بیروت آئے۔ یہاں مسٹر ایلی اسمتھ اور اُن کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد اُن کو استادوں کی ٹریننگ کے کالج میں جگہ مل گئی۔ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے پطرس بستانی نے بے حد مفید کتابیں تصنیف کیں۔ عربی زبان کا ایک لغت بھی انھوں نے مرتب کیا جو محیط المحیط کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے بعد میں اسی لغت کی ضخامت کم کرکے طلباء کے استعمال کے لئے قطر المحیط کے نام سے شایع کیا۔ عربی زبان کی انسائیکلوپیڈیا بھی پطرس بستانی نے مرتب کرنی شروع کی تھی جس کی چھ جلدیں اُن کے انتقال کے وقت تک شایع ہوئی تھیں۔

عربی زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار بھی پطرس بستانی نے نفیر سوریہ کے نام سے جاری کیا۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے قتل و غارت نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعصب اور نفرت کی خلیج بہت وسیع کردی تھی۔ اس اخبار کا مقصد اسی خلیج کا پر کرنا تھا۔ پطرس بستانی نے اسی تخیل کے پیش نظر ایک اسکول بھی نیشنل اسکول کے نام سے کھولا اور ایک پندرہ روزہ رسالہ بھی جاری کیا اس کا بھی مقصد تعصب کا ازالہ اور قومیت کے جذبہ کو بیدار کرنا تھا۔ اس رسالہ کے سرورق پر لکھا رہتا:

"حب الوطنی جزو ایمان ہے"

ناسف یازجی اور پطرس بستانی نے ایک ادبی انجمن بھی قایم کی جو صرف شام ہی میں نہیں بلکہ پورے عرب میں اپنی طرز کی پہلی انجمن تھی۔ اُس کی دیکھا دیکھی ملک میں اور بھی ادبی انجمنیں بنائی گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ اہم وہ انجمن تھی جو سنہ ۱۸۵۷ء میں بنائی گئی۔ اس کی دو خصوصیتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے تمام ممبر عرب تھے اور دوسرے یہ کہ اس کے ممبروں میں عیسائی و مسلمان سبھی شامل تھے۔ پہلی انجمن کے قیام کے وقت تو فرقہ وارانہ تعصب بہت تھا اسی وجہ سے مسلمان اُس انجمن سے علحدہ رہے لیکن رفتہ رفتہ تعصبات کی بندشیں ڈھیلی پڑتی گئیں۔ بالآخر مسلمانوں نے خود یہ تجویز پیش کی کہ اگر عیسائی مبلغین کا اثر اُس انجمن سے دور کردیا جائے تو وہ شرکت کریں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک سوسائٹی سیرین سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے قایم ہوئی۔ شام کی تاریخ میں عموماً اور [illegible] برس کے عثمانی دور میں خصوصاً کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں بنا تھا جس پر عیسائی اور مسلمان کسی مشترک مقصد کے لئے جمع ہوتے۔

(۴۲)

سیرین پروٹسٹنٹ کالج کے تعلیم یافتہ پانچ نوجوان خفیہ طور پر ایک جگہ جمع ہوئے۔ اور باضابطہ انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔

قصہ سلطان عبدالحمید کے دورِ خلافت کی ابتدا سے پورے ایک سال پیشتر کا ہے۔ اسی خفیہ انجمن نے پہلی بار منظم طریقے پر عربی قومی تحریک شروع کی۔ یہ سب کے سب عیسائی تھے مگر پہلے ہی دن ان لوگوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں اور دروزیوں کو بھی اس انجمن میں شامل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ملک کے بائیس اور روشن خیال اصحاب اس خفیہ جماعت میں شامل ہو گئے اب یہ قومی انجمن تھی جس میں مسلمان اور عیسائی سب شامل تھے۔ انھیں دنوں یورپی انداز کی فرمیسنری بھی شام میں نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ اس خفیہ انجمن نے اپنے ایک ممبر کی مدد سے اس نوزائیدہ فرمیسن لاج کو بھی اپنی تحریک کا ہمدرد بنا لیا۔

اس انجمن کا مرکز بیروت تھا اور اس کی شاخیں دمشق، طرابلس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس انجمن کا مطمح نظر واضح انداز میں انقلابی تھا۔ ابتدا میں تو یہ انجمن نشستند و گفتند و برخاستند کے آگے نہ بڑھ سکی، خفیہ جلسے ہوتے، ممبر آپس میں تبادلۂ خیال کرتے یا کچھ اسکیمیں مرتب کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ بالآخر کانا پھوسی کی سازشوں کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اب وسیع پیمانے پر کام شروع کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ موثر طریقہ ان لوگوں نے یہ سوچا کہ بڑے بڑے اشتہار ہاتھ سے لکھ کر شہر کی دیواروں پر چسپاں کئے جائیں۔ ترکی دورِ استبداد میں کوئی دوسرا موثر طریقہ ممکن بھی نہ تھا۔ ان نوجوان سازش کرنے والوں نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ اشتہار کا مضمون مرتب کرکے رات رات بھر وہ لوگ خط بگاڑ بگاڑ کر ان کی نقلیں کرتے اور رات کے آخری حصہ میں گوند کی شیشیاں جیب میں ڈال کر شہر کے مختلف حصوں میں جا کر جتنے اشتہارات چسپاں کر سکتے کرتے۔ صبح کے وقت ان اشتہارات کے گرد سیکڑوں انسانوں کا مجمع ہوتا۔ ایک شخص بہ آوازِ بلند اس کا مضمون مجمع کو پڑھ کر سناتا۔ یہاں تک کہ پولیس موقعہ پر آجاتی اور اشتہار کو نوچ کر دو چار بے قصور راہ چلتوں کو گرفتار کر لیتی۔ بیروت میں ان اشتہاروں کا چرچا ختم نہ ہونے پایا تھا کہ دمشق، طرابلس سے بھی اسی طرح کے اشتہارات کی اطلاع موصول ہوئی۔ لوگ آپس میں بیٹھ کر بہ جگہ ان اشتہارات کی شانِ نزول کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے۔ انجمن کے ممبر بھی اپنے راز کو چھپائے ہوئے ان حلقوں میں گھس کر بڑھ بڑھ کے بحث کرتے وہ اس کا بھی غور سے مطالعہ کرتے کہ عوام پر ان اشتہاروں کا کیا اثر پڑا ہے اور انھیں تاثرات کی روشنی میں وہ دوسرا اشتہار مرتب کرتے

ان اشتہارات میں ترکی حکومت کی بری طرح دھجیاں اُڑائی جاتیں اور عربوں کو بغاوت کی ترغیب بھی دی جاتی۔ شام اور قسطنطنیہ دونوں جگہ کے حکام سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ سلطان نے دارالخلافت سے اپنے چند معتمد جاسوسوں کو اس کی تفتیش کیلئے روانہ کیا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی ہوئی، سیکڑوں بے قصور انسانوں کو صرف شبہ پر قید کیا گیا۔ عام طور سے مشہور تھا کہ شام کے گورنر مدحت پاشا کو اس تحریک سے گہرا تعلق ہے کچھ لوگ اس سلسلہ میں بہت آگے بڑھ جاتے اور کہتے کہ جس طرح مصر میں محمد علی نے اپنے خاندان کی حکومت قایم کی ہے اسی طرح مدحت پاشا شام میں اپنے خاندان کی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، مدحت پاشا کو اس انجمن کا کوئی علم نہ تھا، بلکہ اُن کے واپس بلائے جانے کے تین چار سال بعد تک یہ انجمن قایم رہی۔ جب سلطان عبدالحمید کا استبداد ناقابلِ برداشت ہو گیا تو انجمن کے ممبروں نے اپنی کارروائی کو ختم کرنا ہی مناسب سمجھا اور اُس کی تمام کارروائیاں ضایع کر دی گئیں اور بیشتر ممبر ہجرت کرکے مصر چلے گئے۔ عوام کو یا حکومت کو اس انجمن کے کسی ممبر کے متعلق کوئی علم نہ ہو سکا۔

اس انجمن کے متعلق اگر کہیں کوئی رکارڈ مل سکتا ہے تو صرف لندن کے رکارڈ آفس میں، وہ بھی صرف مراسلات کی شکل میں جو وقتاً فوقتاً برطانوی قونصل نے روانہ کئے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلا تار جو برطانوی قونصل نے ۲۸ جون ۱۸۸۰ء کو

روانہ کیا تھا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے :

" بیروت میں انقلابی اشتہارات چسپاں کئے گئے ہیں - اُن کا مصنف مدحت کو سمجھا جا رہا ہے تفصیل آئندہ ڈاک سے"

اس کے ساتھ ہی کچھ اور مراسلات ہیں جو بیروت اور دمشق کے برطانوی قونصلوں نے روانہ کئے تھے۔ سب سے زیادہ اہم مراسلہ بیروت کے قونصل کا ہے، جس کے ساتھ تین اشتہارات بھی منسلک کئے گئے تھے - ان میں ایک تو اصلی اشتہار ہے جو پولیس کے پہونچنے سے پہلے ہی کسی نے اُڑا دیا تھا اور دو مختلف اشتہاروں کی نقلیں ہیں۔

پہلا اشتہار جو ۳ رجولائی ۱۸۸۰ء کے مراسلہ کے ساتھ منسلک ہے۔ وہ بہت مختصر اور کم دلچسپ ہے۔ یہ سب سے پہلا اشتہار ہے جس کی اطلاع برطانوی قونصل جنرل کو ہوئی مگر یہ خفیہ انجمن کا پہلا اشتہار نہیں ہے کیونکہ اس میں خود کسی پہلے اشتہار کا حوالہ موجود ہے۔ اس اشتہار میں اہل شام کو ترکوں کے مظالم کے باوجود اُن کی گراں خوابی پر ملامت کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ عربوں کی نااتفاقی نے آج ان لوگوں کو یورپ کی حکومتوں کی خواہشات کا شکار بنا دیا ہے۔ اسی اشتہار میں عربی غرور" کا واسطہ دلا کر اپیل کی گئی ہے کہ اپنے کل اختلافات کو ختم کرکے پوری قوم ظالموں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو جائے۔

ان مراسلات کے ساتھ دوسرے اشتہارات جو منسلک ہیں ان میں اور زیادہ تلخی کے ساتھ ترکوں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ ایک اشتہار جو ۳۱ ردسمبر ۱۸۸۰ء کی شب میں چسپاں کیا گیا وہ بیحد اہم ہے، کیونکہ اس میں عربوں کے سیاسی مطالبات درج ہیں جو پہلے پہل عوام کے سامنے پیش کئے گئے۔ اسی اشتہار میں اس کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اس انجمن کے ممبر تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان مطالبات کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اگر ضرورت ہوئی تو تلوار اُٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے گا۔

اس اشتہار میں حسب ذیل مطالبات درج ہیں :

(۱) شام اور لبنان کو آزاد کیا جائے اور پہلے کی طرح متحد کر دیا جائے۔

(۲) عربی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

(۳) سنسر ختم کیا جائے اور اظہار خیال نیز تحصیل علم پر کوئی پابندی عاید نہ ہو

(۴) مقامی فوجی خدمات کے لئے صرف مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔

ان مطالبات کے متعلق یہاں پر چند باتیں جان لینا ضروری ہے۔ شام اور لبنان کو ۱۸۶۴ء میں تقسیم کیا گیا تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس تقسیم کی وجہ سے شام اور لبنان کا سیاسی ڈھانچا ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو گیا تھا۔ اور یہ چیز عرب قومیت کے احیاء کی راہ میں سنگ گراں بن رہی تھی۔

دوسرا مطالبہ بھی کافی اہم تھا۔ شام میں عربی زبان کی جگہ ترکی زبان نے لے لی تھی۔ اُس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جتنے سرکاری افسر تھے وہ سب ترکی تھے اور وہ عربی سے بالکل نابلد تھے چنانچہ سرکاری دفاتر میں عام طور پر ترکی زبان رائج تھی۔

حکومت نے غیر ملکی کتابوں کا داخلہ قطعاً ممنوع قرار دیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عام نہ ہونے پائے۔ عربوں میں قومی بیداری تعلیمی ترقی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اس لئے حکومت نے بھی مناسب سمجھا کہ پہلے جڑھی پر کاری ضرب لگائی جائے تاکہ شاخیں خود بخود خشک ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں تحریر و تقریر کی آزادی بھی بالکل سلب کر لی گئی۔

(۴)

اُنیسویں صدی کے آخر میں ایک قابل ذکر ہستی منظر عام پر نمودار ہوئی جس نے بڑی حد تک قومی تحریک کا رخ ہی بدل دیا اُس نے لیڈر شپ عیسائیوں کے ہاتھ سے لیکر مسلمانوں کو سونپ دی۔ یہ ہستی عبدالرحمان کواکبی کی تھی۔ اُن کا تعلق شام کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی مسلم کالج میں تعلیم پائی۔ اخبار نویس اور وکیل کی حیثیت سے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔

کچھ دنوں کے بعد سیاسی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اسی سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں رہائی کے بعد مصر ہجرت کرکے چلے گئے کچھ دنوں مصر میں قیام کرنے کے بعد عالم اسلامی کی سیاحت کے لئے نکلے۔ سمالی لینڈ، زنجبار اور یمن ہوتے ہوئے مکہ پہونچے جہاں چند روز قیام کیا اور پھر قاہرہ واپس آگئے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں یکایک ۵۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی سب ہی شامل تھے۔ غریبوں سے اُنکو خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایک دفتر اُنھوں نے کھول رکھا تھا جہاں غریبوں کو بلاقیمت قانونی مشورہ دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور سے وہ "غریبوں کے باپ" کے نام سے مشہور تھے۔

کواکبی نے ایک کتاب " ام القرٰی " کے نام سے لکھی اور اس کتاب میں بڑے دلچسپ انداز سے خلافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ سیاسی تحریک کی باگ ڈور جو عیسائی ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی اس میں بھی اس کتاب کا بہت بڑا حصہ تھا۔

نوجوان ترک اور نوجوان عرب

(۱)

۲۴ ر جولائی سنہ ۱۹۰۸ء کو ترکی میں ایک سیاسی انقلاب ظہور پذیر ہوا اور اُس کے ساتھ ہی سلطان عبدالحمید نے اپنی رعایا کو ایک بنیادی دستور عطا کیا۔ دوسرے ہی دن سنسر کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، سیاسی قیدی رہا کردئے گئے اور جاسوسوں کی فوج جو تین لاکھ افراد پر مشتمل تھی معطل کردی گئی۔

یہ انقلاب انجمن اتحاد و ترقی نے کیا تھا جس میں ترکوں کے ساتھ عرب بھی شریک تھے چنانچہ دستور کے نفاذ کے وقت ترکوں کے ساتھ عربوں نے بھی بہت خوشی کا اظہار کیا۔ شریف حسین جن کو سلطان نے قسطنطنیہ بلاکر نظر بند کر دیا تھا، اتحاد و ترقی نے ان کو شریف مکہ کے عہدہ پر معمور کیا۔ سلطان نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ شریف حسین مدینہ پہونچنے کے بعد بجائے خود ایک مستقل خطرہ بن جائے گا مگر اُن کی بات نہ سنی گئی اور شریف حسین حجاز کے لئے روانہ ہوگئے۔

انقلاب کے بعد جب ملک میں امن و امان قایم ہوا تو نئے دستور کے مطابق عام انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقعہ پر عربوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پارلیمنٹ میں ۱۵۰ ترک اور صرف ۶۰ عرب منتخب ہوئے اگرچہ عربوں کی آبادی نصف سے زاید تھی اور سینٹ (Senate) جس کے ممبروں کو خود سلطان نے نامزد کیا تھا اس کے ۴۰ ممبروں میں صرف ۳ عرب ممبر نامزد ہوئے۔ انقلاب سے پہلے اور اُس کے بعد ترکوں نے عربوں سے جو عہد و پیمان کیا تھا، یہ تھی اُس کی پہلی قسط۔

اس تلخ تجربہ نے عربوں کو اندرونی کارروائی کے لئے مجبور کیا۔ متعدد خفیہ سیاسی ادارے تیزی کے ساتھ ملک میں قایم ہوئے جن میں سے اکثر کا حکومت کو اخیر وقت تک کوئی علم نہ ہوسکا۔ ان تمام انجمنوں کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے بلکہ ان میں ایک حد تک اتحاد بھی تھا۔ ان انجمنوں کے بعض ممبروں کو دوران جنگ میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک انجمن اُن مسلمان طلبہ نے قایم کی جو پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس انجمن نے بہت زیادہ نمایاں کام انجام دئے۔ پہلے دو سال میں اسکا مرکز پیرس ہی رہا لیکن ۱۹۱۳ء میں اُس کا دفتر دمشق میں قایم ہوا اور اُس کی شاخیں تمام ملک میں پھیل گئیں۔ یہاں عیسائیوں نے بھی اس میں کافی دلچسپی لی۔ اس انجمن کا صحیح راز حکومت کو اخیر وقت تک نہ معلوم ہوسکا۔ اس کے ایک ممبر کو حکومت نے گرفتار کیا اور جس قدر اذیتیں دیجا سکتی تھیں اُس کو دی گئیں مگر اُس نے اپنا راز ظاہر نہ کیا۔ جب مصیبتیں ناقابل برداشت ہوئیں تو اُس نے خودکشی کرلی۔

۱۹۱۲ء میں ایک سیاسی ادارہ عرب کو ترکی حکومت سے علحدہ کرنے کے لئے بیروت میں قایم کیا گیا۔ اسکا نام دستور ساز کمیٹی تھا اور یہ کمیٹی ۸۶ ممبروں پر مشتمل تھی جس میں عیسائی اور مسلمان سب ہی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ملکی دستور کا ایک خاکہ تیار کیا اور وسط فروری ۱۳ء میں ملک کے سامنے اُس کو پیش کیا گیا جس کی حمایت میں شام اور عراق کے تمام شہروں میں جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ یہ تحریک اتحاد و ترقی والوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ ۸ ر اپریل ۱۳ء کو جبکہ اس کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا پولیس نے اُس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا اس حکم نے ملک میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگادی۔ بیروت میں دوسرے دن مکمل ہڑتال ہوئی اور اخباروں نے اس خبر کو سیاہ حاشیوں میں شایع کیا۔ حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ تحریک کے سربرآوردہ لیڈروں کو گرفتار کیا اور ملک کے بہت سے اخبار بند کر دئے لیکن تحریک رک نہ سکی اور شام سے نکل کر عرب کے دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی۔ مجبوراً حکومت نے اعلان کیا کہ دستور ساز کمیٹی کے مطالبات عنقریب پورے کئے جائیں گے۔ اس کے بعد ہی لیڈروں کو بھی رہا کر دیا گیا اور تحریک ختم ہوگئی۔

۵ ر مئی ۱۳ء کو سرکاری طور پر ایک اعلان شایع کیا گیا اس میں اصلاحات کا ذکر ضرور تھا مگر عرب مطالبات اُس سے پورے نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض اعتبار سے تو عربوں کو جو حقوق حاصل تھے وہ بھی چھین لئے گئے تھے۔

اب تحریک کا مرکز پھر پیرس منتقل ہوا۔ عام طور پر تحریک کے لیڈروں کا خیال تھا کہ اب وسیع پیمانے پر پروپگنڈے کا کام شروع کیا جائے مگر صورت حالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ترکی حکومت کسی طرح بھی اب اس کو چلنے نہیں دیگی چنانچہ ایک ایسے غیر جانبدار ملک کی تلاش ہوئی جس پر ترکوں کا کوئی اثر نہ پڑ سکے اور اس سلسلہ میں پیرس کو منتخب کیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کے پیش نظر ایک کانفرنس کی تجویز تھی جس میں تمام عرب صوبوں کے نمایندے شرکت کریں اس تجویز کی تائید کم و بیش ملک کی تمام انجمنوں نے کی اور اُس کے انتظامات پوری قوت کے ساتھ شروع کر دئے گئے۔

بالآخر ۱۸ر جون ۱۳ء کو کانفرنس کا افتتاح پیرس میں ہوا۔ ملک کے ۲۴ بڑے بڑے لیڈر اس اجتماع میں شریک تھے۔ اتحاد و ترقی نے پہلے تو کانفرنس کے ممبروں کو توڑنے کی کوشش کی اور جب کوئی کامیابی کی شکل نظر نہ آئی تو فرانس کی حکومت پر اُس نے زور ڈالا کہ یہ کانفرنس پیرس میں نہ منعقد ہوسکے اور جب اس میں بھی ناکامی ہوئی تو اتحاد و ترقی کے سکریٹری کو پیرس روانہ کیا گیا کہ وہ کانفرنس کے ممبروں سے مصالحت کی گفت و شنید کرے، اُس نے اپنا مشن بڑی کامیابی کے ساتھ

پورا کیا؛ اور کانفرنس کے عرب ممبر خوشی خوشی واپس لوٹے۔ لیکن جب سرکاری اعلان شایع ہوا تو وہ امیدوں کے سراسر خلاف تھا اور اُس وقت کانفرنس کے ممبروں کی سمجھ میں آیا کہ یہ تمام شاطرانہ چالیں کانفرنس کو ختم کرنے کے لئے چلی گئی تھیں۔

(۲)

ایشیا میں سلطان کے مقبوضات تو سنہ ۱۴ء میں وہی تھے جو اُن کے تخت نشین ہونے کے وقت اُن کو وراثتاً ملے تھے۔ لیکن جزیرہ نمائے عرب میں برطانیہ کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ حکومت ہند نے عرب سرداروں سے کئی معاہدے بھی کئے تھے۔ عدن کے اردگرد کی نوچھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی برطانیہ کی حفاظت میں آگئی تھیں اور مسقط و بحرین سے بھی حکومت ہند نے معاہدہ کرلیا تھا۔ ان حالات نے قدرتاً حکومت ہند کے اقتدار کو بڑھا دیا۔ یمن میں بھی سلطان عبدالحمید کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں وہاں شدید بے چینی پیدا ہوئی جس کو دبانے کے لئے پایۂ تخت سے ایک فوجی دستہ روانہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ابھی اس طرف سے پورا اطمینان نہ ہوا تھا کہ سنہ ۱۹۰۴ء میں پھر وہاں بغاوت شروع ہوئی۔ اس کی قیادت امام یحییٰ کر رہے تھے ——— پر امام کا قبضہ ہوگیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ امام یحییٰ کا پر قبضہ ہوا۔ اس مرتبہ سلطان نے عاجز آکر امام سے مصالحت کرلی، اس کامیابی نے یمن میں امام یحییٰ کا اقتدار بہت بڑھا دیا۔

یمن کے شمال میں اسیریا کا صوبہ تھا وہاں سید محمد ابن علی ادریسی کا زور بڑھ رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اُس نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام یحییٰ اُس کی پشت پناہی کر رہے تھے، مگر اس کو شکست ہوئی۔ دوسری مرتبہ اُس نے پھر بغاوت کی اس مرتبہ اطالوی امداد اُس کے ساتھ تھی۔ ابکی بار وہ پہاڑی علاقہ کا مالک بن بیٹھا۔

حجاز میں بھی اب سلطان کا اثر بہت کم ہوگیا تھا۔ شریف مکہ کے عہدہ پر شریف حسین کے تقرر نے سلطان کے لئے ایک مستقل مصیبت پیدا کردی تھی۔ حجاز میں اب شریف حسین کا اس قدر اقتدار پیدا ہوگیا تھا کہ سلطان، شریف حسین کو اُس کے عہدہ سے معزول کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔

(۳)

حجاز میں شریف حسین کے بعد دوسری اہم شخصیت خود اس کے بڑے لڑکے امیر عبداللہ کی تھی۔ شریف حسین کی جلاوطنی کے زمانہ میں اُس کو ترکوں کے ساتھ رہنے کا بہت کافی موقعہ ملا تھا اور اسوقت وہ عثمانی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا عبداللہ تیز، جلد باز اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والا انسان تھا۔ اپنے باپ سے دوراندیشی کا بھی کچھ حصہ اُس نے پایا تھا۔ وہ ہمت کے ساتھ لارڈ کچنر کے پاس انگلستان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے گیا۔ یہ قصہ فروری سنہ ۱۴ء کے پہلے ہفتہ کا ہے۔ کچنر اُسوقت مصر میں برطانوی ایجنٹ تھا۔ ان دونوں کی گفتگو رونلڈ اسٹورس کی موجودگی میں

ہوئی جو اُسوقت برطانوی ایجنسی کے محکمۂ مشرقیات کے سکریٹری تھے۔ عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ گفتگو کی، اور یہ بھی بتلا دیا کہ اتحاد و ترقی والے اُس کے باپ کو شریفِ مکہ کے عہدہ سے معزول کرنے کی فکر میں ہیں اور اگر ان لوگوں نے ایسا کیا تو وہ حجاز میں ترکوں کے خلاف قطعاً بغاوت کرے گا۔ عبداللہ نے ہر کارانہ انداز سے دورانِ گفتگو میں اس کا بھی اندازہ لگانے کی پوری کوشش کی کہ بغاوت کی صورت میں انگلستان کا کیا رویہ ہوگا۔ کچنر نے بھی در پردہ یہ ظاہر کیا کہ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات چونکہ دوستانہ ہیں۔ اس لئے عبداللہ کا ساتھ انگلستان شاید ہی دے سکے مگر اُس نے کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ کچنر نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا مخاطب کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا ہے مگر پہلی ملاقات میں اُن کا اظہار وہ مناسب نہیں سمجھتا۔ چنانچہ کچنر نے دوسرے دن رونلڈ اسٹورس کو بازدید کے لئے بھیجا۔

عبداللہ نے اپنے ارادے، عرب لیڈروں کے خیالات اور حجاز کی پوری صورتِ حال صاف اور واضح انداز میں رونلڈ اسٹورس کے سامنے کھول کر رکھدی۔ آخر میں پھر اُس نے انگلستان کے رویہ کے متعلق سوال کیا اور یہ بھی دریافت کیا کہ انگریز اس کے لئے کچھ مشین گنیں فراہم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اسٹورس نے بھی وہی کہا جو کچنر نے کہا تھا۔

ظاہراً تو اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مگر آنے والے واقعات پر یہ ملاقات بہت زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس گفتگو نے کم از کم کچنر کی تو آنکھیں کھولدیں۔ ایک طرف اُس کو عربوں اور ترکوں کے تعلقات کی صحیح حقیقت معلوم ہوئی اور دوسری طرف عربوں کے جذبۂ آزادی کا صحیح اندازہ بھی اس کو ہوگیا۔

(باقی)

حصۂ دوم : عربوں کی سیاست دورانِ جنگ میں
تیسرا حصہ : عربوں کی سیاست بعد از جنگ

محمد عتیق صدیقی

مکتوبات نیاز

مکرمی۔

زحمت تو ہوگی، لیکن میرا بڑا کام نکل جائے اگر آپ سلام صاحب کو فوراً میرے پاس روانہ کرا دیں۔
آپ جانتے ہی ہیں کہ "وسلے برندش" قسم کے انسان ہیں اور جب کبھی وہ سفر کرنا چاہتے ہیں تو ریل ہمیشہ وقت سے پہلے چھوٹ جاتی ہے۔

وہ وعدہ کریں بھی تو یقین نہ کیجئے بلکہ اپنے آدمی سے کہئے کہ کشاں کشاں انھیں اسٹیشن تک لیجائے بلکہ ممکن ہو تو گاڑی میں بٹھانے کے بعد دروازہ کو بھی مقفل کرا دے، اور جب تک ریل کی رفتار کافی تیز نہ ہو جائے، دیکھتا رہے کہ کہیں کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش تو نہیں کرتے۔

میں روز ایک خط بھیجتا ہوں اور وہ روز وہاں سے لکھ بھیجتے ہیں کہ آ رہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ قیامت کا آنا برحق ہو یا نہ ہو لیکن ان کا نہ آنا ضرور برحق ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔
اُن کے نہ آنے سے جتنا حرج ہو رہا ہے، اس کا اندازہ آپ میری اس بیتابی سے اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

جناب کی تحریر تقضائے مُبرم کی طرح پہونچی اور اسی وقت میں نے تعمیل ارشاد بھی کر دی، لیکن اگر ناگوار نہ ہو تو یہ بتا دیجئے کہ اس تدبیر سے آپ نے کیا فایدہ سوچا ہے۔ بفرض محال اگر وہ آپ کی خواہش کے مطابق تحریر دے بھی دیں، تو اس کی پابندی کی ضمانت کیا ہے۔ جس کام کا آغاز ہی بے اعتمادی ہو۔ اس کا انجام معلوم!

اگر یہ سب کچھ بربنائے احتیاط ہے، تو میری رائے میں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زہر کھا کر مرجانے کے لئے تو طیار رہو، لیکن شرط یہ قرار دے کہ پہلے تریاق مہیا کر دو۔ تریاق کی فکر ہو تو زہر کھانا ہی کیا ضرور ہے۔

اگر آپ کو اُن کی طرف سے بدعہدی کا اندیشہ ہے تو میری رائے میں یہ رشتہ مناسب نہیں۔ ٹوٹنے والے دل کہیں دستاویز و تحریر سے جڑا کرتے ہیں

گرامی عزیز

غزل دیکھی۔ یوں آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو تعریف کر دوں، لیکن میری رائے میں آپ کی غزل کا ایک شعر بھی صحیح رنگ تغزل نہیں رکھتا۔ آپ اس باب میں میری رہنمائی و ہدایت چاہتے ہیں، لیکن میں کیونکر سمجھاؤں کہ تغزل کس چیز کا نام ہے اور اس کا صحیح معیار کیا ہے۔

ذوق کا شعر ہے:۔

ساتھ آہ کے شب، دل سے وہ پیکاں نکل آیا تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

فن کے لحاظ سے اس میں کوئی خامی نہیں، لیکن شعریت یا تغزل سے اسے کیا واسطہ؟ اسی "دل سے پیکان نکلنے"، کو میر اس طرح کہتا ہے:۔

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو، جاناں نمیت تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت

آپ ان دونوں میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر میر کا شعر آپ کے دل پر کوئی اثر چھوڑ جاتا ہے تو غور کیجئے کہ کیوں؟ اسی چیز کا نام تغزل ہے۔ لیکن اگر آپ کو ذوق کا شعر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، تو پھر آپ کو کسی رہبری و ہدایت کی ضرورت نہیں۔ آپ آزاد ہیں، جو چاہے کہئے اور جو چاہے کیجئے۔

ذوق کی ایک مشہور غزل ہے " قابل ہوتا۔ مقابل ہوتا" قابل کا قافیہ انھوں نے اس طرح نظم کیا ہے

سینۂ چرخ میں سر اختر اگر دل ہے تو کیا ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا،

دوسرا مصرعہ بہت پاکیزہ ہے، لیکن پہلے مصرعہ کے سینۂ چرخ اور اختر نے شعر کو تغزل سے علحدہ کر دیا۔ اسی قافیہ میں شہیدی کا شعر سنئے:

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ذوق کے سارے دیوان پر بھاری ہے۔

افسوس ہے کہ شعر کا صحیح ذوق بالکل خدا کی دین ہے اور کوشش کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص شعر بھی ضرور کہے۔ شاعر ہونا کوئی بڑی عمدہ بات نہیں جس پر آپ کو رشک آئے۔ لیکن اگر آپ اس مشغلہ کو ترک کرنا نہیں چاہتے تو غزلوں کا خیال چھوڑ دیجئے، اور بہت سے اصناف سخن ہیں ان کا تجربہ کیجئے۔

بندہ نواز، مکرمت نامہ کا شکریہ۔ آپ نے جن محبت بھرے الفاظ سے مجھے یاد کیا ہے، ان کی قوت کو محسوس کرتا ہوں لیکن

یہی بات میں جو کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

اور سچ پوچھئے تو سوال اعتمادی و بے اعتمادی کا بھی نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ

زشبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گُل را

اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

شعراء کہا کرتے ہیں کہ درد حد سے گزر کر دوا ہو جاتا ہے، یہاں دوائیں حد سے گزر کر درد بن گئی ہیں۔ پھر آپ کیوں اپنی محبت رائگاں کریں زمینِ شور سنبل بر نیارد!

کس قدر تکلیف ہوئی مجھے یہ سنکر کہ آپ اِدھر سے گزرے لیکن بغیر ملے واپس بھی چلے گئے! میں جانتا ہوں کہ مجھ سے ملنا نہ ضروریاتِ زندگی میں داخل ہے نہ نشاطِ زندگی میں، لیکن کم از کم آپ کے لئے معیارِ انسانیت ضرور تھا۔ آپ کے لئے، اس لئے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ انسان سمجھتے ہیں۔

خیر، میں یہ تو پوچھ نہیں سکتا کہ سفر کا مقصد کیا تھا، لیکن اس قدر بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ آیندہ کب جانے کا مقصد ہے۔ مجھے آپ سے بعض باتیں نہایت ضروری کرنا ہیں، چاہتا ہوں کہ اسٹیشن ہی پر مل کر کہہ لوں جو کچھ کہنا ہے، یوں تو میں لکھوں گا نہیں اور لکھوں بھی تو آپ جواب کب دیتے ہیں۔

خط پہونچا۔ کیا بتاؤں ان کا کیا حال ہے۔ کسی اُستاد کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا

پڑی توسنِ عشق کی ٹاپ رے ارے باپ رے، باپ رے، باپ رے

بس یہی عالم ہے — کل تشریف لائے تھے، نہایت بدحواس و پریشاں حال، میں نے قصداً کوئی ذکر نہیں چھیڑا، ورنہ رو پڑتے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چند دن کے لئے تم اپنے پاس بلا لو۔ شاید سنبھل جائیں۔

مکرمی - میں آپ کی رائے سے تو متفق ہوں، لیکن تدبیرِ عمل کی راہ سے نہیں۔ یعنی یہ تو ضرور چاہتا ہوں کہ اُن کو ہموار کرکے یہ کام کیا جائے، لیکن ہموار کرنے کی جو صورت آپ نے سوچی ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔

آپ جانتے ہیں وہ نہایت خاموش بلکہ گھُنّا انسان ہے، ایک عمر گزرنے کے بعد بھی میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب وہ خفا ہوتا ہے تو مُسکراتا کیوں ہے، اسلئے اس کے دل میں گھر کرنا تو مشکل ہے، خدا معلوم کیا سوچتا ہے کس ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔

ایسے انسانوں کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ جب تک انکے دماغ کو کوئی سخت ضرب نہ پہونچائی جائے انکی زبان نہیں کھُلتی اسلئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ بجائے صلح و آشتی کے آپ شروع ہی سے معاندانہ پہلو اختیار کیجئے اور اس کو یقین دلائیے کہ اس نزاع میں آپ کی ہمدردیاں دوسرے فریق کے ساتھ ہیں، یہ بات چونکہ اسکی توقع کے خلاف ہوگی، اسلئے وہ گھبرا جائیگا اور ہو سکتا ہے کہ شکوہ و شکایت کے سلسلہ میں دل کی بات زبان پر آجائے۔ مجھے بھی انکے ساتھ پوری ہمدردی ہے لیکن پہلے یہ تو اطمینان ہو جائے کہ وہ کس قسم کی دشمنی کو دوستی سمجھتا ہے!

جرمنی کو ناکہ بندی سے شکست نہیں ہو سکتی

یہ خیال کہ جرمنی کی شکست کا باعث ناکہ بندی ہو گی درست نہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پولستان کے قبضہ سے جرمنی کو کتنا فایدہ پہونچا۔

پہلی ستمبر کو نازی افواج نے مغرب اور شمال اور جنوب کی طرف سے پولینڈ پر حملہ کیا اور ۱۷ کو روس نے مشرق کی طرف سے اور بارہ دن بعد ۲۹ ستمبر کو دونوں نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس سے قبل بھی تین بار پولینڈ کی تقسیم ہو چکی ہے (سنہ ۱۷۷۲ء - سنہ ۱۷۹۲ء - سنہ ۱۸۹۵ء) اب چوتھی مرتبہ پھر قوی پڑوسیوں نے اس کے حصے کر لئے اور فرق صرف اتنا ہے کہ پچھلی تقسیموں میں آسٹریا بھی شریک ہوتا تھا اور اس مرتبہ چونکہ جرمنی اسے پہلے ہی ہضم کر چکا ہے اس لئے اسے کوئی حصہ نہیں ملا۔

اس مرتبہ جرمنی کو پولینڈ میں جتنا کچھ ملا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ گلیشیا کا حصہ جس میں پٹرول کے چشمے پائے جاتے ہیں جرمنی کو نہیں ملا لیکن یوں سب سے زیادہ زرخیز حصہ اسی کے ہاتھ آیا ہے۔

پولینڈ کا رقبہ ۱۵۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس میں سے ۵۵۰۰۰ مربع میل کا رقبہ جرمنی کو ملا اور ۹۵۰۰۰ میل روس کو لیکن آبادی کی تقسیم میں دو کرور دس لاکھ آدمی جرمنی کے حصہ میں آئے اور ایک کرور چالیس لاکھ روس کے حصہ میں

جرمنی کے مقبوضہ حصہ میں مختلف قوموں کی آبادی کا تناسب یہ ہے:-

پولستانی ۱۸۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۷۰۰۰۰۰ — جرمن ۸۰۰۰۰۰ — اوکرانی ۲۰۰۰۰۰ — — روسی تقریباً ۶۰۰۰۰

روس کے مقبوضہ حصہ میں اس تناسب کی صورت یہ ہے:-

پولستانی ۴۵۰۰۰۰۰ — اوکرانی ۶۰۰۰۰۰۰ — سفید روسی ۲۰۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۵۰۰۰۰۰ - جرمن ۹۵۰۰۰ — روسی وزیکی ۱۲۵۰۰۰!

اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ بھی روس کو پولینڈ کا بڑا رقبہ ملگیا لیکن زیادہ آباد حصہ جس میں بڑے بڑے شہر، اور خاص خاص صنعت گاہیں شامل ہیں جرمنی ہی کے حصہ میں آیا۔ یعنی پولستان کے دس بڑے شہروں میں سے آٹھ جرمنی کو ملے اور صرف دو روس کو۔ بہترین زراعتی زمین، بڑے بڑے فارم، لوہے، کپڑے کے کارخانے اور کوئلہ کی معدنیں سب جرمنی ہی کے ہاتھ آئی ہیں۔

لڑائی سے پہلے پولستان میں ۳۲ لاکھ زراعتی فارم پائے جاتے تھے جن میں نصف سے کچھ کم یعنی ۱۴ لاکھ فارم جرمنی کو ملے لیکن بہت زیادہ ترقی یافتہ و زرخیز زمینیں ۶۰ فی صدی کے حساب سے ہاتھ آئیں جواب بالٹک سے ہجرت کرنے والے جرمنوں کو دیجا رہی ہیں۔

قابل کاشت زمینوں، جنگلوں اور مویشیوں کی جو تقسیم ان دونوں کے درمیان ہوئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے :-

	قابل کاشت زمین	چراگاہیں	جنگل
جرمنی =	ایک کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ	۴۰ لاکھ ایکڑ	ایک کروڑ ایکڑ
روس =	تین کروڑ ۱۰ لاکھ ایکڑ	×	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ

علاوہ اس کے جانوروں میں ۱۶۰۰۰ گھوڑے - ۴۰ لاکھ گائیں - ۴۰ لاکھ سور اور ۷ لاکھ بھیڑیں بھی جرمنی کے ہاتھ آئیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک رقبہ و کاشت کا تعلق ہے، روس کو جرمنی سے زیادہ ملا ہے، لیکن اس کو سب سے بڑا فایدہ کوئلہ کی معدنوں اور صنعت گاہوں سے ہوا ہے جن میں روس کا حصہ بہت کم ہے۔

کوئلہ کی پیداوار کے لحاظ سے پولستان کا دنیا میں ساتواں نمبر ہے۔ یہاں تین اضلاع میں ستر کوئلہ کی معدنیں ہیں جہاں ۶۵ ہزار کان کن کام کرتے ہیں اور تین کروڑ ٹن سے زیادہ کوئلہ سالانہ یہاں سے نکلتا ہے اور اب ان تمام معدنوں پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ جنگ کے دوران میں اندیشہ تھا کہ پولستانی فوجیں ان معدنوں میں پانی بھر کے بیکار کر دیں گی، لیکن جرمنی نے حملہ کرتے ہی سب سے پہلے ان معدنوں کا محاصرہ کر لیا تاکہ وہ پانی بھر کے خراب نہ کر دی جائیں اور اس طرح تمام کانیں جوں کی توں جرمنی کے ہاتھ آگئیں۔

پولستان میں نمک کی کانیں بھی بہت بڑی بڑی ہیں، یہ بھی سب کی سب اچھی حالت میں جرمنی کو ملگئیں اور وہاں برابر کام جاری ہے۔

پٹرول کے چشمے البتہ روس کے ہاتھ آئے۔ یہاں سے سالانہ پانچ لاکھ ٹن پٹرول نکلتا ہے لیکن گزشتہ جنگ سے قبل دس لاکھ ٹن پٹرول یہاں سے نکلتا تھا اور اب بھی اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ نکل سکتا ہے

اگر انتظام معقول ہو۔

سیمنٹ، کاغذ، چمڑا اور ربڑ کے چند کارخانوں کے علاوہ باقی سب کارخانے (یعنی تقریباً ۹۰ فیصدی) جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح نہ صرف لوہے و فولاد کے کارخانے بلکہ اور صنعتی ادارے بھی جرمنی کو مل گئے۔ پولینڈ کا کارخانہ Wspolnota Interesow دنیا کے بہت بڑے آہنی کارخانوں میں شمار ہوتا ہے اسی طرح [illegible] کا کارخانہ بھی دھات صاف کرنے کا نہایت عظیم الشان و ترقی یافتہ کارخانہ ہے۔ جہاں ۲۰ ہزار مزدور، ۵ ہزار عہدہ دار اور سیکڑوں انجینیر و ماہرین فن کام کرتے ہیں اور جرمن فوجوں نے حملہ کے پہلے ہی دن ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ الغرض پولستان کے جست، سیسہ، ٹین، لوہے وغیرہ کے تمام کارخانے جرمنی کو مل گئے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جست کی پیداوار میں پولستان کا نمبر پانچواں ہے اور گزشتہ جنگ سے پہلے تقریباً دو لاکھ ٹن جست یہاں سے نکلتا تھا۔

پولستان کے پارچہ بافی، ادویہ سازی اور مشین ڈھالنے کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی ہی کو ملے۔ روس کو الکحل، شکر، تمباکو اور لکڑی کے کارخانے زیادہ ملے ہیں۔

پولستان میں تین شہر پارچہ بافی کے بڑے بڑے مرکز تھے ان میں سے دو مرکز جرمنی کو ملے ہیں، اسی طرح دوا سازی اور برقی اشیاء کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی کے ہاتھ آئے ہیں، چمڑے کی صنعت گاہیں دونوں میں برابر برابر تقسیم ہو گئی ہیں لیکن کاغذ کے کارخانے زیادہ تر جرمنی کو ملے ہیں۔ طیارہ سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی اکثر جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح پولستان کے تمام صنعتی اداروں میں سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار جرمن کو ملے اور ۲۷ ہزار روس کو۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ جرمن کو خام پیداوار کی فراہمی پولستان ہی کی طرف سے کتنی ہو رہی ہے اور اس میں اگر آپ روس، بلقان اور بالٹک کی ریاستوں کو بھی شامل کر لیں تو یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ناکہ بندی سے جرمنی کو اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دس فیصدی نقصان پہونچا ہے جو اُن ذخایر کو دیکھتے ہوئے جو جرمنی میں عرصہ سے جمع کئے جا رہے ہیں، کچھ نہیں ہے، اور اتحادیین کا یہ خیال کہ وہ صرف ناکہ بندی سے جرمنی کو شکست دے سکتے ہیں، درست نہیں ہے۔

باب الاستفسار

کلامِ مومن

(جناب محمد یحییٰ صاحب۔ بھاگلپور)

اس سے قبل کلامِ مومن کے مشکل اشعار پر نگار میں جتنا حصہ شایع ہوا ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستفسرین نے ترتیب کو پیشِ نظر رکھا تھا جو بہت مفید بات تھی اس لئے میں اسی سلسلہ کو قایم رکھتے ہوئے گزشتہ استفسارِ متعلقہ کے بعد والے اشعار پیش کرتا ہوں۔ آیندہ جو صاحب استفسار فرمائیں وہ اس کا لحاظ رکھیں تو بہتر ہے، کیونکہ اسکے بعد آخر میں، ایک کتاب طیار ہو جائے گی۔

حل طلب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱۔ یہ کاہ رُبا سے بھی ہیں کم اے کششِ دل، مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا

اس میں ہیں کا فاعل کون سا لفظ ہے۔ شعر میں موجود نہیں ہے۔

۲۔ تفریح نہ کیونکر ہو، ہوا آ نہیں سکتی گویا درِ دلدار نشیمن ہے ہمارا

ہوا کا نہ آنا باعثِ تکلیف ہوا کرتا ہے یا باعث تفریح۔

۳۔ گر پاس ہے لوگوں کا تو آ جا کہ قلق سے ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

پہلے مصرعہ کا تعلق دوسرے مصرعہ سے سمجھ میں نہیں آیا۔ لاش و مدفن کا تفرقہ اور لوگوں کا پاس دونوں باتیں بے ربط سی معلوم ہوتی ہیں۔

۴۔ چشمۂ حیواں بنا اس کے لبوں کی شرم سے پانی پانی بسکہ اعجازِ مسیحا ہو گیا

۵۔ بیوفائی ہے سرشت اسکی سو وہ ہم میں کہاں ہم مزاجی کے سبب سے غیر اپنا ہو گیا

مومن اور غیر میں ہم مزاجی کیونکر ہو گئی جبکہ ایک بیوفا ہے اور دوسرا نہیں۔

۶۔ رو دیا اس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر قطرۂ اشک ندامت مجھ کو دریا ہو گیا

۷ ۔ میں تو دیوانہ تھا اس کی عقل کو کیا ہو گیا — قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

دوسرا مصرع سمجھ میں نہیں آیا۔

۸ ۔ یکس سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو — غیر ہمسا کب ہوا ہر چند ہمسا ہو گیا

دوسرے مصرعہ میں ہمسا دو جگہ آیا ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے ان میں کیا فرق ہے۔

۹ ۔ کیا اشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا — میں جانکر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

۱۰ ۔ اس نے جو دل کو منہ نہ لگایا دو نیم ہے — یہ جامِ جم ہوا قدحِ مل نہ ہو سکا

۱۱ ۔ کہتے ہیں گلشن اپنی گلی اس کے دم سے تھی — دشمن جو ہم ترانۂ بلبل نہ ہو سکا

۱۲ ۔ وہ عکسِ زلف چشمِ عدو میں پڑا نہ ہو — نظارہ مجھ سے جانبِ سنبل نہ ہو سکا

۱۳ ۔ تنگی وہی رہی دلِ صد چاک کی ہوا — یہ غنچہ پاش پاش مگر گل نہ ہو سکا

۱۴ ۔ یہ ضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا — خود رفتگی کے صدمہ سے غش مجھ کو آ گیا

۱۵ ۔ جلتی ہے جان آتشِ حسن پوش دیکھ کر — چلمن سے شعلہ رو کوئی جلوہ دکھا گیا

۱۶ ۔ بوئے سمن سے شاد تھے اغیارِ بے تمیز — اس گل کو اعتبارِ نسیم و صبا گیا

۱۷ ۔ وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا — مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

۱۸ ۔ دردِ شانہ سے ترا [illegible] نزاکت خوش ہے — کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش [illegible]

(نگار) ۱۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں ہیں غلط ہے اس کی جگہ ہے ہونا چاہئے۔ اس کا فاعل یہ ہے جو کششِ دل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ معشوق پسِ چلمن بیٹھکر ہماری کششِ دل پر طعنہ زن ہے کہ اس میں تو کاہ ربا کی سی بھی کشش نہیں، ورنہ یہ چلمن کہیں پڑی رہ سکتی تھی، آپ اُٹھ جاتی۔

۲ ۔ ہوا نہ آسکنے سے مومن کو صرف اس وجہ سے تفریح ہے کہ ان کا نشیمن بھی معشوق کے گھر سے مشابہ ہو گیا یعنی کسی طرح وہاں ہوا تک نہیں جا سکتی اسی طرح ان کے نشیمن میں بھی ہوا کا گزر نہیں۔ دونوں جگہ معنی کا فرق ضرور ہے، لیکن مومن لفظی مناسبت [illegible] سے لطف حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۳ ۔ اگر لوگوں کا لحاظ ہے تو پھر میرے مدفن پر آنے میں کیا حرج ہے کیونکہ خلقت سے میری لاش وہاں موجود ہی نہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاش و مدفن کا تفرقہ تمہارے آنے سے مٹ جائے گا اور یہی ایک بات ایسی تھی جس کا لحاظ تھا۔

۴ ۔ جس چیز کو دنیا چشمۂ حیواں کہتی ہے وہ فی الحقیقت اعجازِ مسیحا ہے جو محبوب کے لبوں کے اعجاز کو دیکھ کر

شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اس کے لبوں کا اعجاز، مسیحا کے اعجاز اور آبِ حیواں کی جاں بخشی سے کہیں بڑھا چڑھا ہے۔

۵۔ دوسرے مصرعہ کا تعلق محبوب سے ہے اور اسی کی ہم مزاجی غیر سے دکھائی گئی ہے۔ مومن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لاغری کی یہ حد ہے کہ ایک قطرۂ اشک بھی ڈبو دینے کے لئے دریا کا حکم رکھتا ہے۔

۷۔ دوسرے مصرعہ کے دو ٹکڑے یوں کیجئے:-

قیس کہتا ہے مجھے ۔ ناصح کو سودا ہوگیا

یعنی ناصح مجھے قیس کہتا ہے اور یہ اس کا سودا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قیس کو مجھ سے کیا نسبت!

۸۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کسی پر مہربان ہو اور وہ گستاخ نہ ہو جائے لیکن مومن اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ سمجھتا ہے اور غیر کے مقابلہ میں اپنا امتیاز اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ ہر چند غیر موردِ الطاف ہونے میں تو ہم سا ہوگیا لیکن ضبط و تحمل میں وہ ہمسا نہ ہو سکا، یعنی وہ گستاخ ہوگیا اور میں نے یہ غلطی کبھی نہیں کی۔

۹۔ محبوب کا تغافل کوئی رشکِ غیر تو تھا نہیں کہ متحمل نہ ہو سکتا۔ میں تو جان بوجھکر متحمل نہ ہوا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ میں تمھارے تغافل کو تو برداشت کر سکتا ہوں لیکن رشکِ غیر کا متحمل نہیں ہو سکتا یعنی اگر تم مجھ سے تغافل کرتے ہو تو کرو لیکن غیر سے بھی التفات نہ رکھو کہ اس کی برداشت مجھ میں نہیں ہے۔

دوسرے مصرعہ میں ہو سکا بجائے ہوا کے استعمال ہوا ہے، کیونکہ جانکر کے بعد ہو سکا کا کوئی موقعہ نہیں۔

۱۰۔ چونکہ اس نے دل کو منھ نہ لگایا اس لئے دو نیم ہوگیا۔ اگر وہ منھ لگاتا تو قدحِ شراب بن جاتا لیکن اب صرف جامِ جم ہو کر رہ گیا۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا دل وہ ہے کہ دو نیم ہونے کے بعد جامِ جم بن جاتا ہے۔

۱۱۔ محبوب کہتا ہے کہ میری گلی دشمن کی وجہ سے گلشن بنی ہوئی تھی، حالانکہ اس کو ہم ترانۂ بلبل ہونے کا بھی سلیقہ حاصل نہ تھا یعنی وہ بلبل کے برابر بھی نالہ نہ کر سکتا تھا۔

۱۲۔ مومن سنبل کی طرف نہ دیکھ سکا اور اس کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ چشمِ عدو میں عکسِ زلفِ یار پڑا ہو۔ اور اس کا اثر مجھ پر یہ ہوا ہو کہ سنبل کی طرف نہ دیکھ سکوں انتہائی رشک و احساسِ رشک کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۳۔ پہلے مصرعہ میں ہوا کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے، یعنی یہ غنچہ پاش پاش ہوا مگر گل نہ ہو سکا۔ دل کی تنگی باوجود چاک چاک ہو جانے کے بھی وہی باقی ہے۔

۱۴۔ پہلے مصرعہ میں چلا گیا، "چلا جائے گا" کی جگہ استعمال ہوا ہے یعنی جب "خود رفتگی"، کے صدمہ سے

مجھ کو غش آجاتا ہے تو دم سے کیونکر چلا جائے گا۔ اس شعر کی بنیاد "خود رفتگی" پر قائم ہے جس میں چلنے کا مفہوم پنہاں ہے۔

۱۵۔ چلمن کے پیچھے سے کسی شعلہ رو کے حلوہ کو مومن "آتشِ خس پوش" سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۶۔ نسیم وصبا تو اس گُل (محبوب) کی خوشبو کو لے گئیں لیکن بے تمیز اغیار نے اس خوشبو کو بوئے سمن سمجھا اس لئے اب نسیم وصبا کا بھی اعتبار گیا کہ وہ کیوں بوئے محبوب کو ایسے بدتمیز تک لے گئیں۔

۱۷۔ اُن کی سخت دلی کا یہ عالم ہے کہ بلبل کی آہ وزاری پر بھی ہنسی آتی ہے اور یہاں خندۂ گل کے انجام کو دیکھ کر اس پر بھی رونا آتا ہے۔

۱۸۔ شانہ میں درد دونوں کے ہے، مومن کے بھی اور محبوب کے بھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محبوب کے شانہ میں درد اس لئے ہوا کہ وہ غیر سے ہمدوش ہوا تھا اور مومن کے شانہ پر اتفاقاً کسی وجہ سے درد پیدا ہو گیا۔ لیکن مومن خوش ہے کیونکہ اس طرح وہ محبوب کا ہمدوش تو ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں پہلے "ہمدوش" کے معنے ہمسر یا برابر ہونے کے ہے اور دوسرے ہمدوش کے معنے ہم بغل ہونے کے ہیں۔

"Fjord"

(جناب کریم اللہ خاں صاحب - علی گڑھ)

آجکل جرمنی اور ناروے کی جنگ میں لفظ (Fjord) بعض مقامات کے نام کے ساتھ اکثر وبیشتر ملحق دیکھا جاتا ہے۔ اس کا تلفظ و ترجمہ کیا ہے۔

(نگار) اس کا تلفظ فیورڈ (Fjord) ہے ترجمہ کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں سوائے اس کے کہ بجنسہ اسی لفظ کو لے لیا جائے۔ اس سے مراد سمندر کا وہ محدود و تنگ حصہ ہے جو اونچی اونچی چٹانوں سے گھرا ہو۔ چونکہ ناروے کے سواحل پر پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اس لئے وہاں اکثر جگہ فیورڈ بن گئے ہیں۔ یہ فی الاصل وہ وادیاں ہیں جو Glaciers (برف کے چشموں یا دریاؤں) سے کٹ کٹ کر بنتی ہیں۔ ان وادیوں اور دوسری وادیوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ان کی شکل U اور معمولی دریاؤں کی وادیاں V شکل کی ہوتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برف کا وزن سیدھا عمودی خطامیں ساحل کو کاٹتا ہے اور پانی میں اتنا وزن نہیں ہوتا کہ وہ عمودی خط میں ساحل کو کاٹے۔ یہی چھوٹی چھوٹی گہری وادیاں فیورڈ کہلاتی ہیں جہاں سمندر کافی گہرا ہوتا ہے۔ اور چاروں طرف چٹانوں کی وجہ سے جہاز آسانی کے ساتھ ان میں چھپ سکتے ہیں۔

کشکول

سنسر کا دفتر جب گزشتہ جنگ شروع ہوئی تو سنسر کے دفتر میں صرف ۱۷۰ آدمی کام کرتے تھے لیکن ۱۹۱۸ء تک ان کی تعداد پانچ ہزار ہوگئی تھی جو رات دن پارسلوں اور خطوں کی جانچ میں مصروف رہتے تھے۔

اس جنگ کے آغاز ہی میں تین ہزار آدمیوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو مرموز تحریروں (Code letters) اور غیر مرئی روشنائیوں ([illegible]) کی جانچ کیا کرتے ہیں۔ یہاں کے اسٹاف میں زندگی کے ہر شعبہ کا انسان پایا جاتا ہے یعنی اسکول کے اساتذہ، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ارباب کلیسا، قانون پیشہ لوگ، ساہوکار غرض سبھی یہاں موجود ہیں جن کو ان کی خدمت کا معاوضہ ۳۵۰ پونڈ سالانہ کے حساب سے ملتا ہے۔

لیورپول اور دوسرے بڑے بڑے مرکزی مقامات پر پانچ ٹن یا ۱۴۰ من سے زیادہ وزنی ڈاک کے تھیلے روزانہ جانچے جاتے ہیں اور ستمبر سے اس وقت تک ایک کروڑ پونڈ سے زیادہ قیمت کی ممنوع اشیاء ڈاک سے برآمد ہو چکی ہیں۔

خطوں کے جانچنے والے سب کے سب مرموزہ تحریروں اور غیر مرئی روشنائیوں کے ماہر ہیں لیکن پھر بھی بعض بعض تحریروں پر انھیں گھنٹوں صرف کرنا پڑتے ہیں۔ کیونکہ اگر کسی پیغام کے الفاظ پڑھ بھی لئے جائیں تو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پیغام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

خبر رسانی کے لئے لوگ عجیب وغریب طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض ٹکٹ کے نیچے اپنا پیغام درج کر دیتے ہیں، محض کسی فہرست کے صفحات پر چند چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے اپنا مدعا ظاہر کر دیتے ہیں۔

اکثر وبیشتر خطوط کو کھول کر ان کی تصویر لے لی جاتی ہے اور پھر انھیں لفافہ میں اس طرح رکھ دیا جاتا ہے کہ مکتوب الیہ کو شبہ نہ ہو۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ لفافہ کے ایک کنارہ پر نہایت باریک دھار کے اوزار سے شگاف کر دیتے ہیں اور پھر خط اس کے اندر رکھ کر ایک خاص قسم کی گوند سے چپکا دیتے ہیں اور کوئی نشان کھولے جانے کا باقی نہیں رہتا لفافہ کے اندر سے خط نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ٹکٹ علیحدہ کرکے اسی جگہ دندانے دار شگاف دے لیتے

ہیں اور تار ڈالکر وہیں سے خط نکال لیتے ہیں۔ جب پڑھ لیتے ہیں تو پھر خط کو اندر رکھ کر شگاف جوڑ دیتے ہیں اور ٹکٹ چسپاں کر دیتے ہیں۔ تصویر کے کیمرے سے بھی جاسوسی کرنے میں بڑی مدد لیجاتی ہے، کیونکہ بہت سی ایسی باتیں جو نگاہ کو نظر نہیں آتیں، فوٹو لینے پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خط میں صرف ایک حرف پر نہایت باریک سا سوراخ ہوتا ہے جس سے مکتوب الیہ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس خط کے ظاہری الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ پھر یہ سوراخ نگاہ کو تو نظر نہیں آتا لیکن فوٹو سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

غیر مرئی روشنائی کا استعمال جاسوسی کی دنیا میں بہت قدیم چیز ہے، لیکن اب اس نے بالکل علمی صورت اختیار کرلی ہے اور ان روشنائیوں کو ابھارنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بعض خطوط ایسے سامنے آتے ہیں جو بظاہر کسی شبہ کی گنجائش نہیں رکھتے، لیکن جب انھیں دواؤں کے پانی میں ڈالا جاتا ہے تو بین السطور میں غیر مرئی روشنائی سے کچھ اور عبارت نظر آتی ہے۔ پھر یہی نہیں کیا جاتا کہ اس عبارت کو پڑھکر خط ضایع کردیا جائے بلکہ نمایاں ہونے والی عبارت کو پھر اس کی اصلی حالت پر لاکر مکتوب الیہ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ انکی باہمی مراسلت سے مزید اطلاعات حاصل ہوسکیں۔

پارسلوں کے ذریعہ سے جو چیزیں بھیجی جاتی ہیں ان کی جانچ بڑی دشوار ہے، پارسل کے ڈورے اور اوپر کے کاغذ سے لیکر اندر تک بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ سے خبر رسانی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ایک فلم ٹین کے اندر بند کرکے بھیجا جا رہا ہے جس میں بظاہر کوئی بات شبہ کی نہیں معلوم ہوتی، لیکن جب وقت کھولکر اس کے سلولائڈ کا فوٹو لیا جاتا ہے تو کنارے کنارے کچھ لکیریں سی نظر آتی ہیں جو درحقیقت مرموز پیغام ہے۔ جوتے کی ایڑیوں، صابونوں، چاکلٹ کی ٹکیوں، بکسوں کے جوڑوں، کتاب کی دفتیوں، قمیصوں کے بٹنوں اور گیندوں کے اندر بھی یہ پوشیدہ پیغامات پائے گئے ہیں۔

ایک شخص پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا لیکن اس کے اسباب میں کوئی چیز ایسی نہ ملی جس سے اس شبہ کو تقویت پہونچتی، اتفاق سے اس کے کنگھے کو خوردبین سے دیکھا گیا تو اس کے دانتوں پر کچھ نشانات نظر آئے جو فی الحقیقت پیغام تھے۔

۶۰ لاکھ پونڈ روزانہ کہاں جاتا ہے

کئی مہینے ہوئے لارڈ سائمن نے کہا تھا کہ اس جنگ میں برطانیہ کو روزانہ ۶۰ لاکھ پونڈ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی تقریباً سوا سات کروڑ روپیہ۔ لیکن یہ روپیہ کہاں جاتا ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

رائفل	۸ پونڈ
۱۶ انچ دہانے کے بحری توپ	۴۵ ہزار پونڈ

جنگی جہاز (۳۵۰۰۰ ٹن)	۸۰ لاکھ ۴۲ ہزار پونڈ
وِکرمشین گن	۲۰۰ پونڈ
آبدوز (۱۰۹۰ ٹن)	۳۴۹۰۵۰ پونڈ
ٹینک (۳۵ ٹن)	۲۵ ہزار پونڈ
۷ء۴ انچ دہانے کی توپ	۲۰ ہزار پونڈ
۷ء۴ انچ کا پھٹنے والا گولہ	۲ پونڈ
بڑا بمبار ہوائی جہاز	۲۰ ہزار پونڈ
لیوس گن	۶۰ پونڈ
غبارہ کی چھتری	۶۰ پونڈ

اشتہار کا ایک نیا طریقہ یوروپ کے ایک اخبار میں اشتہار شایع ہوتا ہے کہ "ایک لکھ پتی کو ایسی ہی صفات کی بیوی چاہیئے جو فلاں ناول کی ہیروئن میں پائی جاتی ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اس ناول کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوگئیں۔

پیرس میں جوانی کا معیار تم جوان ہو اگر روزانہ چاکولٹ کا ایک پیکٹ پورے لطف کے ساتھ کھا سکتے ہو لیکن تم کم جوان ہو اگر تم یہ کہو کہ "چاکولٹ مضرت رساں چیز ہے"

تم جوان ہو اگر تمھیں ایسے فلم یا ایسا لٹریچر پسند ہے جو تمھیں رونے پر مجبور کردے، لیکن تم جوان ہو اگر تم سب سے پہلے ایک آدمی کی آنکھیں دیکھتے ہو لیکن تم کم جوان ہو اگر تمھاری نگاہ پہلے اس کے ہاتھوں پر پڑتی ہے۔

تم جوان ہو اگر تم لوگوں سے اپنی ذہانت کی داد چاہتے ہو، لیکن کم جوان ہو اگر اپنے حُسن کی داد چاہتے ہو

ایک ڈاکٹر کی فیس اس وقت تک سب سے بڑی فیس جو کسی ڈاکٹر کو دی گئی۔ وہ تھی جو انگلستان کے ایک ڈاکٹر ڈمس ڈیل (*Thomas Dimsdale*) روس کی ملکہ کیتھرائن دوم نے ادا کی۔

ملکہ نے اس ڈاکٹر کو چیچک کا ٹیکہ لینے کے لئے روس بلایا تھا اور اس کا معاوضہ اس نے یہ دیا:

۹۰۰۰ پونڈ فیس — ۱۸۰۰ پونڈ مصارف سفر — ۵۰۰ پونڈ سالانہ کی پنشن۔

کھانے کا اندازہ میلوں سے ستاروں کی دوری "نوری سال" سے معلوم کیجاتی ہے اور ایک بوسہ کا وقفہ فلم کی طوالت سے، لیکن ہوائی جہازوں میں کھانے کا اندازہ

میلوں سے کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک نصف اُبلے ہوئے انڈے کا آرڈر دیا جائے تو اسکے طیار ہونے، سامنے آنے اور کھانے میں ۷۵ میل طے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہلکے ناشتہ میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ہوائی جہاز پر ۷۵ میل کے کھانے کا آرڈر دیا جائے گا تو آپ کو صرف ایک اُبلا ہوا انڈا ملے گا اور سو میل کے آرڈر پر ہلکا ناشتہ۔

ہیرا اور اسلحہ سازی عام طور پر ہیرے کو صرف زیب و آرائش کی چیز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اگر اس کا وجود نہ ہو تو بعض مہیب آلات جنگ طیار ہی نہ ہو سکیں۔ جن دھاتوں سے آلات حرب طیار کئے جاتے ہیں وہ خاص طور سے نہایت سخت طیار کی جاتی ہیں اور ان کے کاٹنے کے لئے جن اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی دھار بغیر ہیرے کی مدد کے بن ہی نہیں سکتی۔ یہ ہیرا ہی ہے جس کی مدد سے ٹینک اور جنگی جہاز طیار ہوتے ہیں۔ پٹرول کی فراہمی بھی بہت کچھ ہیرے پر منحصر ہے، کیونکہ بعض چٹانیں اتنی سخت آجاتی ہیں کہ بغیر ہیرے کی مدد کے ان کو کاٹا ہی نہیں جا سکتا۔ اس وقت دنیا میں جتنی معدنیں ہیرے کی ہیں، ان میں سے دو تہائی ہیرا، آلات بنانے کے کام آرہا ہے۔

ایک جرمن لیڈر کی دُعا اے خدا اگر ہماری مدد نہیں کرتا تو نہ کر، لیکن کم از کم یہی کر کہ ہمارے دشمنوں کو مدد نہ دے۔ مدعا یہ کہ جرمنی کا مخالف صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کوئی غیبی امداد اسے پہونچے ورنہ یوں ممکن نہیں۔

تنوعات

اٹلی میں باہر سونا لیجانے کی ممانعت ہے۔ خفیہ فروشوں نے یہ ترکیب کی کہ سونے کی کھونٹیاں اس قسم کی طیار کرائیں جیسی ریل کے فرسٹ کلاس ڈبوں میں لگائی جاتی ہیں اور ان پر نکل کی پالش کرا دی۔ ریل میں بیٹھنے کے بعد اس کی کھونٹیوں کو علحدہ کر لیا اور یہ کھونٹیاں لگا دیں۔ مقصود یہ تھا کہ جب اٹلی کی سرحد سے نکل جائیں تو سونے کی کھونٹیاں نکال لیں اور اسلی کھونٹیاں لگا دیں۔

گٹھیا اور اسی قسم کے امراض کا علاج شہد کی مکھیوں کے ڈنک سے، عہد قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا ———

——— اگر انسان کے جسم سے تمام نمک نکال لیا جائے تو ۴۸ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا

——— زمین کا سب سے زیادہ گہرا سوراخ وہ ہے جو کیلیفورنیا میں پایا جاتا ہے، یہ پٹرول کا کنواں ہے جو ۱۵۰۰۴ فٹ گہرا ہے۔

مطبوعات موصولہ

کلام الملوک حیدر آباد میں ایک انجمن "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کے نام سے قایم ہے جس کو نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس انجمن کا مقصود یہ ہے کہ ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شعرا و صاحبان تصنیف کے غیر مطبوعہ کلام کو شایع کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو کتابیں شایع ہوئی ہیں، انھیں میں سے ایک "کلام الملوک" ہے۔

اس میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کا فارسی کلام نہایت محنت و کاوش کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے اور مغربی انداز تحقیق و ترتیب کو سامنے رکھ کر یہ مجموعہ شایع کیا گیا ہے۔ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے نے جو اس انجمن کے شریک معتمد ہیں اس مجموعہ کو ترتیب دیا ہے اور ایک مختصر مقدمہ لکھ کر بتایا ہے کہ انھوں نے اس مجموعہ کی ترتیب میں کن کن کتابوں سے مدد لی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان پر تاریخی انتقاد بھی کیا ہے۔

اس قسم کے جواہر ریزے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یقیناً انجمن کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو ایسے خوش ذوق نادر کتب خانہ رکھنے والے امیر کی سرپرستی حاصل ہو سکی۔

جن بادشاہوں کا کلام دیا گیا ہے ان کی تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہے اور ان کا شجرۂ نسب بھی معہ مختصر حالات کے دیدیا گیا ہے۔ اس لئے کتاب کی اہمیت و دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ "آرٹ پیپر" استعمال کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں حسب ذیل بادشاہوں کا کلام پایا جاتا ہے:-

(بہمنی خاندان) سلطان محمد ثانی (یہ سلطان حسن گنگو بہمنی کا پوتا تھا) سنہ ۷۸۰ھ - سنہ ۷۹۹ھ -

سلطان فیروز شاہ بہمنی (سنہ ۸۰۰ھ - سنہ ۸۲۵ھ)

(عادل شاہی خاندان) یوسف عادل شاہ (سنہ ۸۹۵ھ - سنہ ۹۱۶ھ) - اسمٰعیل عادل شاہ (سنہ ۹۱۶ھ - سنہ ۹۴۱ھ)

ابراہیم عادل شاہ ثانی (سنہ ۹۸۸ھ - سنہ ۱۰۳۷ھ)

(قطب شاہی خاندان) یار قلی جمشید قطب شاہ (سنہ ۹۵۰ھ - سنہ ۹۵۷ھ) - محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ - سنہ ۱۰۲۰ھ)-

طوطی نامہ

یہ کتاب بھی "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" نے شایع کی ہے اور اس کے مرتب بھی میر سعادت علی رضوی ام - اے ہیں۔ یہ مثنوی غواصی کی ہے جو وجہی سے بہت پہلے ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا، جس نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال لکھنا شروع کی اور سلطان عبداللہ کے عہد میں طوطی نامہ لکھا (۱۰۴۹ھ) یہ شاہی دربار کا ملک الشعراء تھا اور بڑی عزت و مرتبت اس نے حاصل کی تھی طوطی نامہ اسی کی مثنوی ہے جسے فارسی زبان سے اس نے دکنی زبان میں منتقل کیا - اس فسانہ کا اصل ماخذ سنسکرت کی کتاب شوکا سپ تتی ہے جس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔

اس کے مقدمے میں تمام متعلقہ مسایل سے بسیط بحث کر کے طوطی نامہ کی شاعرانہ حیثیت اور عہد غواصی کی زبان پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کی طباعت و کتابت بھی نہایت نفیس ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہے۔

سیف الملوک و بدیع الجمال

یہ بھی غواصی کی مثنوی ہے اور انھیں خصوصیات کی حامل ہے جو طوطی نامہ میں پائی جاتی ہیں۔

پھول بن

ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ہے اور عبدالقادر سروری ام - اے نے مرتب کی ہے۔ پہلے دکن میں اردو مثنوی کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے اور پھر ابن نشاطی کے حالات لکھ کر مثنوی کا قصہ نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں مثنوی پھول بن ہے اس کی طباعت و کتابت میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

قصۂ بے نظیر

صنعتی کی مثنوی ہے جو محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر تھا - یہ مثنوی پھول بن سے پہلے کی ہے اور گیارھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی تھی - اس کی ترتیب بھی عبدالقادر سروری نے کی ہے۔

اردو مثنوی کا ارتقا

جناب عبدالقادر سروری ام - اے کی تصنیف ہے جس میں ابتدا سے اس وقت تک مثنوی کے تدریجی ارتقاء پر بحث کی گئی ہے - فہرست مضامین یہ ہے:

مثنوی کا درجہ اصناف شعر میں ــــ اردو مثنوی کے اولین نمونے ــــ طویل تر مثنویاں ــــ قدیم مثنوی کا سنہرا زمانہ ــــ بیجاپور کی مثنویاں ــــ گولکنڈہ کی مثنویاں ــــ مغلیہ عہد کی مثنویاں ــــ دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں ــــ دور متوسط میں مثنوی کی ترقی ــــ مثنوی دور جدید میں۔

کتاب بہت مفید و کار آمد ہے۔

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن اور قیمت عہ

مرقع سخن چوتھی جلد اس سے پہلے کی تین جلدوں میں عہد حاضر سے پہلے کے شعراء کا حال درج کیا گیا تھا اس مجموعہ میں جامعۂ عثمانیہ دکن کے چھبیس فارغ التحصیل شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد کا موجودہ دور شعر و شاعری میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ مولفۂ جناب عبدالمجید صدیقی ایم اے، ال، ال، بی استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔ علاوہ مقدمہ کے کتاب پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ دکن کے اس حصہ میں سلطنت کا آغاز کیونکر ہوا، دوسرے حصہ میں اس کے استحکام اور تیسرے میں اس کے عروج سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ زوال سے متعلق ہے اور پانچویں میں گولکنڈہ کی تمدنی، سیاسی و علمی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عمارات و سلاطین قطب شاہی کی گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب بہت مفید ہے اور تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت ہے ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن

افی جینیا جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے جس کا نام افی جینیا ہے یہ فسانہ یونانی تاریخ کے خرافیات سے متعلق ہے جس کو اس نام سے جناب دبیر حیدر آبادی نے اردو میں پیش کیا ہے قیمت ۱۰ روپے اور ملنے کا پتہ محبوب پورہ حیدر آباد دکن۔

اردو دانی پہلا حصہ اس زمانہ میں پڑھنے سے زیادہ پڑھانا محنت و ذہانت چاہتا ہے اور اس لئے فن تعلیم کو آج کل بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو سکھانے کی یہ پہلی کتاب محمد اظہر الدین صاحب مدرس مدرسہ خیریت آباد نے اسی فنی حیثیت سے لکھی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر حیدر آباد دکن ہے

اردو کے قاعدے نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳ - صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب سابق وزیر تعلیم بھوپال کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اصول تعلیم کے لحاظ سے ان میں ترتیب و تدریج کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک کتاب صاحبزادہ صاحب کی

مدرس کا قاعدہ نما بھی ہے جس میں مدرسوں کو ہدایتیں کی گئی ہیں کہ انھیں چھوٹے بچوں کی حروف شناسی اور حرفوں کے جوڑ پیوند کو سمجھانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنا چاہئے۔ ایک تیسری کتاب اس سلسلہ کی

اردو سکھانے کا آسان طریقہ بھی ہے اس میں صاحبزادہ صاحب نے بڑی عمر کے لوگوں کو پڑھانے کے طریقے بتائے ہیں۔ بظاہر یہ سٹ بہت مفید معلوم ہوتا ہے اور مکتبہ جامعۂ ملیہ دہلی سے ہے میں مل سکتا ہے۔

اُردو سکھانے کا سٹ جامعہ ملیہ کا مذکورۂ بالا سٹ کے ساتھ جامعۂ ملیہ نے اپنا مرتب کیا ہوا سٹ بھی ریویو کے لئے بھیجا ہے، اس میں یہ کتابیں ہیں:

ہندوستانی قاعدہ — ہندوستانی کی پہلی کتاب — اُردو پڑھنے کا قاعدہ — حرف کا قاعدہ۔ بچوں کا قاعدہ — رہنمائے قاعدہ — آسان قاعدہ — نئی کتاب۔

یہ تمام کتابیں طریق الصوت کے اُصول پر لکھی گئی ہے اور نفسیاتی حیثیت سے بچوں کے لئے زیادہ قابل قبول ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتابیں اسی وقت زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں، جب ان کے پڑھانے والے ملک میں پیدا ہوجائیں اور چونکہ جامعہ ملیہ کا ٹریننگ کالج اس کمی کو بھی پورا کررہا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کی یہ کوشش "کار آگہانہ" طریقہ سے جاری ہے جس سے ملک میں تعلیم کی عام ترویج کو بہت فایدہ پہونچے گا۔

تذکرۂ وقار اس کتاب میں مولوی محمد امین زبیری نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ نواب وقار الملک، سرسید کے خاص اعوان و انصار میں سے تھے اور نواب محسن الملک کے بعد، ام۔ اے۔ او کالج میں سکریٹری کی خدمات بھی انھوں نے عرصہ تک انجام دی تھیں۔

اس تصنیف کے تین حصے ہیں، ایک حصہ میں ان کی قیام حیدر آباد کے زمانہ کے حالات درج ہیں، دوسرے میں سکریٹری شپ ام۔ اے۔ او کالج کے عہد کا حال بیان کیا گیا ہے اور تیسرے حصہ میں ان کے زمانۂ آخر کے مشاغل سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب اپنی ترتیب و تہذیب اور فراہمی مواد کے لحاظ سے سیرت نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے اور اس کے مصنف چونکہ اس نوع کی تصانیف کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں اس لئے بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو فرو گزاشت ہوگیا ہو۔ عبارت بہت صاف و شگفتہ ہے اور طباعت و کتابت نہایت پسندیدہ۔ قیمت درج نہیں ہے اور نہ ملنے کا پتہ لیکن غالباً کتب خانہ مسلم یونیورسٹی سے دستیاب ہوسکے گی۔

حیاتِ سلطانی یہ تصنیف بھی مولوی محمد امین صاحب زبیری کی ہے جس میں نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے سوانح حیات درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کو عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم کے حضور میں باریابی کا موقعہ حاصل رہا ہے اس لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص اس تصنیف کا ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور نہایت صحت و خوبی کے ساتھ۔ بھوپال کے انسائی دورِ حکومت میں نواب سلطان جہاں بیگم کو کُل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھکر اس کتاب کو تصنیف کیا گیا ہے۔ جابجا تصاویر بھی پائی جاتی ہے جنھوں نے ظاہری

حیثیت سے بھی اس کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ غالباً مسلم یونیورسٹی ہوگا۔

دیوان انیق

مولانا محمد یعقوب انیق صدیقی مرحوم کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب انیق جونپور کے ایک صاحب علم خاندان کے نامور بزرگ تھے اور تصوف کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپ نہایت اچھے خطیب بھی تھے اور اردو، ہندی، فارسی و عربی زبانوں میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ اس نعتیہ مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ذات نبوی سے واقعی غیر معمولی محبت تھی اور بعض اشعار سے ان کے اس شغف کا پتہ چلتا ہے۔

فن شعر میں نعت گوئی ہجو گوئی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، لیکن کلام انیق میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو واقعی شعر کہے جا سکتے ہیں اور نعت بھی۔ کتابت و طباعت بہت معمولی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

دفتر طارق جونپور سے خط و کتابت کی جائے۔

بغداد کا جوہری

ایک ناول ہے جناب اشرف صبوحی دہلوی کا جسے انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے، لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ جناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے اس کی تمہید لکھی ہے اور صبوحی صاحب کی اس محنت و کاوش کی نہایت اچھے الفاظ میں داد دی ہے۔

قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

دوشیزۂ صحرا

یہ ترجمہ ہے مس جون کونکوسٹ کے انگریزی ناول کا۔ یہ قصہ عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے جس میں عربوں کی تمام خصوصیات کو نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ جناب صادق الخیری ایم۔ اے نے ترجمہ کرنے میں اس کا بڑا خیال رکھا ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ قیمت ۲ر اور ملنے کا پتہ کتب خانۂ علم و ادب دہلی۔

مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی

یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی کاوش کا نتیجہ ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن مقصود غالباً مسلم لیگ کی تاریخ کو خوشنما الفاظ میں پیش کرنا اور اس کے وجود کی اچھی تعبیر کرنا ہے۔ جس حد تک فراہمی واقعات کا تعلق ہے کتاب کے اچھے ہونے میں شک نہیں لیکن استخراج نتائج کے لحاظ سے مجھے اس سے جا بجا اختلاف ہے۔ فاضل مصنف کا آخر میں ایک جگہ یہ ظاہر کرنا کہ ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں میں صرف مسلم لیگ ہی کو تعمیری لائحۂ عمل پیش کرنے کا فخر حاصل ہے، ایسا عجیب و غریب انکشاف ہے جس پر جتنی حیرت کیجائے کم ہے۔ اس کی قیمت ۸ر اور ملنے کا پتہ، کتب خانۂ علم و ادب ہے۔

باسی پھول

مجموعہ ہے جناب علی عباس حسینی کے تیرہ افسانوں کا جسے مکتبۂ اردو لاہور نے شایع کیا ہے

جناب عباس حسینی کے فسانے ملک میں عام طور پر بہت مقبول ہیں اور غالباً یہ افسانے بھی مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہوں گے ۔ قیمت عمہ

ہندو ادیب

جناب ناظر کاکوروی نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ بتایا ہے کہ ہندو اہل قلم نے اُردو کی ترویج و ترقی میں اسوقت تک کتنا حصہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کو جتنے واقعات و حالات مل سکے ہیں وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر دئے ہیں ۔ اس زمانہ میں جبکہ ہندی و اُردو کا مسئلہ ملکی سوال بنکر رہ گیا ہے اس کتاب کی اشاعت بہت برمحل ہے اور امید ہے کہ اس کا مطالعہ ہندو مسلمانوں دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا ۔ قیمت عمہ اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ

سلطان محمود غزنوی

ترجمہ ہے مولوی محمد حبیب صاحب پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی کے ایک انگریزی مقالہ کا جو انھوں نے سلطان محمود غزنوی کے حالات پر تبصرہ کی حیثیت سے لکھا تھا ۔ پروفیسر حبیب چونکہ مسلم الثبوت مورخ ہیں اس لئے اصل مقالہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے ، رہا ترجمہ سو اس کی خوبی کا بھی اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا ۔ یہ کتاب [illegible] اکاڈیمی [illegible] کی ہے اور ایک روپیہ میں ملسکتی ہے ۔

حسین ابن علی

اس کتاب میں جناب نکہت شاہجہانپوری نے [illegible] حیثیت سے حسینؑ کی ہستی پر نگاہ ڈالی ہے اور اسی سلسلہ میں بعض ان ایرادات کا [illegible] کیا ہے جو واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں آپ پر عاید کئے جاتے ہیں ۔ گو کتاب مختصر ہے لیکن قوت بیان و زور [illegible] نظر سے جامع حیثیت رکھتی ہے گو اس باب میں کوئی قاطع فیصلہ نہ اس وقت تک ہوا ہے نہ ہو سکیگا ۔ کیونکہ مذہب والے اپنے اکابر کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی نہیں اور یہیں پر آکر اعتقادی قوت سپر ڈالدیا کرتی ہے ۔ بہر حال کتاب کافی محبت و ارادت کے ساتھ لکھی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے خوب ہے ۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

پس پردہ

چندر بھوشن سنگھ صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے ۔ زبان ، پلاٹ اور انداز بیان سب میں کافی دلکشی پائی جاتی ہے اور ان کے مطالعہ سے ہم کو سوسائٹی کے بہت سے مسایل پر غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے ۔ ہلکا سا مزاح بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے جس نے ان افسانوں میں اور زیادہ جان ڈالدی ہے ۔ یہ مجموعہ ۱۲ر میں ٹھاکر ابھیراج سنگھ وکیل جونپور سے ملسکتا ہے ۔

خبطی

ناول ہے محمد علی صاحب واحدی کا جو فی الحال طالب علم ہیں اور جنھوں نے طالب علمانہ زندگی ہی سے اس کا پلاٹ پیدا کیا ہے ۔ ہر چند واحدی صاحب ایک ذہین طالب علم ہیں اور ادب کا ذوق بھی رکھتے ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کو اس کتاب کی اشاعت پر کس چیز نے مجبور کیا ۔ مشق و مطالعہ کے زمانہ میں شہرت کی طلب کوئی اچھا جذبہ نہیں ، اگر وہ تعلیم سے فارغ ہو کے اور اپنی تحریر میں پختگی پیدا کرنے کے بعد یہ جسارت کرتے

تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس کی قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ ادارہ بک ڈپو لکھنؤ۔

جوئبار جناب ہیم سین صاحب ظفر ملتانی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب ظفر ابھی نوعمر ہیں لیکن نظموں سے کافی پختگی خیال ظاہر ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں اعتنا کے قابل ہیں، معلوم ہوتا ہے ظفر صاحب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ان کا مطالعۂ عالم وہی نزاکت رکھتا ہے جو ایک فطری شاعر کے مطالعہ میں پایا جانا چاہئے اگر ظفر صاحب کی مشق جاری رہی تو ایک وقت آئے گا کہ اردو کے اچھا کہنے والوں میں ان کا شمار ہوگا۔ اس مجموعہ کی قیمت ۱۲ روپے اور ملنے کا پتہ قصر اردو۔ ملتان چھاؤنی۔

آزادی کی نظمیں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے حلقۂ ادب مال روڈ لکھنؤ نے اس کتاب کو شایع کیا ہے اور سبط حسن صاحب اس کے مرتب ہیں، اس میں تقریباً تیس شعراء ماضی و حال کی وہ نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں جو وطن کے جذبۂ آزادی یا سامراجی حکومت کی طرف سے جذبۂ بیزاری سے متعلق ہیں۔

میرے خیال میں یہ پہلا مجموعہ ہے جو اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اردو میں شایع کیا گیا ہے، قیمت ایک روپیہ ہے

دارالسلام جناب ذاکر لکھنوی کے چند سلاموں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے۔ جناب ذاکر، حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد ہیں اور انھوں نے اپنے استاد کے سادہ و سلیس لیکن پر معنی رنگ کو ان سلاموں میں پوری طرح نباہنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مجموعہ ۸ر میں شائننگ بک ڈپو امین الدولہ پارک لکھنؤ سے ملسکتا ہے۔

محبت کے افسانے مختصر سا مجموعہ ہے الطاف حسین رشدی (بیاور) کے چند عشقیہ مقالوں کا جو انھوں نے پورے جوش شباب کے ساتھ لکھے ہیں۔ گو جناب رشدی نوعمر ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اندر "عشق کہن سال" پنہاں ہے، خدا خیر کرے۔

یہ مجموعہ محمد سعید خاں آزاد سے جامع مسجد بیاور (راجپوتانہ) کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

قول احسن دفتر امت مسلمہ امرتسر نے یہ رسالہ شایع کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی فرقہ بندی کو مٹا کر ایک مرکز پر لانا ہے۔ اس میں تمام استدلات کلام مجید سے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر ہے۔

برق و باراں مجموعہ ہے جناب برق کرمانی کی قومی و ملی نظموں کا، جن میں سے کوئی اس وقت تک میری نگاہ سے نہ گزری۔ معلوم نہیں رسائل و جرائد میں ان کی اشاعت ہوئی ہے یا نہیں۔

تمام نظمیں انقلاب انگیز جذبات سے لبریز ہیں اور اسی جوش و ولولہ کے ساتھ لکھی گئی ہیں، جو ایک جانباز مخلص انقلابی کے دل میں پایا جانا چاہئے۔

زبان و شاعری کے لحاظ سے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان بلکہ کمسن شاعر کیونکر اس پختہ کارانہ اسلوب بیان پر قادر ہو سکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ صرف اُردو ادب کے موجودہ طوفان خیز رجحانات کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو "برق و باراں" کے ذکر سے اس کے صفحات خالی نہ ہوں گے اور شمیم کرمانی کا نام بھی قلمی مجاہدین کی فہرست میں نمایاں طور پر نظر آسکے گا۔

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی پسندیدہ ہے اور ایک خصوصیت اس مجموعہ کی جو مجھے بہت پسند آئی، یہ ہے کہ اس میں کسی کا "مقدمہ" شامل نہیں ہے۔

قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ انڈین بُک ڈپو لکھنؤ

شمیم سخن ہور ضلع بستی میں ایک بزم ادب قایم ہے اور یہاں ایک عقد کی تقریب میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ "مساہرہ" بھی، یعنی غزلوں کے ساتھ سہرے بھی سنائے گئے تھے ——

سید شبیہ الحسن صاحب رضوی نے انھیں غزلوں اور سہروں کو ایک مقدمہ اور روئداد کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ پہلے پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا تعارف ہے اور اس کے بعد "حکایات بیگانہ" کے عنوان سے شبیہ الحسن صاحب نے اُردو ہندی کی بحث چھیڑی ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ اس کے بعد روئداد مشاعرہ بیان کی ہے، جسے کلام شعراء پر ایک سرسری تبصرہ کہنا چاہئے اور آخر میں سہرے اور غزلیں درج کردی ہیں۔ قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ ۱۳ - مارلین کورٹ علی گڈھ۔

انڈین میوزک اس کتاب کے مولف جناب ام محتشم ہیں، جو علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور تمام مبادیات نہایت سہل و صاف الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

پندرہ مشہور و متداول راگوں کا نوٹیشن بھی دیا ہے اور تال کو بھی اچھی طرح سمجھایا ہے۔ ہارمونیم سیکھنے والوں کے لئے بھی نہایت مفید نقشے اس میں پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی جس سے اس قسم کی اُردو کتابیں خالی ہوتی ہیں، اس کی طباعت و کتابت ہے۔ یہ کتاب مجلد، نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین اہتمام کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ یہ ہے:—

میوزک پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

علم

معنی و لفظ کے پیچوں میں اُلجھنے والو!
کشمش نقش و دو اثر پہ تمھاری ہے نگاہ
علم کو تم نے لکیروں میں کیا ہے محدود
اصطلاحات کے جادو کا اثر ہے تم پر
تم نے الفاظ کو برتا ہے کھلونوں کی طرح
اُن پہ تم علم و بصیرت کا سمجھتے ہو مدار
علم ہے منزلِ عرفان و ہدایت کا چراغ
علم سے تربیتِ فکر و نظر ہوتی ہے
علم سے رمزِ حقایق کی گرہ کھلتی ہے
علم سے بے جین بھی کرتا ہے بعنوانِ عمل
علم، ہر غیب کے پردے کو بناتا ہے شہود
علم ہے گلکدۂ جذب و یقیں کی خوشبو
علم ہے مرہمِ دل، علم ہے تسکینِ ضمیر
علم سے رومی و عطار نے پایا تھا فروغ
علم ہے فقر میں جو رتبۂ شاہی سے بلند
"رب زدنی" کی صدا، علم کی آوازِ جرس
علم ہے نور، جہالت ہے بھیانک ظلمت
علم بے سوزِ یقیں کیا ہے؟ حجابِ اکبر

تم نے سمجھا ہی نہیں علم کا معیار و مقام
تم نے کاغذ کے تراشوں کو بنایا ہے امام
تم پرستار ہوا عداد کے، نقطوں کے غلام
ایک ہی شے کی بنائی ہیں، بہت سی اقسام
تم نے تخئیل سے تعمیر کئے ہیں اصنام
وہ مسایل جو بہت دن سے ہیں مشہورِ عوام
علم ہے معرفتِ انفس و آفاق کا نام
علم فطرت کی صدا، علم خودی کا پیغام
علم کی زد میں لرزتے ہیں شکوک و اوہام
علم آرام بھی دیتا ہے بشکلِ الہام
علم مستقبل و ماضی میں ہے اک ربطِ تمام
علم سے فکر و تصور کا معطر ہے مشام
علم سب کچھ ہے اگر اُس سے لیا جائے کام
علم نے فکرِ غزالی کو بنایا تھا امام
اُس کی تقدیر! جسے علم کا حاصل ہو مقام
علم کے رہبر و رہرو پہ ٹھہرنا ہے حرام
علم ہے صبحِ چمن، جہل ہے مرگھٹ کی شام
اس میں منطق ہو کہ سائنس ہو یا علمِ کلام

علم بے جذبِ خودی کچھ نہیں جز مکر و فریب
جس طرح جوہرِ شمشیر سے خالی ہو نیام

ماہر القادری

ایک گمراہ دوست سے!

چمن میں تجھکو مثلِ آفتابِ نو ابھرنا تھا   مگر تو سازِ ہستی کو فقط رنگ و نوا سمجھا
دکھاتا ہی رہا میں تجھ کو آئینہ حقیقت کا   مگر تو سنگ ریزوں ہی کو اپنا آئینہ سمجھا
بھرا رکھا رہا امرت ترے گلرنگ پیالوں میں   مگر تو، زہر کے جرعوں کو کیفِ جانفزا سمجھا
تجھے تھی جستجو اک قلبِ ایمن زار کی شاید   مگر تو، کرمکِ شب تاب کو ماہ دسہا سمجھا
پہونچنا تھا بہر صورت تجھے بر وقت منزل پر   مگر تو شورِ بے ہنگام کو بانگِ درا سمجھا،
پکارا کی حقیقت تجھ کو اکثر گوشۂ دل سے   مگر تو نے نہ اس دل کو حقیقت آشنا سمجھا
خلوص و صدق کی آنکھوں نے برسائے بہت موتی   مگر تو اوس کے قطروں کو درِ بے بہا سمجھا
جفا اک چیز ہے مردود، دنیا بھر کی نظروں میں   مگر تو نے اسے بھی داخلِ کیشِ وفا سمجھا
ضرورت تھی کہ مہرِ علم تیری رہبری کرتا   مگر تو نے جہالت کو چراغِ رہنما سمجھا
تری خاطر تو اُٹھ سکتے تھے بزمِ طور کے پردے   مگر تو خاک کے ذروں کو اپنا مدعا سمجھا
چھری تو پھیر دی تو نے بروٹسؔ بنکے سیزرؔ پر   مگر تو فطرتِ کیشیئسِ بدبیں کو کیا سمجھا
ارے میں تجھ کو شہزادہ بناکر تاج پہناتا!   مگر تو اس کہانی ہی کو بے انجام سا سمجھا

مجھے معلوم ہے انسان اصلیت میں حیواں ہے
مگر میں نے تجھے کیوں ان حدوں سے ماورا سمجھا؟

فضل الدین اثر ایم-اے

Cassius Caesar Brutus

اعتذار

کل وعدہ خلافی پہ تجھے دیکھ کے نادم　　آیا مرے شکووں کی جبینوں پہ پسینا،
وہ تجھ پہ نظر کر کے مری شکر گزاری　　وہ حال مرا دیکھ کے آنسو ترا پینا!
وہ ضبط سے باہر مرے جذباتِ محبت　　وہ تنگ مئے کہنہ پہ گنجایشِ مینا
ماتھے پہ بھڑکتے ہوئے بیتابی کے شعلے　　چہرے پہ برستا ہوا ساون کا مہینا
ہیجان سے گویائی گرانبار، مگر ہاں　　غماز اُدھر حال ادھر دیدۂ بینا،
گردن میں خم۔ آنکھوں میں تری جرم کا اقرار　　دہکے ہوئے رخسار۔ دھڑکتا ہوا سینا
آنچل میں گرہ دے کے کسا زور سے اسکو　　قالین کے ریشوں سے نکالا کبھی کینا
نظروں کو بچانا کہ مبادا مجھے ملجائے　　آنکھوں میں جو جذبات کا رہتا ہے خزینا
گیسو میں لگا تار شکن فرقِ حسیں تک　　بنتا ہوا زائر کی نظر کے لئے زینا،
وہ دیدۂ میگوں میں اُبھرتا ہوا آنسو،　　سونے کی انگوٹھی پہ وہ ہیرے کا نگینا
وعدے پہ اگر تو نہیں آیا تو ہوا کیا؟　　میں نے کوئی دم، نزع کی شدت ہی سہی نا؟

مرنے پہ بھی گر میرے تجھے ہو یہ ندامت
منظور ہے تسکین ابد تک مجھے جینا

رزمی صدیقی (بی-اے)

غزل:

ہے سہل جو تو عقدِ ثریا سے گزر جا　　بے خوف و خطر ملجا و ماوئی سے گزر جا
اے راہروِ عشق یہ توہینِ وفا ہے　　اب آرزو و شوق کی دُنیا سے گزر جا
اب دل کو بنا آئینۂ حُسنِ حقیقی　　اور عارض و کاکل کی تمنا سے گزر جا
اس بزم گہ ہوش کے جلوے ہیں سرابی　　اس بزم کے ہر ذوقِ تماشا سے گزر جا
تخئیل کے رفعت کو اُڑاتا ہوا دم لے　　پرواز وہ کر عرشِ معلّٰی سے گزر جا
یہ وادیِ پُر خار ہے اور راہروِ عشق　　دامن کو بچاتا ہوا دنیا سے گزر جا
لیلائے تخیل پہ تو اس طرح فدا ہو　　رخسار سے اور زلفِ چلیپا سے گزر جا
کافی ہے تجھے اس دلِ پر شوق کی مستی،　　ہاں آرزوِ مستیِ صہبا سے گزر جا

لا اپنی نظر میں نہ یہ پستی و بلندی
یوں بیخود و سرشار ہو تو دنیا سے گزر جا

نبی احمد بریلوی

جگر بریلوی:

رہینِ غم تو رہے رازِ غم سمجھ نہ سکے
مآلِ کشمکشِ زیست ہم سمجھ نہ سکے

اُسے حیات سی نعمت عطا نہ کرنا تھا
طرب طرب کو جو اور غم کو غم سمجھ نہ سکے

جئے تمھارے لئے جان دی تمھارے لئے
ہمارے تم بھی ہوا افسوس ہم سمجھ نہ سکے

نہ جینے میں ہمیں راحت ملی نہ مرنے میں
حیات و مرگ کو جُز نوعِ غم سمجھ نہ سکے

حیات و مرگ تھی مرگ و حیات کی تقریب
ستم رہا کہ تمھارا کرم سمجھ نہ سکے

جنوں جنوں تھا خرد بھی تھی ایک نوعِ جنوں
بہار لالہ و گل کیا تھی ہم سمجھ نہ سکے

گداگری کا بھرم بے نیازیوں سے رہا
میرے سوال کو اہلِ کرم سمجھ نہ سکے

عطا ہوئی ہمیں ہستی بھی نیستی بھی مگر
مآلِ کار وجود و عدم سمجھ نہ سکے

کبھی خوشی میں تھا غم اور کبھی خوشی غم میں
تھے اس قدر غم و شادی بہم سمجھ نہ سکے

گزارنے کو تو ہم نے گزار دی اک عمر
ہمیں بھی کچھ ہوا حاصل یہ ہم سمجھ نہ سکے

ظہورِ جلوہ بھی تھا اک حجابِ حسن جگرؔ
کچھ اور اس کے سوا خود کو ہم سمجھ نہ سکے

قیصر:

قدم جنونِ محبت میں ڈگمگا نہ سکے
ہماری راہ میں کانٹے بھی سر اُٹھا نہ سکے

کھلی ہیں سیکڑوں راہیں جنوں زدوں کے لئے
بلا سے ہوش پرستوں میں بار پا نہ سکے

نرالی وضع ہے تیرے نیازمندوں کی
یہ روٹھ جائیں تو دنیا انھیں منا نہ سکے

بہارِ خلد سکونِ دلِ حزیں کے لئے؟
خطا معاف اگر اعتبار آ نہ سکے

وہی ہیں داد کے خواہاں بھی مجھ سے محشر میں
بگاڑ کر جو مقدر مرا بنا نہ سکے

نقابِ عیشِ غمِ جاوداں کے چہرہ پر!!
خزاں نصیب فریبِ بہار کھا نہ سکے

خجل کھڑے ہیں سرِ حشر رحمتِ حق سے
وہ بدنصیب جو لطفِ گنہ اُٹھا نہ سکے

بہار ہو کے خزاں مسکرا کے رہ جائے
جو اپنے غم کو غمِ جاوداں بنا نہ سکے

نکال اپنی خزاں میں بہار کے پہلو
وہ چشمِ تر ہی نہیں پھول جو کھلا نہ سکے

فریبِ رنگ نہ دے مجھکو کارسازِ بہار
بہار کیا جو کلی دل کی مُسکرا نہ سکے

خیال آتے ہی قیصرؔ ٹپک پڑے آنسو
ہم اپنا درد کسی بزم میں سنا نہ سکے

قند پارسی

ہست، وا لیعقل کن از مے بگذر از اہل عقول تا زیادمن غم ہستی وے گر دد ذہول
نقش غم را از دلم شوئید باآب طرب زانکہ از فضل وکمال خود ملولیم وملول
تا نمیگیری سراحی تا نہ بگذاری سراح، کے رسی بر منزل عشق و مقامات وصول
جز بنور بادہ کشف راز حق باشد محال شرح کشاف اینقدر برمن مخواں اے بالفضول
آتش تر زن دریں طومار خشک قیل وقال غرق مے کن دفتر قاموس وہم شرح فصول
در کتاب ہردو ملت نیست حرف خوشدلی گرچہ دردے نوبنو ہستند ابواب وفصول
معنئ عیش مخلد در خط ساغر بجوئے بس ہمیں علم المعانی بس ہمیں علم الاصول
حالیامن زندہ ام ہرانچہ خواہی زود کن تو زفرصت غافلی و مرگ من باشد عجول
اے سحاب لطف باری برمن خاکی ببار اے غمام رحمت حق کن بروے من نزول
کشتۂ بیداد دادت از کہ گیرد داد دل چوں بحق خویشتن او خود ظلوم ست وجہول

مدعی وانجمن آرائی نام ونمود،
شرم بادت اے فلک امید وہم کنج خمول

(ابوالکمال) اُمید امیٹھوی

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین رشید:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ شاداب و فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ ۸ر

میدانِ عمل:۔ ملک کے مشہور ومعروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو انکے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے قیمت مجلد عہ ۸ر

بیوہ:۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ ر

منیجر نگار لکھنؤ

نومبر ۱۹۴۶

قیمت

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجۂ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد (۴۸) — فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۴۰ء — شمار (۱)

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمار - ۱	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	جلد - ۳۸

ملاحظات

رفتارِ جنگ

دُنیا کی تاریخ میں فتح و شکست کی شاید ہی کوئی ایسی عجیب و غریب مثال آپ کو نظر آئے جیسی اسوقت فرانس کے میدانِ جنگ میں نظر آئی ہے

فرانس ایسی عظیم الشان سلطنت، جو تمام نو آبادیوں کو ملاکر گیارہ کرور انسانوں پر حکمراں تھی، جس کی ۵۵ لاکھ فوج دُنیا کی بہترین آراستہ فوج سمجھی جاتی تھی، جو دُنیا کی بری بڑی بحری قوتوں میں چوتھے نمبر پر شمار ہوتی تھی، جس کی زمین سالانہ ۴۸ ملین ٹن کوئلہ، ۳۸ ملین ٹن لوہا اور ۸ ملین ٹن فولاد کی دولت اُگلتی رہتی تھی اور جس کے پاس ۴۰ کرور پونڈ کا سونا محفوظ تھا ایسی زبردست حکومت کا صرف دو ہفتہ کے اندر جرمن افواج کے سامنے ہتھیار ڈالدینا اور باوجود برطانیہ کی حمایت و تقویت کے، نازی حکومت کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرلینا، تاریخ عالم کا اس قدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری مثال اس کی مل سکے

یقیناً جرمن فوجوں کی تعداد زیادہ تھی، ان کے اسلحہ بھی بہتر تھے، ان کا طریقِ جنگ بھی نیا تھا، تاہم فرانس کا اس بُری طرح ہمت ہار دینا کہ وہ پولینڈ کے برابر بھی حملہ نہ جھیل سکے اور دس بارہ دن کے اندر ہی اندر صدیوں کی بنی بنائی

شوکت و جبروت خاک میں مل جائے، کوئی خاص معنی رکھتا ہے اور بلا شبہ اس کا تعلق کسی ایسے راز سے ہے جس کا صحیح حال دنیا کو غالباً اختتام جنگ ہی کے بعد معلوم ہوگا

جس وقت نازی فوجوں نے اپنا رُخ فلانڈرس کی طرف کیا تو جنرل ویگان نے اس کو اپنے لئے فالِ نیک قرار دیا، کیونکہ اس طرح انھیں مہلت مل گئی تھی کہ وہ پیرس اور نازی افواج کے درمیان ایک زبردست خطِ مدافعت قایم کرکے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے، لیکن جب جرمن فوجیں، فلانڈرس سے فارغ ہو کر فرانس کی طرف پلٹیں تو جنرل ویگان اور ان کی فوجوں کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو گئی کہ ان کا کلاسکل طریقِ جنگ جرمنی کے نئے اندازِ حرب کا حریف نہیں بن سکتا اور ابتدا ہی سے فرانسیسی فوجوں میں بددلی کے آثار پیدا ہو گئے چنانچہ جرمنی کے ہزاروں ٹینکوں نے بڑھنا شروع کیا اور فرانسیسی افواج نے ہٹنا، یہاں تک کہ اس آگ کے شعلے پیرس تک پہونچ گئے اور سارے ملک میں انقلاب کی ایک لہر دوڑ گئی جسنے رینآں کی وزارت سے جو جنگ کی حامی تھی استعفےٰ کا مطالبہ کیا اور اسکی جگہ جنرل پیٹاں کی وزارت قایم ہوئی جو اس جنگ کو ختم کرنیکا حامی تھا۔ فرانسیسی فوج کے انتشار اور ملک کی بد دلی کا جو عالم تھا، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت بورڈو کے ہوٹل میں رات کو جنرل پیٹاں کی بعد میں کیبنٹ کا جلسہ ہوا تو ایک فرانسیسی سپاہی بھی پہرہ دینے کے لئے موجود نہ تھا

نازی فوجیں تعاقب کر کر کے فرانسیسی افواج کو گرفتار کر رہی تھیں، خط میزنو جسے اس وقت تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، بچوں کے گھروندے کی طرح ٹوٹ رہا تھا، سولیین آبادی انتہائی انتشار و اضطراب کے عالم میں کوہ وصحرا کی خاک چھانتی پھر رہی تھی اور مطلق سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جرمنی کے اس سیلاب آتش و آہن کو کیونکر روکا جائے۔ اب سے ۷۰ سال پہلے بھی ٹیوٹانک توم کا خنجر فرانس کے حلق تک پہونچا تھا، لیکن اس مرتبہ جس بے بسی اور بے کسی کا اظہار فرانس کی طرف سے ہوا وہ تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ ہے

امداد کا وعدہ کرنے والوں کی طرف سے نازی دیوتا پر جتنی قربانیاں چڑھائی جا سکتی تھیں، چڑھائی جا چکی تھیں اور فرانس کے لئے جو بد قسمتی سے برطانیہ کے "ایفاء عہد" تک زندہ نہ رہ سکا سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو نازیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، چنانچہ ٹھیک اسی جگہ اور قریب قریب اسی تاریخ کو جب ۱۹۱۸ء میں جرمن حکومت کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تھے، اب فرانس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے اور دنیا حیرت سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔

جرمن و فرانس کے درمیان عارضی شرائط صلح کا اجمالی حال اخباروں کے ذریعہ سے سب کو معلوم ہو چکا ہے میں نے "اجمال" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ جو صلح نامہ فلس کیپ سایز کے تیس گنجان ٹائپ کئے ہوئے صفحا کو محیط ہو وہ یقیناً بہت سی ایسی تفصیلی باتوں کا بھی حامل ہوگا جن سے اس وقت تک دنیا کو بے خبر رکھا گیا ہے لیکن جو اجمالی بیان شایع ہوا ہے وہ بھی اتنا سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ فرانس کی عظمت دیرینہ بالکل ختم ہو چکی اور باوجود

اس کے کہ جنرل پیتاں کی وزارت اس صلحنامہ میں کوئی بات ایسی نہیں باقی ہو فرانس کی عزت کو صدمہ پہونچانے والی ہو، فرانسیسی قوم یقیناً ذلیل ہو چکی اور اس کی باعزت زندگی اب اسوقت تک واپس نہیں آسکتی جب تک نازی حکومت کو شکست نصیب نہ ہو اور اس کے حلق سے تمام ان حکومتوں کو ایک ایک کرکے نہ اُگلوایا جائے، جن کو وہ اس وقت تک ہضم کر چکا ہے

اس صلحنامہ کی رو سے، تمام شمالی و وسطی فرانس معہ تمام مغربی سواحل کے جرمنی کے قبضہ میں رہے گا، فرانس کے بحری بیڑے کا بڑا حصہ جرمنی کی نگرانی میں چلا جائے گا اور تمام فوجی ادارے - حملہ ذخایر جنگ کے نازی حکومت کے حوالہ کردئے جائیں گے اور اسی کے ساتھ فرانس کو اُن نازی افواج کے مصارف بھی ادا کرنے پڑیں گے جو اختتام جنگ تک فرانس پر قابض رہیں گی

ان شرایط کے مطالعہ سے نازی حکومت کا اصل مقصود پوری طرح واضح ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فرانس کی طرف سے برطانیہ کی تمام امیدیں بالکل منقطع ہوجائیں اور بلجیم و فرانس کے مغربی سواحل پر قابض ہو کر وہ خلیج لیسکے (Biscay) اور رود بار انگلستان کو برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کے لئے خطرناک بنا دے۔ اسی کے ساتھ آپ اگر ان شرائط کو بھی پیش نظر رکھیں جو اٹلی اور فرانس کے درمیان طے پائی ہیں، تو اس خیال کو اور مزید تقویت پہونچتی ہے، کیونکہ ان شرایط کی رو سے فرانس کا اقتدار بحر روم اور سواحل افریقہ سے بھی ختم ہوجاتا ہے اور اس طرح گویا بحر شمال سے لیکر بحر روم تک سارے حصۂ آب کو برطانیہ کی بحری نقل و حرکت کے لئے خطرناک بنانے کی اسکیم ہٹلر کے پیش نظر ہے

گزشتہ جنگ کے بعد اس میں شک نہیں کہ براعظم یورپ میں فرانس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور مشرقی یورپ کی اتحادی پالیسی میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ یورپ کی بین الاقوامی سیاست اور مجلس اقوام کی کمزوری نے فرانس کی اس اہمیت کو رفتہ رفتہ کم کرنا شروع کیا اور جرمنی کو موقعہ دیا جاتا رہا کہ وہ معاہدۂ ورسائی کی خلاف ورزی کرکے آہستہ آہستہ اپنی قوت کو بڑھاتا رہے۔ پھر فرانس اور برطانیہ یہ تو ضرور سمجھتے تھے کہ جرمن قوم اپنے گزشتہ نقصانات کی تلافی اپنی صنعت و تجارت کے ذریعہ سے پوری طرح کر سکتی ہے، لیکن اس کی فوجی طیاریوں کی طرف سے دونوں کی آنکھ بند تھی اور یہ بے خبری برابر قایم رہی یہاں تک کہ ایک ایک کرکے اس نے پولینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ و بلجیم پر قبضہ کرلیا اور جب آخر میں اسنے ۴۰ ہزار ٹینکوں اور بے شمار طیاروں سے فرانس پر حملہ کیا تو اقرار کرنا پڑا کہ جرمنی کی یہ کامیابیاں صرف اس کی زبردست فوجی طیاریوں اور خوبی اسلحہ کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اتحادیوں کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ اس قسم کی طیاریاں نہ کریں اس کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک نے دوسرے کی قوت کا غلط

اندازہ لگایا تھا، نہ اتحادیوں کے وہم گمان میں یہ بات آسکتی تھی کہ نازی حکومت کی فوجی طیاریاں اس قدر زبردست ہوسکتی ہیں اور نہ نازی حکومت اس سے واقف تھی کہ فرانس فوجی طیاریوں کے لحاظ سے اس قدر پیچھے ہے

اس میں شک نہیں کہ نازی حکومت کی گزشتہ سات سال کی تاریخ سوائے مکر و فریب اور جھوٹ کے کچھ نہیں لیکن اس جھوٹ کے انبار میں ایک بات سچ بھی تھی وہ یہ کہ اس کی فوجی طیاریاں غیر معمولی حد تک پہونچ گئی ہیں اور اسی ایک سچ کو جھوٹ سمجھنے کا خمیازہ اسوقت سارے یوروپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے

اب جنگ جس نقطہ پر پہونچ گئی ہے اس نے بیشک ہمیں فیصلہ کن ساعت سے قریب تر کر دیا ہے لیکن سوال یہی ہے کہ وہ فیصلہ کیا ہوگا اور یہ دور آمریت ختم ہوگا یا نہیں۔ اسوقت ساری دنیا کی نگاہیں انگلستان کی طرف لگی ہوئی ہیں جو جمہوریت کی طرف سے اکھاڑہ میں تنہا مقابلہ کے لئے رہ گیا ہے اور اسی کی پوزیشن پر ہمیں غور کرنا ہے

اس میں شک نہیں کہ فرانس کے ہمت ہار دینے سے برطانیہ کا ایک بازو ضعیف ہوگیا ہے، لیکن چونکہ انگلستان جزیرہ ہے اور جرمنی کو یہاں ٹینکوں سے حملہ کرنے کی وہ آسانیاں حاصل نہیں جو فرانس میں حاصل تھیں، اسلئے لامحالہ فیصلہ بحری جنگ پر آکر ٹھہرے گا جس میں برطانیہ کا تفوق ظاہر ہے

ہرچند عارضی شرائط صلح کی رو سے فرانسیسی بیڑے، جرمنی کی نگرانی میں چلے جاتے ہیں، اور اس نگرانی کے معنے یہ ہیں کہ وہ عہد شکنی کرکے اُن سے کام بھی لے سکتا ہے لیکن چونکہ فرانسیسی نوآبادیاں اس صلح کی طرفدار نہیں ہیں اور وہ فرانس کی آزادی کے لئے اب بھی لڑنے کے لئے طیار ہیں، چنانچہ شام کے فرانسیسی سپہ سالار، انڈو چائنا کے گورنر اور تیونس و مراکش وغیرہ کے حاکموں کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ مرکزی حکومت کے احکام کی تعمیل نہیں کریں گے، اس لئے ممکن ہے کہ فرانسیسی بیڑے کا بڑا حصہ جو بحر روم یا دوسرے سمندروں میں پایا جاتا ہے بدستور آزاد رہے اور برطانیہ کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لے۔ اگر یہ قیاس صحیح نکلا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جرمنی کبھی انگلستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کرے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ اگر فرانسیسی بیڑے جرمنی کے قبضہ میں نہ آئے یا انھوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا، تو اٹلی اس کمی کو پورا کرے گا، لیکن یہ خیال درست نہیں اٹلی نے تو اپنے اندازہ کے مطابق اسوقت جنگ میں اپنی شرکت کا اعلان کیا تھا جب اس کے نزدیک میدان صاف ہوچکا تھا اور فرانس کی شکست کو اس نے لڑائی کا انجام سمجھ لیا تھا، لیکن فرانس کی شکست کے بعد بھی صورت وہی باقی رہتی ہے اور بحر روم میں وہ اپنی کمزوری کو پوری طرح محسوس کرچکا ہے، اس لئے اٹلی جرمنی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا، بلکہ خیال یہ ہے کہ کہیں اُس کا بوجھ خود جرمنی کے لئے ناقابل برداشت نہ ہوجائے، کیونکہ اب چاروں طرف سے اس کی ناکہ بندی ہوچکی ہے اور اس کے سواحل اتنے کھُلے ہوئے ہیں کہ وہ عرصہ تک مقابلہ کی تاب لا ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں جرمنی کی ایک چال اور بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اسپین کو بھڑکا کر

شرکتِ جنگ پر آمادہ کرے، کیونکہ جنرل فرانکو کی حکومت ہٹلر اور مسولینی ہی کی مدد سے قایم ہوئی ہے، چنانچہ ہسپانیہ کی طرف سے مطالبۂ جبرالٹر کی خبریں اس دوران میں ایک دو بار سننے میں آئی ہیں، لیکن چونکہ وہاں کی جمہوری جماعت میں بدستور بےچینی پائی جاتی ہے اس لئے اگر جنرل فرانکو نے جبرالٹر کے لئے جنگ چھیڑ دی تو یہ بات خلاف قیاس نہیں کہ وہاں پھر خانہ جنگی شروع ہو جائے اور فرانکو کی نئی قایم کی ہوئی حکومت جو ہنوز متزلزل حالت میں ہے ختم ہو جائے بہرحال اٹلی اور اسپین کی طرف سے نازی حکومت کو کوئی توقع نہیں ہے اور نہ ان کی امداد کے بھروسہ پر وہ انگلستان پر حملہ کر سکتا ہے

اس مسئلہ میں روس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کی پالیسی اس قدر مشتبہ ہے کہ نہ نازی حکومت اس پر بھروسہ کر سکتی ہے نہ برطانوی حکومت۔ عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پہلے بالٹک ریاستوں پر قبضہ کیا اور اب رومانیا سے بسربیا اور بکووینا بھی لے لیا ہے۔ اس سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ اگر روس نے رومانیا کی طرف پیشقدمی کی تو سارے بلقان میں آگ لگ جائے گی، کیونکہ برطانیہ رومانیا کی حفاظت کی ذمہ داری لے چکا ہے اور اٹلی بھی روس کی اس مداخلت کو پسند نہیں کر سکتا، لیکن چونکہ اس دوران میں خود رومانیا کے فرمانروا شاہ کیرول نے ڈکٹیٹروں کی سی حیثیت قایم کر لی ہے اور اس کا میلان نازی حکومت کی طرف زیادہ ہے اس لئے اگر وہ خود اپنی خوشی یا ہٹلر کی مرضی سے بسربیا روس کو واپس دینا پسند کرتا ہے تو برطانیہ کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، لیکن عجب نہیں اگر بلغاریہ بھی اپنا کھویا ہوا علاقہ ڈبروجا رومانیا سے واپس مانگے اور ہنگری بھی ٹرنسلونیا کا مطالبہ کرے۔ بلغاریہ روس کی طرف مایل ہے اور ہنگری جرمنی کی طرف اس لئے معاملہ پھر وہی روس و جرمنی کے سمجھوتہ کا رہجاتا ہے اور چونکہ جرمنی کی موجودہ پالیسی بلقان میں جنگ چھیڑنے کی حامی نہیں ہے اور روس کی مصلحت اندیشی بھی جرمنی سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی اس لئے ممکن ہے کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ آسانی سے ہو جائے، لیکن اگر بلغاریہ نے اپنا مقدونیا والا علاقہ بھی یونان اور یوگوسلیویا سے لینا چاہا تو بگڑی الجھ جانے کا اندیشہ ہے اور پھر ترکی کو بھی اس آگ میں پھاندنا پڑے گا اور برطانیہ کو بھی

ایشیا پر اسوقت تک جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا، لیکن فرانس اور ہالینڈ کی شکست نے انڈو چائنا اور ایسٹ انڈیز کے معاملہ کو البتہ اہم بنا دیا ہے اور جاپان دونوں پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈال رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ قصداً چھیڑ نکالکر ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس صورت میں امریکہ کا خاموش بیٹھا رہنا مشکل ہوگا۔ شنگھائی میں بھی جاپان کی پالیسی جارحانہ صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور برما کا نام بھی اس کی زبان پر کئی بار آ چکا ہے، لیکن چونکہ مغربی حکومتیں اسوقت یوروپ میں الجھی ہوئی ہیں اس لئے امید نہیں کہ جاپان کو اپنے اقدام کے لئے ان کی طرف سے کوئی بہانہ ہاتھ آئے بہرحال اسوقت تک ایشیا اور بلقان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان سے متعلق جنگ کے امکانات پر بحث کی جائے

اور پھر بھی کم وقت کا سب سے زیادہ اہم سوال یہی رہتا ہے کہ اب جرمنی کیا کریگا

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جرمنی سمندر کے راستہ سے اپنی فوجیں سواحل انگلستان پر اُتارنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے ممکن ہے کہ وہ انگلستان کا محاصرہ کرنے کی فکر میں ہو۔ انگلستان کا مشرقی و جنوبی حصہ تو بیشک خطرہ میں ہے کیونکہ خلیج بسکے (Biscay) اور رودبار انگلستان دونوں طرف سے وہ برطانوی جہازوں کی آمدورفت کو روک سکتا ہے اور سواحل بلجیم و فرانس پر بڑھا قسم کی توپیں نصب کر کے مشرقی سواحل انگلستان پر گولہ باری بھی کر سکتا ہے لیکن شمال و مغرب کے سواحل انگلستان ابھی تک خطرہ سے دور ہیں۔ اگر روس کے بیڑے نے جرمنی کی حمایت میں آئس لینڈ پر قبضہ کر کے شمالی راستہ بند کر دیا جسکا خطرہ ہے تو پھر جرمنی ضرور آئرلینڈ کی طرف سے محاصرہ کی کوشش کرے گا بشرطیکہ آنکہ بحر روم میں برطانوی بیڑوں کو اُلجھائے رکھے اور فرانسیسی بیڑا بھی اس کے ہاتھ آجائے، لیکن چونکہ اٹلی کی طرف سے اس کی توقعات بلند نہیں ہیں اور فرانسیسی بیڑے بھی ہنوز اس کی دسترس سے باہر ہیں، اس لئے بحالات موجودہ جرمنی کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انتظار کرے یا کسی اور طرف برطانیہ کو اُلجھا کے بانہوں سکی بحری قوت کو کئی جگہ تقسیم کر دینے کے بعد اس پر حملہ کرے۔

کیا جنگ میں ہمیں برطانیہ کا ساتھ دینا چاہئے

یہ ہے وہ سوال جو حلقۂ نگار کے احباب کی طرف سے اس دوران میں مجھ سے بارہا کیا گیا ہے۔ گو اس کا جواب انفرادی طور پر بھی مستفسرین کو دیا جا چکا ہے، لیکن نگار کی وساطت سے بھی میں اپنی رائے اس باب میں ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں

اس وقت ہندوستان میں دو جماعتیں پائی جاتی ہیں ایک وہ جو یہاں برطانوی حکومت کے قیام کی حامی ہے اور دوسری وہ جو ملک کو بالکل آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور کسی غیر حکومت کو پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے اس جماعت سے بحث نہیں جو برطانوی حکومت کی طرفدار ہے، کیونکہ اس کو تو لامحالہ انگریزوں کی مدد کرنا ہی ہے، بلکہ میرا خطاب دوسری جماعت سے ہے جو ملک کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے

کہا جاتا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہیں کہ موجودہ جنگ نہ صرف یورپ بلکہ تمام دُنیا کا نقشہ بدل کر رہے گی اور یقیناً ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بہت کچھ اس جنگ کے انجام پر منحصر ہے۔ اسوقت ہمارے سامنے صرف ایک سوال ہے اور اس پر ہمارے طرزِ عمل کا انحصار ہونا چاہئے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اگر انگریزوں کو اس لڑائی میں شکست ہوگئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا ؟

اس کا جواب مشکل نہیں۔ بحالات موجودہ ہندوستان کا انگریزی تسلط سے علحدہ ہونا کسی نہ کسی دوسری حکومت کا غلام ہو کر رہنا ہے، خواہ وہ حکومت جاپان و جرمنی کی ہو یا روس کی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہم نے انگریزوں کی مدد نہ کی تو زیادہ سے زیادہ ہندوستان کے حالات میں اتنا ہی تغیر ہو سکتا ہے کہ ہم بجائے ایک آقا کے دوسرے آقا کی خدمت پر مجبور ہوں اور ظاہر ہے کہ اس کو کوئی غیرتمند ہندوستانی گوارا نہیں کرسکتا

ہندوستان جس منزل سے گزر رہا ہے وہ یقیناً آزادی سے قریب تر ہے، لیکن اگر آج یہاں کوئی دوسری حکومت آجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے پھر ان زنجیروں کو اپنے پاؤں میں ڈال لیا جن کو بمشکل ایک ایک کر کے توڑا تھا اور ہم کو آزادی کی جد و جہد پھر از سرِ نو کرنا پڑے گی جس کی کامیابی کے لئے صدیاں درکار ہیں۔

اسوقت یہ خیال کرنا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے، تو ہم آزاد ہو کر خود اپنے ملک کی مدافعت کرلیں گے بچوں کی سی باتیں ہیں۔ انگریزوں کی غلطی کہئے یا دانشمندی سب سے بڑی یہی تھی کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو اسوقت تک ملک کی حفاظت و مدافعت کے لئے طیار نہیں کیا جس کو اب وہ محسوس کر رہے ہیں اور یقیناً اس سے زیادہ سخت غلطی ہماری ہوگی اگر ہم نے اس موقعہ سے فایدہ نہ اُٹھا کر اپنی حفاظت کے مسئلہ میں بدستور دوسروں ہی کا دست نگر بنا رہنا پسند کیا

حکومت ہند نے اسوقت حفاظت ہند کے مسئلہ کو زیادہ وسعت نظر سے دیکھنے کا ارادہ کیا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم نہایت حریصانہ طور پر اس سے فایدہ اُٹھائیں۔ علاوہ اس کے کہ حکومت کی موجودہ تجاویز مدافعت پر عمل کرنے سے ملک کی بیکاری کم ہوتی ہے، سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد جدید اُصول جنگ سے واقف ہو جائیں گے اور اگر کسی دشمن نے ہم پر حملہ کیا تو کم از کم یہ تو نہ ہوگا کہ ہندوستان کی شکل دیکھ کر جسم پر لرزہ طاری ہو جائے

اس لئے میری آزادانہ رائے یہی ہے کہ اسوقت ہم کو جوق در جوق فوج میں بھرتی ہونا چاہئے اور جو نوجوان تعلیم یافتہ ہیں ان کو خصوصیت کے ساتھ بحری و فضائی فوج میں داخل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیونکہ سوال اسوقت انگریزوں کی مدد کا نہیں بلکہ خود اپنی مدد کا ہے اور اگر اسوقت ہم نے اس سے فایدہ نہ اُٹھایا تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پسند نہیں کرتے اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ آزادی کا لفظ زبان سے نکالیں۔

دُنیا میں تاریخوں کو پلٹ دینے والی ساعتیں شاذ و نادر ہی کبھی آتی ہیں اور اسوقت ہندوستان انھیں ساعتوں سے گزر رہا ہے، پھر اگر ہم نے اس سے فایدہ نہ اُٹھایا تو یہ غلطی نہ انگریزوں کی ہوگی نہ انگریزی حکومت کی بلکہ ہماری غلطی ہوگی اور ایسی سخت غلطی جس کی تلافی شاید کبھی ممکن نہ ہو!

عربوں کی سیاسی بیداری

(جنگ عظیم کے بعد)

(مسلسل)

جنگ عظیم کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ ہوچکا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار عرب کی قومی تحریک اپنی قسمت کے فیصلہ کی منتظر تھی۔ شریف حسین نے عرب حکومت کے جو حدود متعین کئے تھے وہ تمام کے تمام ترکوں کی غلامی سے آزاد ہوچکے تھے، قومی تحریک کے لیڈر اور عوام اپنی جگہ پر مطمئن تھے کہ شریف حسین نے برطانیہ سے جو وعدے کئے تھے انکو عربوں نے پورا کردیا۔ اب عربوں کی نظریں برطانیہ پر لگی تھیں کہ وہ بھی اپنے وعدے پورے کرے۔ مگر جب صلح کانفرنس میں ایفاء عہد کا وقت آیا تو صورتِ حال بالکل مختلف تھی اور وہاں عجیب عجیب انکشافات ہوئے، برطانیہ نے شریف حسین سے جو وعدے کئے تھے اُن کی اب نئی نئی تاویلیں ہونے لگیں جو عربوں کے خیال میں کبھی نہ آسکتی تھیں۔

سنہ ۱۹ء میں آزاد شدہ عرب علاقوں کی حیثیت ایک "مفتوحہ علاقہ" کی سی تھی جہاں مارشل لا کا دور دورہ تھا اور تمام انتظامی احکامات برطانوی کمانڈر انچیف سے حاصل کئے جاتے تھے، ملک کو مختلف حصوں میں منقسم کردیا گیا تھا، اور ہر حصہ میں مختلف انداز کی حکومت تھی۔ عراق کی حکومت کا افسرِ اعلیٰ برطانوی سول کمشنر کو مقرر کیا گیا اور وہاں تمام اعلیٰ افسر انگریز ہی تھے۔ شام اور فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک میں انگریزی حکومت، دوسرے میں فرانسیسی اور تیسرے میں عرب حکومت قایم کی گئی۔

صلح کانفرنس میں حجاز کی نمایندگی کے لئے جب فیصل پیرس پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ عربوں سے اتحادیوں نے جو وعدے کئے ہیں اُن کی راہ میں تین طاقتیں حائل ہیں ـــ عراق و فلسطین میں برطانوی شہنشاہی مفاد، شام میں فرانس کا شہنشاہی مفاد اور فلسطین میں یہودیوں کا قومی مفاد۔ فیصل ۲۶ر نومبر سنہ ۱۸ء کو مارسیل (Marseilles) پہونچا۔ دو فرانسیسی افسروں نے جہاز پر اُس کا خیر مقدم کیا اور یہ بھی بتلایا کہ

حکومت فرانس اس کا استقبال بحیثیت ایک سیاح کے کر رہی ہے اور کسی حال میں بھی اُس کی نمایندہ حیثیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نہایت شائستہ الفاظ میں اُس کو مغربی محاذ جنگ کے معائنہ کی بھی دعوت دی گئی، فیصل نے بھی اسی شائستگی کے ساتھ دعوت قبول کی۔ ۱۳ دسمبر کو فیصل لندن پہونچا یہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اُس کو ہر طرف پامردی کی فضا نظر آئی۔ دو ایک روز بعد اس کو معلوم ہوا کہ سائکس پی کاٹ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) صرف بالشوکوں کا پروپگنڈا نہ تھا بلکہ یہ ایک سنگین حقیقت ہے۔

اُس زمانہ میں ہر چند یہی معاہدہ زیر بحث تھا خصوصاً برطانیہ اور فرانس کے مابین تو اس مسئلہ نے بڑی نازک صورت اختیار کر رکھی تھی۔ فرانس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے پر مصر تھا اور برطانیہ کو اس سے گریز تھا۔ برطانیہ کا استدلال یہ تھا کہ یہ معاہدہ روس، برطانیہ اور فرانس کے مابین ہوا تھا، اب جبکہ روس اُس معاہدہ سے دستکش ہو گیا تو اسکو ردی کی ٹوکری میں ڈالدینا چاہئے۔ نیز برطانیہ اس معاہدہ کو ناقابل عمل بھی سمجھ رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس سے برطانیہ کے مفاد کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ بھی تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے اول تو ولایت موصل فرانس کے حصہ میں آتا تھا، جہاں لاتعداد تیل کے چشمے تھے، دوسرے فلسطین کو ایک بین الاقوامی انتداب کے حوالہ کرنا پڑتا اور [illegible] برطانیہ کا کوئی اقتدار باقی نہ رہتا۔ جب لائڈ جارج نے دیکھا کہ فرانس اپنی ضد پر اڑا ہے تو اُس نے ایک دوسری تجویز فرانس کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ فرانس بخوشی موصل اور فلسطین برطانیہ کے حوالہ کرے اور اُس کے معاوضہ میں اُس کو دوسرا علاقہ دیدیا جائے۔ نیز موصل کے تیل کے چشموں میں بھی فرانس کا حصہ رہے۔ یہ تجویز فرانس نے بڑی مشکلوں سے قبول کر لی۔

فیصل کو تفصیل کے ساتھ تو نہیں مگر سرسری طور پر حالات سے آگاہ کیا گیا اور برطانیہ نے اُس پر زور ڈالا کہ لائڈ جارج کی تجویز کی وہ بھی تصدیق کردے۔ سب سے زیادہ زور فلسطین کے علاقہ کے لئے ڈالا گیا کہ عربوں کی طرف سے وہ برطانیہ کی اسکیم منظور کرلے۔ دوسری طرف یہودی بھی زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے کہ وہ یہودیوں سے ایک معاہدہ کرے۔ فیصل کی جان سخت مصیبت میں پھنسی تھی اُسکے وہایٹ ہال (White Hall) کے دوست وہ شرطیں اُس سے منوانا چاہتے تھے جو اُس کے مشن کے بالکل منافی تھیں۔ اُس نے اپنے باپ کے احکامات حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہاں سے صاف جواب آیا کہ برطانیہ نے عربوں سے جو وعدے کئے ہیں ان کا ایفاء اور مکمل آزادی سے کم کوئی چیز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یورپ میں فیصل کا شناسا سوا انگریزوں کے اور کون تھا جن سے وہ مشورہ کرتا۔ چنانچہ اُس نے لارنس (Lawrence) سے مشورہ کیا اُس نے وہی مشورہ دیا جو دفتر خارجہ کا مشورہ تھا۔ لارنس نے بھی فیصل پر زور ڈالا کہ وہ یہودیوں سے معاہدہ کرلے مگر اس شرط کے ساتھ کہ عرب کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر وزمین (Dr. Weizmann.) جو یہودی لیڈر تھے انھوں نے اپنی پہلی ملاقات (جون ۱۹۱۸ء) میں فیصل کو یقین دلایا تھا کہ یہودی قطعاً فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کے لئے کوشاں نہیں بلکہ وہ تو ملک کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور صرف اس حد تک کہ اُس سے عربوں کے مفاد کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ دوسری طرف انگریز بھی اس کا یقین دلا رہے تھے کہ اس سے عربوں کی سیاسی و اقتصادی زندگی پر کوئی خراب اثر نہ پڑے گا چنانچہ فیصل نے یہودیوں سے ایک معاملہ کر لیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ عربوں سے برطانیہ نے جو معاہدات کئے ہیں اُن کو بھی پورا کیا جائے

فیصل صلح کانفرنس میں

فیصل وسط جنوری میں پیرس پہونچا۔ فرانس کسی طرح صلح کانفرنس کے لئے اُس کی نمایندہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا، لیکن برطانیہ کے دفتر خارجہ نے طے کرا دیا اور حجاز کو بجائے ایک کے دو نشستیں ملیں۔ ۶ فروری کو عرب معاملات، کانفرنس کے سامنے پیش ہوئے، اس سے چند روز قبل فیصل ایک بیان قلمبند کر کے کانفرنس کے حوالہ کر چکا تھا جس میں ان سے اختصار کے ساتھ عربوں کے حسب ذیل مطالبات پیش کئے تھے۔

"میں اپنے باپ کے نمایندے کی حیثیت سے، جس نے ترکوں کے خلاف عربی بغاوت کی قیادت کی تھی یہاں آیا ہوں کہ ایشا میں بولنے والی قوم کی آزادی کا مطالبہ کروں، اور میں اس کا مطالبہ کرتا ہوں کہ سنجاق اور دیار بکر لائن سے لیکر جنوب میں بحر ہند تک کے علاقہ کو آزاد اور حکمراں تسلیم کیا جائے ۔۔۔۔۔۔ حجاز جو ایک حکمراں ریاست ہے اور عدن جو ایک برطانوی مقبوضہ ہے اس مطالبہ میں شامل نہیں"۔

فیصل نے کانفرنس میں جو تقریر کی وہ بھی بجید دل تھی۔ دوران تقریر میں فیصل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ کسی حکومت کے قیام سے قبل ضروری ہے کہ ملک کے بسنے والوں کی رائے اور خواہش بھی اس مسئلہ میں معلوم کر لی جائے۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ صلح کانفرنس ایک کمیشن مقرر کرے جو شام و فلسطین کا دورہ کر کے لوگوں کی خواہش معلوم کرے۔ یہ تجویز پریسیڈنٹ ولسن کو بہت پسند آئی اور اُس نے اس کی پوری حمایت کی۔ فرانس نے اُس کی مخالفت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی کیونکہ اُس کو معلوم تھا کہ شام کی پوری آبادی اُس کے خلاف ہے۔ برطانیہ نے اُس کی کھلی مخالفت تو نہیں کی مگر درپردہ اُنکی بھی یہی خواہش تھی کہ یہ تجویز کامیاب نہ ہو۔ ایک خفیہ جلسہ لائڈ جارج کی قیام گاہ پر ہوا، وہاں پریسیڈنٹ ولسن نے اس تجویز کو پیش کیا اور سب سے منوا بھی لیا، چنانچہ طے یہ پایا کہ کمیشن کی شرکت کے لئے متعلقہ حکومتیں اپنے دو دو نمایندے مقرر کریں۔ صدر ولسن نے امریکہ کی طرف سے ہنری سی، کنگ (Henry C. King) صدر اوبرلن کالج (Oberlin College.) اور مسٹر چارلس، آر، کرین (Charles R Crane) کو منتخب کیا۔ برطانیہ نے سر ہنری مک ماہون (Henry Mc Mahon) اور کمانڈر ڈی، جی ہاگرتھ (D. G Hagroth) کو مقرر کیا۔ فرانس نے اس سلسلہ میں کسی سرگرمی کا اظہار نہ کیا بلکہ

خاموشی اختیار کی۔

لوگوں کا بیان ہے کہ اس خفیہ اجلاس کی اطلاع جب فیصل کو ہوئی تو اُس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی اور جی کھول کر پی، پھر موٹر پر بیٹھ کر برطانوی اور امریکی نمایندوں کے پاس گیا اور وہاں صوفوں کے گدّوں کو پٹخ کر کہا کہ میرے پاس بم کے گولے نہیں ہیں اس لئے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کر رہا ہوں۔

فیصل کی دمشق کو واپسی

اوائل مئی میں فیصل دمشق واپس لوٹا، اُس نے دیکھا کہ مستقبل کے متعلق لوگوں کے اندر شدید بےچینی واضطراب ہے۔عوام اور لیڈروں کا اصرار تھا کہ وہ صاف صاف بیان کرے کہ برطانیہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اُس نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اپنی نا امیدیوں اور تلخ تجربات کو اس نے ایک محدود طبقے تک محدود رکھا اور عوام کو مطمئن کرنے کی اُس نے پوری کوشش کی مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ملک کے ذمہ دار لیڈروں نے ایک قومی اسمبلی کے قیام کی تجویز عوام کے سامنے پیش کی جس کی ہر طرف سے تائید ہوئی۔ ایک خفیہ انجمن "حزب الاستقلال العرب" کے نام سے بنائی گئی۔ فیصل نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ فوجی تحریک کے سلسلہ میں کوئی غیر آئینی اقدام ظہور میں نہ آئے جلدی جلدی اس اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے اور دوسری جولائی کو دمشق میں اُس کا اجلاس (General Syrian Congress) کے نام سے منعقد ہوا۔ شام کے بعض علاقوں کے نمایندوں کو فرانسیسی حکومت نے جبراً شرکت کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ ۸۹ ممبروں میں صرف ۶۵ ممبر شرکت کر سکے۔ ان نمایندوں میں عیسائیوں کی تعداد اُن کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی اس کانفرنس نے متعدد تجاویز پاس کیں اور ایک بیان ملک کی موجودہ حالت کے متعلق شایع کیا یہ بیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے بیحد اہم تھا

ان تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ :-

(۱) شام کو (معہ فلسطین کے) آزاد و خود مختار تسلیم کیا جائے۔

(۲) امیر فیصل کو شام کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔

(۳) عراق کی آزادی تسلیم کی جائے۔

(۴) سائکس پی کاٹ معاہدہ۔

بلفور اعلان (Balfour Declaration) اور اُن تمام معاہدات کو منسوخ کیا جائے جنمیں شام کی تقسیم اور فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کی تجویزیں ہیں۔ کانفرنس کی تمام تجاویز قومی جذبات کے مظاہروں کے ساتھ بلا کسی مخالفت کے پاس ہوئیں۔ ان تجاویز کی تائید تمام ملک نے کی اور ہر جگہ سڑکوں پر اس کی حمایت میں مظاہرے کئے گئے، ملک کے اخباروں میں جلی حرفوں میں ان تجاویز کو شایع کیا گیا۔

کنگ کرین رپورٹ (King Crane Report) صلح کانفرنس کی مجوزہ تحقیقاتی کمیشن کے سلسلہ میں برطانیہ اور فرانس نے پوری مخالفت کی، اطالیہ کا چونکہ اس میں کوئی مفاد نہ تھا اس لئے اُس نے لاپرواہی برتی، صرف پریسیڈنٹ ولسن کی ایک ذات تھی جو اپنی تجویز پر قایم رہی اور جب اُس نے فرانس و برطانیہ کی مخالفت کو محسوس کیا تو اسے یہی مناسب نظر آیا کہ امریکہ کم ازکم اپنے نمایندوں کو تحقیقات کے لئے ضرور روانہ کرے چنانچہ امریکی نمایندے سفر پر روانہ ہوگئے۔ اُن کی مرتبہ رپورٹ کنگ کرین رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن نے چھ ہفتے تک شام و فلسطین کے اندرونی علاقوں کا دورہ کیا۔ ۴۰ مقامات پر قیام کرکے مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا اور تفتیش حالات کئے۔ اپنا دورہ ختم کرنے کے بعد یہ لوگ قسطنطنیہ گئے اور وہیں رپورٹ مرتب کی۔ اگست کے آخری ہفتہ میں پیرس واپس آئے۔ اور ۲۸ر اگست کو رپورٹ متحدہ امریکہ کے دفتر کے حوالہ کی۔ اس کے فوراً ہی بعد ڈاکٹر کنگ (Dr. King) امریکہ لوٹے تاکہ جلد سے جلد رپورٹ کی نقل پریسیڈنٹ ولسن کے حوالہ کریں۔

اب کنگ کرین رپورٹ عوام کی ملکیت تھی، شروع میں اس کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن نے پوری رپورٹ پڑھی بھی یا نہیں مگر اس کے خلاصہ سے ان کو ضرور واقفیت تھی کیونکہ دونوں کمشنروں نے بذریعہ تار اپنی تحقیقات کے خلاصہ سے اُن کو پہلے ہی آگاہ کردیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں جب رپورٹ کی اشاعت کی اجازت اُن سے طلب کی تو وہ فوراً اس کے لئے طیار ہوگئے لیکن پوری رپورٹ صرف امریکی اخبارات میں شایع ہوئی۔ یہ رپورٹ ایک اہم ترین دستاویز ہے، خصوصاً مورخین کے لئے کیونکہ صرف اسی رپورٹ میں ایسا مواد دستیاب ہوسکتا ہے جو غیر جانبدار اداروں کا فراہم کیا ہوا ہے اور جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ صلح کانفرنس کے بعد عربوں کے جو جذبات اور خیالات تھے اُن کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس رپورٹ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

کمیشن نے شام، فلسطین اور عراق کے لئے انتداب کو ضروری سمجھا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ انتداب ایک معین و محدود وقت کے لئے ہو اور مقصود صرف یہ ہو کہ ملک کے تمام حصے جلد از جلد آزاد ریاست کی شکل اختیار کرسکیں۔ کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا کہ عراق کو ہرگز تقسیم نہ کیا جائے اور پورے ملک کے لئے ایک انتداب ہو۔ شام (مع فلسطین) کے اتحاد کو بھی برقرار رکھا جائے اور عراق کی طرح سے شام کے لئے بھی ایک انتداب ہو جس میں فلسطین کا علاقہ بھی شامل رہے، دونوں علاقوں میں دستوری شہنشاہیت عمل میں لائی جائے۔ امیر فیصل کو شام کا بادشاہ اور کسی عرب حکمراں کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی کوشش کی جائے۔ انتداب کے انتخاب کے باب میں کمیشن نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ملک کی رائے عامہ سب سے پہلے امریکہ کو ترجیح دیتی ہے اور پھر برطانیہ کو، فرانس کا انتداب تو قبول کرنے کے لئے وہ کسی حال میں بھی طیار نہیں چنانچہ تمام حالات پر بحث کرتے ہوئے کمیشن نے مشورہ دیا ہے کہ انتداب کے لئے متحدہ امریکہ سے استدعا کی جائے اگر وہ طیار نہ ہو تو پھر برطانیہ کے سپرد کیا جائے

لیکن اگر فرانس کے سپرد یہ علاقہ کیا گیا تو عربوں اور فرانسیسیوں میں یقیناً جنگ ہوگی۔
کمیشن نے یہودیوں کے مسئلہ پر بھی کافی بحث کی اور بتلایا کہ تحقیقات شروع کرتے وقت وہ لوگ یہودیوں کی
اسکیم کے موافق تھے مگر دوران تحقیقات میں یہودی نمایندوں نے جو بیانات دئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ مختلف
چالاکیوں سے عربوں کی جائدادیں خرید رہے ہیں اور اس طرح سے اُن کی یہ کوشش ہے کہ فلسطین میں عربوں کا
کوئی حصہ نہ رہے۔ یہودیوں کی اسکیم ملک کے باشندوں کے حقوق و مفاد کو بری طرح پامال کر رہی ہے نیز برطانیہ اور
پریسیڈنٹ ولسن نے جو اُصول مرتب کئے ہیں، یہ اسکیم اُن کے بالکل منافی ہے۔ جس برطانوی افسر سے کمیشن نے گفتگو
کی اُس نے بھی بتلایا کہ یہ اسکیم صرف تلوار کی طاقت سے کامیاب ہو سکتی ہے، چنانچہ کمیشن نے یہ تجویز کیا کہ یہودیوں
کا داخلہ بالکل محدود کر دیا جائے اور فلسطین کو یہودی ریاست کی شکل میں تبدیل کرنے کا خیال چھوڑ دیا جائے۔ یہ
تجاویز ظاہر ہے کہ برطانیہ، فرانس اور یہودی تینوں کے لئے کس درجہ تلخ تھیں۔ چنانچہ اس رپورٹ کی طرف کسی نے توجہ
بھی نہ کی اور اُس کی اشاعت سے پہلے ہی دونوں طاقتوں میں آپس میں سمجھوتہ کر کے ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔

فیصل کا دوسرا سفر یورپ اور اُسکے نتائج

اگست میں لائڈ جارج نے فیصل کو دوبارہ یورپ آنے کی دعوت
دی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب برطانیہ و فرانس کے تعلقات
عرب معاملات کی وجہ سے خطرناک حد تک کشیدہ ہو چکے تھے۔ فرانس کے تمام سیاستداں اور کل اخبارات برطانیہ
کو بدنیتی اور وعدہ خلافی کا مجرم گردان رہے تھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ انگریز عربوں کو شام میں فرانس کے خلاف
اُبھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فیصل کے لندن پہونچنے سے قبل لائڈ جارج نے ایک تجویز فرانس کے سامنے پیش
کی اور فرانس نے اُس کو قبول کر لیا۔ جب فیصل کے لندن پہونچنے کے بعد وہ تجویز اُس کے سامنے پیش کی گئی، تو وہ
بیحد برافروختہ ہوا اور فوراً ایک احتجاجی بیان قلمبند کر کے وزیر اعظم کے حوالہ کیا۔ اس تجویز نے برطانیہ کو سخت اُلجھن میں
مبتلا کر دیا۔ اب برطانیہ نے یہ سوچا کہ فرانس اور عرب کے مابین اگر کوئی معاہدہ ہو جائے تو اس سے برطانیہ کی پوزیشن بڑی
حد تک صاف ہو جائے گی چنانچہ برطانوی وزراء نے فیصل پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ بالواسطہ فرانس سے گفت و شنید
کرے۔ فیصل کو انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر فرانس کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔ ۲۷ نومبر کو فیصل نے فرانس کے
وزیر اعظم سے ملاقات کی اور پہلی ہی ملاقات میں معاملہ طے ہو گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ عرب حکومت
لبنان اور شام کے ساحلی علاقہ کو جو شمال میں سنجاق تک ہے، فرانس کا مقبوضہ تسلیم کرے گی۔ نیز عرب حکومت
کو جس قسم کی امداد درکار ہوگی، فرانس اُس کو فراہم کرے گا۔ فیصل نے کرنے کو تو یہ معاہدہ فرانس کے ساتھ کر لیا مگر اس
قسم کا معاہدہ کرنے کا فیصل کو کوئی حق نہ تھا اس کے باپ شریف حسین نے بھی جو ہدایات اُس کو دی تھیں یہ معاہدہ
اُس کے بالکل منافی تھا۔ اور یہ معاہدہ شام کی رائے عامہ کے بھی بالکل خلاف تھا چنانچہ شام پر اس کا بیحد اثر پڑا۔

جب شام میں اس معاہدہ کی خبر پہونچی تو ہر طرف شدید بےچینی اور اضطراب کے آثار نظر آنے لگے۔ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ فیصل نے ملک کو فرانس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ فیصل کو جب ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً شام کا رُخ کیا۔ یہاں ہر جگہ اُس کا سرد مہری سے استقبال کیا گیا۔ سڑکوں پر عام طور سے آزادی اور اتحاد کے مظاہرے کئے گئے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ عرب لیڈر اور عرب رائے عامہ اس معاہدہ سے کس قدر غیر مطمئن ہے۔

دمشق میں ملک کے ہر حصہ سے لیڈر، طلبہ اور عرب افسر جوق در جوق چلے آرہے تھے اور آزادی و اتحاد کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔

۸ ارمارچ سنہ ۱۹۱۹ء کو جنرل سیرین کانگرس (General Syrian Congress) کا اجلاس ہوا اُن تمام لیڈروں نے اس اجلاس میں شرکت کی جنھوں نے بغاوت میں پورا حصہ لیا تھا اور ملک میں جن کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی اجلاس میں شام (مع فلسطین) کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی امیر فیصل کو بادشاہ منتخب کیا گیا۔ اسی طرح عراقی لیڈروں نے بھی اپنے ایک جلسہ میں عراق کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا اور وہاں کا بادشاہ امیر عبداللہ کو منتخب کیا گیا

فرانس و برطانیہ کی حکومتوں نے اس کانفرنس کی تجویز اور اُس کے اعلان کو قبول کرنے کے بجائے 'ناجائز' قرار دیا اور فوراً مجلس اعلیٰ (Supreme Council) کا اجلاس طلب کیا۔ فیصل کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ برطانیہ و فرانس کی حکومتوں نے سیرین کانگرس کے اعلان کو ٹھکرا کر صرف عہد شکنی ہی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ بہت بڑی سیاسی غلطی بھی کی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فیصل کے لئے اب اس کانفرنس میں شرکت کا مسئلہ بجید پیچیدہ ہو گیا۔

سین ریمو (San Remo) میں ۲۵ راپریل کو مجلس اعلیٰ (Supreme Council) کا اجلاس ہوا جزیرہ نمائے عرب کا وہ تمام علاقہ جو بحیرہ روم سے لیکر خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے وہاں انتداب کا قیام طے پایا۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے اپنے مفاد کے مطابق شام کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ فرانس کے حصہ میں شام و لبنان کا علاقہ آیا، برطانیہ کو عراق و فلسطین کا علاقہ ملا۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ بالفور اعلان (Balfour Declaration) کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے یہ تجاویز ۵ رمئی کو شائع ہوئیں اور اُس کی اشاعت کے ساتھ ہی عرب عوام میں مغربی طاقتوں کے خلاف غصہ و نفرت کی آگ مشتعل ہو گئی۔ کیونکہ عربوں کی تمام قربانیوں کو جن کی وجہ سے اتحادیوں کو کامیابی نصیب ہوئی تھی، پس پشت ڈالدیا گیا تھا۔

فرانس کا دمشق پر حملہ سین ریمو (San Remo) کانفرنس کے اختتام کے ساتھ ہی عربوں اور فرانسیسیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ فرانس کو انتداب حاصل

ہو جانے کے بعد فیصل پر ہر طرح کا زور ڈالنے کا موقعہ ملا جس کی فرانس کو عرصہ سے تمنا تھی، دوسری طرف عرب فیصل کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے مجبور کر رہے تھے فیصل نے اس سے قطعاً انکار کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فیصل کو برطانیہ اور امریکہ سے انصاف کی امید تھی۔ چنانچہ فیصل نے اب پھر سفر یورپ کا قصد کیا۔ لیکن ابھی اس سفر کے انتظامات پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچے تھے کہ فرانس کا ایک الٹیمیٹم موصول ہوا، جس میں دمشق کی عرب حکومت کے خلاف ایک طویل فرد جرم پیش کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بیان بھی منسلک تھا جس میں مصالحت کی پانچ شرطیں درج تھیں:-

(۱) ریاق علی پو ریلوے لائن (Rayyaq Aleppo Rly :) فرانس کے فوجی نظم ونسق کے سپرد کر دیجائے

(۲) جبریہ فوجی بھرتی ختم کر دیجائے اور عرب کی فوجی طاقت بڑی حد تک کم کر دی جائے۔

(۳) فرانسیسی حکومت کا (Currency System) قبول کیا جائے۔

(۴) فرانس کا انتداب غیر مشروط طریقہ پر تسلیم کیا جائے۔

(۵) فرانس کے مخالفین کو سزا دیجائے۔

ان شرائط کی تکمیل کے لئے صرف چار دن کا موقعہ دیا گیا تھا "اور اگر اس عرصہ میں یہ شرطیں پوری نہ کی گئیں تو حکومت فرانس ہر اس اقدام کے لئے آزاد ہو گی جس کو وہ مناسب سمجھے"۔

فیصل کے ساتھیوں کے غصہ و تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی جب ان کو معلوم ہوا کہ فیصل نے ان شرائط کو قبول کر لیا ہے۔ خود فیصل کو اس کا پورا احساس تھا کہ یہ اقدام تمام ملک میں اس کو غیر ہر دلعزیز بنا دے گا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ فرانس آمادہ جنگ ہے اور اسوقت مصلحت یہی تھی کہ جنگ کو ٹال دیا جائے تاکہ اس کو ایکبار لندن جانے کا موقعہ ملے اور وہاں بالکل مختلف انداز میں وہ پورے مسئلہ کو از سر نو اٹھائے۔ برطانیہ کی خوش نیتی پر اعتماد اب بھی اس کی پالیسی کا ایک لاینفک جزو تھا۔ نیز فرانس کے الٹیمیٹم کے ساتھ ہی لارڈ کرزن کا ایک تار بھی موصول ہوا، جس میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اسوقت ہر ممکن قیمت پر لڑائی سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ فیصل نے تمام شرطیں قبول کر لیں اور انکی تکمیل کا انتظام بھی شروع کر دیا۔ مگر اس کے باوجود فرانس کی فوجیں دمشق کی سمت بڑھنے لگیں۔ اس خبر کو سنکر پورا شہر اور قرب وجوار میں ایک ہلچل مچ گئی۔ فیصل نے صورت حال پر قابو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں تقریباً سو عرب خود اس کی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ مگر فیصل کو کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر مقامی فوج کے دوش بدوش دو ہزار محبان قوم بھی جا کر ملے ہوئے۔ فرانسیسی توپوں اور ہوائی جہازوں کے سامنے یہ نیم مسلح اور غیر مسلح فوج کیا ٹھہرتی مگر ان لوگوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا۔ حکومت شام کا وزیر جنگ یوسف العظم بھی اسی لڑائی میں کام آیا۔ فرانسیسی فوج نے دمشق میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دمشق

خالی کرنے کا حکم دیا جس کی اُس نے فوراً تعمیل کی اور وہاں سے نکل کر اُس نے سیدھے اٹلی کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں تک لیک مگیور (Lake Maggiore) میں قیام کیا۔ دسمبر میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا اور اُس کے جواب میں وہ لندن کے لئے روانہ ہوا۔

مسلح عرب بغاوت

عربوں کی تاریخ میں سنہ ۲۰ء کو فلاکت اور بدبختی کا سال سمجھا جاتا ہے۔ سین ریمو کانفرنس کے بعد اسی سنہ میں فرانس نے شام پر قبضہ کیا۔ عراق پر انگریزوں کا تسلط ہوا اور فلسطین میں یہودی اسکیم کا اجرا شروع ہوا، دوران جنگ میں عربوں اور اتحادیوں کے مابین جو معاہدات ہوئے تھے ان کو بروئے کار لانے کے لئے اُسی سال عربوں نے مسلح بغاوت کی، شام، فلسطین اور عراق میں ہر جگہ بلوے ہوئے، غرض اُسوقت ملک کے گوشہ گوشہ میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ رہی تھی، اور ہر جگہ سے جارحانہ اقدامات کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ فساد کی آگ سب سے پہلے فلسطین میں ایسٹر (Easter) کے موقعہ پر مشتعل ہوئی۔ بیت المقدس کی عرب آبادی نے یہودی لیڈروں کی تقریریں سنیں جن میں فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام اور عربوں کو نکالنے کا ذکر تھا، عرب ان بیانات کو سنکر مستقبل کی طرف سے بیحد خائف ہوئے اور اسی گھبراہٹ میں انھوں نے یہودی آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس فساد کے اسباب پر سرکاری طور سے آج تک کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ برطانوی کمانڈر انچیف نے تحقیقات کے لئے ایک کمیشن ضرور مقرر کیا۔ حکومت نے اس کی رپورٹ کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔ عوام کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ کمیشن کے خیال میں اس فساد کے اسباب قطعاً سیاسی تھے اور عرب آبادی نے جو کچھ کیا وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوکر کیا۔

شام پر فرانس کے قبضہ کے ساتھ ہی فسادات بھی شروع ہوئے۔ سب سے زیادہ خونیں فسادات عراق میں رونما ہوئے۔ یہ فسادات در اصل انتداب کے خلاف صرف مظاہرے تھے۔ اہلِ عراق برسوں سے آزادی اور اتحاد کی خاطر اپنا خون بہا رہے تھے لیکن جب آزاد ہونے کا وقت آیا تو اُن کے سر انتداب تھوپا جا رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ برطانیہ کا طوقِ غلامی ان کی گردن میں ڈالا جا رہا ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے ان لوگوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کیا، لیکن حکومت نے ان مظاہروں کے سدباب کے لئے قوت کا استعمال ضروری سمجھا۔ ملک کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے مقدمات کی سرسری سماعت کرکے سب کو سزائیں دیدی گئیں۔ اس چیز نے عربوں کے غم وغصہ کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ جون کے آخری ہفتہ میں ایک فساد وادی فرات میں رونما ہوا۔ یہ فساد اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ خونیں فساد تھا۔ اس کا سلسلہ جون سے شروع ہوکر اگست تک جاری رہا۔ عرب مقتولین کی صحیح تعداد کا تو کوئی علم نہیں مگر لوگوں کا اندازہ ہے کہ کم از کم ۴ ہزار عرب جانیں اس فساد میں ضایع ہوئیں۔ اس فساد کا مقابلہ کرنے اور شورش کا سر کچلنے کے سلسلہ میں برطانیہ کے خزانہ پر ۴ کروڑ پونڈ (تقریباً ۰ کروڑ روپیہ)

کا بار پڑا۔ خود اہل عراق کا کتنا مالی نقصان ہوا اس کا کوئی تخمینہ موجود نہیں ہے۔

برطانیہ نے مجبوراً عرب نما برطانوی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی عرب وزراء کا تقرر بھی عمل میں آیا، ہر وزیر کے ساتھ ایک برطانوی مشیر بھی تھا اور انتظامات کی باگ ڈور خود سول کمشنر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو عرب حکومت، تو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ عرب و برطانیہ کے درمیان جو اختلافات کی خلیج پیدا ہوگئی تھی وہ بڑی حد تک پُر ضرور ہوگئی۔ آگے چلکر عراق کو سیاسی آزادی دیدی گئی اور انتداب کو منسوخ کر دیا گیا۔

مسٹر چرچل وزیر نو آبادیات کی تجویز پر عرب کے برطانوی عمال کی ایک کانفرنس قاہرہ میں طلب کی گئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل فیصل نے لندن میں برطانوی عمال سے طویل ملاقاتیں کیں، ان میں چرچل اور کرنل لارنس کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ فیصل اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوگیا اور یہ طے پایا کہ برطانیہ عراق کا تمام نظم و نسق عرب حکومت کے حوالہ کر دے۔ نیز فیصل کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی پوری کوشش کرے۔

قاہرہ کانفرنس ۱۲ مارچ کو منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ فیصل اور چرچل کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اُس کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کانفرنس نے بڑی حد تک وہ وعدے پورے کر دئے جو برطانیہ نے انگریزوں سے کئے تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس کانفرنس میں عراق کو یقیناً سیاسی آزادی ملی مگر عرب کے مغربی حصوں کا جہاں تک تعلق ہے برطانیہ پر بد عہدی کا الزام بدستور قایم رہتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی

"نگار" کے پرانے پرچے

"نگار" کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری عہ۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری عہ۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔ جنوری سنہ ۳۸ء عہ۔ اپریل عہ۔ (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ۔ فروری تا نومبر (علاوہ اگست و ستمبر) ۸ر فی پرچہ۔ فروری تا دسمبر (علاوہ جون دسمبر) ۶ر فی پرچہ

مینیجر نگار لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال

میرے نزدیک سب سے دلچسپ اور مستند خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دئے جائیں یا منظرِ عام پر نہ آئیں۔ اس لئے بزاتہ میں ایسے خطوط کا قایل نہیں ہوں جو شایع کئے جائیں چہ جائیکہ ان پر مقدمہ لکھا جائے اور ان کی تشریح و تحلیل کیجائے۔ اس اعتبار سے نیاز صاحب اور میں دونوں قصوروار ہیں، لیکن اکثر یہی چیز پبلک کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ گو میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب یا میں خود کشی کر لوں یا انمیں سے کوئی سنگسار کیا جائے تو پبلک کی دلچسپی کئی گونہ بڑھ جائیگی!

خطوط بالعموم ایسے لوگوں کے محفوظ رکھے جاتے ہیں یا ان کو شایع کیا جاتا ہے جو پبلک کی نظروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے اہم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ایسے لوگ جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی حیثیت سے اہم سمجھتے ہیں، کبھی بے تکلف بننا یا بے جھجک ہونا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے ایسے لوگ بھی ہوں جو اپنی اہمیت کو اکثر بھول جایا کرتے ہوں لیکن وہ کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ لوگ بھی انھیں بھول جایا کریں۔ چنانچہ ایسے لوگ جب کبھی اپنے خیالات سپردِ قلم کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ غیر شعوری طور پر بھی اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی چیز قلم سے ایسی نہ برآمد ہونی چاہئے جس پر ادبی، اخلاقی یا کسی اور نوعیت سے حرف گیری کیجا سکے اور یہی وہ احتیاط ہے جو خطوط کی ساری دلکشی یا اہمیت غارت کر دیتی ہے۔

خطوط نویسی بھی ایسا فن ہے جس کی تعمیر میں اصل معنوں میں "مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہوجاتی ہے کی نہیں جاتی اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

خط اور دوسرے قسم کے مضامین لکھنے والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے اس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے اور براہ راست نوکِ قلم سے برآمد ہوجاتی ہے۔ دوسرے لوگ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی تحریر نظرِ عام پر آئے گی اس کے حسن و قبح یا عواقب پر ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑیں گے اس لئے وہ دلی ولولوں کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا اور جو کچھ لکھتا ہے اس کو دماغ کے جنتر سے نکالتا ہے اور دل کو "پاسبانِ عقل" کی معیت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ دُنیا کی مستقل تصانیف کا یہی حال ہے اس لئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا

گھاگھیت سے لبریز ہوتی ہیں یعنی جھوٹے سچ اور سچے جھوٹ کا ایک منظم پشتارہ !

خطوط کا میں احترام کرتا ہوں اس لئے کہ اصلی خطوط اس قسم کی بے عنوانیوں سے مبرّہ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بالعموم لوگ اپنی تصانیف کو شایع کرنا اور خطوط کا پرائیوٹ رکھنا یا چاک کر ڈالنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تصانیف پیشہ کی اور خطوط شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنھیں اپنی اصلی سیرت یا شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کی جرأت ہو۔

داعیِ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیوٹ زندگی کی تمام جزئیات منظرِ عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالتمآب کا ضبط ظرف دیکھئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہونچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے ! اس محکِ آتشیں پر آزمائے جانے پر کون آمادہ ہے ؟

خطوط، لکھنے والے کی سیرت کے اصلی خط و خال ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ بے لاگ لکھے گئے ہوں اور اگر بے لاگ نہیں لکھے گئے ہیں تو ان سے زیادہ بے کار محض کوئی اور چیز نہیں کیونکہ ان پر خط کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ چیز محض مضمون آفرینی یا مضمون نویسی ہوتی ہے جس کا کسی حد تک قابل برداشت نمونہ شعر و شاعری ہے۔ انسان کی اصلی سیرت کی غمازی اکثر دو چیزیں کرتی ہیں یعنی وہ موجود ہو تو اس کے ساتھ کھیلئے وہ کھل جائیگا، اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط دیکھئے وہ پکڑا جائے گا۔

میں اکثر اپنے طلبا سے کہا کرتا ہوں کہ زندگی کی جنگ میں ممکن ہے مخلص نہ ہونا فایدہ بخش بھی ہو لیکن انشا پردازی میں مخلص نہ ہونا مہلک ہے، لکھو جو تم محسوس کرتے ہو نہ یہ کہ دوسروں نے کیا محسوس کیا ہے یا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اگر ہر انسان اپنے حُلیہ سیرت اور تشخصات کے اعتبار سے منفرد ہے تو بحیثیت انشا پرداز کیوں نہ منفرد ہو۔ تم اپنے والدین کو خط لکھتے ہو تو وہ فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ انشا اور املا سب کچھ تمھارا ہے اور صرف تمھارا ہے اور مضمون لکھتے ہو تو والدین تو کیا تم بھی نہیں بتا سکتے کہ تمھارا ہی لکھا ہوا ہے !

زمانہ کے تغیرات نے خطوط نویسی کے بھی اسلوب بدل دئے ہیں۔ پہلے مدتوں بعد خطوط کے بھیجنے کا سامان ہوتا تھا، عرصہ تک لکھے جاتے تھے اور ایک طویل زمانہ کے بعد پہونچتے تھے، خطوط اطمینان سے لکھے جاتے تھے اور شوق سے لکھے جاتے تھے اس لئے ان میں دلکشی ہوتی تھی، موثر ہوتے تھے اور یادگار کے طور پر محفوظ کر لئے جاتے تھے۔ اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ پہلے ضرورت ایجاد کی محرک ہوتی تھی، اب ایجاد ضرورتوں کی محرک ہوتی ہے۔ ایجادات نے زندگی کے اسلوب بدل دئے، بعضوں کا خیال ہے کہ اگر انسان کی مشغولیت اور بدحواسی کا یہی عالم رہا تو آیندہ خطوط صرف

زبانی کھیل رہ جائے گی، لیکن مایوس ہونے کی وجہ نہیں ہے۔ جس طرح اور جن اسباب کے ماتحت طویل قصص یا ناولوں کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی، مجھے یقین ہے خطوط کی نوعیت بھی بدل جائے گی، فرصت کم ہونے کی سبب سے ممکن ہے آئندہ لوگ اپنے تمام خیالات خطوط ہی میں ادا کرنے لگیں۔ اب تک مکتوب کو نصف ملاقات کہتے آئے ہیں، ٹیلی وژن کی ترقی سے ممکن ہے نصف ملاقات "نصف بہتر" قسم کی ملاقات پر ختم ہوا کرے اور تماشا کی کامیابی تمنا کی بیقراری کو بہت کچھ کم کر دیا کرے۔

خط نویسی کی تاریخ نہایت طول طویل اور دلچسپ ہے۔ یونانی ادب میں خط کا تذکرہ ہومر کی ایلیڈ میں آیا ہے۔ اسکی ابتدا یقیناً بعض مخصوص نشانات سے ہوئی ہوگی، اور اس زمانہ میں عوام اس سے ایسی طور پر متحیر یا سراسیمہ ہوئے ہونگے جیسے آجکل کے بعض وحشی قبائل گراموفون وغیرہ قسم کی چیزوں سے ہو سکتے ہیں سلسلہ ان روم میں یہ چیز زیادہ منظم اور مقبول ہوئی، یہاں تک کہ صدی قبل مسیح میں سسترو نے خط نویسی میں جو شہرت حاصل کی اس کے سامنے اب بھی لوگ سر عقیدت خم کرتے ہیں۔ سسترو کے خطوط کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ متمدن طبقوں اور مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں صدیوں لاطینی کا دور دورہ رہا۔ اور لاطینی میں سسترو کے خطوط اسلوب خط نویسی کے بہترین نمونہ ہیں۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک انگریزوں کی آپس میں لاطینی ہی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ ملٹن اور کرامویل کے عہد تک سائنس اور علم سیاست کی زبان بھی لاطینی رہی، چودھویں صدی تک نہ تو انگریزوں کو متحدہ قومیت کا احساس ہوا اور نہ مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی دربار پر فرانسیسی زبان کا تسلط رہا یہی نہیں بلکہ بچوں کو ابتدا ہی سے فرنچ بولنے کی ترغیب دیجاتی تھی اور فرانسیسی جاننا عالی نسبی کی دلیل سمجھی جاتی تھی جنگ صد سالہ کے بعد انگریزوں میں روحِ ملت بیدار ہوئی اور انھوں نے اپنی مادری زبان کو قوم کی زبان قرار دیا۔ انگریزی زبان میں والپول، چسٹر فیلڈ کاؤپر، فٹز جیرلڈ، اسٹونسن، کیٹس اور کارلائل خطوط نویسی کے امام مانے جاتے ہیں۔

اُردو میں بھی خط نویسی کی تاریخ انھیں حالات سے ملتی جلتی ہے، ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی رہی اور گو مغلوں کے آخر دور حکومت میں اُردو رفتہ رفتہ برسرِ عروج آنے لگی تھی، لوگ عام طور پر اُردو بولنے لگے تھے، شعر و شاعری بھی کافی ترقی کر چکی تھی لیکن فارسی کا تسلط ایک گونہ برقرار ہی رہا۔ دور حاضر میں ابھی کافی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے عہد طفولیت میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور فارسی اور عربی کا جاننا شرافت اور

لہ ٹیلی فون میں آواز سنائی دیتی ہے شکل نہیں دکھائی دیتی۔ ٹیلی وژن میں آواز کے ساتھ ساتھ شکل بھی دکھائی دیتی ہے جسکو آلہ صوت رساں و شکل نما بھی کہہ سکتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: "دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم"۔ ٹیلی وژن کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔

خوش خوقی کی دلیل تھی۔

غالب کو جہاں اور بہت سی باتوں میں نمایاں خصوصیات حاصل ہیں ایک یہ بھی ہے اور کسی سے کم نہیں ہے کہ جس چیز کو انھوں نے اپنے لئے "ننگ" قرار دیا تھا اس میں ایسے "نقشہائے رنگ رنگ" پیدا کئے جو آج بھی بے مثل ہیں اور خطوط نویسی کے جدید ترین اُصول تنقید پر صحیح اترتے ہیں۔ غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے خط نویسی کا اولین اور شاید بہترین معیار یہی ہے۔ غالب کے خطوط کا سب سے زبردست راز یہ ہے کہ انھوں نے رقعات میں اپنی سیرت اور اپنے ماحول کی ادنیٰ جزئیات کو بھی اصلی رنگ میں بغیر کسی تصنع یا آمیزش کے پیش کیا ہے اور اس امر کی کہیں کوشش نہیں کی کہ وہ بہترین شاعر، مفکر یا معلم کے رنگ میں نظر آئیں۔ ان کی ظرافت، بذلہ سنجی، بے تکلفی وسیع المشربی، شاگردوں سے اُلفت، بڑوں اور بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں پر شفقت ہر جگہ نمایاں ہے، زمانہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انھوں نے زمانہ کو کس طور پر برتا اس کے بعض نہایت دلنشین نمونے ملتے ہیں اور بحیثیت مجموعی جس چیز نے ان رقعات کو لازوال بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا لکھنے والا غالب اور صرف غالب ہو سکتا تھا!

غالب کے علاوہ اوروں کے مکاتیب بھی شایع ہوئے ہیں، مثلاً سرسید، محسن الملک، امیر، نذیر احمد، شبلی، اکبر وغیرہ وغیرہ ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ شبلی کے خطوط ہیں۔ جس چیز کو شبلی نے عطیہ فیضی کے نام کے خطوط میں چھپانے کی کوشش کی ہے اس کو بے نقاب کرنا یوں ضروری نہیں ہے، کہ خود نقاب نے جلوؤں کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے ہماری اُفتادِ طبع کچھ ایسی ہے، جس کے حسن یا قبیح سے یہاں بحث نہیں ہے، کہ ہم ہر چیز کو اکثر کھینچ تان کر اس معیارِ اخلاق سے پرکھنا چاہتے ہیں جو اکثر نفسِ اخلاق سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا مخصوص تمدن اور ماحول سے، شبلی کے ان خطوط سے شبلی کے پرستاروں کو نگاہ نیچی کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ خطوط میرے نزدیک یوں قابل احترام ہیں کہ ان میں انسانی جبلت اور شاعرانہ شرافت کو ایک دوسرے سے متوازن رکھا گیا ہے ان خطوط میں تصنع اور تکلف کم اور صداقتِ شعری پورے طور پر نمایاں ہے۔ ہر حقیقت حسین ہوتی ہے لیکن اکثر حسین نظر نہیں آتی اصلی شاعر صرف وہ ہے جو حقیقت کو حسن کا جامہ پہنا سکے۔ حُسنِ حقیقت، حقیقت حُسن سے زیادہ دلکش چیز ہے ایک کا بے نقاب کرنا شاعر کا کام ہے اور دوسرے کی تحلیل و تجزیہ فلسفیوں کی بدتوفیقی ہے!

سرسید، محسن الملک، نذیر احمد کے خطوط کو پرائیوٹ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے ان خطوط کو اپنی نج کی زندگی کا آئینہ دار نہیں بننے دیا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کے خطوط کو یہاں ہم وہ حیثیت نہیں دینا چاہتے، جس کو ہم نے شروع سے مدنظر رکھا ہے، اکبر کے خطوط میں یہ صفت ضرور ہے کہ ان میں وہ اکثر اپنے خاص رنگ اور مخصوص حال میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خطوط بالعموم اس زمانے کے ہیں جب

لان پر

گہے خندہ او چو تیغ اصیلے

کے بجائے ۔ گہے گریۂ او چو ابر بہارے ——— زیادہ صادق آتا ہے ۔

اب نیاز صاحب کے مکتوبات کی باری آتی ہے ۔ نیاز صاحب بڑے گھاگ ہیں ۔ پہلے ہی پیترے میں انھوں نے میرے ان تمام خطرات کا سد باب کرنا چاہا ہے جن کا اظہار میں نے ان اوراق کے ابتدائی سطور میں کیا ہے ۔ نیاز صاحب سے میرے بڑے پرانے ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں ۔ بہت زمانہ ہوا اسٹریچی ہال کے سامنے ملاقات ہوئی ، میں ہال کے اندر تھا چپراسی نے کہا ایک صاحب بلاتے ہیں ، میں نکلا تو نیاز صاحب نظر آئے ۔ اس سے پہلے صرف غائبانہ تعارف تھا ، اور معلوم ہوتا ہے ہم دونوں ایکدوسرے سے مرعوب تھے لیکن ملاقات کا فوری انجام یہ ہوا کہ دونوں کا ایک دوسرے پر سے رعب زائل ہوگیا جس کا دونوں کو ابتک افسوس ہے ۔

دو تین سال بعد ایک شام کو جو باوجود اس کے کہ عورتوں کا مجمع تھا اور موسم اعتدال پر تھا ، قطعاً قاتل نہ تھی ، نورالرحمٰن صاحب کی معیت میں نیاز صاحب سے دوسری ملاقات نمائش میں ہوئی ۔ طے یہ پایا کہ تھیٹر دیکھا جائے ۔ چنانچہ ہم تینوں تماشا گاہ پہونچے ۔ جگہ کچھ ایسی ملی تھی کہ جہاں سوا مونگ پھلی کھانے کے اور کوئی موقع ہی نہ تھا ، نیاز صاحب نے ارٹ کی کچھ فضا بھی پیدا کرنی چاہی لیکن فوراً پردہ اُٹھنے کا اعلان ہوا ، اور بادشاہ صاحب گاتے ہوئے نظر آئے ہاتھ میں ابرک کا ایک رنگین گلاس ، پاؤں میں روپ سول کا میلا سا جوتا ! ابھی ہم سب سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بادشاہ صاحب نے ایک لمبے ، بلند اور بھرپور سُر کے عین وسط میں اس زور سے گلا صاف کیا کہ ہم تینوں دہل گئے اور قریب تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کی زبان سے کوئی اضطراری فقرہ برآمد ہوتا کہ مردود نے سہیلیوں کے ساتھ چٹکی بجانی شروع کردی اور ہم تینوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے !

یہ وہ زمانہ تھا جب نگار بھوپال سے نکلتا تھا اور نیاز صاحب کے ذہن و دماغ میں نگارستان کی کارفرمائی تھی خوب خوب چیزیں نکل رہی تھیں اور مجھے بڑی مسرت تھی کہ اُردو میں ایک خوشگوار اسلوب کی طرح پڑ رہی تھی ۔ یلدرم نے جس چیز کو حسین اور دلکش بنا دیا تھا ، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کردی تھی ۔ بعض بعض چیزیں داغ کے رنگ سے گزر کر داغ کے " دھبوں " سے ضرور جا ملی تھیں ۔ لیکن بحیثیت مجموعی فضا میں رنگ یا آہنگ کا کہیں اختلال نہ تھا ۔ اسی دوران میں آگرہ سے نقاد نکلا اور مجھے محسوس ہوا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ادب لطیف ادبی اوباشی کا مترادف بن جائے گا ، ایسا ہی ہوا ۔ شبابیات اور ٹیگوریت نے اُردو کی فضا ایسی مسموم اور متعفن کردی کہ مجھے رہ رہ کر اُردو کا وہ زمانہ یاد آنے لگا جس کو متعین کرنا آسان ہے لیکن جس کے اظہار میں ہراس نیاز ہے ۔ نیاز صاحب کی ہمت ہو تو فٹ نوٹ میں میری ذمہ داری پر اس کا اظہار کر سکتے ہیں !

ادب لطیف جس کے امام یلدرم اور نیاز صاحب تھے بازاری لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہوا جو یقیناً کم مایہ ناتجربہ کا

اور نامعقول تھے اور جلد سے جلد کسی قیمت پر سستی سے سستی شہرت حاصل کرنے کے بھوکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نت نئے رسالے نکلنے لگے اور ان میں خرافات کو وہ فروغ دیا گیا کہ شریفوں پر دُنیا تنگ ہوگئی۔

یلدرم اپنی جگہ پر قایم رہے ان کو اپنی شاعرانہ پرواز کے لئے ترکی ادب کی وسیع اور صالح فضا پہلے سے میسر تھی، نیاز رقاصہ کی بزم تک پہونچ چلے تھے کہ ناگزیر کمین

"عالم آشوب نگاہے سر راہم بگرفت"

نیاز صاحب لکھنؤ پہونچے اور لکھنؤ والوں سے ٹکر ہوئی۔ ایک طرف نیاز صاحب تھے دوسری طرف لکھنؤ کا تمدن وہاں کی معاشرت، وہاں کے لوگ، وہاں کی روایات، اور وہاں کی شعر و شاعری۔ یہ حالات و حوادث بجائے خود کیا کم تھے اور نیاز صاحب میں کیا کچھ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے تھے کہ مولانا ماجد صاحب نے اسلام کو خطرہ میں پاکر مسلمانوں کو صفِ جہاد میں آجانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ مولانا ماجد صاحب فتحیاب رہے، نیاز صاحب کو زک ہوئی اور اسلام جہاں کا تہاں رہا!

ان واقعات سے نیاز صاحب کا ذہن و دماغ غیر شعوری طور پر متاثر ہوا۔ اب ان کی تحریروں میں وہ شگفتگی، رنگینی اور "جذبۂ بے اختیارِ شوق" نہیں پایا جاتا جو نگارستان کی جان ہے۔ اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور سوسائٹی سے بیزار ہیں۔ ان کی تحریروں میں بیزاری، زہرناکی اور انتقام کی لہریں ملتی ہیں اور یہ حقیقت حال بجائے خود اسد رجہ روح فرسا ہے کہ اس سے پناہ لینے کی خاطر اُن کو شراب و شاہد جیسی سستی اور گریز پا لذتوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ پناہ لینے کے معنے یہاں کام و دہن کی لذت یابی نہیں بلکہ وہ ذہن کی زہرناکی کو کبھی شاہد و شراب کی حکایت لطیف سے تسکین دینا چاہتے ہیں اور کبھی زندگی کے بعض نازک، عمیق یا پیچیدہ مسائل سے تنگ و ترش ہو کر نظام حیات و معاشرت کو یکسر اس مشتبہ اخلاقیت کے دلدل میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں جس کو عرف عام میں لامذہبی، التذاذیت یا اشتراکیت وغیرہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ذہنی میلان موجودہ دنیا کا سب سے بڑا انکشاف یا سرمایہ ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مذہب اخلاق یا سوسائٹی کے دیرینہ تصور سے یکسر بغاوت کر دیجائے اور ہر کس (و ناکس) سوچنے ہی پر آزاد نہ ہو بلکہ اپنی سوچی ہوئی چیز کو قطعاً صحیح یا حق بجانب سمجھنے اور آزادی سے برتنے میں بھی آزاد ہو۔ ہر شخص کو ہمیشہ سوچنے اور سمجھنے کی آزادی رہی ہے یہ نعمت کچھ آج ہی کی دریافت کی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ جو چیز آج کی ہے وہ یہ کہ ہر شخص جو کچھ سوچتا ہے وہ صحیح اور صالح بھی ہے اور دوسری چیزیں صحیح اور صالح اس لئے نہیں ہیں کہ وہ دوسرے کی سوچی اور برتی ہوئی ہیں!

اصل یہ ہے کہ مادی ذرائع اور وسائل کی ترقی سے آجکل زندگی اس درجہ تیز و تند ہوگئی ہے کہ ہم اس کا مداوا صرف مفرحات یا محرکات سے کرنے کے عادی ہوگئے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ باقاعدہ علاج کی فرصت ہی باقی نہ رہی۔ اب

زندگی عزیز نہیں رہی بلکہ زندگی کے لذائذ عزیز رہ گئے ہیں۔ امتحانات کا احترام نہیں ڈگریاں مقصود بالذات ہوگئیں!

نیاز صاحب میری اس فرسودہ منشی پر کیا کچھ چیں بجبیں نہ ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کجا مطربی و مسخرگی اور کجا یہ قل اعوذیت لیکن کیا کیا جائے جب معلم و مصلح مطربی و مسخرگی اختیار کرلے تو بیچارہ مطرب و مسخرہ کیا کرے۔

نیاز صاحب سے میں یہ کہوں گا کہ بوڑھوں کو درگور سمجھئے لیکن رزم حیات میں نوجوانوں کو صف آرا اور سینہ سپر ہونے کی دعوت دیجئے۔ نوجوانوں کے سامنے بڑی بڑی گتھیاں ہیں جو ہمارے آپ کے آباؤ اجداد کے سامنے بھی غالبًا نہیں آئی تھیں۔ ان کو غیر ذمہ دارانہ فقرے یا شعر، شراب و شباب کی سرمستیوں کی طرف اشارہ کرکے اپنی ذمہ داری نہ بھولئے اور نہ ان نوجوانوں کو بوالہوسی یا سہل انکاری پر آمادہ ہونے دیجئے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی مسئلہ یا معاملہ پر خود متیقن نہیں ہوتے تو یا انہیں کا صحیح محل سمجھنے سے معذور رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں طالب یا تشنہ کو غیر ذمہ دارانہ بشارتوں یا غفلت نما طرب انگیزیوں کی طرف متوجہ یا مائل کردینا قطعًا غیر صالح فعل ہوتا ہے۔ اسی کو "عطائیت" کہتے ہیں۔ نوجوانوں کو امتحان سے عہدہ برآمد ہونے کی دعوت دینی چاہئے، نتائج کی مشکلات یا مسکرات سے کیوں دھمکایا یا پرچایا جائے!

نیاز صاحب! امید ہے میرے ان خیالات سے آزردہ نہ ہوں گے۔ میں مجبور ہوں لیکن کیا کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جن سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں، مصیبت کا علاج مسکرات سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی ابھی قاضی عبدالغفار صاحب (صاحب نقش فرنگ) کی دو تصانیف نظر سے گزریں۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری۔ نقش فرنگ کے مطالعہ کے بعد میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ادب طرازی دونوں کا معترف ہوگیا تھا۔ لیلیٰ کے خطوط دیکھ کر ادب طرازی کا اب بھی قائل ہوں، لیکن مجنوں کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے اختیار آہ نکلی کہ

از قبیلۂ مجنوں کسے نماند!

قاضی صاحب نے بھی نوجوانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہے جس کی ان کی سیرت و شخصیت سے توقع تھی۔

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو کوئی ذمہ دارانہ طریق کار نہیں ہے۔ نوجوانوں کو "جوانی دیوانی" کا سبق پڑھانا سہل ضرور ہے لیکن قطعًا "نافرجام" ہے۔ یہی چیز عبرت خیز اور مضحکہ انگیز بھی ہوجاتی ہے جب یہ سبق ہم بوڑھے پڑھانے لگتے ہیں

میرا ذاتی خیال ہے کہ ہماری اس حرکت پر نوجوان لعنت تو خیر نہیں بھیجیں گے، کیونکہ نوجوان نہ مایوس ہوتا ہے اور نہ مریض، لیکن وہ ہنسنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔

مکتوبات نیاز میں ہر نوع کے خطوط ملتے ہیں جن میں نیاز صاحب نے اپنے مخصوص طرز انشاء میں زندگی کے تقریبًا ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً عشق و عاشقی، رندی و ہوسناکی، شعر، شاعری یا افسانہ، مذہب، شعرا، اشعار،

صاد و پُرسا، ماتم پرسی، بیوی اور شوہر کے مناقشات، شادی سے اجتناب، بچوں کے ہوتے ہوئے باپ کو دوسری شادی کرنے کی ترغیب، سانحہ کی اطلاع، مشرقی علم و ادب، غرض ایک پڑھے لکھے خوش مزاج انسان کو بالعموم جو امورِ زندگی میں پیش آتے ہیں، ان سب پر تنقید کی گئی ہے۔

ان خطوط میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نیاز صاحب نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے خطوط لکھے ہیں وہ نیاز صاحب ہی کے برابر لکھے پڑھے یا صاحبِ ذوق ہیں۔ دوسرے یہ کہ نیاز صاحب نے مکتوب الیہ کے انتخاب میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس زمرہ میں وہ لوگ نہ آنے پائیں جن کو نیاز صاحب سے سب سے قریب ہونا چاہئے تھا، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹی، بیٹا، بیوی، ملازمین یا متوسلین تعجب ہے کہ ان کا سابقہ دوسروں کے رشتہ داروں سے ایسا پڑا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو فراموش کر گئے! بعض خطوط میں یہ دریافت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے اور نیاز صاحب سے ان کے تعلقات کیسے ہیں خطوط کا لب و لہجہ یا اسلوبِ نگارش بالعموم عاشقانہ، شاعرانہ یا رندانہ ہے، طعن و طنز کا عنصر بھی کچھ کم نہیں ہے، لیکن ان سب پر فوق، وہ پندارِ تفوق ہے جس کو نیاز صاحب کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔

نیاز صاحب کے موجودہ اسلوبِ انشا کی مثال ایک طور پر انگریزی کے مشہور طنزیہ شاعر جوناتھن سوئفٹ کے ہاں ملتی ہے۔ سوئفٹ بھی دنیا اور انسانوں سے بیزار تھا، نظامِ حیات میں اس کو بھی کہیں شگفتگی نظر نہیں آتی تھی، تلخی اور زہرناکی اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے، تاہم اس نے اپنی محبوبہ اسٹیلا کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سادگیِ الفاظ اور سادگیِ خیال کے بہترین نمونے خیال کئے جاتے ہیں۔ اسٹیلا ایک غریب خاندان کی بہت کم پڑھی لکھی لڑکی تھی سوئفٹ نے اس کو وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں (جنرل ٹو اسٹیلا) ان میں اپنے جذبات، شیفتگی کو سہل سے سہل الفاظ اور چھوٹے سے چھوٹے فقروں میں ادا کئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی 'سخت و سنگین' یا زہر میں بجھا ہوا کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی نرم و نازک جذبات کا اسیر نظر آئے گا اور پرائیوٹ لائف یا پرائیوٹ خطوط اسکے بہترین ترجمان ہیں۔ اس بنا پر نیاز صاحب کے خطوط یا تو پرائیوٹ نہیں ہیں یا نرم و نازک جذبات کی ان پر کارفرمائی نہیں ہے یا پھر جو مال اچھا تھا، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے۔

اب میں بعض خطوط کا سرسری جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف ایسے خطوط کا انتخاب کیا ہے جن سے صاحبِ مکتوبات کے طبعی میلان یا مخصوص طرزِ انشا پر روشنی پڑتی ہے مثلاً:۔

مکتوب نمبر ۵۳　یہ خط نواب صاحب کو لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب عازمِ حج ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ انھوں نے فرمایا کیا نیاز کا ساتھ ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس پر نیاز صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جسکے جستہ جستہ اقتباسات حسبِ ذیل ہیں

لہ اسیر کی ذمہ داری پر نیاز صاحب پورا مصرعہ نقل فرما سکتے ہیں!!

(۱) آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھکر اور یہاں عالم ہوگا "نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد"
(۲) آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح و حمائل ہوگی اور یہاں جام و مینا۔
(۳) ممکن ہے کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکلے اور آپ تسبیح یا استغفر اللہ سے رجوع کریں۔
(۴) میرے لئے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آیئے گا اور یہ نہ ممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی لیکن خاکِ شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علٰحدہ ہی رکھئے گا، ورنہ ممکن ہے خراب ہوجائے۔

اس خط کے مطالعہ سے بذاتہٖ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نیاز صاحب نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہی اس لئے کہ اس کو ہدفِ ملامت بنائیں۔ اول تو نیاز صاحب کے خیالات معلوم ہوتے ہوئے نواب صاحب کی یہ خواہش کہ نیاز صاحب حج میں ساتھ چلیں، کچھ بے تکی سی معلوم ہوتی ہے، بالفرض نواب صاحب نے ازراہ لطف و محبت یہ خواہش ظاہر بھی کی تو نیاز صاحب زیادہ سے زیادہ ان کو معذور قرار دے سکتے تھے نہ یہ کہ بعض ایسے خیالات کا اظہار کرتے جن سے ان کے دوست یا مخدوم کی دلشکنی قسمی تھی، پھر یہ بھی ہے کہ اب تک حج وغیرہ کے سلسلہ میں شعرا یا رندوں نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں زہد ریائی، تنگ نظری، استعارۃً شراب وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے لیکن ایک پرائیوٹ خط میں کسی شخص نے آج تک کسی عازمِ حج سے جارجیا کی کنیز کی فرمائش نہیں کی۔ علاوہ بریں اگر لطفِ داستان کے سلسلہ میں ان خیالات کا اظہار ناگزیر تھا تو بھی اس خط کے مکتوب الیہ نواب صاحب براہ راست نہیں ہوسکتے تھے اس کے جواز کی صورت صرف یہ ہوسکتی تھی کہ نیاز صاحب کسی دوسرے دوست کو خط لکھتے اور ضمناً نواب صاحب کے حج اور جارجیا کی کنیز کا تذکرہ کردیتے۔

مکتوب نمبر ۴۳ ۔ یہ خط ایک حادثہ کا مظہر ہے۔ مجھے ایک مکرم نے بتایا کہ غالباً نیاز صاحب نے یہ خط اپنے جگر گوشہ کی وفات پر لکھا ہے لیکن کسی کو اس دردناک حادثہ کی خبر نہ ہو تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خط کس سے متعلق ہے اور نیاز صاحب کے اُس سے کیسے تعلقات ہیں۔ الفاظ میں جوش و خروش، زور و استواری سب کچھ ہے، فقرے اور ترکیبیں باہمدگر پیوست اور پیوست ہیں۔ انشا و عبارت ادیبانہ ہے لیکن یہ چیزیں اس درجہ نمایاں ہیں کہ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی چیزیں مقصود بالذات تھیں

مکتوب نمبر ۹۰ ۔ یہ خط نیاز صاحب ہی کے پیش کردہ ایک شعر کی تفسیر ہے،

بیا کہ رونقِ یک کارخانہ کم نہ شود
ز زُہد ہم چو توئی یا زفسق ہم چو منی

اور نیاز صاحب کے عین اُس رنگ میں جسکے خلاف میں نے انھیں اوراق میں احتجاج کیا ہے۔ اسلئے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے

مکتوب نمبر ۶۵ ۔ سب سے نرالا اور سب سے دلچسپ، خط نہیں ایک مختصر افسانہ ہے۔ دلنشین ظرافت کا نہایت سنجیدہ رنگین اور شگفتہ نمونہ۔ نیاز صاحب اس خط پر فخر کرسکتے ہیں۔ مجھے رشک ہے کہ یہ چیز مجھے کیوں نہ سوجھی۔ نیاز صاحب سے میں درخواست کرونگا کہ اس قسم کا کوئی اور واقعہ کبھی پیش آئے تو مجھے ضرور "یاد و شاد فرماتے رہیں گے"

مکتوب نمبر ۱۲۵۔ اس خط کی جان کراماً کاتبین کی شادی ہے۔ میں اس خط کو بھی نیاز صاحب کا کارنامہ سمجھتا ہوں گو آخر میں تھوڑے سے بدخط ہو گئے ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، کراماً کاتبین معاف فرمائیں گے۔

مکتوب نمبر ۱۴۲۔ اس خط کا پہلا شعر ان تمام اشعار پر بھاری ہے جو نیاز صاحب نے مولانا ابوالکلام کی مانند اپنی مکتوبات میں ہر طرف بکھیر رکھے ہیں۔ کیا کہنے ہیں۔

بے دیکھے کہہ دیا کہ چنے ہم نہ کھائیں گے
کچھ کہاں ہیں یار اُبالے ہوئے تو ہیں

مجھے خود اپنا بچپن یاد آگیا۔ میرے معلم اول ایک "منشی جی" تھے۔ دوالی کے موقع پر (بہ مناسبت عیدی) ایک 'دوالی' کہکر دی تھی اور فرمایا تھا کہ اپنے قبلہ گاہی صاحب کو دینا، شعر تھا:-

دوالی آمدہ ایام اعلےٰ
چراغاں جل رہے ہیں زیر و بالا

اس خط میں نیاز صاحب نے اپنی طفولیت کا زمانہ یاد کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن عہدِ طفلی کی جن جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنے ہم عمر ساتھی (یا بقول میرے منشی جی کے، طفل سے) نہیں وابستہ کی باتیں۔ قصہ سننے کے بچے بڑے آرزو مند ہوتے ہیں لیکن چاند میں بڑھیا کا چرخہ کاتنا یا دیو، پری، طلسمات، توہمات یا شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں بچے ایک دوسرے سے نہیں کہا کرتے بلکہ گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی ہیں۔ شام کو دریا کے کنارے لایعنی طور پر بیٹھے رہنا بھی بچوں کا کوئی محبوب مشغلہ نہیں ہے، البتہ چوری چھپے امرود توڑ کر کھانا اور آنکھ مچولا کھیلنا طفلانہ مشغلوں میں آتا ہے جس کا تذکرہ نیاز صاحب نے کیا ہے۔ لیکن یہ باتیں بچوں کے ساتھ اس درجہ مخصوص کر دی گئی ہیں کہ ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی۔ یہ کنبہ مولانا راشد الخیری کے ناولوں کا پلاٹ ہے یعنی وہی بیوہ، سوکن، یتیم، نمونیہ، دق اور رات کے وقت جب کڑاکے کی سردی پڑتی ہو صحن میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا وغیرہ۔ ہر شخص کا بچپن اور بچپنے کے ساتھیوں کے ساتھ لطایف و ظرائف مختلف اور مخصوص ہوتے ہیں۔ پرائیوٹ خط میں ان کا تذکرہ یقیناً پر لطف ہوتا۔

ناظرین — میں نے غلطی کی کہ یہ مضمون لکھ مارا، دوسری غلطی نیاز صاحب کریں گے اگر اسے شایع کر دیں گے اور تیسری اور یقیناً سب سے بڑی غلطی آپ کریں گے اگر اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیں گے۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ مکتوبات نمبر ا - ۱۸ - ۷۹ - ۱۰۱ - ۱۱۹ - اور ۱۴۳ کا مطالعہ کریں اور مجھے اور نیاز صاحب دونوں کو بخشدیں۔		تا بہ بخشد خدا ئے بخشندہ!

رشید احمد صدیقی

روسی نظام حکومت پر ایک تاریخی و اقتصادی تبصرہ

(۱)

مسٹر اسپنسر نے حال ہی میں بمبئی سے ایک کتاب شایع کی ہے جس میں بتایا ہے کہ روس اور اس کی حکومت پر تاریخی تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ سلسلۂ مضامین اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ مسٹر اسپنسر کا مقصود اس کتاب کی اشاعت سے جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے یہ نہیں ہے کہ روس کا نظامِ حکومت ہر ملک کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے کیونکہ ہر ملک کے حالات کا اقتضا مختلف ہوا کرتا ہے، بلکہ مدعا صرف تاریخی و اقتصادی مطالعہ ہے سرمایہ داری اور محنت و عمل کی جنگ بہت قدیم ہے اور اسی لئے سرمایہ داری نے ہمیشہ اشتراکیت کو مطعون کیا ہے۔ ہڑتالیں، کارخانوں کا تعطل، لامتناہی خطرات و انتشار، عام بیروزگاری، افلاس، فاقے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ سرمایہ داری نوع انسانی کے دکھ درد کا علاج نہیں کر سکی بلکہ اس میں اور اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دامنِ قدرت میں اس قدر دولت موجود ہے کہ دُنیا کے ہر فرد کی ضرورت اُس سے پوری ہو سکتی ہے۔ مگر سرمایہ داری نے شبانہ روز محنت کرنے والے مزدور کی زندگی میں کسی ایک مسرت کا بھی اضافہ نہیں کیا اور قدرت کی تمام دروازے اس پر بند کر دئے۔

سوشلزم کیا ہے جی، ڈی، آچ، کول (G. D. H. Cole) نے اپنی کتاب (The simple case for Socialism) میں اشتراکیت کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے چار باتوں کا ذکر کیا ہے جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا:۔

(۱) انسان دوستی (Human fellowship)

(۲) ایسا سماجی نظام جس میں امیر و غریب کی تفریق کا کوئی وجود نہ ہو۔

(۳) پیداوار کے تمام ذرایع پر سب کو یکساں حق ملکیت و تصرف حاصل ہو۔

(۴) ہر انسان اپنی اہلیت کے مطابق مشترکہ خیر و بہبود کے لئے کام کرنے پر مجبور ہو۔

سوشلسٹ کہتے ہیں کہ تمام دولت مزدور کی پیدا کی ہوئی ہے۔ تبادلۂ اشیا سے کوئی قدر (Value) ظہور میں نہیں آتی۔ زمین کی صرف اسی وقت تک قدر ہے جب اُس کا رشتہ انسان کی تخلیقی قوتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر انسان کے لئے محنت کرنا ضروری ہے اور قدرت کے ذرایع بھی بیحد وسیع ہیں۔ اگر شخصی حیثیت کا خاتمہ کر دیا جائے

اور (Exploitation) کا سد باب ہو جائے تو انسان کی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں یعنی اگر انسانی مفاد کے پیش نظر پیداوار، اُس کی تقسیم اور مبادلہ کو اشتراکی اُصول کے مطابق چلایا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس طرح کا اجتماعی نظام افلاس کا خاتمہ کردے گا اور بلا تفریق نسل و قوم اس سے تمام انسانوں کی تمدنی ترقی ظہور میں آئے گی۔

روس کا تجربہ روس دنیا کا سب سے پہلا ملک ہے جہاں اس خیال کا عملی تجربہ کیا گیا۔ روس کی گزشتہ بیس سال کی تاریخ شدید نکتہ چینیوں کا مستقل موضوع بنی رہی ہے اُس کی لامذہبیت طوائف الملوکی اور مصائب کی ہولناک تصویریں پیش کی گئیں۔ دنیا کی ہر سیاہ کاری اور بدنظمی اُس سے منسوب کی گئی اس میں شک نہیں کہ دوران انقلاب میں لینن نے دہشت انگیزی سے کام لیا لیکن اُس کی وجہ یہ تھی کہ بالشوکوں کو صرف تشدد ہی کا ایک طریقہ معلوم تھا۔ چنانچہ جو بھی اشتراکیت کی مخالفت کرتا اُس کے لئے وہ یہی حربہ استعمال کرتے

روس میں انسان کی مدنی حیثیت سویٹ روس کے دستور کا اصل مقصد سوویٹ یونین کے بسنے والوں کی اقتصادی زندگی کی تشکیل و تعمیر ہے تاکہ ملک کی دولت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو، مزدوروں کی معاشرت کا معیار بلند ہو اور یونین کی آزادی و دفاع کو تقویت پہونچے۔

بنیادی حقوق اور فرائض مدنیت (۱) شہریوں پر بہت فرائض عاید ہیں، لیکن ان فرایض سے کہیں زیادہ اُن کو حقوق حاصل ہیں۔ جو پابندیاں اُن پر عاید ہیں اُنمیں سب سے بڑا درجہ "کام" کو حاصل ہے۔ ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے۔ ریاست اُس کی اہلیت کے مطابق کام فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ "جو کام نہ کرے گا وہ کھانا بھی نہ کھائے گا" کے اُصول کی وہاں سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔

(۲) سوویٹ حکومت نے آرام و سکون کی ضرورت کو پوری طور پر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہاں کے دستور میں ملک کے بسنے والوں کے اس حق کی پوری حفاظت کی گئی ہے۔ عام طور سے کام سات گھنٹہ لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی ایسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں جان کا خطرہ ہو وہاں صرف چھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ سال میں چھٹیاں بھی پوری تنخواہ کے ساتھ ملتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے مزدوروں کے لئے آرام خانوں (Rest Houses) صحت گاہوں، اور کلبوں وغیرہ کے پورے انتظامات ہیں اور ملک بھر میں اُن کا جال بچھا ہوا ہے۔

(۳) ملک کے بسنے والوں کی بڑھاپے میں کفالت کی جاتی ہے۔ اسی طرح بیماری کی حالت میں یا کام کرنے کی اہلیت نہ رہنے کی صورت میں حکومت تمام ضروریات کی کفیل ہوتی ہے۔

(۴) تعلیمی مصارف کی ذمہ دار تمام تر حکومت ہے۔ یعنی روس کے بسنے والوں کو تعلیم پر ایک حبہ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔

(۵) سوویٹ دستور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں عورتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں سماجی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی غرض تمام مسایل میں عورت کا درجہ مردوں کے برابر ہے۔

(۶) بلا لحاظ نسل و قوم سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ نسلی یا قومی امتیاز یا تعصب تعزیری جرم ہے ریاست کے تخیل سے قومیت کو بالکل جدا کر دیا گیا ہے اور سوویٹ حکومت کی کامیابی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

یہی چیز ہے جس نے آج بہت سی پامال اقوام کو ترقی دیکر اگلی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ روشن ترین مثال اس سلسلہ میں تاتاریوں کی ہے۔ انقلاب سے پہلے اُن میں بمشکل ۵ افیصدی تعلیم پائی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۴ء میں یہ اوسط ۹۰ فیصدی ہوگیا۔ تاتار ریپلک میں صرف تعلیم ہی مفت نہیں ہے بلکہ تمدنی اصلاح کے دروازے بھی وہاں کھولدئے گئے ہیں۔ عورتوں نے اپنے برقعے اُتار پھینکے ہیں اور اُن کو مردوں کے ساتھ مساویانہ حقوق حاصل ہیں۔ دارالسلطنت قازان (Kazaan) میں متعدد شفاخانے، طبی درسگاہیں اور تمام مدارس اور کالج پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں کثیر تعداد عورتوں کی ہے اور حکومت کے دارالاشاعت سے لاتعداد کتابیں اور رسالے شایع ہوتے ہیں۔

(۷) ہر بالغ کو بلا لحاظ نسل و جنس ووٹ دینے کا حق ہے۔ ہر شخص کو تقریر، تحریر، اجتماع و مظاہرہ کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن ایک مختصر جماعت ایسی بھی ہے جو نہ ووٹ دینے کی مجاز ہے اور نہ اُن حقوق سے متمتع ہوسکتی ہے جو یونین کے شہریوں کو حاصل ہیں اور یہ جماعت مذہبی پیشواؤں، تاجروں، کارخانہ داروں اور قدیم زار کے حامیوں کی ہے جو اشتراکیت کی کھلی ہوئی مخالفت کرتے ہیں۔

ذاتی کاموں کے لئے مزدوروں کو لگانا تعزیری جرم ہے۔ ایک امریکی سیاح نے دوران گفتگو میں اپنی رہبر لڑکی سے کہا کہ امریکہ میں بہت سے کارخانے ایسے پائے جاتے ہیں جہاں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ یہ سُن کر لڑکی کے استعجاب کی انتہا نہ رہی اور بولی کہ "یہاں تو اس جرم میں دس سال کی سزا ہو جاتی ہے"۔

(۸) ملک کے تمام بسنے والوں کو آزادی ضمیر حاصل ہے۔ ریاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اسی طرح سے تعلیم کو بھی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر آدمی کو اپنے خیال کے مطابق عبادت کا پورا پورا اختیار ہے۔ لیکن بالکل اسی طرح ہر شخص کو مذہب کے خلاف بھی پروپاگنڈہ کا یہی حق ہے۔

یونین کا دستور

دی یونین آف دی سوشلسٹ سوویٹ ریپلک (The Union of the Socialist Soviet Republics) گیارہ مختلف سوویٹ جمہوریتوں کی ایک وفاق ہے۔ ہر جمہوریت خود اپنا دستور مرتب کرتی ہے جو یونین کے بنیادی تخیل کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر یونین کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے مرکزی وفاق سے علحدگی اختیار کرلے۔ یو، اس، اس، آر سے متعلق قانون سازی کے جملہ اختیارات سوویٹ اعلیٰ (Supreme Soviet) کو حاصل ہیں جو دو ایوانوں پر

مشتمل ہے۔ پہلا ایوان سوویٹ اف دی یونین (Soviet of the Union) ہے اور دوسرا سوویٹ آف دی نیشنلٹیز (Soviet of the nationalities) ہے پہلے ایوان کا انتخاب اس اُصول کے ماتحت عمل میں آتا ہے کہ ہر علاقہ سے تین لاکھ کی آبادی پر ایک ڈپٹی (ممبر) لیا جائے دوسرے ایوان کا انتخاب یو، ایس، ایس، آر کی تمام یونینیں (Unions) اور جمہوریتیں کرتی ہیں۔ دونوں ایوانوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور یہ انتخاب چار سال کے لئے عمل میں آتا ہے۔

پنچایتی طریقہ ہندوستان کی طرح روس بھی ایک زراعتی ملک ہے۔ پورا ملک ستر لاکھ قریوں پر مشتمل ہے اور ہر قریہ کی ایک پنچایت (Soviets) ہے۔ یہی پنچایتیں حکومت کا اہم ترین جزو ہیں جن کا دائرۂ عمل صرف گاؤں ہی کی خیر و بہبود تک محدود نہیں بلکہ سوویٹ اعلیٰ (Supreme Soviet) کے انتخابات بھی اسی کے سپرد ہوتے ہیں۔ ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے۔ ووٹ دینے کے وقت لوگوں کو کسی خاص گاؤں کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے طلب نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کو کسی مخصوص کارخانے یا مخصوص فارم (Farm) پر کام کرنے والے کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام جمہوریتوں میں نمایندگی جغرافی حدود سے وابستہ ہوتی ہے لیکن یہاں امداد باہمی کی انجمنیں، ٹریڈ یونینیں (Trade Unions) اور دوسرے سماجی ادارے حلقوں کا کام دیتے ہیں۔

عسکری خدمات یورپ کے تمام ممالک کی طرح روس میں بھی جبریہ فوجی بھرتی ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بین فرق ہے۔ سرخ فوج (Red Army) میں صرف مزدوروں اور کسانوں کے لڑکے شرکت کا اعزاز حاصل کرسکتے ہیں۔ ملک میں عسکری خدمت کو بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ یو، ایس، ایس، آر کا عسکری نظام صرف دفاع کی غرض سے قایم ہے۔ وہاں کے عسکری کیمپ کو دراصل اس وجہ سے اہمیت دیجاتی ہے کہ وہ صرف عسکری تعلیم ہی کا مرکز نہیں ہوتے بلکہ مدنیت و تمدن کا بھی وہاں سبق دیا جاتا ہے، اور اسکا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ عسکری اداروں سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ اپنے فرایض مدنیت بھی آسانی کے ساتھ ادا کرسکیں۔ یورپ میں عموماً اور جرمنی میں خصوصاً فوج میں کام کرنے والوں کی حیثیت قوم کے دوسرے افراد سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ روس میں حالات بالکل برعکس ہیں۔ سرخ فوج کے ممبر انتخابات میں بھی شہری ہونے کی حیثیت سے حصہ لیتے ہیں۔ عسکری قواعد کے وقت تو حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد افسروں اور ادنیٰ سپاہیوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اگپو (Ogpu) یونین میں خفیہ پولیس کو اگپو ( ) کہتے ہیں۔ یہ حکومت کا بیحد اہم محکمہ ہے۔ یونین کے دستور کا اصل مقصد مظالم اور لوٹ کھسوٹ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردینا ہے۔ وہ لوگ جو اشتراکیت کی

مخالفت کرتے ہیں اُن کو ریاست کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ نفع کمانے کے لئے مزدوروں کو لگانا یا اس خیال سے خرید و فروخت کرنا سخت جرم ہے۔ کسی ایسے نظام کی تعریف یا پروپاگنڈا کرنا جو اشتراکیت کے منافی ہو غداری کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ متذکرہ بالا معاملات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں اوگپو (Ogpu) خاص خدمات انجام دیتی ہے یہ محکمہ انقلاب کے بالکل ابتدائی دور میں "انقلاب کو برقرار رکھنے" یعنی ردانقلاب کو روکنے کے لئے ظہور میں آیا تھا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ردانقلاب کی تمام سرگرمیوں کو ختم کیا۔ مگر اب اس کی حیثیت بالکل بدل چکی ہے۔ روس میں جرائم کا ارتکاب تقریباً مفقود ہے۔ جیل خانوں کو اصلاحی اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں قیدیوں کو سزا نہیں بلکہ تعلیم دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کے بعد ہر قیدی ایک باعزت شہری بن جاتا ہے۔

مختلف ادارے ملک میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اداروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ٹریڈ یونین (Trade Union) کے ادارے ان میں بیحد اہم ہیں، جن میں تمام ملک کی صنعت گاہوں کے مزدور متحد ہو کر اشتراکیت کی توسیع کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسرا نمبر اُن اداروں کا ہے جن کو پنچایت (Soviets) کہتے ہیں۔ یہ دیہات اور قصبات میں کام کرنے والے مزدوروں کی انجمن ہوتی ہے تیسرے نمبر میں امداد باہمی کی انجمنیں ہیں اور چوتھا نمبر کمیونسٹ پارٹی (Communist Party) کا ہے اس کا مقصد مختلف اداروں میں کام کرنے والے مزدوروں کو متحد کرنا اور اُن کی سرگرمیوں کو صحیح راستہ پر لگانا ہے تاکہ وہ اپنے اصلی مقصد یعنی طبقۂ عمال (Proletariat) کی مکمل خلاصی کی منزل کی سمت تیزی کے ساتھ بڑھ سکیں۔

(۱) ٹریڈ یونین سوویٹ یونین کے دستور کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں ٹریڈ یونین (Trade Union) بیحد ممد و معاون ہوتی ہے۔ لاتعداد مزدور اُس کے ممبر ہیں، چنانچہ سوویٹ حکومت میں ٹریڈ یونین (Trade Union) کے ممبروں کی تعداد تمام دنیا کی ٹریڈ یونینوں (Trade Unions) کے ممبروں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔

سرمایہ دار ملکوں میں ٹریڈ یونین سرمایہ داروں کی حریف مقابل کی حیثیت سے کام کرتی ہے کیونکہ وہاں سرمایہ دار اور مزدور کے مفاد ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے وہاں کی ٹریڈ یونین کے پیش نظر یہ رہتا ہے کہ محنت کے متعینہ اوقات میں کمی کرائی جائے، مزدوری میں اضافہ چاہا جائے اور مزدوروں کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے صنعت متعلقہ کی خیر و بہبود سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ روس کی ٹریڈ یونین کے فرائض اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کو ریاست کے کسی ادارے سے کوئی مخالفت نہیں ہوتی بلکہ اُن کا اصل کام ریاستی اداروں کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ چنانچہ پیداوار بڑھانے کے ذرائع اور تدابیر سوچنے کے لئے ٹریڈ یونین ریاستی اداروں کے ساتھ

پورا تعاون کرتی ہیں۔ یہی ٹریڈ یونین اس کا بھی فیصلہ کرتی ہیں کہ ریاست کے انتظامات، دفاع اور دیگر اخراجات کے لئے مزدور اپنی آمدنی سے کس قدر رقم بطور ٹیکس کے ادا کریں۔ مزدور جمع ہوکر خود اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ کارخانوں کی آمدنی اور اِن کا خرچ اور ریاست کے اخراجات سب پر غور کرنے کے بعد مزدور اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی آمدنی کا اس قدر حصہ بطور ٹیکس کے ادا کریں گے۔ اس طرح سے ٹیکس کی رقم جبریہ نہیں ہوتی بلکہ بہ طیب خاطر وہ اس کو ادا کرتے ہیں۔

مزدوروں کی زندگی میں کارخانوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں سے مزدوروں کو صرف کھانا ہی نہیں ملتا بلکہ رہنے کی جگہ اور اُن کے خاندان کی پوری ضروریات بھی وہیں سے پوری کی جاتی ہیں۔ ایک طرف اگر مزدور سے پوری محنت لی جاتی ہے تو دوسری طرف اُن کے آرام کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ٹریڈ یونین کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں جس قدر آزادیاں حاصل ہیں اُن کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مزدور کے کام اور اُس کی زندگی سے متعلق جتنی چیزیں ہیں اُن کا تمام تر انتظام ٹریڈ یونین کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں کی پرورش گاہیں، زچہ خانے، بچوں کے تعلیمی ادارے، تفریح گاہیں، پارک، کتب خانے، اسکول، کالج، ورزش خانے کھیل کود، غرض کوئی چیز مزدور کی ایسی نہیں جس کا انتظام ٹریڈ یونین نہ کرتی ہو۔

(۲) ریاستی فارم روس ایک زرعی ملک ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو جس طرح حکومت کے معاملات میں نمایندگی حاصل ہے بالکل اُسی طرح کاشتکاروں کو بھی حاصل ہے خواہ سرکاری فارم (State Farms) میں کام کرتے ہوں یا "امداد باہمی" کے فارموں میں کام کرتے ہوں حکومت میں اُن کو بھی پوری پوری نمایندگی حاصل ہے۔ انقلاب سے پہلے وہاں کا کسان جسکو 'موجک' (Mujik) کہتے تھے اُس کی حالت بہت ابتر تھی۔ زمیندار اور حکومت کے مطالبات ادا کرنے کے بعد اُس کے پاس بمشکل اتنا بچتا تھا کہ وہ اپنا پیٹ پال سکے اور تن ڈھانک لے۔ لیکن اب وہاں کی دنیا بدل چکی ہے۔ لکڑی کے فرسودہ ہلوں کی جگہ اب وہاں بڑے بڑے ٹریکٹر (Tractors) استعمال کئے جاتے ہیں۔ آج روس نے دنیا کے سامنے کامیاب ترین سائنٹفک زراعت کی جو مثال پیش کی ہے وہ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہیں نظر آتی۔

مختلف اجتماعی فارم سوویٹ روس میں مختلف اندازہ کے اجتماعی فارم (Collective farms) پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کاشتکار اجتماعی طور پر صرف فصل کاٹتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کاشتکار الگ الگ مکانوں میں رہتے ہیں لیکن فارم کی ضروریات کی تمام چیزیں اجتماعی ہوتی ہیں۔ اور تیسری صورت جو بہت کامیاب ہے، یہ ہے کہ وہ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی طرح کا لباس بھی استعمال کرتے ہیں۔ غرض پورے

فارم کی آبادی میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس منزل پر پہونچنے کے بعد پورا فارم ایک خاندان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اجتماعی فارم میں کسان کی آمدنی تقریباً ۲۴ روبل ماہوار ہوتی ہے۔ نو روبل ماہوار رہنے اور کھانے کے اخراجات کے لئے دینے پڑتے ہیں اور پندرہ روبل دوسرے مصارف کے لئے بچتے ہیں۔ شہر کا مزدور تقریباً ۸۰ روبل پیدا کرتا ہے مگر اُس کو ۶۵ روبل کے قریب اپنے اخراجات کے لئے ادا کرنے پڑتے ہیں اور اس طرح سے اُس کے پاس ۱۵ ہی روبل ماہوار دوسرے اخراجات کے لئے بچتے ہیں۔

کمیون سوویٹ حکومت کی اجتماعی زندگی کا مکمل ترین نمونہ کمیون (Commune) میں نظر آتا ہے۔ پورے روس میں تقریباً دو ہزار کمیون ہیں۔ ہر کمیون میں آلات کاشتکاری مشترک ہوتے ہیں۔ کل ضروریات کے انتظامات بھی اجتماعی طور پر کئے جاتے ہیں۔ اس طریقِ کار کی کامیابی کا بین ثبوت شمالی قاف کی آبادی ہے جو فنلینڈ کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ روسی کاشتکاروں کی خوشحالی دیکھ کر یہ لوگ فنلینڈ سے بھاگ کر روس آئے۔ لینن نے ان کا پرخلوص استقبال کیا اور ریاست نے اُن کو ½ ۲ ہزار ایکڑ زمین دی۔ آج ان لوگوں کی حالت تمام دنیا کے لئے قابلِ رشک ہے۔

(باقی)

مشین کا اثر ہماری معاشرت پر

یورپ اور امریکہ میں جو معاشی دور آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے، دنیاوی قوت کے استعمال سے شروع ہوا، اور جو "ترقی" "خوش حالی" اور "آزادی" کا دور کہلاتا ہے اس کے خلاف ہر زمانے میں احتجاج ہوتا رہا ہے، چنانچہ حال ہی میں پروفیسر ورنر مبارٹ نے بھی "جدید فلسفۂ اجتماعیات"[1] میں اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں یورپ اور امریکہ میں جو کچھ ہوا ہے اسے کچھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو شیطان اور اس کی ترغیبات پر یقین رکھتا ہو، کیونکہ جو کچھ پیش آیا ہے اسے صرف شیطان ہی کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

اس نے خود پسند انسان کو باور کرا دیا کہ ہر شخص اپنی عقل کے زور سے ساری بنی نوع آدم کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے اور اس نے انسانوں کے تمام ادنیٰ جذبات حرص و آز کو خوب ابھارا اور ایک نئے معاشی نظام یعنی سرمایہ داری کی بنیاد رکھ دی۔ اس نے انسان کو صنعت کے نئے نئے گر سکھائے، پہاڑ اس کے سامنے رائی ہو گئے اور زمین کی طنابیں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ انسان کو ایک بلند پہاڑ پر لے گیا اور کہا کہ "آؤ ہم تم مل کر ایک ایسا منارہ بنائیں جس کی چوٹی آسمان سے جا لگے: تاکہ ہمارا نام ہمیشہ باقی رہے۔"

آئیے اب یہ دیکھیں کہ انسان نے یہ منارہ کیونکر بنایا، اور اس تعمیر میں کیا کھویا؟

چنانچہ سب سے پہلے آبادی بڑھنی شروع ہوئی، اور صرف ایک انیسویں صدی میں یورپ میں ۲۷ کروڑ نفوس بڑھ گئے اور طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ انسان کی عمر بھی بڑھ گئی، یعنی جرمنی میں عمر کا اوسط ۲۵ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال ہو گیا، فرانس میں ۴۰ سے ۵۲ سال ہو گیا اور انگلستان میں ۴۴ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال اور اس زمین پر انسان کی زندگی کے دن طویل ہو گئے، لیکن یہ کسی خدا کے بندے نے نہ سوچا کہ یہ دن کس طرح کٹیں گے، اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کرشمہ یہ ہوا کہ انسانوں کی زندگی نہ صرف بڑھ گئی، بلکہ بہتر بھی ہو گئی اور ہر ملک میں ریلوں کا جال بچھ گیا، سمندروں پر

---

[1] A new social Philosophy (Oxford University Press) 1937.

جہاز چلنے لگے، گھر گھر ٹیلیفون کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ موٹروں کی افراط، مشینوں کی روز افزوں کثرت، لاانتہا خرید و فروخت
وہ جادو کی چھڑی جس نے یہ انقلاب پیدا کیا، مشین کا نظام تھا، جس کی وجہ سے بے حد و شمار "اسپی طاقت"[1]
انسان کی مٹھی میں آگئی۔ اس "طاقت" کے کرشمے ہر طرف نظر آنے لگے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں دنیا نے ۵ کروڑ ٹن گیہوں کی فصل کاٹی تھی، ۶۰ سال بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ فصل ۱۳ کروڑ ٹن ہو گئی! قابل مصرف چیزوں کی تعداد دن دونی، رات چوگنی ہونے لگی، موٹر سائکلیں، اشتہار بازی، بجلی کی روشنی، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، زہریلی گیسیں، نقلی گھی، مصنوعی قہوہ، نقلی سونا، مصنوعی چمڑا، مصنوعی تعلیم، یہ سب کچھ مہیا ہو گیا۔ لاانتہا خوشحالی! بے پایاں فراغت!!

اس جگہ ہمیں سیاسیات سے بحث نہیں، لیکن بر سبیل تذکرہ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ دولت آفرینی اور تجارت کی اس گرم بازاری نے متعدد سیاسی، معاشی نظام پیدا کر دئے۔ سارا صنعتی یورپ، اپنے کروڑوں باشندوں کے ساتھ ایک عظیم الشان شہر بن گیا، شہر والوں نے گاؤں والوں کو مہذب بنانے کا بیڑا اٹھایا، نو آبادیاں بنیں تجارت پھیلی!!

خوش حالوں نے بد حالوں کو قرضے دئے اور اتنے قرضے دئے کہ دنیا قرض خواہ اور قرضدار قوموں میں بٹ گئی، اور "بین الاقوامی" مالیاتی سرمایہ جس کی باگ ڈور گنتی کے چند بنکوں کے ہاتھ میں تھی، ہوا کے پروں اور بجلی کی لہروں پر اڑ کر مخلوق کی دستگیری کے لئے پہونچنے لگا۔ اور شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے والے، حریت کے علم برداروں نے ایک نئی شہنشاہیت قائم کی، جس کا نام ہے اصل شاہی!

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، یہ مضمون سیاسیات سے متعلق نہیں ہے، بلکہ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ "مشینی نظام" کی ان کرشمہ آفرینیوں نے معاشرہ کا چولا کس طرح بدلا، پرانی ہیئت اجتماعی میں کیا کاٹ چھانٹ کی، ذہنوں میں کیا انقلابات پیدا کئے، اور انسانیت کو "ترقی" کا یہ سودا گراں پڑا یا ارزاں۔

پچھلی صدی میں، بغیر کسی سیاسی شور و شغب کے، صدیوں کا پرانا، آزمایا ہوا، معاشرتی ڈھچر زمین پر آرہا اور جن گھروں میں انسان نے آرام و سکون کی زندگی بسر کی تھی، انھیں چھوڑ کر اب اُس نے میدانوں کا رُخ کیا یا کارخانوں کے کھلے ہوئے دروازوں نے اسے نگل لیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک یورپی انسان کی زندگی چند با فراغت حلقوں میں عزت کے ساتھ بسر ہوتی تھی ان میں سب سے زیادہ اہم حلقہ قصبہ تھا، اور دیہی محنت یا گھریلو اجتماعات۔ مشین نے اپنی پوری "اسپی طاقت" کے ساتھ ان بنیادوں پر ضرب لگائی، گھریلو صنعتوں کی بربادی نے وجہ معاش کو کم کر دیا۔ زراعت پیشہ طبقہ اپنا پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ شہروں میں پنچایتوں کی حمایت میں رہ کر دستکار ایک حد تک اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ پنچایتیں، زبردست سرمایہ دار نظامات کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں اور پیشہ ور دستکار بے یار و مددگار

[1] Horse power.

رہ گئے۔ سیکڑوں کام جو اطمینان کے ساتھ گھر کی چار دیواریوں میں ہوتے تھے۔ جیسے سلائی، کشیدہ کاری، کفش سازی اور پارچہ بافی اور جن میں گھر والیاں بھی برابر کی حصہ دار ہوتی تھیں اور سارا خاندان محنت مشقت کرکے زندگی بسر کرتا تھا، رفتہ رفتہ ختم ہوگئے۔ گھر کے کرنے کے کام "بازاروں" میں ہونے لگے، اور گھر والیوں کے لئے صرف یہی صورت رہ گئی کہ یا تو وہ بھی 'بازار' میں جاکر زندگی کی تگ و دو میں مصروف ہوں، یا گھروں میں بیکار رہیں۔ معاشرہ کی جو طبقہ بندی صدیوں سے چلی آ رہی تھی وہ متزلزل ہوگئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آبادی کنبوں اور طبقوں کی بجائے افراد پر مشتمل ہوگئی، جو پرکاہ کی طرح انقلاب کی آندھی میں ادھر ادھر منتشر ہوکر بڑے شہروں اور صنعتی علاقوں میں بغیر کسی ربط باہمی اور شیرازہ بندی کے ڈھیر ہوگئے۔ قصباتی آبادی کا اس طرح 'شہری' بنایا جانا ہمارے زمانہ کی خاص خصوصیت ہے۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ لاتعداد مخلوق شہروں میں کیا کرتی ہے تو آپ کو چاہئے کہ بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی و اقتصادی مرکزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ وہاں آپ کو یہ لوگ کام کرتے نظر آئیں گے اور اب ان کا نام "پرولتار" یا "مزدور پیشہ طبقہ" یا صرف "مزدور" ہے اور آج کل ہمارے اکثر معاشری مسایل میں ان سے بحث کی جاتی ہے۔

اگر آپ موجودہ حیات اجتماعی کا جایزہ لیں اور دیکھیں کہ اس معاشی دور نے افراد کی اس ابتری میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کا معیار آج کل ایک اور صرف ایک ہوگیا ہے یعنی دولت (بشکل زر) اور اب عزت، زر یا آمدنی سے ناپی جاتی ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی دولت سے عزت حاصل ہوتی تھی، لیکن ساتھ ہی کچھ اور صفات بھی شمار کے قابل سمجھی جاتی تھیں۔ اب حُسن، قوت، نیکی، عقلمندی، ہنر، خاندانی شرافت ان سب کی ایک ہی کسوٹی ہے، اور وہ یہ کہ کیا ان سے دولت ہاتھ آ سکتی ہے؟ اب ایک باکمال شاعر، مصور، سنگتراش، اور طبیب کو اپنا کمال ثابت کرنے کے لئے انکم ٹیکس کا تختہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس دور میں دولت کی دوسری خصوصیت اس کا 'ماخذ' ہے۔ پرانے زمانے میں ہر قسم کی دولت کا ماخذ سیاسی ہوتا تھا۔ قوت سے دولت حاصل ہوتی تھی، اب دولت سے قوت حاصل ہوتی ہے اور دولت کا ماخذ معاشی ہوگیا ہے۔ اب معاشرہ کا طبقۂ اعلیٰ یا طبقۂ شرفا محض معاشی قابلیت کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ اب معاشیات کے نمایندے، یعنی کاروباری طبقے، انتظام مملکت میں پیش پیش ہیں۔

جدید معاشرہ میں، کاروباری طبقہ کے مخالف اگر کچھ ہیں، تو وہ صرف بڑے شہروں کے عوام الناس جن کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں لیکن ہر چیز کی ملکیت کے دعویدار ہیں اور وہ خود بھی اسی معاشی دور کی پیداوار ہیں۔ دولت کے اضافے اور "تعلیم" کی ترقی نے ان کو اب اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے "جایز حقوق" کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ سیاسیات میں ان کا دخل روز افزوں ہے۔ ان کی بلند آہنگیوں

نے "پارلیمانی نظام" پیدا کر دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب مملکت کی قوت مختلف معاشی اغراض کا گیند دھڑکا بن گئی ہے۔ اس معاشی دور میں جمہوریت کے معنے "ملی بھگت" کے ہیں۔

معاشرہ پر مشینی نظام کا اہم ترین اثر انسانوں کی ذہنی زندگی پر پڑا ہے۔ انسان فخر کے ساتھ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے، اسے ہر طرف تہذیب ذہنی کے لاتعداد آثار نظر آتے ہیں، کاغذ کی پیداوار پچھلی صدی میں ۱۹۰۰ گنا زیادہ ہو گئی ہے، روزانہ ہزاروں کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ جس طرح پانی، بجلی اور گیس کی تقسیم کے نئے نئے طریقے پیدا کئے ہیں، اسی طرح سے اشاعت تہذیب کے ذرایع بھی بڑھ گئے ہیں۔ سرکاری مدارس، سرکاری کتب خانے سرکاری نمائشیں، سینما، تھیٹر، ریڈیو سب انسان کو مہذب بنانے میں مصروف ہیں۔ کیا یہ سب ترقی کی علامتیں نہیں ہیں؟ کیا بنی نوع انسان اس ثقافتی ترقی پر اپنے آپ کو مبارکباد بھی نہ دے!

لیکن تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس حیرت آفریں اور وسیع ذہنی ثقافت کی بنیاد ایک خاص قسم کی مادی تہذیب پر قایم ہے اور وہ بھی اس معنی میں ایک معاشی پیداوار ہے جس معنی میں تجارت، قدیم زمانہ میں بڑے بڑے علماء وفلاسفہ کو بھی اپنی بسر اوقات کے لئے کچھ نہ کچھ دھندا کرنا پڑتا تھا، اور اس طرح تخلیقی ذہانت پر ایک طرح کی بندش عاید تھی، لیکن اب اضافۂ دولت کی وجہ سے اشاعت تہذیب کی مقدار در فتار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب دن رات کے ہر گھنٹہ میں ناشرین، طابعین، سینما اور تھیٹر کے مالک ذرایع تہذیب کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ لیکن کیا کتابوں کی بہت بڑی تعداد صرف اس لئے تیار نہیں کی جاتی کہ بڑے بڑے چھاپے خانے بیکار نہ رہیں؟

جس ثقافت کی بنیاد کاروباری ہو، اس پر موجودہ مشینی دور کا اثر انداز ہونا یقینی ہے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ثقافت میں فرد کی حیثیت گم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ثقافتی پیداوار کے بوجھ کے نیچے دب گیا ہے، اور یہ دولت پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں دونوں پر صادق آتا ہے۔ مثلاً علم کے پیدا کرنے والے (یعنی عالم) کی کمر آج کل علم کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہے۔ اب وہ پناہ لینے کے لئے تنگ سے تنگ تر کونے ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اپنے لئے "خصوصی" میدان تلاش کرتا ہے اس لئے کہ اب وہ کائناتی نقطۂ نظر کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ غیر معروف کاملین فن کی جو کثرت آج ہے وہ شاید ہی پہلے کبھی ہوئی ہو اور یہ سب ناقدری زمانہ کے شاکی ہیں۔ سب کو اپنی اپنی جگہ جدت و ندرت کا دعویٰ ہے، لیکن در اصل وہ ایک دوسرے کے نقال ہیں۔

پھر ثقافتی پیداوار کی اس کثرت نے علم کے معیار کو پست کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد کی بہت بڑی تعداد اپنے اپنے الگ کونے میں کام کرے گی تو معیار ضرور پست ہوگا، لیکن دوسری طرف اوسط دماغوں کی خاطر سے بھی یہ معیار پست کر دیا گیا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب امریکہ میں ۴۰۰۰ پروفیسر عمرانیات پر کتابیں لکھتے ہوں تو عمرانیات سوائے مواد اور معلومات جمع کرنے کے اور کیا رہ جاتی ہے؟

مقدار و معیار کے علاوہ اس معاشی دور نے ذہنی ثقافت کے موضوعوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اب تہذیب کی شکلیں ہی دوسری ہیں، اور ان کے متعلق نقطۂ نظر بھی بدل گیا ہے۔ فلسفہ کی ہمہ گیر حیثیت ختم کر دی گئی ہے اور اس کی جگہ علیحدہ علیحدہ علوم نے لے لی ہے۔ سائنس کی بھی صرف وہی قسم ترقی کے قابل سمجھی جاتی ہے جو علوم طبیعی کی مدد سے مادی ثقافت کے نشوونما میں مدد دے۔ اب انسان "زمانۂ حال" کا اسیر ہے۔ اسے اتنی مہلت نہیں کہ نظم و ربطِ کائنات پر غور کرے۔ وہ اب صرف فطرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر تصرف کیونکر حاصل کیا جائے۔ اسکی فکر و نظر کی بلندی اب صرف یہ ہے کہ ہوا سے نائٹروجن کیونکر نکالا جائے اور ہوائی جہاز کس طرح بنائے جائیں!

کاروباری تقسیم عمل کا اُصول اب علم کی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح صنعت میں اس اُصول نے دستکار کو صرف مشین کا دستہ گھمانے والا بنا دیا، اسی طرح مادی وسائل و آلات کی کثرت سے اب عالم بھی علمی فیکٹری کا مزدور بن چکا ہے۔

اور ستم بالائے ستم یہ کہ علوم طبیعی کے مقاصد اور طریقے علوم ذہنی میں بھی استعمال ہونے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادی قدر (Value) روحانی قدر پر غالب آگئی۔ مثلاً آجکل کسی نفسیاتی ناول کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے گویا آپ طلبا کی نفسیاتی مشقوں کو پڑھ رہے ہیں اور تھیٹر میں مادی ساز و سامان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بجائے فن لطیف کے 'کاریگری' بن کر رہ گیا ہے اب غور کیجئے کہ اس تمام انقلاب میں افراد انسانی پر کیا گزری؟ گزشتہ صدی نے ان سے کیا چھینا، اور اس کی بجائے کیا دیا؟

سب سے کاری ضرب جو مشین نے انسانیت پر لگائی یہ ہے کہ اس کی دنیاوی زندگی کا رشتہ ہر قسم کے ماورائی تعلقات سے منقطع کر دیا۔ وہ فطرت سے بیگانہ ہو گیا اور ایک ایسی نسلِ انسانی وجود میں آگئی جس کی زندگی مظاہر فطرت کی موسیقیت سے خالی ہے۔ سلسلۂ روز و شب اور موسموں کا تو اثر اب اس کی زندگی کے اجزا نہیں رہے بلکہ مدرسہ کے سبق ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس نسل انسانی کی زندگی اب فطری وجود کا جزو نہیں، بلکہ اسباق مدرسہ، جیبی گھڑیوں، اخبارات، کتابوں، سیاسیات اور بجلی کی روشنی کا معجون مرکب ہے۔

اگر ایک طرف شہری زندگی کی رُست و خیز نے انسان و فطرت کی ہم آہنگی ختم کر دی، تو دوسری طرف قدیم اجتماعات کی پراگندگی کی وجہ سے خود انسانوں کے باہمی تعلقات بھی متزلزل ہو گئے، ہمارے قدیم دیہی تعلقات برادریوں اور پیشوں کی پنچایتوں کی شکل میں نہ صرف انسان کے لئے آسودگی کا باعث تھے بلکہ اس کا اخلاقی سہارا بھی تھے اگر ایک طرف یہ بندشیں عاید کرتے تھے، تو دوسری طرف اتفاق باہمی کے بھی ذمہ دار تھے۔ مشینی اثرات نے آج یہ پرانے بندھن ڈھیلے کر دئے ہیں اور افراد کو زندگی کی دار و گیر میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ انسان آج جس قدر تنہا ہے شاید ہی تاریخ میں پہلے ہوا ہو۔

آجکل کے اجتماعات میں رہکر بھی ہر فرد دوسرے کو اپنا مخالف سمجھتا ہے اور اگر کوئی قدر مشترک ہے تو یہی کہ انسانوں کے اس جنگل میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ تنہا ہے! اب انسان محروم انسانیت ہے، وہ نہ خدا پر اعتقاد رکھتا ہے، نہ انسان پر بھروسہ۔

اضافۂ دولت نے آج زندگی کو زیادہ "خوش حال" بنا دیا ہے، لیکن خوشحالی کے معنی اب تن آسانی کے ہیں۔ اب غریب سے غریب شخص بھی سمنٹ کی سڑکوں، بجلی کی روشنی، آراستہ چار خانوں، اور پارکوں کے "آرام و آرائش" سے بہرہ مند ہے۔ اس کی زندگی ہما ہمی کی زندگی ہے۔ کھیل ہیں، تہوار ہیں، سیاسی جلسے ہیں، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کا سیلاب ہے۔ غرض کہ زندگی کی نبض پوری سرعت کے ساتھ چل رہی ہے، اور ایک علمی قسم کی مادیت روح کی جڑوں تک سرایت کر چکی ہے۔

ہم آج بے شک زیادہ دولتمند ہیں، اتنے دولتمند کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ تھے، لیکن اسی دولت نے ہمیں بندۂ ضروریات بنا دیا ہے اور ضروریات کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور انسان کی روح میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کے لئے انسان نت نئی تفریحیں تلاش کر رہا ہے۔

انفرادی بے اطمینانی اور نئی نئی مسرتوں کی تلاش کا لازمی نتیجہ آپس کی رقابت کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ دنیا میں کبھی پہلے اتنی دشمنی و رقابت نہ تھی جتنی آج ہے۔ ساری انسانیت آپس میں برسرپیکار ہے۔ انسانی روح اب ویران مضطرب، خالی اور سخت ہو گئی ہے۔ قلب انسانی کے لطیف جذبات محو ہو چکے ہیں۔ قلبی اعمال کی جگہ اب ارادی اعمال نے لے لی ہے۔

قلب و روح کی اس متاع کو لٹا دینے کے بعد کاش کہ ہم زیادہ عقلمند ہی بن جاتے، لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔ آج انسانی نسل پہلے سے زیادہ غبی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا تعلیم یافتہ انسان انیسویں اور بیسویں صدی کے پڑھے لکھے انسان سے زیادہ زیرک تھا۔ اُس زمانہ کا گڈریہ آج کے کارخانے کے مزدور سے زیادہ عقلمند تھا۔ پرانے زمانہ کی گھروالی، آج کی نسوانی مدارس کی پیداوار سے زیادہ سمجھدار تھی۔ جب کہ نسل انسانی کی عام ذہنی صلاحیت کمزور نہیں ہوئی ہے تو پھر تعلیم کا جدید مواد دماغوں کو بہتر کیوں نہیں بناتا؟ علوم جدیدہ نے کتابوں، رسالوں، اخبارات، سینما، ریڈیو اور تقریروں کے ذریعہ سے جو اثرات انسانی روح و دماغ اور روح انسانی پر ڈالے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱- انسان اب "علمیت پرست" ہو گیا ہے، یعنی کتابوں کے ذریعہ حاصل کی ہوئی واقفیت اب اس کا انتہائی مقصود ہے۔ اشیاء کے تصور کی بجائے اب وہ "علمی واقفیت" کا پیاسا ہے، اور پیچ در پیچ خیالات میں گم ہو۔ دنیا اور انسان پر غور کرنے کی بجائے اب اسے "نظریۂ آفرینش عالم" اور "نظریۂ تخلیق آدم" میں زیادہ لطف آتا ہے۔ وہ

ھولوں سے زیادہ 'نباتیات' کا دلدادہ ہے، جانوروں سے اسے گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ 'حیوانیات' سے ہے۔ انسانی وح کی رنگینیوں کی بجائے وہ اب 'نفسیات' کا زیادہ شوقین ہے۔

۲- ذہنی معلومات کی افراط نے انسان کو سطحی بنا دیا ہے۔ وہ اس غذائے مفرط کو جذب و ہضم نہیں کر سکتا۔ اسلئے ب یہ اس کو پہلے ہی سے ہضم شدہ صورت میں دی جانے لگی ہے۔ چنانچہ آج کل اکثر آدمیوں کی ذہنی غذا ایسی علمی گولیاں ہیں جو چند چلتے ہوئے الفاظ یا جملوں کی صورت میں انھیں دیجاتی ہیں۔

۳- علم کی اس افراط کا تیسرا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود علم میں ایک طرح کا طفلانہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ انسان کے قلب میں دنیا کے بے شمار موجودات کی عظمت پیدا ہو، وہ ان کی طرف سے بے پروا سا ہو گیا ہے مثلاً آج کل تعلیمی فلموں کا بڑا چرچا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ وہ اشاعت علم کے اچھے ذریعے ہیں، لیکن اگر آپ کسی ایسے مدرسہ یا سینما میں جائیں جہاں یہ فلم دکھائے جا رہے ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ حاضرین بجائے اس کے کہ تعجب و عظمت کے احساسات کے ساتھ، دنیائے حیوانات یا نباتات کے عجائب کو دیکھیں، لاپروا اور بے حس بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے چہرہ سے بھی احترام کا احساس ظاہر نہیں ہوتا۔ پہلے جب انسان اپنی سیر و سیاحت میں اس قسم کے حقایق دریافت کرتا تھا تو محو حیرت ہو جاتا تھا اور اسے دنیائے عجائبات سے ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی تھی، لیکن اب یہ تجربے عامۃ الناس کے لئے خالی از معنویت ہیں، اس لئے کہ صرف چند آنے خرچ کر کے ہر شخص انھیں حاصل کر سکتا ہے!

حاصل کلام یہ کہ آج انسان نے اپنے ماحول کے اثر سے کائنات کا ایک دوسرا ہی نظریہ قایم کر لیا ہے، جو بچوں کی فہم کائنات سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچے کی کائنات اس کے تخیل سے بنی ہے اور آج کل کے بالغوں کی دنیا اعداد و شمار پر قایم ہے۔ جن معیاروں پر عہد حاضر کے انسان نے دنیا کا یہ تصور قایم کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں جسامت پرستی، سُرعت پسندی اور جدت۔

آج کل ہر جسامت کو عظمت سمجھا جاتا ہے، خواہ یہ "جسامت" شہروں کی آبادی کی ہو، یا ستاروں کے فاصلے کی، یا واردات خودکشی کی تعداد کی یا کسی اخبار کے اڈیشنوں کی۔

سرعت پسندی کی مثالیں آپ کو ہر طرف نظر آئیں گی۔ اب آج کل کسی ہوائی جہاز کا ایک گھنٹہ قبل پہونچ جانا، کسی سرفروش موٹر باز کا تین سو میل کی رفتار سے موٹر چلانا، اخباروں میں کسی واقعہ کی اطلاع کا چند گھنٹے پہلے چھپ جانا، یہ دنیا کے دلچسپ ترین واقعات سمجھے جاتے ہیں۔ ریکارڈ قایم کرنے کا سودا ہر سر میں سمایا ہوا ہے، ریکارڈ کے اس خبط نے کھیل اور ورزش جسمانی کی سی اہم چیزوں کو بھی آج کل بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔

آج ہم ہر نئی چیز کو محض اس وجہ سے پسند کرتے ہیں کہ وہ نئی ہے۔ ہیجان خیز باتوں کا شوق حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔ ان تینوں خصوصیتوں کے اعتبار سے آج ہم بچوں کی ذہنی سطح پر آ گئے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج انسان کی زندگی معنویت سے معرا ہے۔ ہر قسم کے ماورائی تعلقات سے بیگانہ ہو کر انسان ہر سمت ٹکراتا اور خود اپنے اوپر گرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کی تکمیل اپنے اندر چاہتا ہے لیکن پاتا نہیں۔
معاشرہ پر مشینی نظام کے اثرات کا یہ خاکہ بعض طبایع کو بہت شاق ہوگا۔ کوئی کہے گا کہ یہ مبالغہ آمیز ہے، کوئی اسے یک طرفہ قرار دے گا اور کوئی اسے سرے ہی سے غلط بتائے گا۔
بے شک یہ خاکہ مبالغہ آمیز ہے، لیکن صرف اس معنی میں کہ اس میں بدیہیات کو واضح کرکے بیان کیا گیا ہے۔ یک طرفہ بھی ہے، اس لئے کہ اس میں اس معاشی دور کی ثقافت کے ہر پہلو پر نظر نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف انہی پہلوؤں کو دیکھا گیا ہے جو اہم ترین ہیں۔ باقی رہا اس کا غلط ہونا! تو اگر کوئی چیز اعداد و شمار اور واقعات سے ثابت ہو جانے کے بعد بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آج امریکہ میں ہر پانچویں شخص کے پاس موٹر ہے، اور جرمنی میں پچھلے دس سال میں اخبارات کی تعداد دگنی ہو گئی ہے۔ ان واقعات کو کون بدل سکتا ہے۔
انسانوں کی بہت بڑی تعداد اب تک یہ نہیں جانتی کہ مشینی نظام کا یہ تماشہ جو آج ہو رہا ہے، ہے کیا؟ اس خلاصے سے اگر صرف یہی مطلب حاصل ہو جائے کہ لوگ اپنی ثقافت کے احیاء کے لئے اس معاشی دور کی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں تو ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ مشین ایک شیطان ہے، جسے منتر پڑھکر ہم نے اپنا تابع کیا، اب یہ ہمارے سروں پر سوار ہے، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت وہ منتر بھول گئی ہے جس سے اسے واپس کیا جا سکے۔

(ماخوذ و مقتبس از "سیاست") سید معراج الدین احمد بی اے (علیگ)

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس:۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی سی کمار پا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳ر

منیجر نگار لکھنؤ

(۱)

مضافات کنڈوہ ضلع مرشد آباد میں ایک گاؤں ہے - کاتیھن - اب تو خیر یہ بالکل ویران و تباہ ہے، لیکن ہم جس زمانہ کا حال بیان کر رہے ہیں، اُسوقت یہ گاؤں بہت آباد تھا۔

یہاں کے لوگ پیر فقیر، سادھو سنت کے بڑے معتقد تھے۔ اسی اعتقاد کی برکت تھی کہ اکثر سادھو اور فقیر یہاں آتے رہتے تھے اور اُن کی نصیحتیں سننے کا موقع گاؤں والوں کو اکثر ملتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک سادھو آیا تو پورے ایک مہینہ تک اُپدیش دیتا رہا، اُس کا اُپدیش یہ تھا کہ اگر "نروان" چاہتے ہو تو مایا کے جنجال کو تیاگ دو ...... اس سے دور بھاگو ...... بیوی، بال بچوں کے پھندے میں پڑ کر مکتی ملنا ناممکن ہے ......

لیکن اُپدیش اور وعظ سننے کے لئے ہوتے ہیں۔ عمل کرنے کے لئے تو ہوتے نہیں ہیں اس لئے سادھو جی اپنا اُپدیش دے کر چلے گئے اور گاؤں والے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ مگر نوجوان بدھن پر سادھو کی تعلیمات نے اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ رات دن اسی خیال میں ڈوبا رہتا تھا۔ اُس میں صفائی کا خیال زیادہ آگیا تھا۔ رات دن کے غور و فکر سے اُس کا جسم لاغر ہوگیا تھا اور اُس کا چہرہ اُترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیوی روپا سے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ ماں سے بھی کترا کر نکل جاتا تھا۔ ماں اس بات کا کوئی خیال نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی جوان بیٹا اور بہو گھر میں ہیں۔ اُن کے ہنسی خوشی کے دن ہیں دونوں رات دن ہنستے بولتے رہتے ہوں گے۔ مگر روپا اس اچانک تبدیلی سے خوفزدہ ہوگئی اس کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن آخر کار ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے دھڑکتے ہوئے کلیجہ کے ساتھ پوچھا "آخر یہ تم رات دن کیا سوچتے رہتے ہو۔ نہ کھانے کی پرواہ ہے، نہ سونے کی فکر، ان دنوں چہرہ بھی بہت اُترا ہوا ہے"

بدھن نے روپا کی طرف پیار سے دیکھا۔ اُس کی نظریں روپا کے معصوم چہرہ پر پڑیں اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بولا :- "یہ گیان دھیان کی باتیں ہیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی"

"تو کیا گیان دھیان میں آدمی بے سدھ ہو جاتا ہے؟ تمھارے باپو جی بھی تو برہمن ہیں اور صبح شام روز

پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر میں نے تو اُن کو کبھی بھی اتنی چنتا کرتے نہیں دیکھا" روپا نے کہا۔

"نہیں روپا! اس کو گیان دھیان نہیں کہتے ہیں۔ یہ بھگوان کی بھگتی نہیں ہے۔ یہ رسم و رواج کی پوجا ہے۔ جب تک آدمی مایا کے جنجال کو تیاگ نہ دے اُسوقت تک وہ بھگوان کا سچا بھگت نہیں ہو سکتا" بدھن نے کہا۔

روپا ایک بھولی بھالی لڑکی تھی وہ اس فلسفہ کو بالکل سمجھ نہ سکی اُس نے دل میں کہا "نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے؟" اور کچھ جواب نہ دے سکی۔

(۲)

چیت کا مہینہ تھا اور چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ سفید چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور چیت کی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سارے گاؤں میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہر شخص سو رہا ہے مگر بدھن ابتک جاگ رہا ہے۔ اُس کے پاس روپا اپنے بچے کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے سو رہی ہے۔

"تو کیا بیوی اور بچوں کی محبت اور ماں باپ کا خیال مجھے نروان کے راستہ سے بھٹکا دیگا؟ - یہ دنیا مایا ہے اور نروان کا حصول بغیر تیاگ کے ناممکن ہے۔ بیوی بچوں کی محبت، ماں باپ کا خیال، دھن دولت، جھوٹی خوشی کی خواہش، سب مایا ہے۔ ان میں حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب دلکش جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت فریب ہے۔ ہے ایشور! میری سہایتا کر کہ میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں۔ ہے پربھو! میرے ہردے کے مندر میں سما جاؤ تاکہ سوائے تیرے آجانے اور تیری بھگتی کے میرے دل میں کسی اور کی جگہ باقی نہ رہے"

بدھن اُٹھ بیٹھا۔ اب وہ مایا کی زنجیروں کو توڑ چکا تھا، اب وہ آزاد تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار کمرہ سے باہر نکل گیا لیکن ایک لامعلوم کشش نے اُس کے پاؤں تھام لئے۔ وہ لوٹ گیا اور اُس نے روپا اور اپنے پیارے بچے کی طرف دیکھا۔ اُس کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی وہ کیفیت زائل ہو چکی ہے۔ وہ پانچ منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر یک بیک خود بخود آہستہ آہستہ کہنے لگا "نہیں! نہیں!! میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اب یہ دلکش فریب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے" یہ کہتے ہوئے وہ دیوانوں کی طرح باہر نکل گیا۔

(۳)

وہ کہاں کہاں نہ پھرا ــــ جنگل، پہاڑ، سبھی چھان ڈالے ــــ مگر حقیقی امن و سکون کی روشنی نہ ملی۔ وہ تین سال تک اسی طرح پھرتا رہا یہاں تک کہ وہ گیا پہونچا ــــ جہاں مہاتما بودھ کو "نروان" کی روشنی ملی تھی۔ یہاں پہاڑ کی کھوہ میں ایک سادھو کے درشن ہوئے۔ سادھو کی جٹائیں لمبی لمبی تھیں، ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ داڑھی اور بھوں کے بال بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ سادھو نے بدھن کی داستان سنی اور ایک ٹھنڈی سانس

لیکر کہا "میرے بچے میں تیس سال سے اسی کھوج میں نروان کی تلاش میں پڑا ہوا ہوں مگر بیکار۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ساری زندگی یوں ہی رائگاں چلی گئی۔ میں تم کو کیا راستہ بتلا سکتا ہوں۔ ہاں! آجکل بابا کبیر داس کا بہت چرچا ہے، بنارس چلے جاؤ اور اُن کے درشن بھی کرلو۔ شاید وہ تمھیں راستہ بتلا سکیں"

(۴)

بدھن جب بنارس پہونچا تو رات ہو چلی تھی۔ نئی جگہ نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ کیا کرتا۔ کہاں جاتا۔ مجبوراً گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو رہا۔ چونکہ سفر کی تکان سے چور ہو رہا تھا اس لئے اُس پر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ نہ معلوم وہ کب تک سوتا رہتا۔ مگر پجاریوں کے میٹھے بھجن اور اشنان کرنے والیوں کی چہل پہل نے اُسے جگا دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور کنارے بیٹھ کر تماشا دیکھتا رہا۔

بنارس کی دلفریب صبح، ہوا کے سرد جھونکے، مقدس گنگا کی روانی، اُس کا صاف شفاف پانی، چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر پرستاران فطرت کا اِدھر اُدھر پھرنا، اُن کی دلکش تانیں، ملاحوں کے ترانے، پجاریوں کا بھجن گاتے ہوئے نکلنا ——— اور ایسے پرکیف وقت میں حسین وجمیل، نازک بدن عورتوں کا سفید ساری پہن کر نہانا ——— اُن کی جادو بھری آنکھیں، اُن کی سیاہ عنبر افشاں زلفیں، اُن کے ماتھے پر سیندور کا دلکش سرخ ٹیکا۔ اُن کا نہا نہا کر پانی سے نکلنا، اور شرما شرما کر ساریاں بدلنا ——— ایسا منظر تھا کہ ممکن نہیں کہ ایک انسان عقل و ہوش نہ کھو بیٹھے۔ کچھ بدھن کے سینہ میں بھی دل تھا۔ بھلا وہ کیونکر اس ہوشربا نظارہ کی تاب لا سکتا تھا۔ ایک گھنٹہ تک اُس پر بیخودی کا عالم طاری رہا۔ اُس نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک فرحت بخش اطمینان اور سکون محسوس کیا۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر تک اسی عالم میں رہتا کہ یکایک اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کو کوئی پکار رہا ہو "بدھن! بدھن!! یہ سب مایا کی زنجیریں ہیں اِن سے بچ ورنہ نروان کی روشنی کا دروازہ تجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا"

بدھن چونک پڑا اور فوراً دیوانہ وار اُٹھ کھڑا ہوا۔

(۵)

صبح کے تقریباً سات بجے ہوں گے اور حسب معمول بابا کبیر داس مریدوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ بدھن بھٹکتا بھٹکتا پہونچا۔

"میں بابا کبیر داس کے درشن کے لئے بڑے دور کا سفر طے کرکے آرہا ہوں ....." بدھن یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بابا کبیر داس دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے "آپ کا سیوک کبیر داس آپ کے سامنے ہے"

بدھن کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ بابا کبیر داس کی جو تصویر اُس کے ذہن میں تھی اُس سے وہ بالکل مختلف تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ بابا کبیر داس کوئی سادھو ہوں گے، لمبی لمبی جٹائیں ہوں گی، بڑے بڑے ناخن ہوں گے

اور لنگوٹ کسے، آسن جمائے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ بابا کبیر داس معمولی انسانوں کے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

اس اثنا میں بابا کبیر داس کی نظر برابر برہمن کے چہرہ پر جمی رہی۔

"بیٹھو بابا! کہاں سے آئے ہو؟"

"بنگالہ سے"

"کیوں"

"برہما کی تلاش میں"

"افسوس! تم نے ناحق اتنی تکلیف کی برہما تو وہیں تھا۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ چشمہ تمھارے بغل میں بہہ رہا تھا۔ اُس چشمہ کو چھوڑ کر پیاس بجھانے کے لئے اتنا دور دراز سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"لیکن بغیر مایا کے جنجال کو تیاگ کئے ہوئے برہما کیونکر مل سکتا ہے؟"

"میرے بچے! کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں میں رہتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما تلک لگانے والے برہمن اور داڑھی والے مولویوں کی جاگیر ہے؟ نادان نہ بنو۔ اپنے گھر کو واپس جاؤ۔ برہما تمھارے گھر ہی میں ہے۔ تم اُس سے وہیں مل سکتے ہو۔ گھریلو زندگی میں دونوں جہاں کا امن و سکون ہے۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں میں مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ؟ اگر اُس کا کرم ہوگا تو گھر ہی میں حقیقت کے خوبصورت چہرے سے نقاب اُٹھ جائے گی۔ گھر پر رہو۔ گھر رہنے کی جگہ ہے کیونکہ برہما کی ہی روشنی اُس کے گوشہ گوشہ میں جلوہ گر ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ پہاڑوں، جنگلوں، ریگستانوں میں چھپا پھرے کیونکہ ان میں طرح طرح کے درندے، پرندے، کیڑے مکوڑے لاکھوں سال سے بستے ہیں مگر ان میں کوئی بڑائی نہیں ہے ——— اور انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ اپنی صورت بگاڑے کیونکہ بندر، ریچھ، کچھے، اُلو، گدھ بڑے بدصورت ہیں مگر اُن میں کوئی بزرگی نہیں ہے ——— اور نہ انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ہوا میں اُڑے یا سمندر اور دریاؤں کے سینوں کو چیرتا ہوا عبور کر جائے کیونکہ رنگ برنگ کی چڑیاں ہوا میں سالہا سال سے چکر لگا رہی ہیں ——— اور قسم قسم کی مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور ان میں رات دن غوطے لگاتے رہتے ہیں اور اس پار سے اُس پار آتے جاتے رہتے ہیں مگر اُن میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اس لئے انسان بنو، اپنے ہم جنسوں سے نو، اُن سے خوشدلی کے ساتھ معاملہ کرو، دوست احباب کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ، دشمنوں کی مدارات کرو، اپنی روزی قوت بازو سے کماؤ، کھاؤ پیو، خوش رہو ——— اور اسراف مت کرو، کسی کا دل مت دکھاؤ کیونکہ اس سے بڑا کوئی پاپ نہیں ہے ——— ماں باپ کی اطاعت کرو، بیوی، بال بچوں سے محبت کرو، یتیموں، غریبوں اور

مسافروں کی خدمت کرو۔ مگر برہما کی محبت میں ہمیشہ مست رہو اور اُس کی محبت کے راستہ میں کسی دنیاوی لالچ کو حائل نہ ہونے دو۔ یہی ہے تیاگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے عزیز بچے! برہما کو تم دنیا کے انھیں جھگڑوں میں پا سکتے ہو کیونکہ برہما وہیں ہے ۔ اس لئے جاؤ وہیں رہو"۔

(۶)

اس واقعہ کو تقریباً ساڑھے چار سو سال گزر چکے ہیں لیکن آج بھی بابا بُڈھن کا مزار موضع کاتیھن میں اونچے ٹیلے پر نیم کے درخت کے نیچے موجود ہے جہاں ہمیشہ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

شبلی ابراہیمی

ل-احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف:۔ اُردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات:۔ اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثری شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفرین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے ۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل:۔ ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ:۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مرزا ابوالحسن آصف خاں

نام ونسب ابوالحسن نام، یمین الدولہ اور آصف خاں خطاب تھا، باپ کا نام مرزا غیاث بیگ تھا، یہ نیک نام اور خوش قسمت امیر جس نے عہد جہانگیری اور دور شاہجہانی میں ممتاز اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہکر حکومت مغلیہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا ہے، جہانگیر کی چہیتی اور مدبر و ہوشمند بیوی نورجہاں کا بڑا بھائی تھا۔

ابوالحسن کا باپ، غیاث بیگ جس نے ہندوستان آکر وزارت عظمیٰ کا منصب جلیل اور اعتمادالدولہ کا خطاب حاصل کیا خواجہ محمد شریف طہرانی کا بیٹا تھا خواجہ شریف میں محمد خاں تکلو حاکم خراسان کا وزیر تھا جب محمد خاں تکلو کا انتقال ہوگیا تو خواجہ محمد شریف نے شاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے تعلق پیدا کرلیا شاہ طہماسپ نے اس کو مرو کی وزارت پر فائز کردیا۔ شہنشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے مغلوب ہوکر ہندوستان سے بھاگا اور مصیبت و ادبار کا مارا ہوا ایران پہونچا تو شاہ ایران نے اسی امیر کے نام اسکی مہمانداری اور تواضع کے احکام صادر کئے تھے۔

صاحب سیرالمتاخرین نے محمد خاں کے نام ان احکام کا جاری ہونا بیان کیا ہے یہ حکم اکبرنامہ میں موجود ہے۔

خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے (۱) آقا طاہر (۲) مرزا غیاث بیگ جس کی شادی علاءالدولہ بیہ آقا ملا کی بیٹی سے ہوئی تھی جو ایران کا بہت بڑا امیر تھا۔

باپ کے مرجانے پر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرزا غیاث بیگ اور اس کے بھائی کو اپنے وطن مالوف سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اس سفر میں غیاث بیگ کے ساتھ اس کی بیوی دو لڑکے اور ایک لڑکی بھی تھی، اثنائے راہ میں بمقام قندھار ایک اور لڑکی پیدا ہوئی جس نے بعد میں نورجہاں کے نام سے نہ صرف جہانگیر کے اقلیم دل پر بلکہ تمام مملکت ہندپر فرمانروائی کی۔ راستہ میں مرزا پر بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں، بہزار دقت و دشواری اس نے فتحپور سیکری میں پہونچکر شہنشاہ اکبر کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کیا۔ غیاث بیگ حقیقت میں ایک جوہر قابل تھا، انشاء، خوشنویسی، شاعری اور دوسرے علوم میں کافی دستگاہ رکھتا تھا، شہنشاہ کی نگاہ انتخاب کا اس پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی دیوان بیوتات ہوگیا اور وقتاً فوقتاً ترقی کے مدارج طے کرتا رہا حتیٰ کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں اعتمادالدولہ کا خطاب اور وزارت کا منصب ملا۔[1]

---

[1] سیرالمتاخرین صفحہ ۲۴ و دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۲۱ - ۲۲ -

علمی استعداد آصف خاں تمام علوم میں بہت اچھی استعداد رکھتا تھا، مگر معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی اسی لئے مراسلات میں جو القاب اس کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا اس میں یہ فقرہ ضرور ہوتا تھا:۔

شعلہ افروز فطرت اشراقیاں، دانش آموز طبیعت مشائیاں[۱]

خوش نویس، اور زباں داں تھا حساب دانی اور معاملہ فہمی میں جواب نہ رکھتا تھا عمال خالصہ اور دوسرے امراء کے حساب وکتاب کی جانچ خود بغیر کسی اہلکار اور پیشکار کی امداد کے کیا کرتا تھا، امثلہ کا فیصلہ بھی آپ ہی کرتا تھا ان اُمور میں اُسے کسی اعانت کی ضرورت نہ ہوتی تھی[۲]

زمانہ سابق میں جب کوئی امیر بڑے مرتبے پر پہونچ جایا کرتا تھا تو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنا کام دوسروں پر چھوڑ دیا کرتا تھا، جس سے اہل معاملہ کی سخت حق تلفی ہوتی تھی اور چونکہ غیر ذمہ دار اہلکار دیانت داری کے جوہر سے عام طور پر محروم ہوا کرتے تھے اس لئے رشوت کی گرم بازاری ہوجاتی تھی، حقیقت میں یہ بہت بڑی کمزوری تھی، چنانچہ افضل خاں علامی پر بھی مورخین نے یہی الزام لگایا ہے کہ باوجود قابلیت اور حساب دانی کے وہ کاغذات پر خود احکام نہیں لکھتا تھا، لیکن آصف خاں کی یہ خصوصیت کہ وہ امثلہ اور حسابی کاغذات کی دیکھ بھال خود کرتا تھا بے انتہا قابل تعریف ہے۔

عادات واخلاق آصف خاں نہایت سخی، متواضع اور نرم گفتار تھا، گفتگو باپ کی طرح بڑی نرمی سے کیا کرتا تھا کبھی میں سختی، اور تلخی نام کو نہ تھی، آرائش اور نفاست کو بہت پسند کرتا تھا، بہت ہی خوش خوراک اور پرخور تھا، دن رات میں ایک من شاہجہانی غذا کھا تا تھا لیکن بیماری کے دوران میں عرصہ کی علالت نے خوراک اتنی گھٹا دی تھی کہ صرف ایک پیالہ بخود آب پیتا تھا[۳]۔ اس کے مصارف بہت زیادہ تھے، موجودہ زمانہ میں وہ عقل میں بھی نہیں آسکتے، مگر اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان سے بہت مختلف تھا، عام طور پر خوش حالی اور فراغ بالی کا دور دورہ تھا، رعایا افلاس اور فاقہ کی تکالیف سے واقف نہ تھی، ہندوستان کی آمدنی ہندوستان ہی میں رہتی تھی، اس لئے اہل ہند کی خوشحالی کچھ تعجب خیز بھی نہ تھی جب عوام کی یہ کیفیت تھی تو امراء کا کیا ذکر ہے، امراء تو آج بھی عیش وعشرت میں اتنا روپیہ صرف کردیتے ہیں کہ ایک غریب اور فاقہ کش انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن آصف خاں اُس عہد زریں کے امراء میں بھی امتیاز رکھتا تھا، اُس زمانہ میں خوش خوری میں آصف خاں دنیا بھر میں شہرت رکھتا تھا۔

گویند دراں وقت یمین الدولہ و مرزا ابوسعید، و باقر خاں نجم ثانی بخوش خوری شہرۂ آفاق بودند[۴]

---

[۱] ماثرالامراء جلد اول صفحہ ۱۵۰ ۔ [۲] ماثرالامراء صفحہ ۱۵۹ ۔ [۳] ماثرالامراء جلد اول صفحہ ۱۵۰ ۔ [۴] ماثرالامراء صفحہ ۱۸۰ ۔

باوجود اس کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی آمدنی میں غرباء کا حصہ نہ تھا، آج سے سو دو سو سال پہلے جہاں آدمی کے لئے علم و شجاعت ضروری تھی وہاں سخاوت بھی لازمی تھی جس طرح آج ہم چوری، زنا اور اسی قسم کی دوسری بداخلاقیوں کو اپنے لئے باعث شرم و ندامت خیال کرتے ہیں اُسی طرح بُخل و امساک کو اسوقت سخت ترین عیب خیال کیا جاتا تھا شعراء خاص طور پر ایسے سرمایہ داروں کی ہجو کیا کرتے تھے جن کے دامن پر کنجوسی کے داغ نظر آتے تھے، اگرچہ عہدِ حاضر میں بھی اس عادت رذیلہ کی تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن ماحول ایسا ہے کہ اسے بُرا بھی نہیں کہا جا سکتا، آج کسی کو سخی یا بخیل کہنا خود اپنی طماعی اور گداطبعی کا ثبوت بہم پہونچانا ہے، بلکہ حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ سرمایہ داری نے تمام اچھے اوصاف کو شکست دیکر شرافت و نجابت کی مسند پر قبضہ کر لیا ہے اور عزت و شرافت کا معیار اب علم و شجاعت یا دوسرے انسانی اوصاف پر قایم نہیں رہا بلکہ دولت و ثروت یا حکومت پر رہگیا ہے، اگرچہ مسلمانوں کی عالمگیر اخوت اور ان کے نظام مذہب کا تقاضہ آج بھی وہی ہے جو دو سو سال پیشتر تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ سخاوت کی صفت سے یہ قوم قطعی محروم نہیں ہوتی، لیکن زمانہ بڑی تیزی سے اسلاف کی امانتیں چھین رہا ہے، خوف ہے کہیں آگے چل کر یہ چیز بھی اس کی دست درازیوں کی نذر نہ ہو جائے بہرحال آصف خاں سخی تھا، غریب اور مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتا تھا، سنہ ۱۰۴۰ھ میں بالاگھاٹ اور اس کے نواحی علاقہ میں امساک باراں کی وجہ سے سخت قحط پڑا بڑے بڑے غنی محتاج ہوگئے، حتیٰ کہ مدت تک کتے کا گوشت بکری کے گوشت کی جگہ فروخت ہوتا رہا، نان بائی رات کو گلی ہوئی ہڈیاں اُٹھا لاتے اور ان کو پیس کر آٹا شامل کر کے روٹیاں پکا لیتے اور دولتمندوں سے قیمت وصول کر لیتے، ایک دن ایک عورت نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ کیا کہ میں نے اپنے ہمسایہ کو اس شرط پر اپنا بچہ دیدیا تھا کہ اس کو کاٹ کر پکائے اور مجھے بھی کھلائے مگر اس نے خود ہی کھا لیا مجھے کچھ نہیں دیا، غرض عجب آفت اور قیامت تھی، آدمی، آدمی کو کھائے جاتا تھا ہزاروں بھوکے مرگئے اور شہر کے شہر ویران ہوگئے چنانچہ اس غمناک سال کی تاریخ ہی کسی نے "غم" سے نکالی، بادشاہ برہان پور میں تھا اس نے بڑے بڑے اور مشہور شہروں میں لنگر جاری کئے بادشاہ کے ساتھ یمین الدولہ آصف خاں نے بھی لنگر جاری کئے جن میں روٹی اور دلیا اس کثرت سے پکایا جاتا تھا کہ ادھر اُدھر سے جو لوگ بھوک کے ستائے ہوئے آتے تھے وہ خوب شکم سیر ہو کر کھا لیا کرتے تھے۔[1]

بادشاہ، بیگمات اور شاہزادوں کی دعوت کے موقعہ پر آصف خاں نہایت تکلف اور اہتمام سے کام لیا کرتا تھا بڑی بڑی نذریں پیش کرتا اور مکان کو اندر باہر سے خوب سجاتا تھا، نوکر بھی نہایت عمدہ پوشاک پہنتے اور اپنی اپنی خدمات ادب اور قرینہ سے انجام دیتے تھے، چونکہ جہانگیر اور شاہجہاں سے آصف خاں کی قریبی رشتہ داری تھی اس لئے اکثر دعوت کا اتفاق ہوتا تھا اور ہر مرتبہ انھیں تکلفات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

---

[1] مآثر الامراء، جلد اول صفحہ ۱۵۱ —

سنہ ۱۰۲۸ھ میں آصف خاں نے اپنے مکان پر جہانگیر کی دعوت کی اور سوا لاکھ روپیہ کا ایک لعل پیش کیا، جہانگیر نے اپنی توزک میں اپنے قلم سے اس ضیافت کی کیفیت لکھی ہے :-

روز مبارک شنبہ پانزدہم آصف خاں در منزلِ خود کہ بغایت جائے بصفا و دلنشیں بود مجلس عالی وجشن بادشاہانہ آراستہ التماس ضیافت نمود ملتمس او را پایۂ قبول بخشیدہ با اہل محل تشریف بردہ شد، وآں رکن السلطنت ایں عطیہ را از مواہب غیبی شمردہ در افزونی پیشکش وترتیب مجلس غایت اغراق بکار بردہ بود از جواہر گراں بہا و زر بفت ہائے نفیس واقسام تحف آنچہ پسند افتاد برگزیدہ تتمہ بشار الیہ عنایت نمودم از جملہ پیشکشہائے او لعلے است بوزن دوازدہ ونیم ٹانک کہ بیک لک بیست وپنج ہزار روپیہ خریدہ بود وقیمت مجموع پیشکش او آنچہ مقبول افتاد یک لک و شصت وہفت ہزار روپیہ شدہ[1] -

۷؍ شعبان سنہ ۱۰۴۰ھ کے جشن نوروز میں شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو آصف خاں نے دس لاکھ روپئے نذر کئے۔

۶؍ رجب سنہ ۱۰۴۳ھ کو شاہجہاں کی حویلی میں جو اس نے لاہور میں کافی روپیہ صرف کرکے تعمیر کی تھی گیا تو اس نے ۶ لاکھ کی پیشکش کی۔

اگرچہ ہماری رائے میں ان واقعات کو "سخاوت" سے زیادہ فضول خرچی سے تعلق ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ سلطنت مغلیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر مرجاتا تھا تو اس کی تمام جایداد اور املاک ضبط کرلی جاتی تھی، تاہم وہ بادشاہ پرستی کا دور تھا اور بادشاہ کے ساتھ محبت کرنا ایک حد تک جزو ایمان ہوچکا تھا اس لئے یہ اغراق قابل مذمت بھی نہیں کم سے کم ان واقعات سے آصف خاں کے مصارف کا تو اندازہ کیا ہی جاسکتا ہے۔

خطابات ومناصب آصف خاں بڑی جاہ وحشمت اور شان وشوکت کا امیر تھا، جہانگیر اور شاہجہاں کے فیض التفات سے اس کو جو مراتب حاصل ہوئے وہ شاہان مغلیہ کے عہد میں اور کسی امیر کو نصیب نہیں ہوئے، بلکہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی بادشاہ کے عہد میں کسی نے یہ عزت نہیں پائی جو آصف خاں کو ان دو بادشاہوں کے دور فرمانروائی میں حاصل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ آصف خاں اپنی قابلیت اور کاروائی کے لحاظ سے اس کا مستحق ضرور تھا کہ اس پر وہ نوازش شاہانہ ہونی چاہئے تھی جو ہوئی لیکن خوش قسمتی سے اس کو نورجہاں ایسی بہن بھی ملی تھی اسی کے ساتھ قدرت نے اُسے ارجمند بانو ایسی بیٹی بھی مرحمت کی تھی، ان دونوں بیگمات سے ان کے شوہروں کو جو عشق اور شیفتگی تھی وہ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو عہدے اور مرتبے ملے نیز

---

[1] توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۲۶۸ و ۲۶۹۔

ان کے اعزاز و وقار میں اضافہ ہوتا چنانچہ یہی ہوا، جب آصف خاں کی چھوٹی بہن مہرالنسا، (نورجہاں) جہانگیر کے عقد میں آئی تو اس کے خاندان کی عزت و وقعت میں چار چاند لگ گئے نورجہاں کے تمام رشتہ داروں بلکہ ملازموں اور غلاموں تک کو عمدہ عمدہ خطابات اور عہدے ملے، باپ اعتمادالدولہ اور وزیر ہوا، بڑے بھائی یعنی ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب اور میر سامانی کا عہدہ ملا حتیٰ کہ جس عورت "دل آرام" نے نورجہاں کو دودھ پلایا تھا، وہ بھی صدر اناث ہوئی۔ عورتوں کو جو امدادیں اور وظایف دئے جاتے تھے ان میں "صدر الصدور" دل آرام کی مہر پر احکام جاری کر دیا کرتا تھا۔

۱۰۲۰ھ کے واقعات میں جہانگیر اعتمادالدولہ کی ضیافت اور پیشکش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اکبر کے زمانہ سے آج تک کسی امیر نے ایسی پیشکش نہیں کی، یہ لکھتے لکھتے اس کے قلم میں محبت اور خصوصیت کا جوش پیدا ہوتا ہے اور آخر میں یہ جملہ بے اختیار ادا ہو جاتا ہے:۔ "الحق او را بدیگراں چہ نسبت!"[1]

واقعی اعتمادالدولہ کو دوسرے امراء سے کوئی نسبت نہ تھی، وہ نورجہاں ایسی مدبرہ اور ہوشمند عورت کا باپ تھا، جو جہانگیر کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب نورجہاں اور جہانگیر کے ازدواج ہی کی بدولت ہوا اور جن لوگوں کو مناصب و مراتب عطا کئے گئے ان کی اہلیت و قابلیت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا اس میں شک نہیں کہ اس ازدواج نے نورجہاں کے خاندان کو بادشاہ کی عنایات شاہانہ کا زیادہ مستحق بنا دیا تھا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی ندرت ہو ہر بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں اپنے اعزہ اور جاں نثاروں پر بھی نوازشیں کی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خاندان اپنی قابلیت و اہلیت کے باعث اسی رعایت و توجہ کا استحقاق رکھتا تھا اور وزارت و امارت اس کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی خواجہ محمد شریف ایران میں وزیر رہ چکا تھا مرزا غیاث بیگ ایران کے ایک صوبہ کی حکومت پر فائز تھا۔ پھر کوئی تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہی عزت جو اس کے وطن میں اُس سے چھین لی گئی تھی ہندوستان آکر حاصل ہو گئی اور شاہجہانی عہد میں تو آصف خاں کو جو کچھ ملا وہ اُسی کی کوششوں اور سرفروشیوں کا صلہ تھا اور یہ کہنا قطعاً صحیح ہے کہ شاہجہاں کو محض بیوی کی وجہ سے ہندوستان کی سلطنت نصیب ہوئی، ظاہر ہے کہ جہانگیر اول سے آخر تک اپنی محبوبہ نورجہاں کے ہاتھ میں تھا، اس کی خلاف منشا، وہ کوئی کام کرسکتا تھا اور نورجہاں کی کیفیت یہ تھی کہ شاہجہاں سے اس کو سخت خصومت تھی، شاہجہاں سے اس نے باپ کو بدظن کیا۔ شاہجہاں پر بغاوت کا الزام لگایا اور اُسے بغاوت پر آمادہ بھی کیا، پھر اسی کے ساتھ شرفِ حضوری سے

---

[1] تزک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔

محروم کیا، اس کی دولت و ثروت برباد کی، اور اُسے مجبور کیا کہ دشتِ غربت میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرے اسکے برخلاف اس نے اپنے داماد شہریار کو فروغ دیا ہر وقت اپنے پاس رکھا، امراء کو اس کی اطاعت پر مائل کیا اور ہر طرح اُسے تقویت پہونچائی، ان حالات میں کوئی قوت نہ تھی جو سلطنت کا تاج شہریار کے سر سے اُتار کر شاہجہاں کے سر پر رکھدیتی جس کے پاس نہ خزانہ تھا، نہ فوج تھی، نہ لشکر تھا نہ امراء تھے، اگر آصف خاں کو اپنی بیٹی ارجمند بانو (ممتاز محل) کے پاسِ خاطر سے شاہجہاں کی رعایت منظور نہ ہوتی تو وہ بھی اپنی بہن کی ہمنوائی کرتا جس کو سلطنت کا تمام ساز و سامان میسر تھا، اگر ایسا ہی ہوتا تو یقیناً تاریخ میں شاہجہاں کا نام بحیثیت شاہجہاں کے محفوظ نہ ہوتا، یہ سب آصف خاں ہی کی حسنِ تدبیر اور شجاعت و سرفروشی کا کرشمہ تھا کہ شاہجہاں دکن میں منھ چھپاتا پھر رہا تھا اور قلعۂ لاہور کی فضائیں اس کے نام کے خطبہ اور سکہ سے گونج رہی تھیں ——— ایساکیوں تھا ایک بھائی، اپنی بہن سے کیوں لڑ رہا تھا کیوں اس غریب اور بیوہ بہن کو نظر بند کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا، اس کا جواب صرف ایک ہی ہے یعنی بھائی کی محبت پر شفقتِ پدری غالب آگئی تھی، آصف خاں اگر صرف نورجہاں کا بھائی ہوتا اور ارجمند بانو کا باپ نہ ہوتا تو یقیناً صورتِ حال وہی ہوتی جو نورجہاں پیدا کرنا چاہتی تھی مگر تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور صرف اس لئے نہیں ہوا کہ شہریار نورجہاں کا داماد تھا اور شاہجہاں آصف خاں کا، پھر کیونکر ممکن تھا کہ آصف خاں بھانجی کے سہاگ پر بیٹی کے سہاگ کو نثار کر دیتا اور شہریار کی جگہ شاہجہاں کو مخذول و مقتول کرتا۔

مگر جہانگیر کی خوش نصیبی اور اقبال مندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسین و ذہین، عاقلہ و دانشمند بیوی کے ساتھ ہی اُسے دو ایسے جوانمرد، عاقل اور فرزانہ مشیر بھی مل گئے (اعتماد الدولہ اور آصف خاں) جنکے فیضِ صحبت سے جہانگیر کے بہت سے عیوب دور ہوئے اس کی خود پسندی اور خود پرستی، خدا پرستی میں تبدیل ہو گئی شراب جو رام رنگی کے نام سے خلوت و جلوت میں شریک و سہیم رہتی تھی صرف رات کی ہمدم رہ گئی، رات کو پیتا اور دن کو بڑی مستعدی اور دانائی سے عدالت کے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔

جہانگیر کے چھٹے سن جلوس میں ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب ملا، جہانگیر نے مختصر طور پر اپنی توزک میں اس کا ذکر کیا ہے:-

"ابوالحسن پسر اعتماد الدولہ را بخطاب اعتقاد خانی سرفرازی بخشیدم و پسر آں معظم خاں را بمناصب لایق سرفراز ساختہ بہ بنگالہ پیش اسلام خاں فرستادم"[1]

یہ سب سے پہلا خطاب تھا، جو ابوالحسن کو دیا گیا اس کے بعد سنہ ۹ جلوس (سنہ ۱۰۲۳ھ) میں آصف خاں کا خطاب اور سہ ہزاری منصب عنایت ہوا یہ خطاب ابوالحسن کے لئے تنہا نہ تھا بلکہ اس کے خاندان میں دو آدمیوں کو اس سے

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۹۹

پہلے بھی مل چکا تھا چنانچہ جہانگیر خود لکھتا ہے :-

"در تاریخ سوم منصب اعتقاد خاں را کہ دو ہزاری ذات و پانصد سوار بود سہ ہزاری ذات و سوار مقرر فرمودم و بہ خطاب آصف خانی کہ دو کس ہم از سلسلۂ آنہا بدیں خطاب سرفرازی یافتہ اند سربلند ساختم"[1]

مرزا غیاث الدین کو جو ممتاز محل کا نانا یعنی ابو الحسن کا خسر تھا یہی خطاب حاصل تھا اور غیاث الدین کے بھتیجے مرزا قوام الدین کو جو ۹۸۵ھ میں عین عالم جوانی میں اسوقت وارد ہند ہوا تھا جب یہاں کے اورنگ حکومت پر اکبر متمکن تھا، آصف خاں کا خطاب ملا تھا اس کے بعد مسلسل اور متواتر اضافوں کے بعد آصف خاں چھ ہزاری (چھ ہزار سوار) کے منصب پر پہونچگیا[2] یہاں پر پہونچکر بھی اس کی ترقی کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رکا اور بڑھتے بڑھتے وزارت سپہ سالاری کے عہدے پر پہونچکر نو ہزاری ہوا، ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ حسب موقعہ آگے بیان کیا جائے گا۔

اولاد آصف خاں اولاد کے معاملہ میں بھی بہت خوش قسمت تھا اس کے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں، پھر شادی بیاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر وسیع ہوتا گیا اور بہت سے پوتے، پوتیاں، اور نواسے نواسیاں ہوئیں۔

آصف خاں کا سب سے بڑا بیٹا شائستہ خاں تھا جو باپ کی زندگی ہی میں بڑے بڑے کارنمایاں کرچکا تھا اور بہار کا ناظم تھا شاہنواز خاں ولد عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی اس کے عقد میں تھی، معلوم ہوتا ہے کہ شاہنواز خاں کی یہ لڑکی بھی ہمت مردانہ کی مالک تھی، مہابت خاں نے جب جہانگیر کو قید کرلیا اور ساتھ ہی آصف خاں بھی گرفتار ہوگیا تو شائستہ خاں کی بیوی غالباً اپنے شوہر کی پھوپی نورجہاں کے پاس تھی، جہانگیر مہابت خاں کی دلداری کے لئے اس سے عجیب عجیب قسم کی گفتگو کیا کرتا تھا یہ بھی کہا کرتا تھا کہ شاہنواز کی بیٹی سے ہوشیار رہنا وہ کہتی ہے میں مہابت خاں کو گولی سے اڑا دوں گی،[3]

تاریخ میں ابوطالب اور معظم خاں کے نام سے دو اور بیٹے آصف خاں کے ملتے ہیں، لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم خاں کو ہی شائستہ خاں کا خطاب ملا ہے میرے پاس اسوقت مآثر الامراء کی پہلی جلد موجود ہے دوسری اور تیسری جلد بھی ہوتی تو میں اس امر کی زیادہ تحقیق کرسکتا، بہرحال آصف خاں کا دوسرا بیٹا ابوطالب کو سمجھنا چاہئے۔

تیسرے بیٹے کا نام مرزا بہمن یار تھا یہ بہت آزاد لاابالی، عیش پسند اور بے پروا تھا، اس کا موروثی خطاب اعتقاد خاں اس کو حاصل تھا، چار ہزاری منصب تھا، دارا شکوہ کی لڑائی کے بعد عہد عالمگیری میں

---

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۱۲۸ — [2] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۲ — [3] توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۲۲۴ -

پانچ ہزاری ہوگیا تھا اسوقت اس کا بڑا بھائی شائستہ خاں ناظم بنگالہ تھا۔ سنہ ۱۰۸۲ھ میں اس نے انتقال کیا، نہایت سیدھا، سچا، آزاد اور فقیر دوست تھا، ایک دن ایک کوچہ گرد مجذوب سے ملنے گیا بادشاہ کو اس کا علم ہوگیا چونکہ یہ بات اس کے درجۂ امارت سے گری ہوئی تھی بادشاہ نے اعتراضاً پوچھا بندہائے بادشاہی میں سے وہاں کوئی اور بھی تھا، اس نے بے تکلف اور برجستہ جواب دیا، صرف یہی روسیاہ تھا باقی سب خدا کے بندے تھے، اسکا ایک لڑکا محمد یار خاں بہت مشہور تھا، ایک بیٹی فاطمہ بیگم مفتخر خاں کی بیوی اور نگ زیب کی نہایت معتمد اور "صدرالنساء" تھی[1]۔ منجملہ پانچ بیٹیوں کے ایک یعنی ارجمند بانو شاہجہاں سے منسوب تھی، جو ممتاز محل کے نام سے آج تک مشہور عالم ہے اور اس کا مقبرہ "تاج محل" دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے" اس نے باپ کی زندگی میں بمقام برہان پور بحالت زچگیری انتقال کیا اس کے بطن سے شاہجہاں کے بہت اولاد ہوئی، شاہجہاں کو اس سے بڑا اُنس تھا اسکے بعد اس نے پھر شادی نہیں کی۔ ارجمند بانو کی حقیقی بہن جو ایک ہی تھی سیف خاں کے عقد میں تھی، سیف خاں جہانگیر کے عہد حکومت میں احمد آباد کا صوبہ دار تھا اس نے شاہجہاں کے دکن سے آگرہ جاتے وقت بغاوت کا ارادہ کیا تھا۔ شاہجہاں نے اس کی جگہ شیر خاں کو تعینات کیا اور اس کو نظر بند کرنے کا حکم دیا، لیکن ممتاز الزمانی بیگم نے اپنے بہنوئی کی سفارش کی، اور بادشاہ نے اس کو خدمت پرست خاں کو بھیجکر اپنے پاس بلالیا۔

آصف خاں کی ایک بیٹی آصف الدولہ، جملۃ الملک اسد خاں محمد ابراہیم سے منسوب تھی[2]۔ ایک لڑکی جعفر خاں عمدۃ الملک کو بیاہی گئی تھی جو آصف خاں کا بھانجا بھی تھا، اس لڑکی کا نام فرزانہ بیگم اور عرفیت "بی بی جیو" تھی[3]۔ ایک لڑکی میر خلیل المخاطب بہ "خان زماں" پسر اعظم خاں جہانگیری کے عقد میں تھی[4]۔

عمارات آصف خاں نے آگرہ، دہلی، کشمیر اور لاہور میں بہت سے مکانات بنائے اور باغات لگائے تھے۔ لاہور میں ایک حویلی بیس لاکھ روپئے کی لاگت سے تعمیر کرائی تھی، ۶ رجب سنہ ۱۰۴۳ھ کو شاہجہاں لاہور میں وارد ہوا تو اس حویلی کو دیکھنے گیا آصف خاں نے اس موقعہ پر ۶ لاکھ کی پیشکش کی، آصف خاں کے مرنے پر یہ حویلی اس کے نواسے داراشکوہ کو ملی۔

خاندان شاہی سے تعلقات آصف خاں جہانگیر کا سالا تھا اور یہی سب سے پہلا رشتہ ہے جو خاندان شاہی سے قایم ہوا۔

سنہ ۱۰۲۱ھ میں ابوالحسن آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو سے جو بعد میں "ممتاز محل" سے موسوم ہوئی شاہزادہ خرم یعنی شاہجہاں کا عقد ہوا۔

---

[1] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۳۴۲۔ [2] مآثر الامراء، جلد اول صفحہ ۳۱۰۔ [3] مآثر الامراء صفحہ ۵۳۱۔ [4] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۶۸۶۔

اس سے پہلے ۱۰۱۵ھ میں دونوں کی منگنی ہوچکی تھی اور جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے دلہن کو انگوٹھی پہنائی تھی، ربیع الاول ۱۰۲۰ھ میں منگنی کے پانچ سال پانچ دن بعد جب شاہزادہ کی عمر ۲۰ سال اور بیگم کی ۱۹ سال تھی شادی ہوئی، صاحب مآثر الامراء نے ۱۰۲۰ھ میں شادی کا ہونا بیان کیا ہے حالانکہ جہانگیر نے اپنی توزک میں ۱۰۲۱ھ کے حالات میں شادی کا تذکرہ کیا ہے، جہانگیر خود اپنے سمدھی کے گھر گیا اور نذر قبول کی، توزک میں لکھتا ہے:-

"چوں صبیہ اعتقاد خاں ولد اعتماد الدولہ را بجہت خرم خواستگاری نمودہ بودم ومجلس کدخدائی او درمیان بود در روز پنجشنبہ ہجدہم خورداد بمنزل او رفتہ یک روز ویک شب آنجا بودم وپیشکشہا گذرانید"[1]

یہ شادی اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت کامیاب ثابت ہوئی، زوجین میں اتنی محبت تھی جسے بے تکلف عشق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

امراء کے لڑکوں اور بیٹیوں کی شادیاں شاہان مغلیہ کے آئین کی روسے بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ ہوسکتی تھیں آج بھی دیسی ریاستوں میں اعوانِ ریاست اور جاگیرداروں کے لئے ایسی پابندیاں موجود ہیں، اگرچہ بظاہر یہ رسم اچھی نہیں، لیکن سیاست اور اُمورِ سلطنت سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے، بادشاہ اکثر شادیاں سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر کیا کرتے تھے اور منشاء یہ ہوتا تھا کہ اس تعلق سے امراء میں خلوص اور یکجہتی پیدا ہو، عداوت و خصومت کے جذبات کم ہو جائیں چنانچہ اکبر نے اکثر شادیاں ایسی ہی کی ہیں عبدالرحیم کی شادی، مرزا عزیز کوکہ کی بہن سے اسی مصلحت کی بناء پر ہوئی تھی، مرزا عزیز کا تمام خاندان بیرم خاں کا جانی دشمن تھا ایسی صورت میں اندیشہ تھا کہ اس کا بیٹا عبدالرحیم بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکیگا، اس لئے بادشاہ نے مرزا عزیز کی بہن سے اس کا عقد کر دیا تاکہ اس کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے، اور شادیاں بھی اس قسم کی ہوئی ہیں، بیرم خاں اور سلمہ سلطان کا ازدواج بھی قطعاً سیاسی مصالح پر مبنی تھا، جہانگیر بھی اس سیاسی ضرورت سے باخبر تھا، اس نے نورجہاں کی بیٹی کو جو شیر افگن خاں سے تھی، اپنے بیٹے شہریار سے منسوب کیا، اسی طرح شاہجہاں کا عقد آصف خاں کی بیٹی سے کیا، منشاء صرف یہ تھا کہ خاندان کا شیرازہ مجتمع رہے، ایک دوسرے کا ہمدرد اور شریکِ غم ہو، آپس کی خانہ جنگی اور قتل و غارت سے سلطنت کے ٹکڑے نہ ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ شاہجہاں اور ارجمند بانو کی شادی محض شرافت اور نجابت ہی کی بناء پر ہوئی ہو جس کا جہانگیر کو بہت خیال تھا، اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کی یہ حکمتِ عملی کامیاب نہیں ہوئی اور یہ رشتہ آگے چل کر بہت سی خرابیوں اور خانہ جنگیوں کا باعث ہوا، خود بہن بھائی یعنی آصف خاں اور نورجہاں میں اتحاد قایم نہ رہ سکا آخر میں آصف خاں نے اپنی بہن کو نظر بند بھی کیا وہ بھی آصف خاں کی گرفتاری کے خیال میں رہی ایک طرف شاہجہاں مدعیِ سلطنت تھا اور

[1] توزک جہانگیری ص۱۱۱

آصف خاں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے اس کی حمایت کر رہا تھا۔ دوسری طرف شہریار جہانگیر کا چھوٹا بیٹا اور نورجہاں کا داماد بادشاہت کے جھوٹے خواب دیکھ رہا تھا اور نورجہاں کی تائید، جہانگیر کی زندگی ہی سے اس کو شامل حال تھی، اگرچہ انجام بخیر ہوا اور حق بحقدار رسید کی ضرب المثل صادق آئی، مگر اس حسنِ انجام میں جہانگیر کی اصابتِ رائے کو کیا دخل ہے، جبکہ وہ شاہجہاں کو "بے دولت" کا خطاب دے چکا تھا، اور بیوی کے اغوا سے اس پر لشکرکشی بھی کر چکا تھا، پھر نورجہاں کی اُن سیاسی غلطیوں کو کسی طرح نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا جو صرف اسی رشتہ کی وجہ سے سرزد ہوئی اس نے جہانگیر کو شاہجہاں کے خلاف کیا، اور شاہجہاں کو مجبور کیا کہ وہ باپ کے مقابلہ میں تلوار کھینچکر میدان میں آئے، مہابت خاں کی بغاوت اور جہانگیر کی اشارت بلکہ خود نورجہاں کی نظربندی کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے ذیل کے اکثر واقعات میں اُن خانہ جنگیوں کی جھلک نظر آئیگی جو محض اس رشتہ کی وجہ سے برپا ہوئیں -

(باقی)　　　　کوثر چاندپوری

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے - قیمت مجلد عہ

میدانِ عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے - قیمت مجلد عہ

بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے - قیمت مجلد عہ

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے - قیمت ۴ر

مینجر نگار لکھنؤ

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

پچھلے مہینے، ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے، میں نے ظاہر کیا تھا کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے، خدا کا کلام نہیں۔ اس پر مذہبی حلقوں میں کافی بےچینی پیدا ہو گئی اور باوجود اس کے کہ میرا کفر و الحاد اُنکے نزدیک دیرینہ مرض کی حیثیت رکھتا ہے، ان کو میری یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ (حالانکہ مجھے بالکل ناگوار نہیں ہوتا اگر کوئی شخص قرآن کو کلام خداوندی کہتا ہے) اور منجملہ دیگر الزامات کے ایک الزام مجھ پر یہ بھی عاید کیا گیا کہ میں خدا اور رسول کی توہین کرتا ہوں۔ میں یقیناً اہل مذہب کے فتوائے کفر و الحاد کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں خدا و رسول کی توہین کرتا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ خدا کی عظمت اور رسول کی رسالت ہی کو سامنے رکھکر کہتا ہوں اور میرے نزدیک اہل مذہب ہی کی طرف سے خدا و رسول کی زیادہ اہانت ہوتی ہے۔

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو خدا کا کلام کہنا نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشا کے خلاف ہے بلکہ اُس صحیح تصور وحدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے۔ میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا، نہ اقوال سلف سے کیونکہ یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں۔ بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں۔

۱۔ چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہونچایا گیا تھا اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی "اشارۂ سریع" یا "الہام بالسرعۃ" کے ہیں۔ اُردو میں اسکا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری و دیعت ہے اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی "خدا کی دین" اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لئے ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور اُن کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔

وحی کا جو مفہوم میں نے متعین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔
سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:۔

واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اسلئے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈالدی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنے وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ہے:۔

واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنے اس فطری ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لیکر شہد کی مکھی اپنا خوبصورت چھتا طیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورۂ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:۔

یومئذ تحدث اخبارہا بان ربک اوحیٰ لہا

اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو۔

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کا یہ بیان بزبان حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم "ماحول واقتضاء ماحول" قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورۂ "حٰم" میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فقضاہن سبع سمٰوات فی یومین واوحیٰ فی کل سماء امرہا

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دیدیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنے وہی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک

س فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے۔ لیکن آپ سنکر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفسِ انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"فالہمہا فجورہا وتقواہا"

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی — یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت وعدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت:—

وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن ساتھ لگا دئے ہیں اور یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنے "بُری بات سمجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:—

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی علمہ شدید القوی

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے۔

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے جاتے ہیں:

واوحی الیّ ہذا القرآن لانذرکم بہ

مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمھیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے:

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الیّ — (اے رسول کہدو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا

حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)۔

ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے، لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتا، نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحی کے ذریعہ سے چنانچہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب۔

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ، خدا سے باتیں کیا کرتے تھے۔

مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا۔ اس کے متعلق ہم آیندہ بیان کریں گے، لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انھیں سن لیجئے

سورۂ زخرف کی آیت ہے:

ان جعلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تتقون، وانہ فی اُمّ الکتاب لدینا لعلیٌّ حکیم۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اُس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔

یہ اُمّ الکتاب ہے اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

بل ہو قرآن مجید فی لوحٍ محفوظ

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے۔ لیکن جس وقت ہم سورۂ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو "لوح و ام الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہنّ ام الکتاب واُخر متشابہات

اس آیت میں "ام الکتاب" کو "آیات محکمات" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی "مضبوط و مستحکم نشانیاں" یا بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو۔

عرش اعظم سے نیچے اُس نے ایک دانۂ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوحِ محفوظ بنائی۔ اس

لوح کا طول ۷۰۰ سال کی راہ اور عرض تین سو برس کی راہ تھا[۱]۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی مینت کاری کی تھی بعد از اں قلم کو حکم ہوا کہ "لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہوگا اس کے متعلق میرے علم کا حال"۔

قلم نے پہلے لوح محفوظ پر "بسم اللہ الرحمان الرحیم" لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور حسب خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہوگیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت و انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہوگئی ہوں گی، ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتاب استثنا باب ۱۰ آیۃ الغایۃ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی ہی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے توڑ دی تھیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے" — اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا، چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کیلئے استعمال ہوا ہے وہی بجز عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوحِ محفوظ میں درج ہونا چاہئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑ لی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے

---

[۱] معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے، انسان کی، طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی۔

اب درایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہونچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا کی صفتِ نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے اُس تصور وحدانیت کے منافی ہے جو مادیت کے بعید ترین خیال سے بھی پاک و منزہ ہے۔

گفتگو، نطق، الفاظ۔ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ اُن تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرایع کے پیدا کرسکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چالتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اُس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرکے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیجدے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا، جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکیہ کی سی حیثیت دیدینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنے میں مصلح ہوسکتا ہے، جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کرسکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو۔ فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیکر فوج کو نہ لڑائے۔ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کرسکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہئے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوتِ اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا، صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔ قرآن میں جہاں جہاں "کلام اللہ" اور "کلمات اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اُن سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

بعض حیرتناک سیاسی انکشافات

ایک مغربی ماہر سیاسیات کا تفصیلی تبصرہ

دو جنگوں کے درمیان کا زمانہ

مسٹر کے ذلیاکس (K. Zilliacus) کی ایک کتاب ہے "Between two Wars" سرنارمن انجل (Sir Norman Angell)۔ مصنف کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ موصوف یورپ کی آٹھ زبانوں کے ماہر ہیں، جنگ عظیم کے دنوں میں انھوں نے نہایت اہم فوجی خدمات انجام دی ہیں، اتحادیوں نے سائبیریا (Siberia) پر جو حملہ کیا تھا اس میں بھی یہ شریک تھے مجلس اقوام کے قیام کے وقت سے مجلس کے اہم عہدوں پر فائض رہے، یورپ کی وہ بڑی شخصیتیں جنکو مجلس اقوام سے تعلق ہے اُن سے اُن کی شناسائی ہے اور یورپ کے بڑے بڑے سیاستدانوں سے ان کی دوستی ہے۔ گزشتہ بیس سال میں یورپی سیاست کے مد و جزر کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا ہے۔ یہ سب چیزیں اور ان کا طویل تجربہ اس کا ضامن ہے کہ اُن کا بیان یورپی مسایل کے باب میں یقیناً بہت اہم ہوگا۔

یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے 'ماضی' اور 'حال'۔ پہلے میں سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں حکومت کے سیاسی رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے بہت سے ایسے واقعات اور رجحانات کا مصنف نے اظہار کیا ہے جو ابتک عوام کی نظروں سے پنہاں تھے۔ دوسرے باب میں ان حالات اور واقعات پر تبصرہ ہے جو جنگ کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور اُن واقعات و حالات کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور مستقبل سے متعلق پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مئی سنہ ۳۹ء میں لکھی گئی تھی اور آج مصنف کی پیشین گوئیاں بڑی حد تک درست اور صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ مقالہ اسی کتاب کی تلخیص ہے۔ (اڈیٹر)

ماضی | جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی سیاست میں جمہوریت کا یہ حال تھا کہ سول سروس کے لئے مقابلہ کا

امتحان تو ہوتا تھا مگر دفتر خارجہ کی تمام اسامیوں کو پُر کرنے کے اختیارات ایک انتخابی بورڈ کے سپرد تھے جو اس کا خیال رکھتا کہ اس محکمہ میں صرف اعلیٰ طبقے کے افراد منتخب ہوں۔ طبقۂ عوام پارلیمنٹ کی وساطت سے داخلی معاملات میں تو اپنے اختیارات ایک حد تک استعمال کر سکتا تھا، مگر جہاں تک خارجی معاملات کا تعلق ہے اُن کو سختی کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھا جاتا تھا چنانچہ ۱۹۱۱ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک سیاست خارجہ سے متعلق صرف تین مباحثے اور ایک درجن سوالات ایوان میں ہوئے اور ہر موقعہ پر حکومت نے ارادتاً صحیح حالات ظاہر کرنے سے احتراز کیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ عوام کو ان معاملات کے سمجھنے کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خارجی پالیسی صرف حکمران طبقہ کے مفاد سے متعلق سمجھی جاتی ہے اور ایسی حالت میں اگر جمہور کو خارجی سیاست میں درخور حاصل ہو جائے تو ہر دو طبقوں میں باہم تصادم کا اندیشہ ہے۔ اُنیسویں صدی میں جمہوریت نے حکمران طبقہ کی حکومت کو پے بہ پے شکستیں دیں البتہ خارجی معاملات اور مسئلۂ دفاع یہ دو باتیں ایسی تھیں جن پر انقلاب کا اثر سب سے بعد میں ہوا، جب اعلیٰ طبقہ کے مفاد متصادم نہ ہوتے تھے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گزشتہ جنگ عظیم کی گھٹا سر پر آگئی تو عوام الناس اور حکمران طبقے کے مقاصد جنگ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عوام کو اس کا یقین تھا کہ یہ لڑائی لڑی جارہی ہے چھوٹی ریاستوں کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے، عسکریت کے مقابلہ میں جمہوریت کو باقی رکھنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ معاہدات کی حیثیت صرف ردی کاغذ کے پرزوں کی نہیں ہے لیکن در پردہ حقیقت یہ تھی کہ ہمارے حکمران صرف اپنے شہنشاہی مفاد کے لئے توازنِ قوت (Balance of Power) کو برقرار رکھنے کے لئے لڑ رہے تھے۔ برطانیہ نے اعلان جنگ صرف اس لئے کیا تھا کہ اگر جرمنی نے روس کو شکست دیدی تو یورپ میں اُس کی طاقت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور ہمارے مقابلہ میں وہ خم ٹھوک کر آجائے گا۔

شہنشاہی مفاد کے پیش نظر اتحادی حکومتوں نے ایک طرف عثمانی سلطنت اور جرمنی کی نو آبادیات کو آپس میں تقسیم کر لینے کا سمجھوتا کر لیا تھا اور دوسری طرف عوام کو یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ ہرگز اپنی حکومت میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتحادیوں کی امیدوں کے خلاف جنگ نے بالکل مختلف صورت اختیار کر لی۔ ایک طرف تو ۱۹۱۷ء کے آغاز ہی میں عوام جنگ کی تکان محسوس کرنے لگے، دوسری طرف امریکہ کی شرکت جنگ و انقلاب روس نے صورتِ حال بالکل بدلدی اور ہر طرف عالمگیر انقلاب کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اتحادیوں نے اس موقعہ پر بڑی ذہانت اور دلیری سے کام لیا۔ ایک طرف انھوں نے امریکہ کے پریسیڈنٹ ولسن (Wilson) کی پیٹھ ٹھونکنا شروع کی اور دوسری طرف مزدوروں کے سر پر ہاتھ رکھکر اُن کو اپنے قابو میں لے آئے۔ ہر چند انقلاب روس کا مقابلہ کرنے میں انھیں ناکامی ہوئی پھر بھی جنگ کو طوالت دینے میں وہ کامیاب ہوگئے۔

ولسن سے کس طرح فائدہ اُٹھایا گیا

مسٹر ولسن (صدر جمہوریہ امریکہ) مزدور اور معتدل دونوں پارٹیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے عوام اُن کو اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ چنانچہ ولسن کی تجاویز کی عموماً اور "چودہ نکات" کی خصوصاً ان لوگوں نے پرزور تائید کی۔ فرانس، اٹلی اور برطانیہ یوں ہی ان تجاویز سے خائف تھے، عوام الناس کی تائید نے اور بھی ان کے حواس خراب کردئے کیونکہ ان تجاویز سے اتحادیوں کے مفاد کو سخت نقصان پہونچتا تھا۔

چنانچہ ہمارے ارباب حکومت عوام کے سامنے تو اپنی تقریروں میں ولسن کے نکات کی پرزور تائید کرتے تھے مگر در پردہ انھوں نے ولسن کی ناکامی کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے اور ولسن کی انتھک کوششوں کے باوجود اتحادی طاقتیں اپنے خفیہ معاہدوں سے دستبردار ہونے کے لئے طیار نہ ہوئیں۔ ولسن کی دلی خواہش یہ تھی کہ حکومتیں ایمانداری کے ساتھ صلح و امن کی راہ اختیار کریں اور ایک ایسا متفقہ بیان شائع کریں جو اعتدال پسند طبقہ اور مزدوروں کے لئے بھی قابل قبول ہو۔ سب سے پہلی کوشش اُس نے روس کے "مارچ والے" انقلاب کے بعد کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اُس کو یقین تھا کہ اتحادی اگر اپنے مقاصد جنگ میں تھوڑی سی تبدیلی کرلیں تو انقلابی روس علیحدہ معاہدۂ صلح سے باز رہے گا۔ (آگے چل کر ولسن کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا)۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بہرحیثیت ولسن نے صلح کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے چند ماہرین کا تقرر کیا۔ لیکن اتحادی اس اعلان کے لئے بھی تیار نہ ہوئے کہ "یہ لڑائی صرف قیام امن کے لئے لڑی جارہی ہے نہ کہ نوآبادیاتی اضافہ کے لئے"۔ جب "امریکی صلح کا پروگرام" طیار ہوگیا تو ولسن نے کرنل ہاؤس (Colonel House) کو یورپ روانہ کیا تاکہ وہ "اتحادیوں کو سمجھائے اور جرمن پروپگنڈے کو کمزور کرنے اور روس کے ساتھ (اتحادیوں کے) تعلقات برقرار رکھنے کے لئے مقاصد جنگ کا ایک متفقہ بیان شائع کرنے پر مائل کرے"۔

مگر جب کرنل ہاؤس یورپ پہونچے تو اُن کو صورت حال بالکل برعکس نظر آئی ایک طرف پیرس میں ولسن کی تجاویز کے ساتھ ہمدردی مفقود تھی اور دوسری طرف لائڈ جارج (وزیراعظم برطانیہ) نے برطانوی قدامت پسندوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے اُن سے بڑے بڑے وعدے کرلئے تھے۔ ۳۰ نومبر سنہ ۱۷ء کو پیرس میں اتحادیوں کی ایک کانفرنس ہوئی، کرنل ہاؤس نے اس موقعہ پر سخت کوشش کی کہ حسب ذیل تجویز پر سب متفق ہوجائیں:-

"اتحادی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ لوگ یہ لڑائی ظلم اور تاوان جنگ کی خاطر نہیں لڑ رہے ہیں۔ اُن کی تمام قربانیوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کے سر سے عسکریت کا سایہ اُٹھ جائے اور اور تمام قوموں کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ جس طرح بہتر سمجھیں اپنی زندگی گزاریں اور اپنی فلاح و بہبود کے لئے جو مناسب تدابیر چاہیں اختیار کریں۔"

مگر اتحادی اس بات کے سننے پر بھی آمادہ نہ تھے اور کسی طرح بھی انھوں نے حصول نو آبادیات کے خیال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔" چنانچہ کرنل ہاوس اپنی اس ناکامی سے حد درجہ بد دل ہوا اور اُس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء) میں لکھا:-

"مجھ کو اتحادی اقوام کے سپاہیوں اور جہازرانوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، جن کی آنکھیں ہم سب لوگوں پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جسوقت کانفرنس کے لئے ہم سب یہاں یکجا ہوتے ہیں تو مجھ کو اس کا پورا احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنا فرض نہیں ادا کر رہے ہیں۔"

اس موقعہ پر صدر ولسن نے اپنے مشہور عالم چودہ نکات شایع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ اتحادی ممالک کے معتدلین اور مزدور یہ سمجھنے لگے کہ اتحادی حکومتیں یہ لڑائی حصول امن کی خاطر لڑ رہی ہیں مگر خود اتحادی طاقتیں اپنے شہنشاہی مفاد سے دستبردار نہ ہوئیں۔ ہر چند ان لوگوں نے بعد از خرابی بسیار ولسن کی تجاویز کو قبول تو کر لیا مگر اسمیں بھی ان لوگوں کی ایک گہری چال تھی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ کی پوزیشن سے اتحادی ناجایز فایدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہاؤس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۳ مارچ ۱۹۱۹ء) میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ:-

"یہ صلح اس قسم کی نہ ہوگی جس کی مجھکو توقع تھی"

امریکہ کی شرکت جنگ کے وقت سے صدر ولسن نے اتحادی ممالک کے معتدلین اور مزدوروں کو اس کا یقین دلایا کہ شرایط صلح پر ایمانداری کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب صلح کانفرنس میں اُس کو ناکامی ہوئی تو اُس کے سامنے صرف دو راہیں تھیں، ایک تو یہ کہ جن حکومتوں کے ساتھ اُس نے ناتا جوڑا تھا، اُن کو خیرباد کہے یا اُن عوام کے ساتھ غداری کرے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا تھا اور اُس نے موخر الذکر صورت کو ترجیح دی۔

مزدوروں کو کس طرح فریب دیا گیا

انگلستان کی مزدور پارٹی دوسرے ممالک کی مزدور پارٹیوں کی طرح اس تجویز کی پابند تھی کہ:-

"طبقہ دار جنگ اور سیاسی صورت حالات کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جنگ کو روکنے کے لئے وہ موثر انداز میں ہر امکانی تدبیر کو بروے کار لائے، اگر اس کے باوجود جنگ چھڑ جائے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ فوراً مداخلت کر کے جنگ کا خاتمہ کر دیں اور جنگ کی وجہ سے جو سیاسی اور اقتصادی تعطل پیدا ہو اُس کے ذریعہ سے عوام کو بیدار کریں تاکہ جلد سے جلد سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو جائے۔"

لیکن اس تجویز کے باوجود برطانیہ کی مزدور جماعت کے بیشتر افراد نے جنگ کی تائید کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو اس کا پورا یقین دلایا گیا کہ یہ لڑائی بلجیم کے تحفظ، معاہدات کے احترام اور جمہوریت کی مدافعت کے لئے لڑی جارہی ہے۔ برطانوی جنگی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مزدور پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اسکا اعتراف

خود لائڈ جارج نے اِن الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

"اگر مزدور پارٹی اس جنگ کی مخالفت کرتی تو جنگ کا موثر انداز میں جاری رکھنا محال ہو جاتا اور کامیابی کی راہ میں بڑی دشواریاں حائل ہو جاتیں۔ ٹریڈ یونین (Trade Union) کے سب سے بڑے لیڈر نے ہماری کامیابی کے لئے دوران جنگ میں جان توڑ کوششیں کیں۔ مزدوروں کی امداد کے بغیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنا قطعاً ناممکن تھا۔"

جب حکومت نے جبریہ فوجی بھرتی کا پہلا مسودہ پیش کیا تو مسٹر آرتھر ہنڈرسن (Arthur Handerson) اور دوسرے مزدور لیڈروں کے لئے تھوڑی سی دشواری پیدا ہو گئی کیونکہ ٹریڈ یونین کانگرس اپنے اجلاس برسٹل (Bristol) میں حکومت کی اس تجویز کے خلاف اظہار ناراضگی کی ایک تجویز پاس کر چکی تھی۔ آخر کار جب مسٹر اسکوئتھ نے مسٹر ہنڈرسن کو اس کا یقین دلا دیا کہ اس مسودہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ صنعتی حلقوں میں جبریہ فوجی بھرتی ہو گی تو مسٹر ہنڈرسن نے اس مسودہ کی حمایت میں تقریر کی ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسکوئتھ کی وزارت بدل کر قومی حکومت قائم ہوئی اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم نے مزدور لیڈروں کو قومی حکومت میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے کہا:۔

"یہ بالکل ظاہر ہے کہ خواہ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا اس ملک میں کوئی حکومت چل ہی نہیں سکتی جب تک کہ مزدور پارٹی (میں یہاں پر تائید کا لفظ استعمال کروں گا) بلکہ اُس کے ساتھ اتحاد عمل نہ کرے۔"

اسی تقریر میں آگے چل کر انھوں نے یہ بھی کہا کہ:

"یہ تو کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی وزیر مزدور نمایندوں کے مشورہ کے بغیر صلح کی گفت و شنید کا آغاز کر سکتا ہے۔"

مگر جسوقت مسٹر لائڈ جارج یہ تقریر فرما رہے تھے اُسی وقت وہ اپنی بینہ پر یہ بھی طے کر چکے تھے کہ اُن کی پیش رو حکومت نے مزدوروں سے جو وعدے کئے ہیں اُس کو وہ پورا نہ کریں گے۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں انھوں نے کابینہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسا مسودہ تیار کیا جائے جس کی رو سے ساٹھ سال تک کی عمر کے تمام لوگ فوج میں بھرتی کئے جا سکیں اور اگر ممکن ہو تو عورتوں کو بھی مستثنیٰ نہ کیا جائے مگر کابینہ نے اس کے بجائے نیشنل سروس بورڈ (National Service Board) کا قیام زیادہ مناسب سمجھا اور اس محکمہ کے افسر اعلیٰ مسٹر نیول چیمبرلین کو بنایا گیا۔ مگر مزدور جماعت کی مخالفت کی وجہ سے یہ اسکیم ناکام رہی اور مسٹر چیمبرلین کو اُن کی نااہلی کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا۔ انقلاب روس سے پہلے انگلستان کی مزدور پارٹی حکومت کے پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی اور صلح کے باب میں اُسکے کوئی ذاتی خیالات نہ تھے مگر انقلاب روس نے صورت حال بدل دی۔ زار کی حکومت کا خاتمہ کرنے میں روسی

مزدوروں کو جو کامیابی حاصل ہوئی اُس نے اِس ملک کے مزدوروں کو بھی بہت کافی تقویت پہونچائی اور انمیں ایک نوع کی خود اعتمادی پیدا ہوگئی اور ملک کی تمام مزدور جماعتوں نے یہ تجویز پیش کرنی شروع کردی کہ "موجودہ حکومت، صلح کی طرف قدم اُٹھانے کی اہل نہیں ہے"

۲۸ دسمبر سنہ کو مزدور پارٹی اور ٹریڈ یونین کانگرس کا ایک متحدہ قومی جلسہ ہوا جس نے جنگ کو ختم کرنے کے متعلق مزدوروں کی ایک متعینہ پالیسی کا اظہار کیا۔ یہ تجویز ولسن کی تجاویز اور روسی انقلابیوں کی تجاویز سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ مزدوروں کے اس اقدام نے اتحادیوں کو بڑی حد تک پریشان کردیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں جنگ کی مخالفت میں جلسے ہو رہے تھے اور فوجی بھرتی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں جس سے عام انقلاب کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔

مسٹر لائڈ جارج نے اِس موقعہ پر مزدوروں کی تجویز کو سامنے رکھکر ایک تقریر مرتب کی اور آزاد خیال متعلین کو بلاکر سنائی۔ اُس کے بعد ٹریڈ یونین کے جلسہ میں اسی تقریر کو دہرایا اور سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ مزدوروں کی صلح کی تجویز کسی حال میں بھی "اُس تجویز صلح سے مختلف نہیں ہے جو ہماری حکومت نے مرتب کی۔ یہ میں اس کا اعلان کردینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد جنگ یورپ کے صرف اُس قانون کی حفاظت کرنا ہے جس کو آج ٹھکرایا جارہا ہے۔ ہم معاہدوں کی شرایط کی تعظیم کرانا چاہتے ہیں اور بلجیم کو دوبارہ زندہ کرنا ہمارا مقصد ہے"

خود مسٹر لائڈ جارج کا بیان ہے کہ اس تقریر کے ساتھ ہی تمام مخالفت کافور ہوگئی اور دو لاکھ پچاس ہزار وہ لوگ بھی فوج میں بھرتی ہوگئے جو مستثنیٰ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہی مزدور پارٹی نے "اہل برطانیہ کے مقاصد جنگ" کے نام سے ایک بیان شایع کیا جس میں خاص طور سے وزیر اعظم کی تقریر کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ:۔

"۵ جنوری سنہ ۱۸ء کو وزیر اعظم نے ٹریڈ یونین کانگرس کے نمایندوں کے سامنے جو معرکہ آرا تقریر کی ہے وہ اُن تمام تقریروں میں اہم ترین درجہ کی ہے جو ابتک دنیا کے سیاستدانوں نے موضوع جنگ پر کی ہیں"

مسٹر لائڈ جارج نے اپنے بیان کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بالفور کو ہدایت کی کہ وہ صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن سے استدعا کریں کہ وہ بھی ایک بیان اس کی تائید میں شایع کریں۔ مسٹر لائڈ جارج نے کسی جگہ بھی اپنی اس ہدایت کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ کرنے کی کوئی وجہ تھی مگر کرنل ہاوس کے کاغذات (The intimate papers of Col. House) میں وزیر خارجہ کا یہ پیغام (مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸ء) موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کچھ عرصہ سے ٹریڈ یونین کے نمایندوں اور وزیر اعظم کے مابین گفت و شنید ہو رہی تھی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ابتدائے جنگ میں حکومت نے جو وعدے مزدور لیڈروں سے کئے تھے اُن سے وہ آزاد

ہو جائے۔ قومی نقطۂ نگاہ سے یہ بیحد ضروری ہے تاکہ وہ اپنی فوجی طاقت بڑھا سکے اور مغربی محاذ جنگ پر فوجیں روانہ کی جا سکیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ حکومت برطانیہ فوراً اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کر دے۔ وزیر اعظم نے اعلان کر دیا ہے اور یہ اعلان مزدوروں نیز پارلیمنٹ کی مخالف پارٹی سے مشورہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ (جلد سوم صفحہ ۲۴۹)

تار کے اختتامی الفاظ یہ ہیں :-

"وزیر اعظم کو اعتماد ہے کہ اس طرح کا بیان صدر کی اُن سابقہ تقریروں کے طرز پر ہوگا جن کا انگلستان اور دوسرے ممالک کی رائے عامہ نے پر زور استقبال کیا ہے"

مگر ولسن کو اس پیغام کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ تو پہلے ہی اپنے چودہ نکات کے سلسلہ میں ایک تقریر کرنے کا قصد کر چکا تھا۔

مسٹر لائڈ جارج نے، ولسن کی تقریر کے بعد ۱۸ جنوری سنہ ۱۸ء کو پھر مزدور نمایندوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ :-

"لڑائی جیتنے یا کسی بڑے شہنشاہی مقصد کے حصول کا یہاں سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پندرہ دن قبل اپنے مقصد جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہی مطالبہ صدر امریکہ کا بھی ہے۔ ہم تو صرف اُس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو بہ یک وقت حکومت امریکہ ٹریڈ یونین کانگریس اور ہماری حکومت کا مقصد ہے"

آپ نے دیکھا کہ مزدور جماعت صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کونسا مقصد ہے جس کے لئے اُن کو جنگ کی آگ میں جھونکا جا رہا ہے اور حکومت نے کس طرح اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔

(باقی)

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۳ صفحات پر۔ قیمت معہ محصول ۱۲/ عہ

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

بندہ نواز، گرامی نامہ کا شکریہ - جو گفتگو آپ نے چھیڑی ہے، اس میں شک نہیں بہت دلچسپ ہے، بشرطیکہ آپ کی طرح کسی کو فراغ حاصل ہو اور اس سے لطف اُٹھانے کی توفیق بھی ——

میری حالت تو اس دنیا میں ایسی ہے جیسے کسی امیر کے دسترخوان پر ضعفِ معدہ کا مریض! کہ سامنے سب کچھ ہے اور پھر کچھ نہیں —— اکبر مرحوم کا شعر ہے :-

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں، اک نظر ہیں

مگر میرا نظریہ، کائنات کے متعلق کچھ اور ہے —— آپ کہیں گے کہ پھر شاعری شروع کر دی، لیکن آپ نے بحث ہی ایسی چھیڑ دی ہے کہ سوائے شاعری کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے -

غالب کہتا ہے :- "اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ" —— بیدل اپنی زندگی کا سامان یوں پیدا کرنا چاہتے ہیں :- خونے بہ جگر جمع کن و رنگ بروں آ —— ! میں بالکل بیچارانہ گزر جانے کا قائل ہوں، لیکن "متوکلانہ" نہیں —— ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، کیا لذت رکھتا ہے -

تا دل بدنیا دادہ ام در کشمکش افتادہ ام
اندوہِ فرصت یک طرف، ذوقِ تماشا یک طرف

یقیناً بعض اوقات مجھے بھی اس گھڑی کا خیال آجاتا ہے، جب وہ دل کے ساتھ احساس بھی ختم ہو جائے گا، لیکن مستقبل کو "حال" تک کھینچ لانے کی ضرورت بھی کیا ہے - زمانہ اور زمانہ کی تباہکاریاں اپنے اختیار میں نہیں، انکو بھلا دینا بیشک ایک حد تک اختیار میں ہے - زندگی سے گزر جانا اتنی بڑی بات نہیں جتنا زندگی گزار دینا - آپ آسان بات کو سوچ رہے ہیں اور میں اُس کو جو آسان نہیں -

بہرحال، اور کچھ کام نہ ہو تو آپ کی طرح بیٹھے بیٹھے یہ سوچتے رہنا کہ کل کیا ہوگا، بے مزہ کی چیز، لیکن جو آج کی اُلجھنوں میں گرفتار ہے اُسے اِس بھلاوے میں نہ ڈالئے ورنہ وہ کچھ نہ کر سکے گا -

ہماری سوگواری اور اندوہناکی کا بڑا تعلق یہاں کی حکومت سے بھی ہے کہ ہاتھ پاؤں چلنے کی حالت میں بھی وہ بقاءِ حیات کی ذمہ دار نہیں، ضعف و درماندگی کے زمانہ کا کیا ذکر ہے —— آپ لوگ سرمایہ دار ہیں آپ کی سمجھ میں یہ بات مشکل سے آئے گی، میں مزدور ہوں اور سوائے اس کے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا -

اس بحث لطایف میں یہ ٹکروہ عنصر غالباً آپ کو پسند نہ آئے گا، لیکن مجھے آپ کا یہ "چبا چبا کے باتیں کرنا" کب پسند آتا ہے - میں آپ کی سنتا ہوں تو آپ بھی میری سنئے - ایک غریب کی تسکین کے لئے یہ بھی کم نہیں

اے تو مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم !

پورے دو دن یہ سوچتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ آپ کے خط کا جواب لکھوں لیکن باور کیجئے کہ ہمت نہ ہوئی، جب حضوری تھی تب بھی دل ہر وقت کانپتا رہتا تھا، اور اب کہ حضوری نہیں، وہی حال ہے — آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے کہ آپ مجھ سے جس قدر دور ہیں، اتنا ہی مجھ سے قریب ہیں — اسقدر قریب کہ "نتواں ترا و جان زا بہم امتیاز کردن" !

آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا ہے اس کا اقتضاء صرف یہ تھا کہ میں خود حاضر ہو کر "خراج نیایش" پیش کرتا لیکن افسوس ہے کہ اس کی اجازت نہیں، اور ہو بھی تو مصلحت نہیں، اس لئے آپ ہی بتائیے کہ جو باتیں صرف نگاہوں سے کرنے کی ہیں انھیں الفاظ سے کیونکر ادا کروں !

آپ کی نئی زندگی سے مجھے دلچسپی تو نہ ہونا چاہئے، لیکن اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی باقی نہ رہی تو مجھے افسوس ہوگا میرے لئے تو زندگی کے تجربوں میں اب "تلخ و شیریں" کا امتیاز باقی نہیں رہا، لیکن خدانخواستہ اگر آپ کو کسی وقت اس پر غور کرنا پڑا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی -

اگر اجازت ہو تو ایک درخواست پیش کروں - ارادہ یہ ہو کہ جہاں تک ممکن ہو، مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ دیجئے کہ آپ نے مجھے بھلا دیا ہے - مجھے زندہ رہنے کا شوق تو نہیں ہے لیکن ضرورت یقینی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ماضی کی تلخ کامیاں مجھے یاد نہ آئیں -

آپ کے ساتھ میرے ماضی کا تعلق اتنا شدید ہے کہ میں آپ کو "اپنا گزرا ہوا زمانہ" کہتا ہوں، اس لئے آپ کیوں میرے حال میں اس نوش کو شامل کریں، جس کے تحمل کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں — لیکن اگر آپ نے یہی فیصلہ کر لیا ہو کہ بہر صورت مجھے مرجانا ہی چاہئے، تو بسم اللہ — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو !

اللہ، اللہ، کیا تیور ہیں، ذرا دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے چھوتے ہوئے گزر جائیں اور میرے دامن میں آگ لگ جائے !

کیوں دیوانے ہوئے ہو — وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا !

میں قیامت تک تمھارے کہنے میں نہ آؤں گا - جانتا ہوں کہ تم سے کوئی معاملہ کرنا دل کا خون کرنا ہے - اور اب یہاں اس کی تاب نہیں -

میں یوں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں، لیکن تمھارے عہد و پیمان کی تائید مجھ سے ممکن نہیں - اگر تمھاری کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ میں تمھاری "قول و قرار" کا ضامن بن جاؤں، تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں تمھاری کامیابی کا ساتھی نہیں -

باب الاستفسار

کیا آپ مسلم ہیں؟

(جناب محمد صفی اللہ صاحب۔ بارکپور)

میں آپ سے ایک نہایت مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں اور مختصر ہی اس کا جواب چاہتا ہوں یعنی یہ کہ آپ کیا واقعی مسلم ہیں، اگر ہیں تو پھر اسکے معنے یہ ہوئے کہ ساری دُنیا کے تام مسلمان، مسلمان نہیں ہیں اور، اگر آپ مسلم نہیں ہیں تو پھر اسکا اعلان کیوں نہیں کر دیتے۔

(نگار) میں واقعی مسلمان ہوں، اور اگر میرے مسلمان رہنے سے ساری دُنیا دائرۂ اسلام سے خارج ہوئی جاتی ہے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ لیکن یہ خدشہ آپ کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ اسلام ایسی جنس کمیاب ہے کہ وہ سوائے میرے کہیں اور دستیاب ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ میری "نامسلمانی" کا مرتبہ اتنا نہ بڑھائیے کہ مجھے خود اس سے حجاب آنے لگے۔

معاف فرمائیے آپ نے جس زاویۂ نگاہ سے یہ سوال کیا ہے وہ درست نہیں اور اس لئے آپ کی خواہش کے مطابق بہت زیادہ مختصر جواب سے آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

آپ کو میرے اسلام کی طرف سے صرف اس لئے شبہ ہے کہ میرے عقاید، عام عقاید سے علٰحدہ ہیں، لیکن عام عقاید کا اختلاف ایک شخص کو اس جماعت یا قوم سے علٰحدہ نہیں کر سکتا جس میں اس کا نشوونما ہوا ہے۔ اس لئے جب تک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، دُنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ مجھے ملتِ اسلامی کے دایرہ سے خارج کر دے، خواہ میرے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

حیرت ہے کہ میں تو ایک حور و قصور پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان کو بھی باوجود اس مادیت پرستی کے مسلمان سمجھوں اور وہ میرے اسلام میں جو یکسر اخلاق و روحانیت ہے شبہ کرے۔

اب اس قسم کی طفلانہ باتوں کا زمانہ نہیں رہا ہے، کچھ کام کی باتیں کیجئے۔ میں اگر تعلیمات اسلام کو کسی ایسے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں جو آپ کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے، تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم آپ علٰحدہ ہیں۔

حسنک واحد و عبارا تنا شتی

رہ گیا کفر و اسلام، سو اب یہ اصطلاحیں بالکل بے معنی ہیں اور صرف مولویوں اور پنڈتوں کے روٹی کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ آپ اس جھگڑے میں پڑ کر اپنا وقت ضایع نہ کیجئے اور نہ مجھے کافر سمجھ کر اپنی عاقبت خراب کیجئے۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود!

تنوعات

گزشتہ تین ہزار سال میں ایک کرور ۳۰ لاکھ جانیں زلزلہ کی نذر ہوئی ہیں ——— دُنیا میں دودھ پلانے والی مخلوق ۱۴ ہزار قسم کی ہے۔ چڑیوں کی قسمیں ۲۴ ہزار ہیں اور حشرات کی سات ہزار ——— کوّے دن بھر میں کم از کم ۲۵ مرتبہ پانی پیتے ہیں ——— اگر دو سو انچ والی نئی دوربین کے ذریعہ سے جو حال ہی میں طیار ہوئی ہے، ایک میل کے فاصلہ پر کسی مکھی کو دیکھا جائے تو اس کی آنکھیں تک نظر آئیں گی ——— امریکن ہوٹلوں کے کاروبار میں پانچ لاکھ پچاس ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں جو سالانہ ۲۰ کرور آدمیوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں ——— شنگھائی میں روزانہ اخبارات بجائے فروخت کرنے کے زیادہ تر کرایہ پر دئے جاتے ہیں اور ایک ہی کاپی متعدد آدمیوں کو دیکر ہر ایک سے علیٰحدہ علیٰحدہ کرایہ وصول کیا جاتا ہے ——— لندن میں ہر مربع میل پر سالانہ ۲۴۰ ٹن کاجل گرتا ہے ——— کوچین چائنا میں طلاق دینا بہت آسان ہے، چار آدمیوں کو جمع کرکے چاول کھانے کی تیلیوں کو توڑ دیا اور طلاق ہوگئی ——— ہیرا تولنے کے کانٹے اس قدر نازک و صحیح ہوتے ہیں کہ پلک کا ایک بال بھی اس کے توازن کو متاثر کر سکتا ہے ——— امریکہ میں اسوقت تین کروڑ انسان ایسے بستے ہیں جو نسل کے لحاظ سے جرمن ہیں ——— دُنیا کے تمام سمندر ۱۴۵۰۰۰۰۰ مربع میل زمین گھیرے ہیں۔ گویا کرۂ ارض کے ۷۵ فی صدی حصہ پر پانی کی حکومت ہے ——— یہ نپولین کی ایجاد تھی کہ مکانوں پر نمبر ڈالتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ایک طرف طاق نمبر پڑیں اور دوسری طرف جفت۔

——— فرانس کی اکاڈیمی کا بیان ہے کہ یورپ میں ۶۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ساری دنیا میں ۲۷۹۶ ——— اوسط وزن سر کے بالوں کا چھ اونس ہوتا ہے۔ بال کا نشو و نما ہر مہینے آدھ انچ ہے اور اس کا قطر انچ کا پچیسواں حصہ ——— نوزائیدہ بچے صرف دو باتوں کا خوف لیکر دُنیا میں آتے ہیں ایک گرنے کا خوف دوسرا بلند آواز کا، باقی جتنے خوف ہیں وہ اکتسابی ہیں ———

——— ہر مرتبہ جب گلاس میں پانی پیا جاتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ پتلا ہو جاتا ہے ———

——— اگر بارش اس پانی کو واپس نہ دے جو سمندر سے حاصل کرتی ہے تو تمام سمندر تین ہزار سال میں خُشک ہو جائیں۔

یاد

(ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ)

میں ہوں فسردہ اک کلی گزری ہوئی بہار کی
I am the blossom of a bygone spring
جدول دلفریب ہوں صفحۂ روزگار کی
Pressed in the books of Time, a lovely thing.
درد بھری اک آہ ہوں قلب امیدوار کی
The hunger of an unfulfilled desire
خاک ہوں میں جلی ہوئی عشق کے شعلہ زار کی
The ashes in the hearth of last years fire.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

مرہم زخمہائے دل چارۂ دردِ زندگی،
I am the balm that softens all life's scars
غم بھی نصیب غم بھی ہوں راز بلند و پست بھی
The heights, the depths, the anguish & the stars
جمع ہے میرے سائے میں دور کہن کی ہر گھڑی
Into my cooling dark your minutes cast;
میں ہی تو سجدہ گاہ ہوں ماضیِ ناگزشتہ کی
I am the temple of the living past.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

میں ہی ہنسی خوشی کے دن میں ہی گھڑی ملال کی
I am the days you joyed, the days you wept,
میرا ہی طاقِ بیخودی قبر ہے ہر خیال کی
In my vast vault of silence safely kept
خندۂ شادکام ہوں آہ شکستہ حال کی
I am your laughter, I your sobbing cry
میں ہوں صدائے بازگشت نغمۂ لازوال کی
The Echo of a voice that can not die.

(یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

حلقۂ زلف شب ہوں میں سلسلۂ سحر بھی میں
I am the link that bridges Night & Dawn
میں ہوں وجود کائنات موت سے بےخبر بھی میں
I am the soul that lives when all is gone
میرا ہی نام "کل" بھی ہے "آج" کا مستقر بھی میں
The yesterday, when this today shall dwell
زیست بھی میں فنا بھی میں خلد بھی میں سقر بھی میں
I am your life, your death, your heaven your Hell
یعنی میں اُس کی یاد ہوں
I am memory.

فانی بدایونی

آدھ گھنٹہ

ایک پل میں

الہٰی کس چیز کا تجسس مجھے یہ عالم دکھا رہا ہے
یہ کن حجابوں میں چھپ کے شیطان گیت اپنا سنا رہا ہے

خلافِ معمول اتنی تیزی سے آج دل کیوں دھڑک رہا ہے
رگوں میں ہے ارتعاش پیدا دماغ ماؤف ہو چلا ہے

زمیں پہ سورج کی روشنی کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہے
فضا میں تازہ ہوا کا اک سانس کیلئے بھی گزر نہیں ہے

جو تنگ دروازہ ہے کسی جا تو اس پہ کرچ پڑی ہوئی ہے
اور اسکی تہ میں ہلاکتوں کی تباہ کاری چھپی ہوئی ہے

ہر ایک شے میں ہے کثافت ہر ایک کونے میں چیتھڑے ہیں
غلیظ چکٹ سے دائیں بائیں نقوشِ وحشت چھپے ہوئے ہیں

بریکٹوں[1] پہ کسے ہوئے موٹروں کو بجلی چلا رہی ہے
اُدھر سے اک مال آ رہی ہے ادھر سے اک مال جا رہی ہے

نظر کی حد تک لگی ہوئی ہیں بڑے سے اک ہال میں مشینیں
ہیں دو رویہ دائیں بائیں پہیے سروں کے اوپر ہیں شافٹ پنیں[2]

قدم قدم پر ہلاکتوں کا مہیب سامان ہے مہیا،
جگہ جگہ سرخ تختیوں پر نظر کے آگے ہے لفظ "خطرہ"

وہ شور پیدا ہے انجنوں سے کہ بام و در تھرا رہے ہیں
زمین پیہم لرز رہی ہے، فضا میں رعشے سے چھا رہے ہیں

تمام منظر پہ کیفیت چھا رہی ہے کچھ اختلاج کی سی
دماغ و دل میں ہے روح پیدا بغاوت و احتجاج کی سی

---

[1] Brackets [2] Shaft Pins

ام بنکر انھیں مشینوں کے ساتھ بیٹھا ہو آدمی بھی　　اور اسکے ہمراہ پس رہی ہو متاعِ تسکین زندگی بھی

جانے کیوں تیرگی میں اسکو سڑی ہوائیں ہوئیں گوارا　　نہ جانے کیوں ظلمتوں میں اسکے نصیب کا آگیا ستارا

ں ایک لوہے کے ڈھیر میں دو جہان اسکے لئے ہویدا　　مشین اسکے لئے ہو دُنیا، مشین اسکے لئے ہے عقبیٰ

شین کا بن کے جزو اسکو نہ جانے کیوں مل گئی ہو راحت　　رگوں سے ہوتی ہو خون کھچنے میں اسکو حاصل نئی مسرت

ہ ایک مردودِ دو جہاں ہو جو اپنی خودداریاں مٹادے　　جو کلدسکّوں کی خاطر اپنا ضمیر بیچلے، حیا گنوا دے

غافل انسان موت میں بھی سمجھ رہا ہو فروغِ ہستی　　رگوں میں یہ خون کی کمی کو سمجھ رہا ہے نفوذِ مستی

نوں کی قیمت پہ بیچتا ہو یہ ذوق و شوق و کمال اپنا　　یہ چھوٹے سایوں میں دیکھتا ہو جلال اپنا جمال اپنا

ا ہو تہذیب کا پھیرا اور اس کو اتنی خبر نہیں ہے　　جسے یہ جلوہ سمجھ رہا ہے وہ اسکا نقدِ نظر نہیں ہے

اعِ انسانیت گنوائی ہو اسنے لوہے کے ٹھیکروں پر　　ہنر کی دولت کو اسنے قربان کر دیا چند کوئلوں پر

ہیں ہو اسکی اپچ کو کوئی اب اسکے انجام سے تعلق　　نہیں ہو بے روح انجنوں پر میسر اسکو کوئی تفوق

یالی جنت کے سامری نے اسے شکنجے میں کس لیا ہو　　فریبِ دولت کے تیز ناگوں نے اسکو غفلت میں ڈس لیا ہے

ڑا ہوا ہو خموش و ساکت مشین کے دیوتا کے آگے　　بریک پر ہاتھ بندھ گئے ہیں نگاہ ہٹتی نہیں شٹل سے

اثرؔ یہاں سے نکل کے بھاگو یہ بزمِ انسانیت نہیں ہے

یہاں ہو شیطان کی حکومت خدا کی یہ مملکت نہیں ہے

فضل الدین اثر ایم-اے

la　　Brake　　at　　Shuttle

غزل

حاصلِ عشق تھا وہ عہدِ تمنا اپنا
وہ اُنھیں سامنے پاکر بھی نہ پانا اپنا

مائلِ لطف ہے خود آج مسیحا اپنا
ہوچکا اب دلِ بیتاب مداوا اپنا

رنج و راحت سے جُدا تجھ سے میں کچھ چاہتا ہوں
نہیں معلوم مگر خود مجھے منشا اپنا

کھو دیا لے ترے نیرنگِ کرم نے وہ بھی
ترکِ امید، کہ تھا ایک سہارا اپنا

مقصدِ زیست کی تعیین میں حیراں ہے جہاں
آکے اک بار نہ کیوں جلوہ دکھا جا اپنا

اُن کا وہ حال کہ جیسے کوئی دولت پالی
میرا یہ حال کہ سب لٹ گیا گویا اپنا

غور سے دیکھ مجھے میرے مٹانے والے
میں وہی ہوں کہ جسے تونے کہا تھا اپنا

ہائے وہ دن کہ دو عالم سے تو یکسو ہوکر
دیکھتا تھا مری آنکھوں میں تماشا اپنا

ورنہ ہم اور غمِ ناشنوائی، توبہ
سننے والا کوئی یاد آگیا ہوگا اپنا

وصل کے دھوکے میں کھو بیٹھے شکیبائی بھی
دردِ فرقت نے ذرا پہلو جو بدلا اپنا

کیا خبر تھی کہ غمِ عشق کا حاصل ہوگا
وہی اک لمحہ جو دم لینے میں گزرا اپنا

پھر تو تمکین شبِ ہجر کا کٹنا معلوم
زندہ رہنے ہی پہ ٹھیرا ہے جو مرنا اپنا

تمکین (سرمست) حیدرآبادی

تقریباً ہر ماہ

آپ حضرات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ اُسی ماہ کے آخر تک دفتر میں آجانی چاہئے ورنہ ڈاکخانہ کے جدید قانون کے زیر اثر ہم پچھلے ماہ کے پرچہ پر [illegible] کے ٹکٹ لگاکر بھیجنے پر مجبور ہوں گے۔ بعض حضرات بیرنگ طلب کرکے واپس کر دیتے ہیں۔ آیندہ ایسے کسی خط کی تعمیل نہ ہوگی اگر [illegible] کے ٹکٹ وصول نہ ہوں۔
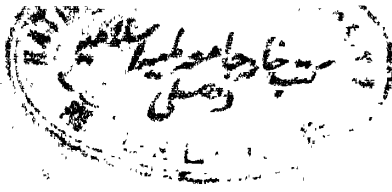
منیجر نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔ منیجر "نگار"

جلد (۳۸)	فہرست مضامین اگست ۱۹۴۰ء	شمار (۲)

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمار - ۲	اگست سنہ ۵۹ء	جلد - ۳۸

ملاحظات

قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے

یہ ہے اصل بحث جو میرے اور ہندوستان کے بعض مولویوں کے درمیان ما بہ النزاع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن انسانی کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے اور اس کے ثبوت میں وہ "وحی یوحیٰ" اور "لوحِ محفوظ" والی آیات کو پیش کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ قرآن کا وحی ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے اور "لوح محفوظ" کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی میرے نزدیک درست نہیں (ملاحظہ ہو نگار جولائی سنہ ۵۹ء) ۔ اس پر مجھے جتنی گالیاں مولویوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے (جو اُن کے پروپگنڈا کے زیر اثر ہیں) دیجا سکتی تھیں، مل چکی ہیں اور مل رہی ہیں لیکن مجھے یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ جو دلایل میں نے اس عقیدہ کی تردید میں پیش کئے ہیں ان کا بھی جواب کسی نے دیا یا نہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سُنا ہے کہ شاید اخبار زمزم میں دارالمصنفین کے کسی رفیق نے کوئی جواب شایع کیا ہے اور اخبار حق میں بھی کسی مولوی صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے۔ بہر حال یہ دونوں مضامین میرے سامنے نہیں ہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا ہے اور وہ میرے لئے باعثِ تسکین ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

ان لوگوں کی طرف سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میری تردید میں لکھتے ہیں وہ میرے پاس ۔ حالانکہ اُصولاً اسے نگار ہی میں شایع ہونا چاہئے، تاکہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں میں جو گمراہی میرے مضامین سے پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو سکے۔ اس کے علاوہ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ میرے شبہات ہوتے ہیں عقل کی بنا پر یا بہ استشہادِ قرآنی پر، اور وہ جواب دیتے ہیں روایات سے۔ یعنی اگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلاں بات فلاں عقلی دلیل کی بنا پر یا فلاں آیت کی رو سے قابل قبول نہیں، تو وہ اس دلیل کی تردید تو کرتے نہیں بلکہ صرف احادیث و تفاسیر، اور اقوال اکابر سلف پیش کردیتے ہیں یعنی ایک طرف وہ مجھے مرتد، ملحد و کافر بھی کہتے جاتے ہیں اور دوسری طرف دلیلیں پیش کرتے ہیں جو ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک مولوی صاحب نے تو جواب میں یہانتک لکھدیا کہ "قرآن کو تو خدا کا کلام کفار قریش نے بھی مان لیا تھا"۔ یہ سنکر مجھے بہت ہنسی آئی۔ اگر وہ مجھے ملتے تو میں انکو صرف یہ جواب دیتا کہ "مولانا بحمداللہ میں کفار قریش میں سے نہیں ہوں، اور نہ کفار قریش کو اتنی اہمیت دیتا ہوں کہ اُن کا کسی بات کو مان لینا میرے لئے دلیل ہو سکے"۔

میں نے عبدالماجد صاحب دریابادی کو بھی لکھا تھا (جو اسوقت اسلامی دنیا کے تنہا محتسب ہیں) کہ نگار کے صفحات، اُن کی گالیوں کے لئے کُھلے ہوئے ہیں، (کیونکہ سوائے گالیاں دینے کے انھیں اور آتا ہی کیا ہے) میں انکے ہر ہر لفظ کو بجنسہٖ شایع کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں عقاید میں کیوں کسی کی تقلید کروں اور مجھے کیوں اس پر مجبور کیا جائے کہ میں اسلام کا مطالعہ دوسروں کی نگاہ سے کروں۔ جس طرح عبدالماجد دریابادی۔ سید سلیمان ندوی۔ مناظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام کے سمجھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مجھے بھی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں میں بھی اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں اور جس طرح وہ میرے عقیدہ کو الحاد و ارتداد سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے اقوال کو لغو و جہل قرار دے سکتا ہوں۔ قرآن شریف ان کے سامنے بھی ہے، میرے سامنے بھی، جس طرح انھیں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے، مجھے بھی دیگئی ہے، لیکن اس کا جواب ان کے پاس صرف ایک ہوا کرتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے جو خصوصیات ایک شخص میں پائی جانی چاہئے، وہ مجھ میں نہیں ہیں۔ گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان کے عقاید کے مطابق پہلے ہی سے مسلمان ہے اور خود اپنی عقل سے کام لینا گناہ سمجھتا ہو۔ اگر واقعی قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایک شخص اپنے آپ کو ایک ملامت پرست مسلمان ثابت کرے، تو بیشک مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، لیکن اگر قرآن "ذکری للعالمین" ہے اور وہ تمام نوع انسانی کو دعوت دیتا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولویوں کا یہ کہنا کہ قرآن پاک کا سمجھنا صرف مولویوں ہی کے لئے مخصوص ہے، کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے

میں اگر قرآن پاک کو خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس کا سبب صرف یہ ہے خود قرآن سے یہی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ سے میں خدا و رسول کی توہین و تکذیب کرتا ہوں، حالانکہ میری رائے میں خدا اور رسول اللہ کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ اسے کلام انسانی سمجھا جائے (جس پر میں تفصیل کے ساتھ اسی مہینے کی اشاعت میں کسی دوسری جگہ اظہار خیال کر چکا ہوں)

وہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلاف کے عقیدہ کے خلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام اسلاف کی پیروی کا نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کا ہے۔ اگر اسلاف یہ عقیدہ رکھتے تھے تو وہ خود اس کے ذمہ دار تھے، ہم اس کے ماننے پر کیوں مجبور ہوں اور اگر صرف کسی کو مرتد و ملحد کہکر قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے، تو اس سے زیادہ ان کی "بے مایگی" اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمارے علماء کا یہ طرزِ عمل کہ وہ اپنے یا اپنے اقوال کے خلاف کوئی بات سننا گوارا کر ہی نہیں سکتے اور فوراً مشتعل ہوکر لوگوں پر جنت کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، یادگار ہے اس کلیسائی دور کی جب مذہب نام تھا بے چون و چرا پادریوں کی تقلید کا (کیونکہ عیسوی مذہب کسی عقلی بحث کا حریف نہ ہو سکتا تھا) اور چونکہ تاریخ اسلام میں بھی ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب شاہانِ اسلام سیاسی اغراض کی بنا پر راویوں سے غلط فتویٰ حاصل کیا کرتے تھے اور مولوی اپنی حمایت میں حکومت کی تلوار سے فائدہ اٹھاتے تھے، اس لئے وہ انانیت اب بھی چلی آتی ہے، لیکن ان کو سمجھنا چاہئے کہ مذہب کے باب میں اب ان اوچھے ہتھیاروں سے کام لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ جن نئے ہتھیاروں سے مذہب پر حملہ ہو رہا ہے، انھیں ہتھیاروں سے جواب دینا پڑے گا، محض غیظ و غضب، یا کافر سازی سے کام نہیں چل سکتا۔ اور یہی ہے وہ اصولی اختلاف میرے اور مولویوں کے درمیان جس کو وہ میرے کفر و الحاد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ میں اسلام کو تبلیغی اور فطری مذہب سمجھتا ہوں، اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ اس کی ہر ہر بات عقل پر پوری اترنا چاہئے اور اسی لئے میں مسلمانوں کے عام عقاید کو درست نہیں سمجھتا اور قرآن پاک سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پھر اگر واقعی مجھ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے تو اس پر مجھ کو متنبہ کرنا چاہئے، نہ یہ کہ صرف نفسی، یہ کام لیکر جاہل مسلمانوں کو میرے خلاف مشتعل کیا جائے، اور بازاری لب و لہجہ میں مجھ پر لعن طعن کی جائے۔

مولویوں کا ایک اعتراض مجھ پر یہ بھی ہے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مجھے تاویل کا کیا حق حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیا قرآن میں تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو انھیں اور مجھے دونوں کو برابر کا حق حاصل ہے اور اگر نہیں ہو سکتی، تو وہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے صرف ظاہر معنی مراد لینے پر مجبور ہوں گے درانحالیکہ یہ ممکن نہیں۔ متعدد آیات کلام مجید میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں ایک ہی لفظ کے معنے مقصود کے لحاظ سے کہیں کچھ اور کہیں کچھ لئے جاتے ہیں۔

علمائے کرام جواب دیں

بہرحال میرے دل میں جو شبہات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہاں بیان کرتا ہوں اور علمائے کرام سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان کے دور کرنے کی کوشش فرمائیں :-

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے۔ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا۔ لیکن "شے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شئے ہالک الا وجہہ" اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لئے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو کلام مجید کا ہر نسخہ، کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضایع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے۔ اس لئے لامحالہ اسے "صفتِ ربانی" ماننا پڑے گا۔ لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اسکی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

(۴) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا، جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے وہ قرآن جو اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظِ ترتیب مختلف ہے جو لوحِ محفوظ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہئے۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالتمآبؐ پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی، اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی

ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنار پر پہلے ہی سے تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات وحالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا تو پھر اُن آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُل سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کرکے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درانحالیکہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات دُنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کرلی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لیکر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً "ایاک نعبد" سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفارِ مکہ اور اُن کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ درانحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت، کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اسکو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان والفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند منجملہ اُن شبہات کے جنکی بنار پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں۔ لیکن اگر

ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلامِ خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے، تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علیٰ وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہؐ پر نازل کئے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔
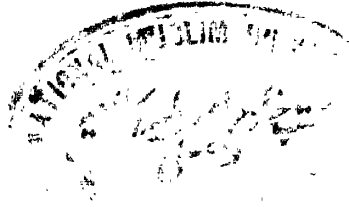
ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان

جناب فضل الدین اثرام - اے - آگرہ - تحریر فرماتے ہیں :-

قرآن یا اس سے متعلق موضوعات پر آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے والی چیز ہوتی ہے اور یقیناً موجودہ مسلمانوں کے حق میں بڑی خدمت ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ہر سال نگار کے کچھ پرچے گنوا بیٹھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بعض لوگوں پر اس قسم کی تحریروں کا اثر دیکھنے کے لئے انھیں دے دیتا ہوں اور مجھے اپنے تجربہ کا بڑا اصلہ مل جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ بھی جو زندگی میں حدودِ آب و گل سے آگے کچھ دیکھنے یا سوچنے کے عادی نہیں ہیں آپ کی تحریر پڑھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ مسلمان قوم کے زوال کی غالباً تنہا وجہ یہی ہے کہ اس نے ہر چیز کے متعلق سوچنا بند کر دیا ہے میں بھی مسلمان قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی سمجھتا ہوں کہ اسے از سرِ نو سوچنے کا عادی بنا دیا جائے۔ قرآن سے متعلق پچھلے مہینے آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جب میں نے جولائی کا نگار ایک صاحب کو جو دنیا داری میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں پڑھنے کے لئے دیا تو انھوں نے اسی دن رات کو مجھ سے قریب ایک گھنٹہ گفتگو کی اور یہ سب گفتگو آپ کی موافقت میں تھی۔ وحی کی جو توضیح آپ نے کی ہے وہی توضیح بعض تعلیم یافتہ عیسائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے مجھے پنجاب کے پادری عبدالکریم ہمیشہ یاد رہیں گے۔ وحی کی توضیح کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ انجیل "کلامِ خدا" نہیں بلکہ "معرفتِ کلامِ خدا" ہے۔

یہ کہنا کہ خدا کے تمام منصوبے اور ارادے کسی ایک کتاب پر ختم ہو جاتے ہیں، خدا کی برتری کو ٹھیس لگاتا ہے ---- اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی تصنیف کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانے سے رسول اپنی حیثیت سے بہت گر جاتے ہیں۔

- - - - - - - - - - -

(نگار) اس مہینے کا نگار ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھئے اور دوسروں کو دکھا کر ان سے بھی پوچھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

جنابِ مُسلم حیدرآبادی فرماتے ہیں:

میں نے حیدرآباد کے اخبارات کو توجہ دلائی ہے کہ ماہ جون و جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر اکثر حضرات (جو مستند علماء کرام سے نہیں ہیں) ذریعۂ اخبارات بلا دلیل نیاز کے ارتداد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے مستند علماء کرام اس مسئلۂ خاص میں قرآن مجید ہی سے نیاز کا ارتداد ثابت کریں۔

- - - - - - - - - -

(نگار) معاف فرمایئے آپ نے ان اخبارات سے صحیح مطالبہ نہیں کیا۔ جو علماء کرام وحی کے معنے خدا کا کلام یا "منطوق خداوند" قرار دیتے ہیں، وہ نہایت آسانی سے میرا ارتداد بھی قرآن پاک سے ثابت کر سکتے ہیں۔

آپ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جو عقلی دلایل میں نے پیش کئے ہیں ان کا جواب دیں اور عقل ہی سے دیں اگر اسلام بے عقلوں کا مذہب نہیں ہے۔

جنابِ ظہیر احمد صاحب - مظفرنگر - فرماتے ہیں:

میں نے اخبار حق میں آپ کے خلاف کچھ تحریریں پڑھیں، میں نے اس کو خط لکھا ہے کہ جو خیالات نیاز صاحب کے ہیں وہ آجکل اکثر نوجوانوں کے ہیں۔ ان کو آپ جبراً اپنے اعتقادات کا پابند نہ بنائیں اور اظہار غصہ کے بجائے دلایل بیان کریں۔

میں نے اُن کو لکھا ہے کہ کوئی بھی مذہبی کتاب الہامی نہیں ہے۔ انسان الہامی کتب کے پیش کردہ اُصول سے بہتر اُصول بنا سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لئے "انسانیت" کافی ہے۔

- - - - - - - - - - - -

(نگار) کیا آپ کو یقین ہے کہ حق جس کے یہاں معیار صحافت نام ہے صرف گالیاں دینے کا وہ آپ کی اس تحریر کو شائع کردے گا۔ کبھی نہیں۔ عقل کی بات کا جواب مولویوں کے پاس اب فتوائے کفر و ارتداد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

رفتارِ جنگ

افسوس ہے کہ اس مہینہ ملاحظات کے صفحات مجھے خود اس جنگ کے لئے وقف کر دینے پڑے جو میرے خلاف جاری ہے اور مغربی جنگ کے متعلق کوئی رائے زنی نہ کر سکا، حالانکہ اسوقت دُنیا جن گھڑیوں سے گزر رہی ہے وہ نہایت اہم ہیں۔

ہٹلر کی پیشکش صلح برطانیہ نے رد کر دی اور اب نازی حکومت کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ برطانیہ پر حملہ کرے، لیکن یہ حملہ کب اور کس طرح ہوگا اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے اسپین کی مدد سے جبر الطر لینے کی کوشش کرے یا آئرلینڈ پر حملہ کر کے بحر اتلانٹک کی طرف امریکہ اور برطانیہ کے درمیان خط فاصل کھینچے، لیکن وہ ایسا کرنے سے قبل بلقان کی طرف سے مطمئن ہو جانا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ روس نے بسریبا کا علاقہ لیکر اور بالٹک ریاستوں کو بالشویک اصول حکومت تسلیم کرنے پر مایل کر کے جرمنی کو پس و پیش میں ڈال دیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ برطانیہ پر حملہ کرے اور اُدھر روس اور بلقان کی سلافی حکومتیں مشرق کی طرف سے اس پر حملہ کر دیں۔ بہرحال جاڑوں کی آمد سے قبل ہی "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"

عربوں کی سیاسی بیداری

(مسلسل)

جزیرہ نمائے عرب جنگ عظیم کے بعد

نجد و حجاز جنگ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ عثمانی حکومت کی جگہ عربی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور پانچ نئی ریاستیں قایم ہوگئیں (۱) حکومت حجاز (شریف حسین)۔ (۲) سلطنت نجد (ابن سعود) (۳) امامت یمن (امام یحییٰ) (۴) حکومت عسیر (سید محمد بن علی ادریسی) (۵) حکومت شامار (Shammar) (ابن الرشید) اس تبدیلی نے عربستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا نئے نئے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہوئے مگر اُن کا تمام تر تعلق نوزائیدہ حکومتوں کے داخلی و خارجی مسائل سے تھا۔ ابن الرشید اور ابن سعود کے مابین شدید کشیدگی تھی اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ مدتوں سے خاندانی دشمنی کا ایک سلسلہ چلا آرہا تھا۔ دوسری طرف امام یحییٰ اور ادریسی کے تعلقات بھی بیحد ناخوشگوار تھے، اس کے وجوہ آگے بیان کئے جائیں گے۔ سب سے زیادہ اہم ابن سعود اور شریف حسین کی کشیدگی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے بیحد نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ جنگ کے خاتمہ اور صلح کے بعد عربستان کو جو بھی فوائد حاصل ہوئے ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُسوقت جزیرہ نمائے عرب میں حقیقی صلح کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور طرح طرح کے مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے۔

شریف حسین کو اُسوقت دو حیثیتیں حاصل تھیں یعنی وہ ارض مقدس کا حکمراں بھی تھا اور عربوں کی فوجی تحریک کا قاید بھی۔ موخر الذکر حیثیت نے اگرایک طرف اُسکی حیثیت بلند کردی تھی تو دوسری طرف پریشان کن حد تک اُسکی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی تھیں۔ ایک طرف ہندوستان کے مسلمان ناراض تھے کہ اُس نے سلطان کے ساتھ غداری کی ہے اور اُس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ دوسری طرف قوم پرور عرب مجبور کر رہے تھے کہ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے الغاء عہد کا مطالبہ کرے۔ ابن سعود کی دشمنی نے شریف حسین کی حیثیت اور زیادہ نازک

کر دی تھی۔ اُس کو اپنی اور ابن سعود دونوں کی جنگی طاقت کا پورا پورا احساس تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اگر کسی دن نجد و حجاز برسرپیکار ہوئے تو اُس کے لئے برطانیہ کی امداد ضروری ہوگی۔ اسی خیال سے وہ برطانیہ و فرانس کو اُن کے وعدے پورے کرنے کے لئے زیادہ مجبور کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ابن سعود اور شریف حسین کے تعلقات خوشگوار ہوتے تو شاید برطانیہ و فرانس کو اپنے وعدے پورے کرنے پڑتے۔

جہاں تک بغاوت کی تیاریوں کا تعلق تھا شریف حسین نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر بغاوت کے بعد جب عربستان میں نئے دور کا آغاز ہوا تو شریف حسین سے اُسی قدر ناعاقبت اندیشی بھی ظاہر ہوئی۔ سب سے بڑی غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ اُس کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ بغاوت کی چونکہ اُس نے قیادت کی ہے اس لئے ہمسایہ حکومتوں پر اس کو ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ جہاں تک برطانیہ کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور بغاوت کے آغاز کا تعلق تھا ابن سعود اور ادریسی دونوں نے شریف حسین کے ان اقدامات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور قومی تحریک کی قیادت اس کو بخوشی سونپ دی اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا مگر اُن لوگوں کو کبھی اُس کا گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ آگے چل کر شریف حسین خود ان لوگوں کے داخلی معاملات میں بھی دست اندازی کرے گا۔

خود ابن سعود کو وہابی تحریک کے سردار کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ صرف نجد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام عربستان میں اُس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

شریف حسین اور ابن سعود میں پہلا تصادم مئی ۱۹۱۹ء میں ترابیہ (Turaba) کے نزدیک ہوا اس لڑائی میں ابن سعود کو کامیابی ہوئی اور اگر عین موقعہ پر برطانیہ، شریف حسین کی حمایت کے لئے میدان میں نہ آجاتا تو ابن سعود کی فوجیں بلا روک ٹوک حجاز تک پہونچ جاتیں۔ اس واقعہ نے شریف حسین اور اُسکے بیٹوں کی آنکھیں کھولدیں اور اُن کو اپنی جنگی کمزوریوں اور ابن سعود کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوگیا۔ اس موقعہ پر سب سے بہتر راہ یہ تھی کہ شریف حسین اور ابن سعود کے مابین صلح کرادی جاتی اور یہ فرض برطانیہ کا تھا۔ خود شریف حسین کے لئے بھی ضروری تھا خواہ اُس کو ابن سعود کو کچھ دینا ہی کیوں نہ پڑتا۔ مگر برخلاف اس کے شریف حسین نے ابن سعود کے قدیم دشمن ابن الرشید سے معاہدہ کی پالیسی کو پسند کیا۔ اسی سلسلہ میں کچھ اور قبایلی سرداروں سے بھی اُسنے معاہدے کئے اور امام یحیٰی پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں برطانوی افواج نے حدیدہ (Hudaida) خالی کیا اور اُس کے ساتھ ہی ادریسی نے اُس پر قبضہ کرکے عسیر کی سلطنت میں اُس کو شامل کرلیا۔ عثمانی دور میں یہ بندرگاہ یمن کا تھا اب ادریسی کے قابض ہوجانے کی وجہ سے یمن کی تجارت کو اس سے بیحد نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا۔ اس واقعہ سے عربستان میں ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ اس موقعہ پر شریف حسین نے کچھ تو ابن سعود کے دوست ادریسی کو

نقصان پہونچانے کے خیال سے اور کچھ امام یحییٰ کو اپنا ہمدرد بنانے کے لئے امام یحییٰ کی حمایت کی۔ اسی سال ابن سعود نے اپنے قدیم دشمن ابن الرشید کو شدید شکست دی اور حکومت شامر (Shammar) کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا جس کی وجہ سے حکومت نجد کا ڈانڈا عراق کی سرحد سے مل گیا اور عربستان میں ابن سعود کی طاقت بھی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف شریف حسین کے ایک ایسے دوست کا خاتمہ ہوگیا جس کی ہمدردیاں شریف حسین نے ابن سعود کا مقابلہ کرنے کے لئے حاصل کی تھیں۔

قاہرہ کانفرنس کے کم وبیش چار ماہ بعد ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں برطانیہ نے شریف حسین سے از سرِ نو گفت و شنید شروع کی اور ایک نئے معاہدہ کا مسودہ طیار کرکے لارنس کو شریف حسین کے پاس روانہ کیا، اس معاہدہ کی دفعات اس درجہ نامعقول تھیں کہ ہر وہ شخص جو عرب مسئلہ کی نوعیت سے واقف ہوتا کسی حالت میں اُس کو قبول نہ کرتا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ برطانیہ کو شریف حسین اور ابن سعود کی کشیدگی کا پورا پورا علم تھا نیز اس کا احساس تھا کہ برطانوی حمایت کے بغیر شریف حسین ابن سعود کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ صورت حال کی اس نزاکت سے برطانیہ نے فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس مسودہ میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر چیز یہ تھی کہ اس کی رو سے ایک طرف شریف حسین کے اختیارات محدود ہوجاتے تھے اور دوسری طرف عراق و فلسطین کے علاقوں میں برطانیہ کو "خاص حیثیت" حاصل ہوجاتی تھی۔ صاف الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا کہ سین ریمو کانفرنس (San Remo Conference) میں برطانیہ کے لئے جو انتدابی حیثیت طے پائی تھی اور جس کو قبول کرنے سے عربوں نے انکار کردیا تھا اُس کو اب نئے انداز میں قبول کرانے کی کوشش کی جارہی تھی، شریف حسین کو اس مسودہ سے بیحد تکلیف ہوئی اور اُس نے لارنس کو بُری طرح پھٹکارا۔

۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں پھر گفت و شنید کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ کم وبیش ایک سال تک جاری رہا۔ اس مرتبہ مابہ النزاع مسئلہ فلسطین کا تھا۔ برطانیہ کی خواہش تھی کہ شریف حسین فلسطین کے انتداب کو نیز اُس برطانوی پالیسی کو تسلیم کرے جس کا اظہار بالفور اعلان میں کیا گیا تھا (یہاں پر یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ اس اعلان میں فلسطین میں بسنے والے عربوں سے صرف اُن کی شہری اور مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا) پہلے تو شریف حسین اس پر اصرار رہا کہ برطانیہ نے دوران جنگ میں جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو پورا کیا جائے۔ بعد میں اُس نے خود ایک تجویز پیش کی کہ فلسطین میں ایک قومی حکومت قایم کی جائے جس میں یہودیوں کو بھی نمایندگی حاصل ہو مگر کسی حال میں بھی اس کی "سیاسی و اقتصادی آزادی" دوسری عرب حکومتوں سے کم نہ ہو اور اُس کو عرب حکومتوں کے وفاق میں شرکت کا بھی حق دیا جائے۔

۱۴ اگست ۱۹۲۳ء کو شریف حسین نے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کو ایک پرزور خط لکھا جس میں

اُن وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جو دوران جنگ میں عربوں سے کئے گئے تھے۔ ابھی اس خط کو لکھے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہابی فوجوں نے حجاز پر قبضہ کرلیا اور شریف حسین کو حکومت حجاز سے دستبردار ہونا پڑا۔ اُس نے انگریزوں سے امداد طلب کی مگر اس کو صاف جواب دیدیا گیا کہ یہ کوئی سیاسی لڑائی نہیں بلکہ مذہبی لڑائی ہے اور برطانیہ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بالآخر پورے حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہوگیا اور جنوری ۱۹۲۶ء میں ابن سعود کو حجاز کا باضابطہ بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔

اس جدید دور نے عربستان میں ایک نئے باب کا آغاز کیا جس میں ابن سعود کی ذات بہت نمایاں ہے اسکے ساتھ ہی مغربی عربستان کی زندگی میں انقلابی تبدیلی کا ظہور ہوا۔ ملک میں ایک نئی حکومت قایم ہوئی جس نے عوام کے اندر شہری فرائض کا احساس پیدا کیا قدیم عربی روایات اور اسلامی فقہ کی تجدید ہوئی۔ ابن سعود کے سامنے چند اہم اور پیچیدہ مسایل بھی تھے جن کا فوری حل ضروری تھا۔ یہ مسایل صرف داخلی نہ تھے بلکہ اُن کو بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ وہ ایک طرف اسلام کے ارض مقدس کا حکمراں تھا اور دوسری طرف اُس کو وہابی تحریک کی سرداری بھی حاصل تھی اور وہابیوں اور دوسرے اسلامی گروہوں میں شدید اختلافات تھے۔ اُس کے بعد حدودِ حکومت کے تعین کے متعلق کچھ پیچیدگیاں پیدا ہورہی تھیں۔ تیسرا اہم مسئلہ برطانیہ اور دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ ان تمام مسایل کو ابن سعود نے بڑی دوراندیشی و تدبر کے ساتھ حل کیا۔

مئی ۱۹۲۷ء میں ابن سعود نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو "معاہدہ جدہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ متعدد اعتبار سے اُس مسودہ سے بالکل مختلف ہے جو شریف حسین کے سامنے لارنس نے پیش کیا تھا۔ اس معاہدہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ عراق و فلسطین کے علاقہ میں برطانیہ کی "خاص حیثیت" کا کوئی ذکر نہ تھا، جس سے بالفور اعلان کی تائید ہوتی۔ اس معاہدہ کی رو سے "جلالۃ الملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل السعود" کو نجد و حجاز کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی مدت صرف سات سال تھی چنانچہ ۱۹۳۴ء میں طرفین نے اسکی تجدید کی۔

برطانیہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے بعد ابن سعود نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے اُن غیر حکومتوں سے معاہدے کئے جن کا تعلق اسلامی ممالک سے تھا۔ چنانچہ ایک طرف ہالینڈ، فرانس، روس اور اٹلی، دوسری طرف ایران و ترکی سے معاہدے کئے۔ عرب نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم معاہدے وہ ہیں جو ابن سعود نے عرب حکومتوں سے کئے ہیں یعنی یمن، عراق اور مصر سے، جنھوں نے اقتصادی اور تمدنی ترقی کی وہ تمام شاہراہیں کھولدیں جو ابتک بند تھیں۔ ابن سعود کے دور حکومت میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ نجد کے خانہ بدوش عربوں کو اُس نے بستیوں میں آباد کیا اسوقت تک کم و بیش اُن کی ستر نو آبادیاں قایم ہوچکی ہیں ان

بستیوں میں چار سو سے لیکر چھ ہزار تک لوگ آباد ہیں اور اب بجائے صحرا نوردی کے وہ زرعی زندگی گزار رہے ہیں۔
یہ ابن سعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابن سعود کے زمانہ تک عربستان میں باربرداری کا کام اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔
لیکن اب یہ کام موٹر لاریوں اور موٹر ٹرک سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رسل و رسایل اور آمد و رفت کے جدید
ترین وسایل کو بھی ملک میں روشناس کیا جا رہا ہے۔ وہ سڑکیں جن پر پہلے کارواں گزرا کرتے تھے اب وہاں موٹر
دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ملک میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے اور انسان بہ آسانی جدہ سے لیکر مدینہ تک اور
بحر احمر سے لیکر ابنائے فارس تک موٹر پر سفر کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں لاسلکی کے اسٹیشن قایم ہیں۔
نئی نئی معدنیں تلاش کی جا رہی ہیں۔

تاریخ انتداب عرب

جنگ عظیم کا اختتام عربستان کے شمالی علاقہ کے لئے مصایب اور خلفشار کا ایک طوفان عظیم
اپنے ساتھ لایا۔ وہ علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے وہاں مصائب و کشمکش کی
تمام ذمہ داری یورپی طاقتوں کے اشتعال انگیز اقدامات کے سر ہے۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے خود عاید کردہ فرض
کو ادا کرنے کے لئے سین ریمو (San Remo) کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی
اور اس سلسلہ میں یہ فساد و خونریزی ناگزیر تھی۔

انتداب خود مجلس اقوام کا عاید کردہ نہ تھا۔ بلکہ یہ تجویز تھی اُس سپریم کونسل (   )
کی جو اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے نمایندوں پر مشتمل تھی اور یہی تین طاقتیں تھیں جن کے مفاد عثمانی سلطنت کے
علاقوں سے وابستہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اطمینان کے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے اپنے اپنے مفاد کے
مطابق کئے۔ مجلس اقوام نے عثمانی سلطنت کے متعلق یہ اُصول قایم کر دیا تھا کہ انتداب کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ
کے باشندوں کی خواہش کا احترام ضروری ہے مگر اس اُصول کو سپریم کونسل کے ممبروں نے قطعاً پس پشت ڈال دیا
جہاں تک ملک کے بسنے والوں کی خواہش کا تعلق ہے، اُس کا علم اتحادیوں کو پورا پورا تھا، کیونکہ کنگ کرین کمیشن
رپورٹ (King Crane Commission Report) اور دمشق کانگرس کی تجاویز اُنکے
پاس موجود تھیں۔ مگر اس معاملہ میں فرانس و برطانیہ کی رہنمائی صرف اُن کے مفاد نے کی۔

سپریم کونسل نے مجلس اقوام کے ایک اور اُصول کو ٹھکرا دیا جس میں واضح انداز میں تاکید کی گئی تھی کہ
عثمانی سلطنت کی بعض قومیں جو منازل ترقی طے کر چکی ہیں اور وہ آزاد اقوام کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہیں
اُن کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے معمولی طور پر زیر انتداب رکھا جائے تاکہ وہ سیاسی اور انتظامی امور میں
پختہ کار ہو جائیں اور خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ جہاں تک عراق و شام کا تعلق ہے سین ریمو کانفرنس
نے اس اُصول کا برائے نام ہی سہی مگر احترام کیا۔ لیکن فلسطین کے مسئلہ میں تو ان لوگوں نے کمال ہی کر دیا

یہاں تو برائے نام بھی اس اصول کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ فلسطین کا انتداب برطانیہ کو سونپا گیا اور اس سلسلہ میں آزادی تسلیم کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔

انقلابی علاقہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا:۔

(۱) عراق مع ولایت بصرہ، موصل اور بغداد (برطانیہ) —— (۲) فلسطین (برطانیہ) ——

(۳) شام کا مشرقی اور مغربی علاقہ اور لبنان (فرانس) —— (۴) عراق۔

عراق سین ریمو کانفرنس کے فیصلہ کی اشاعت کے ساتھ ہی عربستان میں شدید خلفشار کے آثار نظر آنے لگے۔ عراق میں تو باضابطہ بغاوت ہوئی۔ اگرچہ یہ بغاوت کامیاب نہیں ہوئی اور عراق بارہ سال تک زیر انتداب رہا مگر حکومت کی پالیسی میں تبدیلی یقینی طور پر ہو گئی۔ عراق کا بادشاہ فیصل کو منتخب کیا گیا اور اس انتخاب میں کسی قسم کی بے عنوانی نہیں ہوئی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیصل کے انتخاب کے لئے زمین انگریزوں نے تیار کی۔ یہ قصہ ۲۳ راگست ۱۹۲۱ء کا ہے، اور یہ دور فیصل کے انتقال کے وقت (۸ ستمبر ۱۹۳۳ء) تک جاری رہا۔ فیصل کے دور حکومت میں ملک نے سیاسی ارتقاء دستوری ترقی اور آزادی کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں۔ فیصل خداداد قابلیت اور عجیب و غریب اہلیت کا مالک تھا۔ ملک کے اہم ترین اور پیچیدہ مسایل کو اس نے جس خوبی کے ساتھ سلجھایا ہے اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

۳ راکتوبر ۱۹۳۲ء کو عراق کو باضابطہ مجلس اقوام کا ممبر تسلیم کیا گیا اور یہ اس کی دستوری ترقی کی آخری منزل تھی۔ اس درمیانی دور میں برطانیہ و عراق کے مابین چار معاہدے مختلف اوقات میں ہوئے اور ہر معاہدہ کے وقت دونوں میں شدید کشاکش رہی۔ ہر موقعہ پر برطانیہ نے کھا پھر اکر عراق سے سین ریمو کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرانے کی کوشش کی اور دوسری طرف عراق نے خود برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھانا چاہا۔ دونوں ملکوں کے بیچ میں فیصل کی ذات حایل تھی جو توازن برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض وقت صورت حال اس درجہ نازک ہو جاتی کہ ظاہرا مصالحت کے سب دروازے بند نظر آتے۔ فیصل ایک طرف برطانیہ کو دباتا اور دوسری طرف قوم پرور عرب لیڈروں کو زیادہ وسیع نقطۂ نظر رکھنے کی تعلیم دیتا۔ غرض یہ فیصل ہی کی ذات کا کرشمہ تھا کہ ہر بار الجھے ہوئے مسایل سلجھ جاتے اور مصالحت ہو جاتی۔

عراق کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب عیسائی اور اسی ہزار کے قریب یہود عراق میں آباد ہیں۔ یہودیوں کی بیشتر آبادی بغداد میں ہے۔ ملک کی ۳/۴ آبادی خالص عرب ہے۔ ۱/۲ حصہ میں بیشتر آبادی کردیوں کی ہے جو سنی مسلمان ہیں۔ ان کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہوگی اور ان کی بیشتر آبادی ولایت موصل کے شمال میں ہے۔ عراق میں ۳۵ ہزار کے قریب نسطوری عیسائی بھی پائے

جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ شروع میں ان اقلیتوں کی وجہ سے بڑے بڑے اُلجھاؤ پیدا ہوئے مگر فیصل نے اس مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا اور اب تمام اقلیتیں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہیں

شام ولبنان جنگ کے بعد عراق نے جو ترقی کی اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن جہاں تک شام کا تعلق ہے اُس کا دامن اُن ترقیوں سے قطعاً "پاک" ہے۔ عربستان کا یہ علاقہ فرانس کے حصہ میں آیا خلفشار اور خونریزی شام میں بھی ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں فرانس و شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا ہے جس سے مستقبل کے متعلق کچھ امید بندھی ہے۔ لیکن انتداب کے وقت سے لیکر اس معاہدہ کے وقت تک شام نے سوا تباہی و بربادی کے اطمینان و بہبود کی شکل نہیں دیکھی۔

سین ریمو کانفرنس میں فرانس نے کوشش کرکے شام ولبنان کا انتداب حاصل کیا اور دونوں علاقوں میں جداگانہ انداز کی حکومتیں قایم کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس دونوں علاقوں سے جداگانہ انداز اور مختلف نوعیتوں کے فایدے اُٹھانا چاہتا تھا۔ لبنان کا علاقہ مشرق قریب میں فرانس کے اثر اور رسوخ کا آہنی قلعہ تھا۔ اسی علاقہ میں فرانس کے قدیم دوست، میرونائٹ عیسائی آباد تھے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے فرقے بھی وہاں جو آباد تھے وہ بھی فرانس کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ برخلاف اس کے شام میں عرب مسلمان آباد تھے اور دمشق تو عربستان کی قومی تحریک کا مرکز ہی تھا چنانچہ فرانس نے لبنان کو مضبوط اور شام کو کمزور کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس سلسلہ میں فرانس نے جو سب سے پہلا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ شام کے علاقہ سے کچھ حصہ نکال کر لبنان میں شامل کرکے اُس کا رقبہ بڑھا دیا۔ یہ نیا علاقہ شمال وجنوب اور مشرق سے لیا گیا۔ اس اضافہ کی وجہ سے ایک طرف کچھ ساحلی علاقہ لبنان میں شامل ہوگیا اور طرابلس، بیروت اور سیڈون وغیرہ کے ساحلی شہر اُس میں شامل ہوگئے اور بعلبک اور بقاع کے زرخیز میدان بھی اس کو مل گئے۔ اس کی وجہ سے دوسری طرف شام کی بحری تجارت کا تقریباً بالکل خاتمہ ہوگیا اور اُن علاقوں کی مسلمان آبادی بھی اس سے بیحد برافروختہ ہوئی کیونکہ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔

اپنے اثر والے علاقہ میں اضافہ کرنے کے بعد فرانس نے اُس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فیصل کی عربی حکومت کے دور میں ملک کو حاصل تھا۔ چنانچہ ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) حکومت لاذقیہ:- یہ علاقہ لبنان اور سنجاق اسکندرونہ کے درمیان واقع ہے اور اسکا دارالسلطنت لاذقیہ ہے
(۲) جبل دروز:- یہ دمشق اور ماوراء اردن کی سرحد تک ہے اور پہاڑی علاقہ ہے اسکا دارالسلطنت سویدہ ہے
(۳) حکومت شام:- اس کا دارالسلطنت دمشق ہے اور باقی ماندہ انتدابی علاقہ پر مشتمل ہے۔

اُن کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں فرانس نے قایم کی ہیں۔

شام ولبنان کی آزادی

فرانسیسی انتداب کی تاریخ بہ آسانی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلے دور (سنہ ۲۰ء سے سنہ ۲۶ء) کو دورِ تاریک سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ ناعاقبت اندیشی اور ظلم و حماقت کا وہ دور تھا جس میں حکمراں طبقہ نے نفرت اور بے اطمینانی کی تخم ریزی کی اور اس کا ثمر سنہ ۲۶ء کی بغاوت کی شکل میں اُن کو ملا۔ یہ دور اسی بغاوت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ دوسرا دور (سنہ ۲۶ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک) گفت و شنید کا دور ہے۔ فرانس کو اس دور میں تمام دنیا کے سامنے اپنی نا اہلی اور خام کاری کے لئے رسوا ہونا پڑا۔ اسی زمانہ میں فرانس نے عرب لیڈروں سے مصالحت کی بھی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تیسرا دور سنہ ۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اُس معاہدہ سے ہوتی ہے جو فرانس نے بعد از خرابیِ بسیار شام سے کیا۔

پہلا دور مارشل لا اور کشت و خون کا دور تھا جس میں فرانس نے جی کھول کر ظلم کیا۔ بالآخر سنہ ۲۵ء میں تنگ آمد بہ جنگ آمد عربوں نے بغاوت کی۔ یہ قصہ ماہ جولائی کا ہے۔ اس موقعہ پر فرانسیسی فوجوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ فرانس نے فوراً تیس ہزار آزمودہ سپاہیوں کی ایک فوج روانہ کی مگر باغیوں نے اُنکو بھی شکست دی اور کوئی ۱/۲ فرانسیسی فوج اس معرکہ میں کام آئی اور تمام سامان حرب بھی باغیوں نے لوٹ لیا باغی فوج بڑھتی ہوئی دمشق تک پہونچ گئی۔ اس موقعہ پر عرب لیڈر جو قید تھے وہ جیل خانوں سے نکل بھاگے اور باغیوں سے آملے یہ تقریباً سب کے سب دروزی عیسائی تھے۔ اب اس بغاوت نے بالکل قومی رنگ اختیار کرلیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے فرانس نے بعض ایسے انسانیت سوز مظالم کئے ہیں کہ ان کی دوسری مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں مل سکے۔ بہرحال بغاوت بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور حکومت نے اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کی۔

اس دور کی ابتدا ام، پونسوٹ (M. Ponsot) کے ہائی کمشنر کے عہدہ پر تقرر سے ہوتی ہے یہ ایک تجربہ کار سولیین تھے، انھوں نے سب کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور عرب حلقوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کے باوجود فرانس، اور شام کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہوسکا۔ ام، پونسوٹ نے اپنے تقرر کے چوتھے سال جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور کچھ عرصہ کے بعد نئے دستور کے ماتحت انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقعہ پر انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا پورا ثبوت دیا۔ اس چیز نے اُن کو عرب حلقوں میں بیحد مقبول بنا دیا۔ ام پونسوٹ نے اپنے قیام کے آخری سال میں ایک نئے معاہدہ کا مسودہ عرب جمہوریت کے سامنے پیش کیا مگر عرب لیڈروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اسی سلسلہ میں دو قوم پرور عرب لیڈروں

نے شامی کابینہ سے استعفیٰ بھی دیدیا۔ اب پھر عربوں میں جوش و خروش کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی زمانہ میں ام پونسوٹ نے اپنے عہدہ کی مدت پوری کی اور ان کی جگہ پر ام، ڈی، مارٹل (M. D. Martel) کا تقرر ہوا انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شامی کابینہ کے وزیر اعظم کو بلاکر اس مسودہ پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ وزیر اعظم فرانسیسی حکومت کے نامزد کردہ تھے، انھوں نے اُس مسودہ پر دستخط کردے۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس ملی کے سامنے پیش ہوا تو ممبروں کی اکثریت نے اُس کو مسترد کر دیا اس کے جواب میں ام، ڈی، مارٹل نے مجلس ملی کو غیر تعینہ مدت کے لئے معطل کر دیا۔ اسی سلسلہ میں ٹاؤن ہال میں جلسہ ہو رہا تھا کہ یکایک پولیس نے چھاپا مارا اور بیشتر لیڈروں کو گرفتار کرلیا۔ اُن لوگوں پر جرم ثابت نہ ہوسکا مگر اُن کو جلا وطن کر دینا حکومت نے مناسب سمجھا۔ اس چیز نے تمام ملک میں اِس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگادی اور پورے ملک میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ابھی ہڑتال ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ اور عرب لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ حکومت کے اِس اقدام نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک بھر میں بغاوت کی فضا پیدا ہوگئی اور ہڑتال برابر جاری رہی، جس کی وجہ سے ملک کے کاروباری حلقہ میں جمود پیدا ہوگیا۔ اس کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا اور حکومت کی انتھک کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم نہ ہوسکی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑی یعنی فرانس اور شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو انگلستان اور عراق کے معاہدہ کے طرز کا تھا۔

فرانس نے شام میں جو تجربات حاصل کئے اس کی قیمت بھی اُس کو بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ ہزاروں فرانسیسی جانیں ایک طرف ضایع ہوئیں اور دوسری طرف فرانسیسی خزانہ پر فوجی اخراجات اور دوسری ضروریات کے سلسلہ میں ۱۲ کرور پونڈ (تقریباً ایک ارب ۴۴ کرور روپیہ) کا بار پڑا۔

فلسطین سب سے آخر میں فلسطین کے ناکام انتداب کا نمبر آتا ہے۔ انتداب فلسطین کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بہت کافی مواد موجود ہے۔ لیکن اول تو وہ حد درجہ منتشر ہے اور اگر یکجا بھی کرلیا جائے تو اس کو ہاتھ لگانے میں بیحد احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو غیر جانبدار اور دیانتدار مصنفین ہیں اُن کی تصانیف بھی بہت کم پائی جاتی ہے کیونکہ معلومات کے عربی ذرایع اُن کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں دوسری طرف صیہونی پروپیگنڈے کا بجر ناپیدا کنار ہے جو یورپ کے گوشہ گوشہ میں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ عموماً دنیا کے قابل ذکر پریس (Press) اور مغربی جمہوریتوں کے خبر رساں ادارے یہودیوں کی جنبش ابرو پر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور خصوصاً انگریزی بولنے اور سمجھنے والی دنیا کے تو تقریباً تمام اخبارات اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ برخلاف اس کے عرب ابھی اول تو پروپیگنڈے کے میدان میں طفل مکتب ہیں اور دوسرے مالی اعتبار سے عربوں کو اس کی استطاعت نہیں کہ اس باب میں وہ

روپیہ پانی کی طرح بہا سکیں یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کسی زبان میں شاید ہی عرب نقطۂ نگاہ سے کوئی کتاب اس موضوع پر نظر آئے۔ یہودیوں کے پاس دولت کی کمی نہیں اور وہ بے دریغ دولت اِس مقصد کے حصول کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس سال سے دنیا فلسطین کے مسئلہ کو صیہونی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے

معلومات کا دوسرا اہم ذریعہ برطانوی سرکاری محکمہ ہو سکتا تھا مگر وہاں بھی میدان صاف نظر آتا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبضہ میں بعض اہم دستاویزیں ہیں جب تک وہ شایع ہو کر عوام تک نہ پہونچیں اُسوقت تک مسئلہ فلسطین کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ دارالعوام اور دارالامراء کے ممبروں نے بارہا حکومت سے ان دستاویزوں کی اشاعت کی اپیل کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی یہودیوں کے لئے دوسری آسانی یہ ہے کہ متذکرہ بالا دونوں ایوانوں میں یہودی ممبروں کی کافی تعداد موجود ہے جو ہر موقعہ پر یہودیوں کی فاضلانہ انداز میں وکالت کرتی ہے لیکن غریب عربوں کی آواز وہاں تک پہونچانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

معلومات کا ایک اور ذریعہ ہے اور وہ پرمانٹ مینڈیٹ کمیشن (Permanent Mandates Commission) کی کارروائیوں کی کتاب ہے۔ مگر یہاں بھی اک طرفہ حالات نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود جنیوا (Geneva) میں یہودیوں کے محکمۂ اطلاعات کا ایک بہت بڑا اور باضابطہ دفتر موجود ہے جو برابر کمیشن کو فلسطین کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس طرح کا کوئی ذریعہ عربوں کے پاس نہیں۔ فلسطین کا عربی پریس جو اطلاعات بہم پہونچاتا بھی ہے اُن کو نظر انداز کیا جاتا ہے میرے اس بیان کی تائید وزراء کی تقریروں اور سفید کاغذ (White paper) کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔

شاید مسئلہ فلسطین کے مطالعہ کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ متعلقہ جماعتیں جو آج فلسطین پر اپنا حق ظاہر کر رہی ہیں اُن کے دعوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربوں کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ مدت دراز سے فلسطین میں آباد ہیں اور ملک پر ان کا آج بھی قبضہ ہے اُس کے بعد عربوں کے اُن سیاسی حقوق کا نمبر آتا ہے جو شریف حسین اور برطانیہ کے معاہدہ کی روسے اُن کو حاصل ہوئے تھے اور جنکے معاوضہ میں عربوں نے جنگ میں اتحادی طاقتوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اب جبکہ شریف حسین اور ہنری میک ماہن (McMahon) کی خط وکتابت شایع ہو چکی ہے حکومت برطانیہ یا کوئی جماعت اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے کہ ارض فلسطین کا تعلق اُس علاقہ سے ہے جس کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

فلسطین میں آج عرب جو انتداب کے خلاف برسر جنگ ہیں اُس کا یہود دشمنی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ اسلام کے تمدنی اثر کا طفیل ہے کہ قرون وسطیٰ اور دور جدید دونوں دوروں میں عربوں کی تاریخ کا دامن یہودیوں پر مظالم کے داغوں سے قطعاً پاک رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہودی قوم نے تو عرب حکمرانوں کی سرپرستی

میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔ اور آج بھی ان تمام قصوں کے باوجود وہ تمام یہودی اقلیتیں جو دوسری عرب حکومتوں میں آباد ہیں اُن کے ساتھ اُس سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے جو امریکہ یا انگلستان کی حکومتیں اُن ممالک میں بسنے والے یہودیوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ عربوں کو تو انگریزوں سے بھی کوئی دشمنی نہیں وہ تو صرف اپنے اُس سیاسی حق کی حفاظت کر رہے ہیں جو اُن سے چھینا جا رہا ہے۔

فلسطین پر یہودیوں کے حقوق عربوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسطین عہدِ عتیق میں ان کا وطن تھا اور اب پھر اُن کو وہاں جاکر آباد ہونے اور یہودی ریاست قائم کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہودیوں کے استیصال کے وقت سے لیکر آج تک (۱۸ سو سال سے) فلسطین میں یہودیوں کی بہت ہی قلیل اقلیت آباد چلی آرہی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر فلسطین میں یہودیوں کی آبادی ۵۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو تناسب آبادی کے اعتبار سے آٹھ فیصدی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی آبادی نوے فیصدی تھی۔ مگر یہودیوں کے مطالبہ کی اصل بنیاد یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے اتحادیوں کی جو امداد کی تھی اُس کے معاوضہ میں اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنا دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بالفور اعلان وجود میں نہ آتا تو اتحادی یہودیوں کی گراں قدر خدمات سے محروم رہتے اس لئے یہودی اپنے اس دعوے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے۔ اول تو یہ کہ بالفور اعلان مشروط تھا اور دوسرے یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کرنے سے پہلے ہی عربوں سے ایک معاہدہ کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آزادی برقرار رہے گی اور اس وعدے کو متعدد موقعوں پر برطانیہ نے دہرایا بھی تھا۔

بالفور اعلان میں اس کا وعدہ تو ضرور کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنایا جائے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ "فلسطین کی غیر یہود آبادی کے سیاسی اور مذہبی حقوق پر" یہ چیز اثر انداز نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو صرف ان کا قومی وطن ہی نہ بنایا جائے بلکہ وہاں یہودی ریاست کا قیام بھی عمل میں آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزمین (Weizmann) جو بہت بڑے یہودی لیڈر ہیں انھوں نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے کہ صیہونیت کا مقصد یہ ہے کہ "فلسطین کو اسی طرح یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے جس طرح امریکہ اہل امریکہ کا وطن ہے اور انگلستان انگریزوں کا"

انگریزوں نے یہودیوں سے جس وقت یہ وعدہ کیا تھا شاید وہ اسکی اہمیت اور اُسکے نتائج سے واقف نہ تھے۔ عربوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ارادتاً یہ دوہری پالیسی اختیار کی مگر یہ خیال شاید غلط ہے انگریزوں نے جسوقت یہ وعدہ کیا تھا اسوقت اُن کی موت و زندگی کا سوال درپیش تھا۔ اُن کے پاس اس کا موقعہ نہ تھا کہ اس مسئلہ کی جزئیات پر وہ غور کر سکتے۔ لیکن برطانیہ کو اُس کی اِس پالیسی کے لئے کبھی بھی معاف نہیں

کیا جا سکتا جو اُس نے جنگ کے بعد اختیار کی۔ اُس وقت یہودیوں کے ارادے عالم آشکار ہو چکے تھے اور یہ چیز بھی بالکل صاف ہو چکی تھی کہ قومی وطن کی آڑ لیکر وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے درپے ہیں۔ انگریزوں کو دوسری طرف اس کا بھی علم ہو چکا تھا کہ عرب اپنے وطن اور اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینے پر آمادہ ہیں۔ تاریخ پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اس نوعیت کے واقعات کا اگر ابتدا ہی میں سد باب نہیں کیا جاتا تو آگے چل کر شدید خونریزی ناگزیر ہوتی ہے۔

کنگ کرین کمیشن (King Crene Commission) اور دیگر ذرایع بھی آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔ مگر حکومت برطانیہ نے سب کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں یہودیوں نے فلسطین میں جو مظالم شروع کئے تھے وہ راز نہ تھے بلکہ ہر شخص اُن سے واقف تھا۔ یہودی جو روپیہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اُس کو ملکی ترقی پر صرف کرنے کے بجائے عربوں کو اُن کے گھر بار سے محروم کرنے کے لئے پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ حکومت برطانیہ نے پہلے تو ان حادثات کی پرواہ نہیں کی اور مداخلت کی بھی تو یہودیوں کی حمایت میں۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے کچھ ایسے معاہدے کئے ہیں جو ابتک ظاہر نہیں ہو سکے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت برطانیہ دنیا کے اس دور دراز گوشے میں بجائے عرب ریاست کے یہودی ریاست کے قیام کو اپنے شہنشاہی مفاد کی حفاظت کے لئے بہتر اور ضروری سمجھتی ہے۔

۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں رائل کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اُس کے ساتھ امید بندھ گئی کہ اب حالات کی صحیح جانچ پڑتال ہو جائے گی اور مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں جب کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی تو تمام امیدیں مبدل بہ یاس ہوگئیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض اعتبار سے کمیشن کی رپورٹ بہت زیادہ قابل ستایش ہے مگر اسی درجہ یہ ناقص و نامکمل بھی ہے۔ اکثر ایسے واقعات بھی اس رپورٹ میں موجود ہیں جو ابتک عوام کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور سرکاری ذرایع سے وہ روشنی میں نہ آسکے تھے۔ اس رپورٹ میں برطانیہ کی بعض غلط کاریوں کو بھی عریاں کیا گیا ہے۔ نیز اُس کے مطالعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ رپورٹ کے مصنفین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ انتداب ناقابل عمل تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کا بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کے ممبر یہودیوں کے بیانات اور پروپگنڈے سے بھی متاثر ہیں اور اس کا اُن کو کوئی احساس نہیں ہے کہ اس فن سے عرب ناواقف ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں نے عربوں کے بیانات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے اُن کی شکایات کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے اس کی ذمہ داری صرف کمیشن کے ممبروں ہی کے سر نہیں بلکہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں نے کمیشن کا مقاطعہ کیا اور کمیشن کی واپسی سے صرف چند روز قبل یہ مقاطعہ ختم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن نے سات آٹھ ہفتے برطانوی اور یہودی گواہوں کے

بیانات پر صرف کئے اور عربوں کے حصہ میں صرف پانچ یوم آئے۔ کل ۱۱۲ اشخاص کے بیانات کمیشن نے قلمبند کئے انہیں صرف ۱۲ عرب تھے اور سو برطانوی اور یہودی اشخاص تھے۔

کمشنروں نے مسئلہ فلسطین کے پس منظر پر بحث کرتے ہوئے بالفور اعلان اور اُن وعدوں پر بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے جو یہودیوں سے برطانیہ نے دوران جنگ کئے تھے مگر برطانیہ نے جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ شریف حسین اور ہنری میک ماہن (Mc Mahon) خط و کتابت کا سرسری طور پر ذکر ہے مگر بالفور اعلان کے بعد برطانیہ نے جنوری ۱۹۱۸ء میں شریف حسین سے جو وعدہ کیا تھا یا جون ۱۹۱۸ء میں سات عرب لیڈروں کے میموریل کے جواب میں جو اعلان برطانیہ نے کیا تھا اُن کا کوئی ذکر کمیشن کی رپورٹ میں نہیں ہے۔

کمیشن نے مسئلہ فلسطین کا جو حل پیش کیا ہے وہ اِس خیال پر مبنی ہے کہ عرب اور یہودی دونوں فلسطین میں آباد ہیں اس لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ کمیشن نے اس سلسلہ میں پوری اسکیم پیش کی ہے اُسکی رو سے فلسطین کا مغربی علاقہ یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ مجوزہ علاقہ موجودہ یہودی آبادی کے رقبہ سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمیشن کی یہ بھی تجویز ہے کہ بیت المقدس اور بیت اللحم کے مقدس شہروں میں مستقلاً برطانوی انتداب کا قیام عمل میں لایا جائے اور بقیہ حصہ میں عرب ریاست قایم کی جائے اور اس کا تعلق دوسری عرب ریاستوں سے بھی ہو اور دونوں ریاستوں کو مجلس اقوام کی ممبری کا حق ہو۔ وہ مسئلہ جس کو سلجھانے کے لئے کمیشن کا تقرر ہوا تھا اُس کو کمیشن نے اور بھی اُلجھا دیا ہے۔ جس علاقہ کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس میں اسوقت پانچ لاکھ عرب آباد ہیں۔ اُس پر ستم یہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں کا دعوےٰ ہے کہ اُن کی تجویز قابل عمل بھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کی مجوزہ اسکیم تین اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تجویز قابل عمل ہے دوسرے برطانیہ کے تمام سابقہ وعدے اس سے پورے ہوتے ہیں جو عربوں اور یہودیوں کے ساتھ کئے گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ عربوں یا یہودیوں کے ساتھ اس میں بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔

فسادات فلسطین کے سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ قدرتی پیداوار نہ تھے بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری آفندی طبقہ کی سازش، مفتی اعظم کے سیاسی اغراض، اٹلی، جرمنی اور روس کے پروپیگنڈے کے سر ہے۔ ابتداء کے فسادات کا جہاں تک تعلق ہے بعض حلقوں میں اس بیان کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر انتدابی حکومتوں کے کمیشن کی رپورٹ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ یہ فسادات دراصل نتیجہ ہیں اُس محبت اور لگاؤ کا جو عربوں کو اپنے وطن اور تمدن کے ساتھ ہے۔ آج بغاوت اپنے شباب پر ہے اور اُس کا سب سے زیادہ زور شہروں میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں ہے اور اس کا فوری سبب رائل کمیشن (Royal Commission) کی تجویز تقسیم ہے جس کی وجہ سے عربوں کو

پنا گھر بار چھوڑ کر غیر علاقے میں جا کر آباد ہونا پڑے گا۔ تقریباً تمام قومی لیڈر یا تو جیل خانوں میں ہیں یا جلا وطنی کی زندگی نزار رہے ہیں۔ اور اب عنان قیادت خود مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے گھر بار کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دینے پر تیار ہیں۔ اس جوش و خروش کو کسی طرح بھی غیر ملکی پروپگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ غیر ملکی پروپیگنڈا سلگتی ہوئی آگ پر پنکھے کا کام کر سکتا ہے مگر اس میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بغاوت کو مہینوں اور برسوں تک مسلسل زندہ رکھ سکے۔

اس بغاوت میں تو اعلیٰ طبقہ کے عربوں کو بھی کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ کسان اور مزدور عرب جو بغاوت کر رہے ہیں وہ تو زمیندار عربوں سے بھی کچھ کم ناراض نہیں کہ انھوں نے اپنی جائدادیں یہودیوں کے ہاتھ کیوں فروخت کیں جس کی وجہ سے اُن کو اپنے گھر بار سے دست بردار ہونا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف عرب اپنے لیڈروں سے ناخوش ہیں کہ انھوں نے پہلے ہی اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا تھا۔ غرض اسوقت عنان قیادت اُن کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھ میں ہے خود جن کی موت و زندگی کا اسوقت سوال ہے، باغیوں کا تشدد صرف انتدابی طاقت ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا یکساں شکار عرب زمیندار اور وہ دلال بھی ہیں جو خرید و فروخت کے معاملات طے کر رہے ہیں۔

دوسری غلط فہمی یہ پیدا کی جا رہی ہے کہ یہودیوں کی آمد سے عربوں کو اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہودی دولت اور ذہانت سے ملک نے کچھ نہ کچھ اقتصادی ترقی ضرور کی ہے۔ عرب زمیندار اُن کی آمد کی وجہ سے مالدار بھی ہو گئے ہیں اور عرب مزدوروں کی مزدوری بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی آمد ملک کے لئے نئی نئی ضرورتیں اور نئے نئے بار بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ انتدابی پالیسی کی وجہ سے نئی نئی خدمات کی ضرورتیں پیش آئیں، حفاظت عامہ کے لئے پولیس میں اضافہ کیا گیا۔ بلا ضرورت عمارتوں کے ٹھیکے دینے پڑے تاکہ یہودی مزدوروں کے لئے روزگار پیدا کیا جائے۔ ان سب وجوہ سے فلسطین جیسے مفلس ملک کے میزانیہ پر غیر ضروری بار ڈالا گیا۔ ان سب باتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کی آمد سے بہت زیادہ اقتصادی فایدہ پہونچا ہے تو بھی یہ ایک بے حقیقت استدلال ہے کیونکہ اگر ایک طرف فلسطین کو یہ فوائد حاصل ہوئے تو دوسری طرف یہی چیز فلسطین میں بسنے والے عربوں کی سیاسی زندگی کا چراغ گل کر رہی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی تقریباً پانچ فیصدی تھی ۱۹۳۲ء میں یہ بڑھتے بڑھتے اٹھارہ فیصدی ہو گئی اور آجکل جس سرعت کے ساتھ یہودی مہاجرین فلسطین میں آرہے ہیں اُس سے اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ آیندہ دس سال میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ اقتصادی فوائد کی کوئی حقیقت نہیں رہجاتی۔

مسئلہ فلسطین کا کوئی معقول حل اُسوقت تک دستیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمران انصاف سے کام نہ لے

تشدد خواہ وہ جسمانی ہو یا سیاسی لاحاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے جب سے تشدد کی راہ اختیار کی ہے دنیا کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ گئی ہیں اُس سے قبل بیس سال تک جنیوا، لندن اور بیت المقدس میں پُرامن انداز میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی گئیں اور وہ سب ایک ایک کرکے ناکام رہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تشدد سے عربوں کو جسقدر فایدہ ہوا ہے اُسی قدر اُن کی تحریک کو نقصان پہونچا ہے۔ مگر اس تشدد کو ختم کرنے کی پرحکمت اور آسان صورت یہ ہے کہ اُس کے اسباب کا سدباب کیا جائے۔ اس تشدد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ عربوں کا تشدد نتیجہ ہے حکمران طبقہ کے اُس اخلاقی تشدد کا جو عربوں کے ساتھ اُس نے روا رکھا ہے۔ عربوں کے اس تشدد کو اب دُنیا کی کوئی طاقت اُسوقت تک روک نہیں سکتی۔ جب تک کہ حکمران طبقہ اپنے اخلاقی تشدد کو ختم نہ کردے۔

وہ لوگ جو پروپیگنڈے کے پردوں کو چاک کرکے اصل تصویر کو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے فلسطین کے مسئلہ کا حل تلاش کرلینا زیادہ دشوار نہیں بشرطیکہ حکمران طبقہ بھی عقل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ ایک ایسا ملک جہاں مدت دراز سے ایک ایسی قوم آباد چلی آتی ہو جس کو اپنے وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ ہو وہاں باہر سے کسی دوسری قوم کے آباد ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ فلسطین کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں ابتک جو تجربات حاصل کئے گئے ہیں وہ کافی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ عربوں کو یہودیوں کے ساتھ کوئی مخاصمت ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فلسطین کا کسان اپنے وطن سے دستبردار ہونے کے مقابلہ میں اپنی جان قربان کردینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور اسباب سے قطع نظر صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مسئلہ فلسطین کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس حقیقت کو محسوس کیا جائے اور اس کو ہر وقت پیشِ نظر رکھا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانا یا وہاں یہودی ریاست کا قیام برطانیہ اور یہود دونوں کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اگر متذکرۂ بالا حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسطین کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہاں عربی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور وہاں صرف اسی قدر یہودی رکھے جائیں جس سے عربوں کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے، سب قومیں امن و عافیت کی زندگی گزار سکیں اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسئلہ فلسطین کا یہ حل دیانتداری اور انصاف کا حل ہے اور یہ قابل عمل بھی ہے۔ اس سے فلسطین میں بسنے والے عربوں کے حقوق کی ایک طرف حفاظت ہوگی اور دوسری طرف اُن کے قومی جذبات بھی اس سے آسودہ ہوں گے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اُسوقت فلسطین تمدنی اور روحانی اعتبار سے انکا قومی وطن

بھی بن سکیگا اور اُن کو فلسطین سے جو قدیم تعلق ہے اس کی بھی تجدید ہو سکے گی۔ اُس حالت میں فلسطین کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں گے۔

فلسطین کے مسئلہ کا اس سے زیادہ قابلِ اطمینان اور قابلِ عمل حل ملنا دشوار ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ اختیار کی گئی تو اُس سے عربوں، انگریزوں اور یہودیوں کی لاتعداد جانیں تلف ہوں گی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا یہودیوں کو یورپ کی حکومتوں میں جن مصائب کا شکار ہونا پڑ رہا ہے اُس سے اُن کو بچانے کے لئے فلسطین کے بجائے کوئی دوسرا ملک تلاش کرنا چاہئے کیونکہ فلسطین خود ایک چھوٹا ملک ہے۔ اسوقت جتنے یہودی وہاں پہونچگئے ہیں انھیں کا بار اُٹھانے سے وہ قاصر ہے۔ سلطنت برطانیہ بعید وسیع سلطنت ہے، اُس کے ذرایع اور وسایل بھی اُسی اعتبار سے وسیع ہیں۔ اب جبکہ عربوں کی قسمت پر اُس نے یہودیوں کا حل تلاش کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا یہ اُس کا فرض ہے کہ اُن کو کہیں اور کسی نہ کسی طرح کھپا دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اور دوسری یورپی حکومتوں میں یہودیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم کئے گئے ہیں وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اُن مظالم کے مصنفین کے دامن پر ابد تک رہنے والے بدنما داغ ہیں۔ مہذب حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور آج جو بار فلسطین کے کاندھوں پر ڈالا جا رہا ہے اُس کو وہ خود سنبھالیں۔

محمد عتیق صدیقی

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس:۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کمار پا نا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار۔ لکھنؤ

ریڈیو کے آس پاس

شام کا وقت ہے برسات کا موسم، شہر کے چوراہے پر ہوٹل واقع ہے جہاں بارش سے پناہ لینے کے لئے ہر طرح کے بے فکرے۔ مراقی۔ مولوی۔ پنڈت۔ مزدور۔ طالب علم۔ پھیری والے۔ کسان۔ کارخانہ والے۔ جوان۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت مرد۔ ہوٹل کے برآمدہ میں ریڈیو سٹ کے آس پاس جمع ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ مینھ برسنے لگتا ہے۔ ایک کوندا ہوا۔ زور کا ایک تڑاقا۔

مولوی صاحب :۔ ویسبّح الرعد بحمدہ

ایک دیہاتی :۔ مولوی صاحب اِسی کا کرت ہو، برکھا ہوئے دیو۔

ایک نوجوان :۔ الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔

دوسرا بے فکرا :۔ لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے۔

ایک آواز :۔ کہو مولوی صاحب کیسی کہی؟

مولوی صاحب :۔ شامتی۔ دوزخ کا ایندھن۔

پنڈت جی :۔ شانتی، شانتی۔

بے فکرا :۔ دھن ہے مہاراج۔ کیا نام لیا ہے۔

پنڈت جی :۔ رام رام، کلجگ میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ (بارش تیز ہو جاتی ہے)

ایک خفیف آواز :۔ (غمگین لہجہ میں)

یہ کہہ دو ابر و باراں سے اگر برسے تو یوں برسے
کہ جیسے خوں برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

ایک بڑھیا :۔ ارے کل جبھے، تیری انھیں باتوں سے تو دنیا چوپٹ ہو رہی ہے۔

بڈھا شوہر :۔ (کھانستے ہوئے) تم کو دنیا کے چوپٹ ہونے کی پڑی ہے۔ یہاں کھانستے کھانستے پلیتھن نکلا جا رہا ہے

بڑھیا :۔ ارے تم کو کھانسنے سے تھوڑے ہی کوئی روکتا ہے۔ دُنیا چوپٹ ہو یا نہ ہو، تم تو کھانسے جاؤ۔

ایک تانگہ والا:۔ (منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے) بڑے میاں گھر کا جھگڑا گھر میں چکا نا۔ تانگہ ہانکتے تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ چلو چھٹ کا میلہ دکھلاؤں۔

ایک کسان:۔ برکھا دیو کا کرپا۔

ایک موٹا مہاجن:۔ "بجار مندا ہوا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا"

طالب علم:۔ کسان سے اُلجھے تو اچھا نہ ہوگا۔

پولیس کا سپاہی:۔ کچھ برا بھی نہ ہوگا۔

اتنے میں کچھ بچوں کے رونے بلبلانے کی آواز آنے لگی۔ ماؤں نے انھیں پیٹنا اور شوہروں کو کوسنا شروع کیا جوانوں نے گانا اور ادھیڑوں نے سب کو سمجھانا شروع کیا۔ مونگ پھلی والے نے آواز لگائی، خستہ بادام لے لو۔ ہوٹل کا مالک گھومتا ہوا آیا۔ اور بالآخر یہ طے پایا کہ جب تک بارش نہ کھلے ہوٹل کے ریڈیو سٹ سے سب کی تواضع کی جائے

ریڈیو نے تھوڑی سی گھڑگھڑاہٹ کے بعد اعلان کیا:۔

"یہ دلی ہے، اس وقت سات بجے ہیں"

ایک آواز:۔ کیا بات کہی ہے گویا ہم کو معلوم نہیں۔ وقت البتہ بُرا ہے۔ گھر والی دھنت میں رہی ہوگی ہمسائی گرم مسالہ مانگنے اور چغلی کھانے آئی ہوگی۔

دوسری آواز:۔ ارے بھائی سننے تو دو۔ گھر کا کھڑاگ کہاں پھیلایا۔ وہ دیکھو کوئی صاحب بھاشن دے رہے ہیں

ریڈیو:۔ ...... "یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ قدم پھونک، پھونک کر رکھنا چاہیئے"

ایک آواز:۔ واہ بے واہ بالکل اُلو کی دم فاختہ ہی ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک صاحب قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ سامنے سے موٹر آئی۔ اور را دھڑام موٹر اوپر سے گزر گئی۔ مرگئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔

دوسری آواز:۔ بھائی زمانہ نازک ہے۔

تیسری آواز:۔ بڑا نازک جیسے صنفِ نازک۔

چوتھی آواز:۔ سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ اِرشاد لائیے گا۔ جناب کا تخلص۔

دور سے ایک آواز:۔ منحوس۔ (سب قہقہہ لگاتے ہیں)

ریڈیو: — اگر آج ہم اس بات کا عہد کرلیں کہ ہم کو اپنی حالت سدھارنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو نیچا دکھا سکے۔

ایک آواز: — کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ عہد کرلیں، عہد کرلیں۔ عہد کرتے کیا دیر لگتی ہے۔ سینکڑوں دفعہ عہد کئے۔ کیا ہوا۔ نمک حرام۔

دوسری آواز :۔ (بات کاٹ کر) ہاں جی، اور عہد نہ بھی کریں تو کون مائی کا لال ایسا ہے جو ہم کو نیچا دکھا سکے گا (گاکر) مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ اور کیا! (مجمع سے کہیں سے ہنسنے کہیں سے اُف کرنے اور کہیں سے جمائی لینے کی ملی جلی صدائیں)

(ریڈیو کے کھٹکے کی آواز آتی ہے۔ اعلان ہوتا ہے)

ریڈیو :۔ تمام دن اور نصف سے زیادہ رات تک بحث مباحثہ کے بعد بالآخر سبجکٹ کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی۔
"یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ ہم کو ایسے ذرایع اور وسایل جلد سے جلد اختیار کرنے میں غیر معمولی تامل سے کام لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی جن سے اُن امور کی وضاحت ہوتی ہو جو قوم اور ملک کی ایسی ترقیوں میں معین ہوتے ہیں جو زمانہ کے موجودہ مطالبات اور قوم کی گوناگوں ضروریات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم کو دوسری قوموں کے دوش بدوش رکھنے میں اُن تمام باتوں کا احاطہ کرلیں جو ہماری قومی روایات رواداری کو زندہ اور تابندہ رکھنے کی طرف رہبری کرنے میں اس طور پر معاون ہوتی ہوں کہ ہمسایہ قوموں میں شک شبہ کے بجائے ایسا اعتماد پیدا کرسکیں۔ جو ان اغراض و مقاصد کے حصول میں معین ہوں۔ جن کے لئے ہمارے آبا واجداد نے اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کے لئے ایسے زرّیں کارنامے چھوڑے ہیں جو ہر گری ہوئی قوم کو اُبھارنے کے لئے ایسی متحرکات کی طرف لے جانے میں متعین ہونے کا امکان رکھتے ہوئے......"

سننے والوں کا سارا مجمع یک لخت گھبرا کر چیخ اُٹھتا ہے۔ کوئی رونے لگتا ہے۔ کوئی دانت پیس کر رہ جاتا ہے ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ مارنا مارنا جانے نہ پائے۔ مدت کے بعد ہنسنے لگتا ہے۔ کچھ عورتیں بیہوش ہو جاتی ہیں۔ کوئی مونگ پھلی والے کا خوانچہ لوٹ لیتا ہے کوئی پکارتا ہے۔ "فائر بریگیڈ" منیجر دوڑتا ہوا آتا ہے۔ بڑھوں کو اٹھاتا ہے۔ پولیس کو آواز دیتا ہے۔ لفنگوں میں سے ایک آدھ کے جھانپڑ رسید کرتا ہے تھوڑی دیر میں امن ہو جاتا ہے

ایک آواز :۔ معاذاللہ کی پناہ۔

دوسری آواز :۔ ارے بھائی لعنت بھیجو۔ تقریر سنتے سنتے تو کان پک گئے۔

ایک گرہ کٹ :۔ اس کا مزہ تو یار کمپنی باغ میں ہے۔

ایک بے فکرا :۔ کمپنی باغ کا کیا کہنا۔ "گانے لگتا ہے"۔ "سجنی کے لئے تن من دھن ہے"

ایک بچہ :۔ (رو کر) آآں پانی۔

ماں :۔ چپ رہ۔ پانی پانی، جب دیکھو پانی۔ میاں گلچھرے اُڑائیں۔ میں دن رات ہلکان ہوں۔ آگ لگے ایسے پانی کو۔ پانی پانی۔ دن رات پانی۔

ریڈیو :۔ ہندوستان کی نجات اس وقت تک نہیں ہوسکتی......"

ایک آواز :- اماں کچھ اور لگاؤ، ہندوستان کی نجات کو ہم سے کیا جب گھر والی سے نجات نہیں تو پھر کیسی کوئی اور نجات - واہیات -

ایک عورت :- کلموا --- ریڈیو نے گھڑ گھڑا کر گت بدلی -

اندراں دردے کہ در دل بود، درماں یافتن

درحجاب زلفِ جاناں، نورِ ایماں یافتن

ایک قلندر :- ہُو - حق -

ایک شاعر :- کیا بات ظالم نے کہی ہے -- نورایماں یافتن -

ایک صاحب :- ہوش میں آؤ - سوپ ایسے کان ہیں، لیکن سنائی نہیں دیتا - نورایماں یافتن نہیں یافتن ہے

شاعر :- ہوش میں آؤ - تم حسن کلام کیا جانو - زلف کے ساتھ یافتن ہی ٹھیک ہے - واہ وا -

معترض :- اور نور ایمان ؟

ایک آواز :- چُپ بے بے ایمان -

ایک بے فکرا :- ارے بھائی جانے دو - نور بافت کا بھی تو کوئی حق ہے -

ایک آواز :- یار کچھ اور لگاؤ - یہ آداب تسلیمات قسم کا گانا کون سُنے - (ریڈیو میں گڑگڑاہٹ)

اناؤنسر :- اب پٹیالے والے عاشق علی خاں صاحب گو سارنگ کا خیال تُرت میں گائیں گے - آ - آ - (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) آ - آ - آ (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) بھو - بھو - بھو -

ایک بزرگ :- سبحان اللہ اپنے فن کا امام ہے - اب یہ لوگ کہاں اور یہ فن کہاں -

ریڈیو :- بھو - بھو - بھو - آ - آ - آ - - - - - (مجمع میں غلغشار اور چیخ و پکار)

منیجر دوڑتا ہوا آیا اور پکارا " ارے ریڈیو کس نے بگاڑا "

ایک صاحب :- جناب گھوڑ سار ن ہے - (ریڈیو کی چابی ہٹ گئی)

اناؤنسر نے اعلان کیا :- " اب طمنچہ جان ایک غزل سنائیں گی "

ایک آواز :- جزاک اللہ کیا تاریخی نام ہے -

دوسری آواز :- کیا ہندو مسلم اتحاد کا پہلو نکالا ہے -

تیسری آواز :- جی اور کیا مسجد بھی ہے باجا بھی ہے

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی

عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی

ایک آواز :- کیا پُرتاثیر شعر ہے
دوسری آواز :- کیوں نہیں ۔ اور بھئی جوانی تو لٹا دینے کی چیز ہی ہے (گاکر) آؤ پیا سونی لاگے سیجر!
ایک بڈھا :- سرد آہ کھینچ کر، رہے نام اللہ کا ۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں ۔
ایک نوکر :- رام رام جپنا ۔ پرایا مال تکنا ۔
اخبار بیچنے والا لڑکا :- چین میں چیاؤں پیاؤں ۔ چیمبرلین کی چھتری ۔
پھیری والا :- ہر مال چھ پیسے کا ۔ ہر مال چھ پیسے کا ۔
منیجر کی گرجدار آواز :- ارے نکالو اس اخبار بیچنے والے لونڈے اور بساطی کو ۔ ہوٹل میں لڑائی کا مول تول ٹھیک نہیں
(ریڈیو کی گھنڈی گھمائی گئی ۔ آواز آتی ہے) "آپ جتن خانم امور خانہ داری پر تقریر فرمائیں گی"
"گھر کی بیویوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں"
ایک بے فکرا :- ارے فتو استاد، یہ عورتیں ریڈیو پر گھر گرہستی کا کھڑاگ پھیلاتی ہیں ۔ برسات میں تو کچھ چٹ پٹی سلونی بات
فتو استاد :- ادبے لمڈے کبھی تو کام کی بات سُن لیا کر گھروالی میں کیا کیڑے پڑے ہیں ۔ یہی لچھن ہیں تو بیٹا
بھیک مانگوگے اور بھونی بھانگ نہ ملے گی ۔
بے فکرا :- استاد تم تو سٹھیا گئے ہو ۔ اپن نے کیا کہا جو لگے اول فول بکنے ۔
فتو استاد :- چپ بے نہیں دیتا ہوں ایک لپوٹا بتیسی پیٹ میں گھس جائے گی ۔
(بہت سی آوازیں) جانے دو استاد جانے دو ۔ لونڈا ہے کیا جانے بھلے مانسوں میں بندھا ہو تو
جانے ۔ (بے فکرے سے مخاطب ہوکر) اِدھر آبے ادھر آ ۔ استاد کے سامنے کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ)
بے فکرے نے کان پکڑ کر اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا ۔
ایک آواز :- ایک دو تین ۔
دوسری آواز :- تاک دھنا دھندن ۔ تاک دھنا دھندن ۔
بچے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں ۔
ریڈیو سے آرکسٹرا بجتا ہے ۔ جو اسی اٹھک بیٹھک کے وزن پر ہے ۔

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ام ۔ اے

مرزا ابوالحسن آصف خاں

(مسلسل)

آصف خاں اور نور جہاں میں کشیدگی

شہریار نور جہاں کا داماد تھا اور نور جہاں کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی وہ شہریار کے لئے میدان صاف کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ شاہجہاں کی جگہ وہی شہنشاہِ ہند ہو اسی لئے شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان اس نے اختلاف پیدا کرایا اور معمولی معمولی باتوں پر اس قضیہ کو بڑھاتی رہی، اگرچہ آصف خاں نہایت سمجھدار دور اندیش اور محتاط تھا اور وہ ان سب سازشوں کو دیکھ رہا تھا لیکن بمقتضائے احتیاط خاموش تھا تاہم شاہجہاں کو اس کی بیٹی منسوب تھی اس لئے مخالفین کو قدرتی طور پر اس کے خلاف سازشیں کرنے کا موقعہ میسر تھا چنانچہ ان کو اس ناپاک مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل ہوگئی اور آصف خاں شاہجہاں کی جانب داری میں متہم ہوگیا۔ نور جہاں بھی اُس سے منحرف ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا جب آصف خاں کی ماں اور باپ اعتماد الدولہ کا تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے انتقال ہوچکا تھا، اس لئے نور جہاں کے دل میں بھائی کی طرف سے جو غبار پیدا ہوگیا تھا اس کا رفع کرنے والا بھی اب کوئی نہ تھا۔ حقیقت میں یہ نور جہاں کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ایسے دانشمند اور تجربہ کار بھائی کو جو حکومت کا رکن رکین تھا اور ممکن تھا کہ اس گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا، اپنا مخالف بنا لیا۔ نور جہاں کے دل میں آصف کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور وہ اُسے اپنے مقاصد میں مخل سمجھ رہی تھی [illegible] وہ شاہجہاں کو باغی قرار دیکر اس کی تنبیہ بھی کرنا چاہتی تھی بعض مشیروں نے یہ رائے دی کہ آصف خاں اور مہابت خاں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں اگر مہابت خاں کو جو بہادر اور صاحب فوج ہے شاہزادہ پرویز کے ساتھ شاہجہاں کے مقابلہ پر بھیجا جائے تو وہ ضرور اس مہم کو درست طریقہ پر انجام دے گا، نور جہاں نے چند فرمان مہابت خاں کی طلب میں کابل بھیجے، مہابت خاں تجربہ کار اور جہاندیدہ جرنیل تھا وہ بیگم کی ان کارروائیوں کو پسند نہ کرتا تھا بلکہ خود نور جہاں کی طرف سے متوہم تھا، اسی لئے اس مہم پر جانا نہ چاہتا تھا تاہم اس نے لکھا کہ شاہجہاں کو باعثِ فتنہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کا استیصال مدنظر ہے تو پہلے اس فساد کی جڑ پر کلہاڑی چلائی

جائے یعنی آصف خاں کو حضوری سے الگ کر دیا جائے میں ایسی شرط پر دربار میں آنے کی جرأت کر سکتا ہوں یہ درخواست فوراً منظور ہو گئی اور آصف خاں کو خزانہ لانے کے حیلہ سے آگرہ بھیجد یا گیا، یہ وقت بہت نازک تھا آصف خاں آگرے سے تمام روپیہ، اشرفیاں اور سونا چاندی جو اکبر کے آغاز سلطنت سے وہاں رکھی ہوئی تھی لے کر لاہور جانا چاہتا تھا اور صورت یہ تھی کہ شاہجہاں کو خزانہ کے منتقل ہونے کی اطلاعات مل چکی تھیں، وہ خزانہ پر قبضہ کرنے کے خیال سے مانڈو سے آگرہ کی طرف چل پڑا تھا بلکہ فتحپور پہونچ چکا تھا اگر آصف خاں اسوقت خزانہ لے کر روانہ ہوتا تو یقیناً شاہجہاں سے اس کا مقابلہ ہو جاتا اسوقت یا تو وہ داماد پر تلوار اُٹھاتا یا خزانہ اسکے حوالے کر دیتا اور یہ دونوں صورتیں اچھی نہ تھیں لہذا اس نے بڑی دانائی اور دور اندیشی سے کام لیا کہ جہانگیر کی خدمتمیں عرضی بھیجدی کہ شاہجہاں خزانہ پر قبضہ کرنے ادہر آرہا ہے اسوقت حلقہ سے خزانہ کا نکالنا مناسب نہیں ہے، میں خزانہ کو خدا کے سپرد کر کے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔

اب شاہی دربار میں شاہجہاں کے استیصال کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں کابل سے مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز کو اس کے مقابلہ کے لئے بلایا گیا تھا بادشاہ دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھا شاہجہاں کے نام احکام جاری ہو رہے تھے کہ دکن واپس جاؤ وہ درخواست کرتا تھا کہ پہلے حضور میں آکر مجھے اپنے جرائم معاف کرا نے دیجئے پھر کہیں جاؤں گا مفسدوں نے شاہجہاں کی اس ضد کو جو سراسر خلوص و اطاعت پر مبنی تھی بغاوت اور سرکشی پر محمول کیا نورجہاں نے اس خیال کو تقویت دیکر جہانگیر کو بیٹے کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا نوبت یہاں تک پہونچی کہ باپ بیٹے کی فوجوں میں لڑائی ہوئی اگرچہ جنگ کی ترتیب مہابت خاں کی رائے سے ہوئی تھی مگر آصف خاں بھی بادشاہ کی طرف سے تلوار میان سے نکالے داماد کے مقابلہ میں میدان میں آیا اس نے شاہجہاں کے لشکر کو شکست دیکر پیچھے ڈھکیل دیا صرف یہی نہیں کہ باپ بیٹے کی جنگ میں آصف خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا بلکہ اس کا دوسرا داماد اور شاہجہاں کا ہم زلف صفی خاں بھی بادشاہ کی خیر خواہی میں جان لڑا رہا تھا جس کی بدولت اُسے ہفت صدی سے سہ ہزاری کیا گیا اور سیف خاں کا خطاب دیا گیا لیکن آصف خاں کی یہ تمام خدمات اور جاں نثاریاں محض اس بنا پر کہ وہ شاہجہاں کا خسر ہے کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں اور نورجہاں کا مقصد یہی یہ تھا کہ آصف خاں دربار سے دور رہے چنانچہ اٹھارھویں سن جلوس ۱۰۳۲ھ میں آصف خاں کو بنگالہ و اُڑیسہ کی صوبہ داری پر نامزد کر کے خلعت خاصہ اور شمشیر مرصع عنایت کی گئی اس کے لڑکے ابوطالب کو دو ہزاری منصب دیکر باپ کے ساتھ کیا گیا[1] لیکن یہ وقت وہ تھا جب مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز نے شاہجہاں کو دکن کی سرزمین سے نکال دیا تھا اور وہ بنگالہ کا رخ کر چکا تھا ایسی حالت میں آصف خاں کا بنگالہ

---

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۳۶۹

جانا نورجہاں کے سیاسی مقاصد کے بالکل ہی خلاف تھا چنانچہ آصف خاں کو اس بہانہ سے کہ پھوپی کو بھتیجے کی جدائی بہت شاق ہے واپس بلالیا۔[1] آخر شاہجہاں نے جو نورجہاں کا اصل حریف تھا شکست کھاکر باپ سے استدعائے معافی کی جہانگیر نے بیٹے کو معاف کیا اور یہ قضیہ اس طرح طے ہوگیا مہابت خاں کو اس سے پہلے شاہزادہ پرویز سے جدا کرکے بنگال بھیجدیا گیا تھا اور اس کی جگہ خان جہاں مقرر ہوچکا تھا، یہ کارروائی بھی نورجہاں کے ایما اور اشارے سے ہوئی تھی پرویز کے پاس غالبًا ایسے زبردست جرنیل کا رکھنا خلافِ مصلحت تھا چنانچہ آصف خاں اور خدائی خاں کو پرویز کے پاس بھیجکر مہابت خاں کو بنگالہ روانہ کرادیا گیا۔

آصف خاں اور مہابت خاں

مہابت خاں نے بنگالہ پہونچکر وہاں کی رعایا اور امرا پر بہت مظالم کئے بادشاہی دیوانوں اور متصدیوں کو بھی سرزمین بنگال سے نکال دیا رعایا نے جہانگیر سے فریاد کی، اب حالات اور تھے اگرچہ نورجہاں جس کے اشارے سے مہابت خاں نے شاہجہاں کو مصائب میں مبتلا کیا تھا دربار پر چھائی ہوئی تھی لیکن جہانگیر باوجود اس کے کہ نورجہاں سے بے انتہا محبت کرتا تھا فریادیوں کی درخواستوں پر بہت توجہ کرتا تھا، جب اس قسم کی درخواستیں پیش ہوئیں تو آصف خاں نے اسکے مظالم کو خوب بڑھا چڑھاکر بادشاہ کے سامنے بیان کیا اُسے انتقام کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا تھا، مہابت خاں کی شکایات میں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ اس نے محلات شاہی پر بھی تصرف کیا ہے، چنانچہ ایک افسرانِ شکایات کی تحقیقات کے لئے بنگال بھیجا گیا اُسے حکم تھا کہ تحقیقات کے بعد مہابت خاں کو خزانہ اور ہاتھیوں سمیت دربار میں لے آئے۔

یہ سب کچھ آصف خاں کی ہدایت سے ہو رہا تھا مہابت خاں نے ہاتھی اور خزانہ بھیجدیا مگر خود نہ آیا اپنے آنے کے لئے مہلت کا طالب ہوا، آصف خاں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا اور جانتا تھا کہ آصف خاں اس کی عزت و آبرو کے درپے ہے اس نے پانچ ہزار بہادر راجپوت ملازم رکھے اور دو مہینے کے بعد فوجی سازوسامان درست کرکے آگیا۔

اس درمیان میں آصف خاں کے اشارے سے بنگال کے ہزاروں فریادی آگئے جو مہابت خاں کی زیادتیوں پر بادشاہ کو متوجہ کرتے تھے، لیکن مہابت خاں پوری تیاری کے بعد آیا تھا اُس کا زیر کرنا آسان نہ تھا۔ بادشاہ کو مہابت خاں کے آنے کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جب تک شاہی مطالبات ادا نہ ہوں اور فریادیوں کی تکالیف رفع نہ ہوں، انصاف یہ ہے کہ مہابت خاں کو دربار میں آنے نہ دیا جائے، نورجہاں نے سفارش بھی کی لیکن بادشاہ عدالت کے مقابلہ میں بہت سخت تھا اس نے اپنے حکم کو تبدیل نہ کیا۔

---

[1] مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۳

شاہی ضابطہ یہ تھا کہ کوئی امیر اور منصبدار اپنی اولاد کی شادی بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ کرسکتا تھا مہابت خاں نے اپنی لڑکی کا عقد ایک نقشبندی بزرگ زادہ سے اذنِ شاہی کے بغیر ہی کردیا آصف خاں نے اس امر کو اسکے غرور اور رعونت پر محمول کرکے بادشاہ کے گوش گزار کیا اور مہابت خاں کے داماد برخوردار کو گرفتار کرکے قید کردیا، جہیز کا سامان بھی ضبط ہوگیا، اس موقعہ پر آصف خاں اگرچہ اپنی تمام سازشوں میں کامیاب ہورہا تھا لیکن اسنے مہابت خاں کو پہچاننے میں سخت غلطی سے کام لیا اور اس کے معاملہ کو معمولی معاملہ سمجھ لیا مہابت خاں ایک زبردست، تجربہ کار، اور دور اندیش سپہ سالار تھا وہ آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔

اسوقت جہانگیر کابل جارہا تھا اور دریائے بہٹ (اٹک) کے کنارے خیمے لگے ہوئے تھے دریا پر پل باندھ دیا گیا تھا تاکہ فوج کے گزرنے میں کوئی دشواری حائل نہ ہو بادشاہ کے کوچ سے ایک روز قبل حسبِ دستور تمام امراء نے دریا کو عبور کیا آصف خاں، فدائی خاں، خواجہ ابوالحسن اور جملہ امیر دریا پار چلے گئے، جہانگیر اور نورجہاں چند افسروں کے ساتھ ادھر رہ گئے۔

آصف خاں نے ایسی مجرمانہ غفلت سے کام لیا کہ مہابت خاں کا کچھ خیال ہی نہ کیا اور دریا کو عبور کرکے عیش وعشرت میں مشغول ہوگیا۔ مہابت خاں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر سات آٹھ ہزار سوار ہمراہ لئے اور رات کے آخری حصہ میں حکم دیا کہ شور وغل مچائے بغیر بہت خاموشی سے دو ہزار سوار پل پہ چلے جائیں۔ اِدھر سے کوئی اُدھر جانا چاہئے تو اُسے نہ روکیں البتہ اُدھر کا آدمی اِدھر نہ آنے پائے اگر زیادہ شورش ہو تو فوراً پل میں آگ لگادی جائے، پھر چار پانچ ہزار سوار ساتھ لیکر آپ خیمۂ شاہی کی طرف گیا۔ یہ انتظام پہلے ہی کیا جاچکا تھا کہ دریا پار سے حملہ ہو تو پل میں آگ لگادی جائے تاکہ امداد کے ذرائع بالکل منقطع ہوجائیں، جسوقت مہابت خاں نے جہانگیر کے خیمہ کو گھیرا ہے۔ بادشاہ آرام کررہا تھا خواجہ سراؤں نے پیرو پاکر ہوشیار کیا کچھ لوگوں نے مہابت خاں کو خوابگاہ کے قریب آنے سے روکا مگر مہابت خاں کا سیلاب رکنے والا نہ تھا، بادشاہ تلوار لیکر اُٹھا مہابت خاں اس وقت قریب آچکا تھا، بادشاہ نے غضبناک ہوکر پوچھا مہابت نمک حرام یہ آنا کس قسم کا ہے؟

مہابت خاں ڈر گیا اور کورنش کے مقررہ آداب ادا کئے مخالفوں کی شکایت کی اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اپنے ہمراہیوں کو الگ کھڑا کردیا آپ قدمبوس ہوا اور تین دفعہ بادشاہ کے گرد پھرا، پھر عرض کیا مجھے کامل یقین تھا کہ آصف خاں ذلت وخواری کے ساتھ مجھے ہلاک کرادیگا اس لئے مجبوراً یہاں چلا آیا اگر مجھے قابلِ سیاست خیال فرمایا جائے تو یہیں قتل کرادیا جائے مگر دشمنوں کے حوالہ نہ کیا جائے، بادشاہ نے خشمگیں ہوکر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھکر چاہا کہ اس کا کام تمام کردے مگر میر منصور بدخشی نے ترکی زبان میں عرض کیا کہ غصہ کا

وقت نہیں ہے صرف تسلی کر دیجئے، مہابت خاں کے آدمی ہر طرف چھائے ہوئے تھے مگر وہ خوشامدانہ گفتگو کر رہا تھا، مہابت خاں نے بادشاہ سے سوار ہونے کو کہا بادشاہ نے کپڑے بدلنے کی غرض سے نورجہاں کے پاس جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور اسی حالت میں اپنا گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا مگر غیرت شاہی نے اس کے گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ دی، پھر بادشاہ اسپ خاصہ پر سوار ہوا دولت خانہ سے کچھ دور نکلنے پر مہابت خاں حوضہ دار ہاتھی لے کر آیا اور عرض کیا کہ شورش کا اندیشہ ہے بہتر یہ ہے کہ ہاتھی پر بیٹھ کر شکارگاہ کی طرف تشریف لے چلئے بادشاہ ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ مہابت خاں کا ایک معتمد راجپوت ہاتھی کے آگے اور دو حوضہ کے پیچھے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران میں مقرب خاں بھی مہابت خاں کی اجازت سے بادشاہ کے قریب جا بیٹھا مقرب خاں کی پیشانی پر اس طوفانِ بے تمیزی میں ایک زخم بھی آگیا تھا جس سے خون بہ رہا تھا، خدمت پرست خواص بھی جس کے ہاتھ میں شراب خاصہ کا پیالہ تھا قریب پہونچ گیا اور راجپوتوں نے برچھے کی نوک سے بہت روکا مگر وہ بھی حوضہ کا کنارہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ نورجہاں کو معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی اور بہ تبدیلِ لباس جواہر خاں خواجہ سرا کے ساتھ پل سے گزر کر دریا کے اس پار اپنے بھائی آصف خاں کے پاس چلی گئی، آصف خاں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے حواس پراگندہ ہو گئے۔

مہابت خاں ہاتھی کو اپنے خیمہ کی طرف لے گیا اور بڑے احترام سے بادشاہ کو اپنے خیمہ میں اتارا اب مہابت خاں کو نورجہاں کا خیال آیا فوراً ہی معلوم ہوا کہ وہ آصف خاں کے پاس چلی گئی مہابت خاں کو یہ سُکر اپنی غفلت پر بہت افسوس ہوا پھر مہابت خاں بادشاہ کو شہریار کے خیمہ میں لے گیا۔

اگرچہ مہابت خاں بہت ہی آزمودہ کار فوجی افسر تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کرنے کو تو اس نے یہ کام کر لیا تھا مگر اس کے حواس بجا اور عقل ٹھکانے نہ تھی کچھ بن نہ پڑتا تھا اس کے آدمی خیمے کو گھیرے کھڑے رہتے تھے اور وہ خود دست بستہ بادشاہ کے سامنے حاضر رہتا تھا لیکن بادشاہ پر کسی قسم کا خوف یا رعب نہ تھا وہ بڑے ضبط و استقلال کا اظہار کر رہا تھا مہابت خاں مقررہ وقت پر بادشاہ کو تخت پر بٹھاتا اور شراب بھی پلاتا تھا غرض نہایت فرمانبرداری کا اظہار کرتا تھا آصف خاں نے تمام امراء کے مشورہ سے طے کیا کہ صبح کو لڑ بھڑ کر بادشاہ کو مہابت خاں کی قید سے چھڑا لینا چاہئے، جہانگیر نے مہابت خاں کے کہنے سے نورجہاں اور آصف خاں کو اس ارادے سے باز رہنے کی تاکید کی، اور مقرب خاں کے ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ میرے مقابلہ میں تم لوگوں کا جنگ کرنا زیبا نہیں میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔

مہابت خاں نے آصف خاں کو لکھ دیا کہ تم بڑے عقلمند بنتے تھے محض تمہاری وجہ سے بادشاہ کا یہ حال ہوا بہتر یہ ہے کہ وزارت مجھ پر چھوڑ دو میں بادشاہ کی خدمت کروں گا تم پنجاب اپنی جاگیر پر چلے جاؤ، آصف خاں نے

اس خیال سے کہ یہ سارے نامہ و پیام مہابت خاں کی رائے سے ہو رہے ہیں بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور لڑنے مرنے پر تیار ہو کر پل پر آیا مگر راجپوتوں نے فوراً آگ لگا دی بہادروں نے دریا میں گھوڑے ڈال دئے بہت سے ڈوب گئے کچھ خستہ حال کنارے پر پہونچے۔ خدائی خاں نے سات آدمیوں کے ساتھ مہابت خاں کی فوج سے جنگ کی مگر پھر دریا کو تیر کر چلا گیا۔

آخر آصف خاں نے سب امیروں کو ہمراہ لے کر نور جہاں کو ہاتھی پر سوار کیا اور ایک پایاب گھاٹ سے دریا کو عبور کیا لیکن جس گھاٹ سے فوج اُتر رہی تھی وہاں دو تین غار تھے اس لئے فوج میں برہمی پیدا ہو گئی۔ آصف خاں بھی نور جہاں کی عماری سے جدا ہو گیا، آصف خاں خواجہ ابوالحسن اور نور جہاں ابھی دریا سے نکلے نہ تھے کہ مہابت خاں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اس حملہ سے فوج بے ترتیب ہو گئی کچھ لوگ دریا سے اُتر آئے کچھ کچھ دریا ہی میں رہے کچھ لوٹ گئے۔ نور جہاں کا ہاتھی تیر کر نکل آیا اور وہ بادشاہ کے پاس چلی گئی آصف خاں کا بیٹا ابوطالب اور چند دوسرے نامور سردار بھی آ گئے خدائی خاں لڑتا بھڑتا راجپوتوں کو سامنے سے ہٹا کر خیمۂ شاہی تک پہونچ گیا خدائی خاں پر اسوقت سخت یورش تھی ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، اس کے تیر خیمہ میں بادشاہ کے قریب جا کر گر رہے تھے مخلص خاں سامنے آ گیا۔ مہابت خاں نے کہا اس کم بخت کی جرأت ملاحظہ فرمائیے کہ اپنے آقائے ولی نعمت پر تیر چلا رہا ہے بادشاہ نے بہت پیام بھیجے کہ اس کوشش سے باز آؤ مگر اس نے ایک نہ سنی، مہابت خاں کی فوج برابر اس کے مقابلہ میں جمی ہوئی تھی مگر اسکی امداد کو کوئی نہ آتا تھا بلکہ اُسے لڑائی سے روکا جا رہا تھا مجبور ہو کر وہ پھر دریا کو عبور کر کے واپس ہو گیا۔

آصف خاں کی گرفتاری

آصف خاں نے دیکھا کہ کوئی کام نہیں بنتا اور یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے مہابت خاں انتقام لئے بغیر نہ چھوڑے گا اس لئے وہ اٹک چلا گیا جہاں اس کی جاگیر تھی بہت سے امراء مہابت خاں سے معافی کا وعدہ لے کر اس کے پاس چلے گئے، آصف خاں بھاگ کر اپنے ڈھائی سو ہمراہیوں کے ساتھ اٹک کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا، مہابت خاں نے راجپوتوں کی فوج اس کے تعاقب میں بھیجی پھر نور جہاں کو بادشاہ کے پاس چھوڑ کر اس نے اپنی آدھی فوج کو بادشاہ کی حفاظت پر مامور کیا اور نصف فوج ساتھ لے کر وہ آصف خاں کے پیچھے گیا۔ آصف خاں کے ساتھی مہابت خاں سے مل گئے اور مہابت خاں، آصف خاں اور اس کے بیٹے ابوطالب کو قید کر کے بڑی بے آبروئی سے بادشاہ کے پاس لایا۔

بادشاہ مہابت خاں کے خوش کرنے کو اکثر نور جہاں اور آصف خاں کی بُرائی کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ نور جہاں نے بہت فساد مچا رکھا ہے اور میری محبت ظاہری سے فایدہ اُٹھا کر شاہجہاں کو میرا مخالف بنا دیا۔

ب میں ان دونوں بھائی بہنوں کا منھ دیکھنا نہیں چاہتا یہ ساری گفتگو نور جہاں کے مشورے سے ہوا کرتی تھی۔

صف خاں کی رہائی

نور جہاں کی حسن تدبیر سے جب بادشاہ مہابت خاں کی قید سے رہا ہوا اور مہابت خاں بھاگ گیا تو بادشاہ نے افضل خاں کو اس کے پاس بھیجکر پیام دیا کہ صف خاں اور اس کے لڑکے ابوطالب اور دانیال کے بیٹوں کو ہمارے پاس بھیجدو تو تمہارا قصور معاف کر دیا جائے گا۔ مہابت خاں نے دانیال کے بیٹوں کو افضل خاں کے حوالہ کر دیا آصف خاں کی نسبت یہ عذر کیا کہ رجہاں سے مجھے اطمینان نہیں ہے جب تک میں لاہور سے نہ گزر جاؤں آصف خاں کو نہیں چھوڑ سکتا۔

دشاہ نے پھر افضل خاں کو بھیجا اور اپنے اور نور جہاں کی طرف سے قسموں کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ میرے یا یگم کے ہاتھ سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہونچے گا مہابت خاں پہلے ٹالتا رہا پھر تین چار منزل کے بعد آصف خاں دبلاکر عہد لیا اور خلعت، گھوڑا وغیرہ دیکر بادشاہ کے پاس بھیجدیا، مگر ابوطالب کو اپنے پاس رکھا جب اطمینان ہوگیا ہ فوج اس کے تعاقب میں مقرر نہیں ہوئی تو ابوطالب کو بھی عزت کے ساتھ رخصت کر دیا[1]۔

وزارت

آصف خاں کی رہائی کے بعد ۱۰۳۶ھ میں کابل سے واپس ہوتے وقت لاہور پہونچکر اسکو پنجاب کی صوبہ داری اور عہدۂ وزارت پر مامور کیا گیا اسکے بعد ہفت ہزاری عہدہ (ہفت ہزار سوار) لیا گیا[2]۔

جہانگیر کا انتقال اور آصف خاں کی سرگرمیاں

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے کشمیر سے لاہور آتے ہوئے انتقال کیا اسی حادثہ سے قبل شہریار جس کو نور جہاں مسند خلافت پر بٹھانا چاہتی تھی، داء الثعلب میں مبتلا ہوگیا اور مونچھوں، ابرو، اور پلکوں کے بال بالکل جھڑ گئے، صاحب مآثر الامراء کا بیان ہے کہ آتشک کی وجہ سے یہ عارضہ پیدا ہوا تھا بہرحال وہ کچھ تو شرم کی وجہ سے اور کچھ علاج کرانے کی غرض سے لاہور چلا آیا تھا۔ جہانگیر کا پوتا یعنی خسرو کا بیٹا داور بخش قید میں تھا۔

نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خاں کو جہانگیر کی تجہیز و تکفین اور معاملات ملکی میں مشورہ کرنے کی غرض سے اپنے پاس طلب کیا لیکن آصف خاں نہ گیا اور داور بخش کو قید سے نکال کر بادشاہ بنا دیا اسی کے ساتھ اس نے ایک ہندو کو جس کا نام بنارسی تھا اور نہایت تیز رو تھا اپنی انگوٹھی دیکر شاہجہاں کے پاس بھیجا اور بہت جلد آنے کا زبانی پیام دیا[3]۔

---

[1] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳ و توزک جہانگیری جلد دوم ——— [2] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۳ و توزک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔
[3] مآثر الامراء ۱۵۴ و توزک جہانگیری جلد ۲۔

نورجہاں کی نظربندی

نورجہاں شہریار کی سلطنت کے لئے تدبیریں کررہی تھی اورچاہتی تھی کہ آصف خاں اور اعظم خاں میربخشی کو اپنے یہاں بلاکر قید کردے آصف خاں کی دوسری بہن صادق خاں کے عقد میں تھی وہ بھی نورجہاں کا شریک کار تھا، نورجہاں نے چند بار آصف خاں کو بلایا مگر اس نے عذر کردیا آصف خاں آگے آگے لاہور کی طرف آرہا تھا نورجہاں پیچھے پیچھے جہانگیر کی نعش کے ساتھ آرہی تھی دوسرے دن بھیمبر میں قیام ہوا اور جہانگیر کی تجہیز وتکفین کرکے نعش کو آگے روانہ کردیا گیا تاکہ لاہور میں باغ نورجہاں میں اس کو دفن کردیا جائے ہر شخص سمجھتا تھا کہ آصف خاں یہ جو کچھ کررہا ہے سب شاہجہاں کے لئے ہے داور بخش کو زبردستی قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اس لئے تمام امراء اس کی فرمانبرداری کررہے تھے لیکن نورجہاں اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھی اس لئے آصف خاں نے نورجہاں اور اپنی دوسری بہن اہلیہ صادق خاں کے گھر پر نگرانی کے لئے پہرے بٹھادئے اور آدمیوں کی آمدورفت بند کردی بلکہ نورجہاں کو شاہی محل سے لاکر اپنے گھر میں رکھ لیا، چنانچہ مآثرالامراء میں ہے

"بلکہ گویند بیگم را از محل بادشاہی برآوردہ در منزل خود جاداد"[1]

شہریار سے مقابلہ

شہریار نے لاہور میں جہانگیر کے مرنے کی خبر سنی تو شاہی خزانوں اور کارخانوں پر متصرف ہوکر بادشاہی کا دعوے کیا اور لشکر جمع کرنے کے لئے اس نے خزانوں کا منہ کھول دیا چنانچہ ایک لاکھ روپئے صرف کرکے ایک ہفتہ میں کافی لشکر جمع کرلیا اور مرزا بایسنقر خاں ولد دانیال کو جو جہانگیر کے مرنے پر بھاگ کر شہریار کے پاس آگیا تھا۔ اس کا سپہ سالار بنایا، بایسنقر خاں لشکر لیکر راوی کے پار آیا اور شہریار دو تین ہزار سواروں کے ساتھ شہر لاہور کے باہر لڑائی کے نتیجہ کا منتظر رہا۔

اس طرف سے آصف خاں بڑی شان وشوکت سے داور بخش کو ہاتھی پر بٹھاکر چلا ایک ہاتھی پر وہ خود سوار ہوکر قلب لشکر میں قایم ہوا لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا پہلے ہی حملہ میں بایسنقر خاں کو شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہوگئی۔ شہریار شکست کی خبر پاکر قلعہ میں چلا گیا۔

شہریار کی گرفتاری

اگلے دن آصف خاں نے قلعہ کے قریب ہی خیمے نصب کئے شہریار کے اکثر ساتھی آصف خاں سے آملے اور رات کے وقت کچھ لوگ ان کی امداد سے قلعہ میں داخل ہوگئے اور داور بخش کو تخت پر بٹھادیا شہریار جہانگیر کی حرم سرا کے ایک کونہ میں چھپا ہوا تھا فیروز خاں خواجہ سرا نے اس کو پکڑ کر الہ وردی خاں کے سپرد کیا اس نے اس کی کمر کا پٹکہ کھول کر دونوں ہاتھ

---

[1] مآثرالامراء صفحہ ۱۵۵

باندھے اور داور بخش کے سامنے حاضر کر دیا وہاں اُسے پہلے قید کیا گیا پھر دو دن کے بعد آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔[1] پھر چند دن کے بعد طہمورث اور ہوشنگ پسران دانیال کو بھی گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔

آصف خاں نے فتح کی مسرت افزا نوید شاہجہاں کی خدمت میں بھیجی شاہجہاں کو ساہوکاروں کے خطوط سے یہ حالات معلوم ہو گئے تھے اس نے خدمت پرست خاں، رضا بہادر کو احمد آباد سے آصف خاں کے پاس لاہور بھیجا، اور اپنے ہاتھ سے یہ خط لکھا کہ مصلحت وقت کا تقاضہ ہے کہ داور بخش اور دوسرے شاہزادوں کو قتل کر دیا جائے چنانچہ آصف خاں نے ۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو اتوار کے دن داور بخش کو قید کر کے شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا اور ۲۶ جمادی الاول کو گرشاسپ اور اس کے بھائی، نیز شہریار، طہمورث اور ہوشنگ پسران سلطان دانیال کو قتل کر دیا۔[2]

عہد شاہجہانی

شاہجہاں آگرہ میں اورنگ نشین حکومت ہوا تو آصف خاں لاہور میں تھا، شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے اس کو فرمان لکھا جس میں بہت سے القاب و خطابات کے بعد اپنی تخت نشینی کا وقت تحریر کیا یہ بھی لکھا کہ آپ کے کہنے سے ہم نے اپنا لقب " شہاب الدین مقرر کیا ہے، ساتھ ہی شوق ملاقات کا اظہار بھی کیا، اپنا وہ خلعت بھی آصف خاں کے لئے بھیجا جو جلوس کے دن پہنا تھا، اور آٹھ ہزاری منصب بندر لاہوری۔

آصف خاں دربار شاہجہانی میں

۲ رجب ۱۰۳۷ھ میں آصف خاں داراشکوہ، محمد شجاع اور اورنگ زیب کو ساتھ لے کر لاہور سے آگرہ آیا اور بادشاہ کے حکم سے سکندرہ میں مقیم ہوا، ممتاز محل بیٹوں سے ملنے گئی آصف خاں نے اس کا استقبال کیا، آصف خاں کو جہانگیر جو ممتاز محل کے پاس رہتی تھی عنایت ہوئی اور وزارت کا منصب، یمین الدولہ کا خطاب ملا، گفتگو کے وقت بادشاہ لفظ عمو سے مخاطب کرتا تھا، آٹھ ہزاری منصب آٹھ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا، جو آج تک کسی امیر کو نہ ملا تھا اس کے بعد جب آصف خاں نے اپنی فوج کا معائنہ کرایا تو نو ہزاری کر دیا گیا اور نہایت آباد جاگیر جس سے پچاس لاکھ روپیہ وصول ہوتا تھا مرحمت کی گئی۔[3]

آصف خاں کی سپہ سالاری

۱۰۳۹ھ میں نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال کی غرض سے فوج تعینات ہوئی جس کے ایک حصہ کی سرداری شائستہ خاں ولد آصف خاں کے سپرد تھی، اس فوج کا سپہ سالار اعظم خاں تھا۔ سپہ سالاری کا عہدہ نہایت اہم تھا فوج میں بڑے بڑے امیر اور سردار ہوتے تھے ان پر اثر قایم رکھنا آسان نہ تھا اور بغیر اثر و اقتدار کے فوجی مہمات کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں

---

[1] ماثر الامرا صفحہ ۱۵۰ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۴۳۶ و اقبال نامہ صفحہ ۲۹۶ - [2] ماثر الامرا صفحہ ۱۵۶ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۴۳۶ و اقبال نامہ صفحہ ۲۹۶ - [3] ماثر الامراء صفحہ ۱۵۶

معرکۂ جنگ وجدال میں فوج اور امراء پر اقتدار قایم رکھنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے اعظم خاں سپہ سالار تو ہوگیا مگر وہ سپاہ کو قابو میں نہ رکھ سکا امرا اس کی مساوات کا دم بھرنے لگے جس سے تنظیم میں فرق پڑ گیا، پھر اعظم خاں سے کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ وہ انعام یا منصب عطا کرسکتا ہے بادشاہ نے یہ کیفیت دیکھ کر برہان پور میں یمین الدولہ آصف خاں کو سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کیا۔

عادل شاہ کی گوشمالی ۱۰۴۰ھ میں آصف خاں برہان پور سے محمد عادل شاہ بیجاپور کی گوشمالی کے لئے بڑے تزک واحتشام سے زبردست فوج لے کر روانہ ہوا حوالی بیجاپور میں اس نے خیمے لگائے اور مار دھاڑ شروع کی لیکن محمد امین مصطفےٰ خاں اور خیریت خاں چالیس لاکھ روپئے کی پیشکش لیکر قلعہ سے نکلے اور صلح کرلی، لیکن خواص خاں جو اسوقت سلطنت بیجاپور کا کرتا دھرتا تھا وہ جانتا تھا کہ ملک ویران ہے اور لشکر شاہی میں غلہ، گھاس، لکڑی اور دوسرے سامان رسد کی قلت ہے ایسی حالت میں آصف خاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا اسلئے وہ بدستور مدافعت میں مصروف رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ لشکر میں نہ صرف غلہ ہی کا قحط تھا بلکہ تمام ضروری چیزیں بھی نایاب تھیں حتیٰ کہ ایک جوڑ جوتے کی قیمت چالیس روپیہ تھی اور ایک گھوڑے کی نعلبندی میں دس روپئے صرف ہوتے تھے پھر یہ ملک بھی بالکل ویران تھا مجبوراً یمین الدولہ بیجاپور سے محاصرہ اُٹھا کر رائے باغ اور مرچ کی طرف قتل وغارتگری کرتا ہوا راہی ہوا۔ جو بہت آباد ملک تھا پھر برسات کے قریب کی وجہ سے واپس آگیا۔

آصف خاں سے شاہجہاں کی کشیدگی اس مہم کا ایک ناگوار واقعہ یہ ہے کہ ایک دن خلوت میں اعظم خاں نے آصف خاں سے کہا کہ بادشاہ کو اب میری اور آپ کی ضرورت نہیں ہے آصف خاں نے کہا میرے اور تمھارے بغیر سلطنت کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا۔ بادشاہ کو بھی کسی طرح اس گفتگو کا علم ہوگیا اور اس کو سخت ناگواری ہوئی فرمایا کہ آصف خاں کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ آیندہ امور سلطنت میں اُسے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

خان خانانی کا خطاب اگرچہ اس واقعہ کے بعد دونوں میں خلوص نہ تھا لیکن بظاہر آصف خاں کی عزت وتوقیر میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی بلکہ مہابت خاں کے مرجانے پر ۸ جلوس میں خان خانانی اور سپہ سالاری کا لفظ اس کے خطابات میں بڑھا دیا گیا۔

انتقال[1] ۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ کو آصف خاں نے مرضِ استسقا یعنی جلندر میں انتقال کیا۔

"زہے افسوس آصف خاں" تاریخ وفات ہے۔

بادشاہ علالت کے دوران میں چند بار اسکے گھر گیا، بادشاہ کو اس کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا، آصف خاں کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جو ان دنوں صوبۂ بہار کا ناظم تھا ماتمی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا، آصف خاں کے دوسرے

[1] ماثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۸

بیٹوں اور بیٹیوں نیز بیگم صاحبہ (اپنی بیٹی) بادشاہ بیگم، کی دلجوئی کی سب کو بغیر سلے ہوئے نوکپڑوں کا خلعت دیا آصف خاں کے متعلقین میں جو شخص منصب کے لایق تھا اُسے منصب دیا گیا اور جو تنخواہ کے قابل تھا اُس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

شاہجہاں جب آصف خاں کی عیادت کو گیا تو اس نے علاوہ لاہور والی حویلی کے جسکی تعمیر پر بیس لاکھ روپئے صرف ہوئے تھے اور علاوہ ان مکانات کے جو دہلی آگرہ اور کشمیر میں واقع ہے دو کرور پچاس لاکھ روپئے کے جواہرات، چاندی، سونا اور اجناس بادشاہ کے سامنے پیش کر کے التجا کی کہ ان سب کو خزانۂ عامرہ میں، داخل کر لیا جائے[1] کیونکہ مال و دولت جمع کرنے کا مقصد سوا اسکے اور کوئی نہیں ہے کہ اولاد کے آرام و راحت میں کام آئے لیکن میرے اولاد اور اعزہ آپ کے فیضِ التفات سے خوش و خرم ہیں، ایسی صورت میں یہ مال و متاع خزانہ ہی میں داخل ہونا چاہیئے۔

بعض کتابوں میں ان چیزوں کی یہ تفصیل لکھی ہے :۔ جواہر :۔ ۳۰ لاکھ روپئے کے ——

اشرفی :۔ ۳ لاکھ یعنی بیالیس لاکھ روپئے کی —— نقد :۔ ایک کرور پچیس لاکھ روپئے ——

سونے چاندی کے ظروف :۔ تیس لاکھ روپئے کے —— دوسری اجناس :۔ تیس لاکھ روپئے کی ——

بادشاہ نے اس میں سے بیس لاکھ روپئے اسکے تینوں بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو تقسیم کر دئے، لاہور کا محل داراشکوہ کو عنایت کیا گیا جو آصف خاں کا نواسہ تھا۔ باقی اشیاء ضبط کر لی گئیں[2]

مقبرہ آصف خاں کو شاہجہاں کے حکم سے جہانگیر کے روضہ کے غربی جانب دریائے راوی کے کنارے دفن کیا گیا قبر پر عالیشان گنبد تعمیر ہوا اور باغیچہ بھی نصب کیا گیا[3]۔

منشی کانے خاں صاحب نے "تاریخ عمارات شاہان مغلیہ" کے صفحہ ۱۱۹ پر مقبرۂ اعتمادالدولہ کے حالات میں لکھا ہے:

"ایک گوشہ میں ابوالحسن یمین الدولہ آصف خاں کی قبر ہے جن کا منصب شاہجہاں بادشاہ کا عطا کیا ہوا نو ہزاری تھا وزیر اعظم بھی تھے اور شاہجہاں بادشاہ کے خسر بھی تھے ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۲ء میں مرض استسقا سے انتقال کیا"

معلوم نہیں منشی صاحب موصوف کی اس تاریخی کاوش و جستجو کا ماخذ کیا ہے اور اس میں کہاں تک اصلیت ہے سن وفات تو منشی صاحب نے غلط لکھا ہے، آصف خاں ۱۰۵۱ھ میں فوت ہوا ہے، ۱۰۴۲ھ میں وہ زندہ و سلامت تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو کسی نے اُسے لاہور سے اُٹھا کر آگرہ میں باپ کی آغوش میں لا رکھا ہو مگر اُسی کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی نورجہاں بھی تو اعتمادالدولہ کی بیٹی تھی وہ لاہور ہی میں محوِ خواب ہے۔ ممکن ہے جہانگیر کی رعایت سے نورجہاں کو وہاں رہنے دیا گیا ہو، بہر حال میرے مطالعہ میں جسقدر تاریخی کتابیں ترتیب مضمون کے وقت رہیں ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ ابوالحسن لاہور سے آگرہ آ گئے تھے —— واللہ اعلم بالصواب

کوثر چاندپوری

---

[1] مآثرالامراء صفحہ ۱۵۸۔ [2] مآثرالامراء صفحہ ۱۵۰ و سیرالمتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰۔ [3] مآثرالامراء صفحہ ۱۵۰ و سیرالمتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰۔

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :۔

"اگر دُنیا کے تمام شعرا سے سوال کیا جائے کہ وہ کون سا بیش بہا خراج ہے جو زمانہ نے انسانی فطنت (جینیس) کی ظفر مندی کے ذریعے سے حاصل کیا، تو وہ بلا تأمل اور متفقہ طور پر جواب دیں گے کہ سیفو کے گمشدہ اشعار !"

شیکسپیر کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مردوں میں ہومر برترین شاعر ہے، مگر سیفو بغیر استثناء عورتوں میں برترین شاعرہ ہے عجیب بات ہے کہ ہومر اور سیفو نہ صرف کمالِ فن کے اعتبار سے شعرائے عالم کے سرخیل ہیں بلکہ قدامت کے لحاظ سے بھی ہیں اور اس پہلو سے اُن کے کمالِ فن کا کماحقہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

سیفو کی مقبولیت کو دنیا کے کسی ملک اور کسی زمانے کا کوئی شاعر نہیں پہونچتا، کیونکہ دنیا میں کسی شاعر کی تصویر اُسکے ملک کے سکوں پر ٹھپا نہیں ہوئی۔ یہ اعزاز اور خصوصیت صرف سیفو کا مقدر تھا۔

دوسرا ثبوت سیفو کی عظمت اور مقبولیت کا یہ ہے کہ تین سو سال سے سیفو اور اُس کے کلام کے متعلق جستجو جاری ہے اور برابر مجتہدین فن دادِ تحقیق و تلاش دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مکمل کتاب سنہ ۱۹۰۸ء میں مسٹر وارٹن (Wharton) نے لکھی جسے سیفو کے باب میں "لفظ آخر" کا درجہ دیا گیا۔ مگر بیس سال پورے نہ ہونے پائے تھے کہ مسٹر ہینز (Haines) نے ایک جامع تر تالیف پیش کر دی۔

سیفو کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لئے متعدد یورپی شعرا نے سیفو کے ایک ایک پارے کو لیکر پوری نظمیں لکھی ہیں جو دنیا کی تاریخ ادب میں نئی اور نرالی ادبی کاوش ہے۔ کسی شاعر کے خیال کو اُس کے ایک لفظ یا ٹکڑے سے اُس شاعر کی طرح تخئیل کرنا، اُسی کے ماحول میں احساس کرنا، اور اُس کی تخئیل و احساس کو اپنا لینا درحقیقت اہرامِ مصری کو آنِ واحد میں کھڑا کر دینے کے برابر مشکل کام ہے! گویا سیفو کے خوابوں کی تعبیر نہیں بیان کی گئی بلکہ اُسکے خواب خود دیکھے گئے! قطع نظر اس سے کہ ان شاعروں کو کس حد تک کامیابی ہوئی یہ مجرد واقعہ کہ سیفو کے ٹکڑے پر سیفو ہی کی زبان و انداز میں نظمیں لکھی جائیں اور اُس کا رنگ اور سیرت پیدا کی جائے ایک کارِ عظیم و عجیب ہے !

چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک جشن دعوت میں یونان کا مشہور مقنن سولن بھی شریک تھا۔ سولن کے بھتیجے نے اُس صحبت میں سیفو کے بعض شعر پڑھے۔ سولن ان اشعار سے اس قدر متاثر ہوا

کہ اُس نے وہ اشعار اُسی وقت یاد کئے اور پھر ایک سوال کے جواب میں کہنے لگا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں ان اشعار کو یاد کئے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔

دوسرا تاریخی واقعہ اس کے دو سال بعد کا ہے۔ ایکرائیس (Apicrantes) کے ڈرامہ کا ایک کردار فخر کرتا ہے کہ اُسے سیفو کا گیت یاد ہے! اس واقعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُس وقت کی سوسائٹی میں سیفو کے اشعار کا کیا درجہ تھا سسرو کے زمانے میں بھی سیفو کے گیت گائے جانا ثابت ہے اور پھر تیسری صدی عیسوی تک کی شہادت ملتی ہے کہ سیفو کے نغمے ذوق وانہماک کے ساتھ گائے جاتے اور انسانوں کو وجد میں لاتے تھے۔

اس کے بعد یقینی شہادت تو نہیں مگر ساتویں صدی عیسوی میں بھی سیفو کے نغمات کی مقبولیت کے اشارے ملتے ہیں کہ وہ بالکل محو نہیں ہو گئے تھے۔ کیونکہ اُس صدی کے نحویوں نے سیفو کے حوالے دئے ہیں۔

ایک اور خاص بات سیفو کی عظمت کے ضمن میں یہ ہے کہ ساتویں صدی کے بعد سے سیفو کا نام اور کلام محو ہو کر پندرھویں صدی کے آخر تک کہیں اُس کے متعلق اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن سولویں صدی میں اُس کی مقبولیت اور عظمت پھر اپنا مستحق مرتبہ پالیتی ہے۔

ہومر کی طرح کسی شاعر کا کلام ہمیشہ مقبول و معزز رہ سکتا ہے، غالب کی طرح مردود ہو کر مقبول بھی ہو سکتا ہے اور نظیر کی طرح متصل مقبول بھی رہ سکتا ہے اور مردود بھی، لیکن یہ خصوصیت تنہا سیفو کو حاصل ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انتہادرجے پر مقبول رہنے کے بعد انسانی حافظے سے یکسر محو ہو جائے اور آٹھ صدیوں تک بالکل گمنام رہ کر پھر وہی عظمت و قبولیت حاصل کرلے۔

سیفو کی اخلاقی حالت اور اُس کے کردار کے متعلق دو باتوں نے سخت اُلجھن اور مغالطہ پیدا کر دیا۔ ایک تو اس کا اپنی شاگردوں سے غیر معمولی اظہار محبت کرنا جو اُس کے موجود اشعار کا بھی غالب موضوع ہے اور خاص کر اُس کی وہ نظم جو سیفو نے اپنی شاگرد اِتھیس کو مخاطب کر کے لکھی ہے اور دوسری بات وہ خط ہے جس کو غیر مستند طور پر اووِڈ کی تصنیف کہا جاتا ہے، سیفو سے منسوب کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب فاؤن (Faon) کو لکھا تھا۔

فاؤن کے افسانے کا مسالا اصل میں بعض نحویوں کی تاویلوں کا نتیجہ ہے۔ سیفو کچھ دن مقام ارسیس میں بھی رہی تھی، اور وہاں اُس کی ہم نام ایک ڈیرہ دار (Courtezan) بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جب سیفو رسوا کی جانے لگی تو ان نحویوں میں سے کسی نے اِن داستانوں کو اُس ڈیرہ دار سیفو سے منسوب کر دیا۔ یہ خیال شاید اس لئے پیدا ہوا کہ جس باکمال شاعرہ کے نام اور حوالے سے لوگ اپنے فن صرف و نحو کو معزز بناتے ہیں اُسے رسوائی سے بری ہونا چاہئے۔

مگر بعد کے یونانی طربیہ نگاروں نے جو تاریخ ادب میں ایٹک کامیڈین (Attic Comedian) کہے گئے اُن افسانوں کو لیکر متعدد ڈرامے لکھ ڈالے۔ بعد پھر ناموں کی تیورمٹ کر اُن داستانوں کو اُس ذات سے منسوب سمجھا گیا جو نہایت

مشہور تھی۔

قدیم زمانے کے جن لوگوں نے سیفو کے نام کو ذلت و رسوائی سے پاک رکھنے کی کوشش کی اُن میں سب سے پہلے فلسفی میکسی مس کا نام آتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ کردار اور شریفانہ اخلاق کا انسان تھا اور اُس کے خیال میں سیفو کا اپنی شاگرد لڑکیوں سے غیر معمولی محبت کرنا کوئی انہونی بات نہ تھی اور اُس کی یہ محبت اُس محبت سے مماثل تھی جو حکیم سقراط کو اپنے شاگردوں سے تھی یعنی میکسی مس، سقراط اور سیفو کی محبت کو معصوم سمجھتا تھا۔ اُس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اِن دونوں کی رسوائی کی ذمہ دار اُن کی ہمدردانہ فطرتیں تھیں، اور کثرت احباب کے ساتھ اُن کی حسن پرست طبیعتوں کو غلط طور پر سمجھنے کا نتیجہ! وہ خود سیفو کے کلام سے اُس کے اخلاق و کردار کی بلندی ثابت کرتا اور بتاتا ہے کہ سیفو کا ایک بھائی جو اسکندریہ میں تھا، ایک ڈیرہ دار دریشا (جس کا تاریخی لقب روڈوپیس "Rohdopis" تھا) کی محبت میں خراب و خوار ہوا تو سیفو نے ایک نظم میں اُسے سخت تنبیہ کی۔

اُس کے ہمعصر اور مستند شاعر الکائیس نے سیفو کو ان لفظوں میں مخاطب کیا ہے:۔

"بنفشے کے پھول بُننے والی، مسکراہٹ سے مٹھاس برسانے والی، پاکیزہ سیفو! میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر حجاب کرتا ہوں!"

سیفو نے اس نظم کا جواب نظم سے دیا:۔

"تیری خواہش اگر کوئی عمدہ بات کہنے کی ہوتی تو تیری آنکھوں کو شرم نہ چھو سکتی اور تو جو کچھ کہنا چاہتا تھا برملا کہہ سکتا!"

سیفو کی محبت کے اِن افسانوں پر سب سے پہلے ایک جرمن نقاد ویلیکر (Welcker) نے درایت کی نظر ڈالی اور اپنے استدلال سے سیفو کو تمام انسانی اور نسوانی خوبیوں کا مجسمہ قرار دیا۔ مسٹر میور (Mure) نے اس سے اختلاف کیا اور بحث کی گرماگرمی اتنی بڑھی کہ دونوں حد سے تجاوز کر گئے۔

اُس وقت کے ادنیٰ طربیہ نگار شعرا، سیفو کو ایک آوارہ، عشرت پرست اور لیسباس کے اوباش حلقے میں اپنی شاعری اور پست اخلاقی کے سبب مقبول ہونے کے رنگ میں پیش کر کے ان بحثوں کے لئے موضوع پیدا کر گئے اور ان بحثوں کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ سیفو مسلم طور پر اگر اپنے زمانے کے معیار اخلاق سے بالاتر نہ تھی تو گری ہوئی بھی نہ تھی۔

اس گفتگو کے آخر میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کا یہ قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "اگر مثالاً اُس خاکے کو سامنے رکھا جائے جو ارسٹوفینز نے سقراط کا بنا کر پیش کیا تھا تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ سیفو کے متعلق اس ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس تمام کو یکسر ہفوات سمجھیں"۔

مذکورۂ بالا شہادتوں سے سیفو کے کردار کو اُس گندگی سے پاک کیا گیا ہے جو یونانی طربیہ نگاروں نے اُسکے

سرتقوپی بھی اور جس کی تفصیلات اور دلائل اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اور اس واقعے سے بھی انکار کیا گیا ہے کہ اُس قصے کی اگر کوئی اصلیت ہوتی تو اُسوقت کے یونانی ادب میں اُس کا ذکر آتا۔ یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ چونکہ بعض قدیم بیانات میں ایڈونس کو فاؤن کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لئے یہ فسانہ وینس و اڈونس کے قصے کی یاد تازہ کرنے کے لئے وجود میں آیا۔

لیکن اِس تمام تحقیق و تلاش میں جو انسانی فکر و جستجو کا تحیر خیز کارنامہ ہے، ایک بات یکسر نظر انداز کر دی گئی ہے اور وہ سیفو کا انسان اور عورت ہونا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ سیفو اُس قوم کے افراد میں تھی جو حسن کے مظاہر کی دیوانی تھی، لیکن یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا کہ سیفو کو کسی سے محبت ہوئی۔ وہ محبت جو دو گوشت پوست کے انسانوں میں ہوسکتی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا جا سکا کہ سیفو کو اپنے شوہر سے محبت تھی۔ فاؤن کے افسانوں کو قیاسات سے غلط ثابت کیا گیا ہے کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں ہوسکا۔ لیکن اگر دوسرے پہلو سے بھی قیاسات کی شہادت مانی جائے تو خود ایک انگریز نقاد کو تسلیم ہے کہ یہ افسانہ، سیفو کی شاعرانہ شخصیت پر چپت لباس کی طرح زیب دیتا ہے۔

ایک ایسی شاعرہ جس کا ثانی پچیس صدی کا ارتقا بھی پیدا نہ کرسکے، محبت کئے بغیر اتنی زبردست مغنیۂ محبت بن جائے! قیاس قبول نہیں کرتا۔ شاعر اگر حقیقی ہے تو اُس کے لئے محبت ناگزیر ہے! پھر سیفو کی تو فطرت شعر کے سانچے میں ڈھلی تھی! اور اُس کے ساتھ نفسِ انسانی کی رمز شناسی، جذبات کی سچی قدر دانی، راحت و آرام کی زندگی، یہ سب لوازم مہیا ہوں اور محبت کو دخل نہ ملے! عقل نہیں مانتی ایسی سیفو کا کسی کی محبت میں دیوانہ ہو جانا، اُس کا محبت سے محروم رہنا، بے شک حیرت انگیز ہوسکتا ہے! اس کے برخلاف محبت کرنا اور نراس ہونا جو سچی محبت کا انعام ہے اور پھر اُس محبت پر قربان ہو جانا، سیفو کی ہستی کو ایک شعرِ نغز بنا دیتا ہے — محبت کا ایک شاہکار پیش کر دیتا ہے۔

سیفو کی ذات سے اِس واقعے کی نسبت نے اُس کی شخصیت میں ایک طلسمی کشش پیدا کر دی ہے جن محققین نے اس فسانے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کاوشیں کیں، کوئی شک نہیں کہ تحقیق کی دنیا میں قابلِ صد تحسین کام کیا ہے، لیکن شعر و شباب کی دنیا میں تو اسے شکستِ طلسم سے تعبیر کیا جائے گا اور اس سے انکار نہ کیا جاسکے گا کہ اس سراسر تخیلی قصے نے بیش بہا ادب پارے پیدا کرا دئے اور اعلیٰ قسم کی نظم و نثر وجود میں آگئی۔

حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن سیفو کا یہ "نامۂ محبت" اس قابل ہے کہ باقی رہے۔

سیفو کا محبت نامہ

سچ بتانا، جب تم نے یہ خط پڑھا تو کیا میری صورت بھی تمھارے ذہن میں آگئی تھی؟ اور کیا آخر میں نام پڑھنے سے پہلے تم جان گئے تھے کہ خط کس کا ہے؟

تم کہو گے کہ میرا محبوب مشغلہ تو گیت بُننا ہے، میں نے یہ نوحہ کیوں لکھا؟ ہاں، مگر میری محبت مغموم ہے۔

یہ نوحہ ایک مغموم نغمہ ہی تو ہے! حالانکہ میرے بربط سے آنسوؤں کا گیت نہیں نکلتا! مگر میں اس طرح پھُنک رہی ہوں جیسے مکئی کا بھرا پُرا اور تیار کھیت تیز پُروا میں لو دیتا دکھائی دے!

فاؤن، ایٹنا کے کشت زاروں میں پھر رہا ہے اور میرے دل میں ایٹنا کی آگ روشن ہے!

میرے بربط کے تار ملے ہوئے ہیں لیکن مجھے کسی گیت کا الہام نہیں ہو رہا ہے، وہ دماغ جو گیتوں میں بات کرتا ہو خیالات سے خالی ہے!

لیسباس کی دوشیزہ لڑکیاں، ماپڑھا کی کنواریاں، اور میتھمنا کا کنارا اب مجھے نہیں لبھاتے۔ انکٹوریا اور سائڈرو کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے اور نہ ایتھیس ہی کوئی دلکشی، اور میری وہ محبت جس میں سیکڑوں شریک تھے اور جو میری رسوائی بھی بن گئی اب صرف تمھارا حصہ ہے ـــــ تنہا تمھارا! تم کتنے خود غرض ہو!

تم خوبصورت ہو ایسے کہ جوانی تم سے چُہلیں کر رہی ہے، اور اے حسن پُرلذت! تمھاری خوبصورتی اور جوانی میری نظروں کا جال بن گئی ہے! تم اگر گز اور رہبلا اُٹھا لو تو فیبس[1] (Phoebus) بن جاؤ گے، اور جو ماتھے پر ایک سینگ لگا لو تو باخس[2] (Bacchus) نظر آؤ گے! فیبس نے دوشیزہ کریٹ کی آرزو کی اور باخس نے ڈیفنی کی۔ لیکن گیت گانا نہ تو کریٹ والی جانتی تھی اور نہ ڈیفنی! ایسے شیریں نغمے، یہ مدہر گیت تو میوزوں نے بس سیفو کو سکھائے ہیں جن سے دُنیا گونج رہی ہے! الکائیس بہتر سُر لگا لیتا ہے لیکن اُس کی شہرت برتر نہیں، اگرچہ میرا اور اُس کا وطن ایک ہے، ساز ایک ہے!

بے مہر فطرت نے مجھے زیبائی نہیں بخشی، لیکن اُس کے بدلے میں روشن و رسا ذہن دیدیا ہے! میرا جسم و قد مختصر ہے، لیکن میرا نام زمینوں اور سمندروں سے بڑا ہے۔ یہی میری قدر و قیمت کا پیمانہ ہے! میرا روپ رنگ سانولا ہے، پر کالی رنگت والی اینڈرومیڈا[3] (Andromeda) پرسیوس[4] (Perseus) کی نگاہوں میں گوری تھی! رنگ دار کبوتروں میں سفید کبوتریاں اکثر دیکھی جاتی ہیں اور سیاہ کھجورے کی مادہ سبزہ رنگ ہوتی ہے! لیکن تمھیں اگر اپنا ہی سا جوڑا چاہیئے تو یاد رکھو کبھی نہ پاؤ گے ـــ ایسی کوئی نہ ملے گی! ہاں، اگر تم مجھے پڑھو گے تو میرا حسن و جمال بڑھ جائے گا! اور تم کہتے بھی تو تھے کہ تو بس باتیں کرتی رہ!

مجھے یاد ہے کہ جب میں گاتی ـــ کہ محبت کرنے والے ہی گانا جانتے ہیں ـــ گاتی ہوتی، تو تم میرا منھ چوم لیتے تم میرے گانے کی تعریف کرتے، میری ہر چیز اور ہر بات سے خوش ہوتے ـــ خاص کر جب محبت تسکین پاتی! میرا چنچل پن تمھیں بہت بھاتا، میری چلبلاہٹ تمھاری نظر میں بہت پیاری ہوتی! اوہ! جب ہماری محبت اپنا حق

---

[1] اپالو سورج کا دیوتا۔ [2] شراب کا دیوتا۔ [3] ایک حسین دوشیزہ جو ستارہ بنا دی گئی ـــ [4] ایک یونانی ہیرو جس نے اینڈرومیڈا کو رہائی دلائی

الیتی تو خواب ناک کاہلی میں خستہ و خموش پڑے رہنا! کس قدر مزہ دار گھڑیاں ہوتی تھیں!
مگر یہ نئی فتوحات — سسلی کی لڑکیاں ہو اور تم! اب لیسباس کہاں؟ مگر میں بھی سسلی ہی کی ہوں! اے سیگریا کی ماٶ اور لڑکیو! اس فراری کو پلٹا دو! اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا۔ میں بھی انھیں لفظوں کو سن چکی ہوں!
آئریکیس (Eros) والی دیوی! میں تو تیری زبان ہوں — میری مدد فرما! میرے باپ کی موت پر جب اس کی مٹی میرے آنسوؤں سے بھیگی تو میں نے چھ ہی بہاریں تو دیکھی تھیں! میرے بھائی نے ایک بیسوا کے پیچھے اپنی دولت اور عزت کھو دی اور اب اُسے بری طرح پھر حاصل بھی کرنا چاہتا ہے جس طرح کھوئی تھی، اُس نے اپنی بہن سے کھری کھری سنیں۔ یہ تو میرے ضمیر اور صاف گوئی کا تقاضا تھا۔ اور یہ مصیبتیں نہ ہوتیں تب بھی میری بچی کی فکریں کیا کم تھیں
لیکن اب سب سے بڑھ کر میرے غموں کا باعث تم ہو! میری ناؤ ڈبلی اور مخالف ہوائیں تیز ہیں! اب میرے گیسو پریشان رہتے ہیں اور انگلیاں نگینوں سے خالی! میرا لباس گھٹیا ہے اور میرے سر پر نہ تو سنہری دمک دکھاتی دیتی ہے اور نہ اس میں عربستان کی شبنم مہکتی ہے۔ میں اچھے لباس اور جواہر سے سجوں تو کس کے خوش کرنے کو؟ میرے جذبات کا دیوتا تو سمندر پار جا براجا ہے!
میرا دل اب اتنا گداز ہو گیا ہے کہ ایک کانٹا بھی مجھے ہلاک کر دینے کو کافی ہے۔ میرے جینے کی اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ زندگی بھر محبت کئے جاؤں!
میری پیدائش کے وقت بہنوں نے خیال رکھا تھا کہ میرے کرتے میں موٹا ڈورا نہ ہو۔ میری سناعت نے مجھے ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ تھیلیا[1] (Thalia) کی تعلیم میرے قلب کو متاثر کرتی ہے! پھر اگر ایک چکنے گالوں والے نوجوان کی محبت کا روز ظفر مندی مجھے گمراہ کر دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!
سحر کی دیوی! میں ڈرتی تھی کہ تو اُسے مجھ سے چھین لے گی، اور وہی ہوا!
اے آسمان کے چاند! اُس کا واسطہ جو سب کا واسطہ ہے، فاؤن کو کچی نیند میں نہ اٹھا دینا!
وینس اُسے اپنے رتھ میں بٹھا کر الوپ کر لے گئی ہے، مگر میں ڈرتی ہوں کہ کہیں مریخ اُس کی خوبروئی کو دیکھ پائے!
میٹھا برس! نہ بالکل جوان نہ بالکل لڑکا! ہاں، تیرا سن و سال تو بس ایک جوہر ہے — صرف ایک مسرت! آ! او مجسم رعنائی! میری گود میں آجا! تو محبت نہ کر، میری تو اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے محبت کرنے دے!
میں اگرچہ تمھیں خط لکھ رہی ہوں مگر آنسو ہیں کہ اُمڈے آ رہے ہیں۔ کاغذ کے یہ دھبے دیکھ لو!
لیکن اگر تمھیں جانا ہی تھا تو پیار اخلاص کے ساتھ رخصت ہوتے! یہ کہتے ہوئے جاتے کہ "لیباس والی خیر باد!"

---

[1] نو میوزوں میں سے ایک جو طربیہ کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔

میرے آنسوؤں کی اور میرے بوسوں کی تم نے قدر نہ جانی! کاش میں اُسوقت اندازہ کر سکتی کہ مجھے کیا دکھ پہونچنے والا ہے! تمھاری یاد میرے پاس تو ملامت و ندامت بن گئی ہے، مگر تمھارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو تمھیں میری یاد دلائے، حالانکہ میں تمھیں چاہتی ہوں!

میں نے تم سے کچھ نہیں چاہا ۔ کچھ نہیں، بجز اس کے کہ میری محبت کو نہ بھلانا! میرے پیارے! محبت کی قسم ۔ اور محبت خدا کرے تمھارے پاس رہے ۔ نوؤں میوزوں کی قسم، جب کسی نے کہا کہ میری تمام خوشیاں اُڑ گئیں تو میری آنکھ سے نہ تو آنسو گرا اور نہ منھ سے ایک حرف نکلا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھا ہی نہیں، میرے گلے میں آواز تھی ہی نہیں! میرا سینہ برف کی چٹان تھا! لیکن جب غم کو زبان ملی تو میں نے چھاتی پیٹ لی، بال نوچ ڈالے، اور جان گھلا دینے والے صدمے سے چیخا کی! بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کی چتا کے سامنے ایک ماں کا حال ہو!

میرا بھائی کراکس میرے غم کو دیکھ کر ہنستا ہے اور میرے صدمے کے سبب کو زیادہ شرمناک بنانے کے لئے کہتا ہے "یہ اتنا رنج کیوں کرتی ہے، اس کی بیٹی تو زندہ ہے!"

محبت اور ندامت کبھی متفق اور یکجا نہیں ہو سکتے۔ میرا مجروح سینہ لوگوں کی نگاہوں کے لئے کھلا ہوا ہے!

میرے خیالات فاؤن کے قبضے میں ہیں اور میرے خوابوں کو دن کی طرح روشن وہی بناتا ہے! فاؤن، تم گو مجھسے دور ہو مگر خوابوں میں میرے پاس رہتے ہو! مگر نیند سے جتنی خوشی مل سکتی ہے وہ بہت مختصر، نہایت قلیل ہوتی ہے! میں اکثر دیکھتی ہوں کہ میرا سر تمھارے بازو پر رکھا ہے، یا میرا سینہ تمھارا تکیہ ہے ۔ بعض دفعہ یہ اختلاط اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ میرے ہونٹ ۔ میرے سب حواس جاگ پڑتے ہیں! میں زبان در دھن تمھارے بوسہ کی لذت محسوس کرتی ہوں۔ بوسہ لینے اور بوسہ دینے، دونوں قسم کی لذت! اور پھر محبت کی رسم پوری ہوتی ہے ۔ کتنی میٹھی اور پرلذت! فاؤن! تمھارے بغیر محبت کا مزا کیا!

لیکن جب دن اپنی صورت اور سب کچھ دکھانے آجاتا ہے تو میں بڑبڑاتی ہوں کہ میرے خواب اتنی جلدی ختم ہوگئے، اور میں جنگل میں نکل جاتی ہوں۔ گویا میری مایوسی و محرومی کا علاج اس سے ہو جائے گا! کیونکہ اُس جنگل نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس کا دیکھنا سب کو خوش کر دیتا ہے! میں پاگلوں کی طرح سر کھلے وہاں پہونچتی ہوں اور کھوہ کے اندر سیاہ اور کھُردری چٹان لٹکتی دیکھتی ہوں جو اب سے پہلے مصفا مرمر معلوم ہوا کی تھی! میں اُس کنج میں جاتی ہوں جہاں ہم اکثر سوئے تھے اور جس کے جھونسرے ڈالیاں ہمارے اوپر جھکے رہتے تھے، مگر وہ کنج اب اوجڑ معلوم ہوا، کیونکہ جنگل کی رونق اور میرا آقا تو موجود ہی نہ تھا۔

وہ سبزہ زار جس پر ہم پڑے رہتے تھے، جس کے اوپر تمھارے قدموں کے نشان تھے، میں نے اُس جگہ کو

ہاتھ سے چھوا! آہ، وہ سبزہ جو کبھی اتنا پیارا تھا آج میرے آنسوں سے سینچا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی ڈالیاں آہیں بھر رہی تھیں اور چڑیوں کے چہچہے غائب تھے! بس ایک غمزدہ بلبل چیخ رہی تھی، اسلئے کہ اُس کا ـــ شوہر نہیں ـــ محبوب مارا گیا ہے! بلبل ہائے گل پکارتی ہے اور سیفو ہائے دل!

پھر رات آکر اُس کنج کو سلادیتی ہے۔ میں اُس بلوریں چشمے پر جاتی ہوں جو دیوتا کا استھان ہے اُس پر کنول کی ڈالیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں چشمے کے کنارے گھاس پر گر جاتی ہوں تو ایک نمف آکر کہتی ہے:۔

"تو اگر محبت کی آنچ نہیں سہار سکتی تو امبریسیا (Ambraecia) کے ساحل پر جا جہاں سے ڈُکمیان نے چھلانگ ماری اور پائرھا کے دل میں اُس کی محبت پیدا ہوگئی۔ ڈُکمیان کو کوئی صدمہ نہ پہونچا اور اُس کا دکھ درد مٹ گیا۔ تو بھی لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ جا اور بے خوف جست لگا۔ تیرے لئے بھی وہی ہوگا!"

یہ کہا اور وہ آواز اور آواز والی غائب ہوگئی۔ میں اُٹھی، آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو جھڑنے لگے، میں نے کہا:۔

"اچھا نمف، میں محبت کی دیوانی جاتی ہوں چوٹی پر، مجھے ہراس بھی نہیں ہے، جو مقدر! ہواؤ آؤ، میرے ہلکے پھلکے جسم کو اُٹھانے میں تمھیں تکلیف نہ ہوگی! محبت کے فرشتے! آ اور مجھے اپنے پروں پر اُٹھا لے کہ لوکیڈیا کا کنارا میری موت سے بدنام نہ ہو!

میں اپنے بربط کو جو میرے اور فیبس کے لئے مشترک فخر کا باعث تھا، فیبس پر چڑھاتی ہوں۔ میرے بربط پہ یہ شعر لکھوا دینا:۔

'یہ بربط سیفو کا نذرانہ ہے! وہ جتنا سیفو کے لئے موزوں تھا اُتنا ہی موزوں تیرے لئے ہے!"

آہ، مگر او بھاگ جانے والے تو مجھے ایکٹیم کے کنارے جانے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ تو ہی کیوں نہیں آجاتا کہ لوکیڈیا کی موجوں سے بہتر علاج تو تو ہے! تو فیبس دیوتا کی طرح گبرو اور جوانمرد ہے! اُف، تو بحری چٹانوں سے زیادہ سنگدل ہے ـــ تو میری موت سے ایک شاندار خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے!

ہمارے دونوں کے سینے متصل ہونے کی جگہ، میں لوکیڈیا کی چوٹی پر سے کود رہی ہوں! فاؤن، یہ وہی تو سینہ ہے جسے تم نے فطنت کی آگ سے معمور کیا تھا!

اے کاش میں گا سکتی! لیکن غم کی آگ نے میرے دل کو جلا ڈالا، اور میری فطنت و صناعت کو تباہ کر دیا ہے اب میرے گیتوں میں وہ ہنروری نہیں رہی، اب میرا بربط چپ ہے۔ اُس کے تار خموش ہیں۔

لیسباس کی بیاہتا اور کنواریو! ایولیا کے گیتوں میں تمھارے نام بڑے پیارے لگتے ہیں، لیکن لیسباس کی محبت میرے لئے تو رسوائی لائی! اب تم میرے گیت سننے اکٹھی نہ ہونا! وہ سب کچھ جسے تم سماوی سمجھتی تھیں۔

فاؤن کے ساتھ اُڑ گئی! میں — میرے فاؤن — کہنے والی ہی تھی! بدنصیب سیفو! جاؤ، اور اُسے بلالاؤ تو پھر میں تمھیں گیت سناؤں گی! میری فطنت کو چمکانے اور ماند کرنے والا تو فاؤن ہے!

اُف، مگر میری التجائیں کس کام کی! اُس کا دل کب پسیجتا ہے! میری التجائیں تو تیز ہواؤں کے ساتھ بہ جاتی ہیں! او گھونگے! تو ہی میری التجاؤں کو لے جاتا اور اُسے واپس بلالاتا!

ہاں، چڑھاوے کے پھل پھول تو لد چکے ہیں، تو روانہ کیوں نہیں ہوتا، اور میرے دل کو کیوں عذاب دئے جارہا ہے؟ اُٹھ، وینس دیوی محبت کرنے والوں کے لئے سمندروں کو ساکن کردیتی اور بادِ مراد چلا دیتی ہے! روانہ ہو جا، کیوپڈ تیری کشتی کا کھویا ہے، وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بادبان چڑھائے گا!

لیکن اگر تجھے سیفو سے گریز ہی ہے، تو اُس سے بے وجہ بھاگتا ہے، تو نفرت سے لکھی ہوئی ایک سطر بھیج دے تاکہ میں لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ کر قسمت آزماؤں!"

جیسا کہ اوپر کہیں بتایا گیا ہے یہ "محبت نامہ" اووڈ کا کہا جاتا ہے مگر مستند نہیں ہے۔ بہرصورت ایک ادب پارہ ہے۔ اُسے سیفو نے لکھا یا نہیں، وہ ایک پارۂ ادب ہے۔ اور اُس کو وجود میں لانے والی اگر سیفو نہیں تب بھی وہ اُسکے وجود میں آجانے کا سبب تو ہے!

سیفو کی صناعت شعری

اپنے زمانہ میں سیفو کو جذبات انسانی کے گیت گانے والی واحد مغنیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سیفو کی شاعری کو ایسا مافوق بنا دینے والے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لئے سب سے پہلے اُس کے ہمعصر شعرا اور نقادوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چھ سو سال قبل مسیح جب سیفو نے دنیا سے اپنی عظمت و عزت کا خراج وصول کیا، اُسوقت یونانی ثقافت (کلچر) کے مرکزوں میں نغماتی شاعری عجیب اور مخصوص طریق پر مقبول تھی۔ خاص کر (Lesbos) جزیرے کے لوگوں میں یہ صنف شعر عروج کمال کے آخری نقطے پر پہونچ گئی اور یونان کے ذہین مطالعے کا موضوع اور ذکی ونیوں کا محبوب ترین مشغلہ تھی۔

اِن نغمات کی مملکت، ان گیتوں کی راجدھانی مٹی لین تھا، جہاں مقدس قربان گاہوں پر، مرکے معطر کنجوں میں چشموں کی منور روانیوں پر، لاجوردی سمندر کے کناروں پر، اور رنگ و بو کے باغوں میں، حسن اور عشق کی جوان آنچ کو الفاظ میں بند کیا جاتا تھا۔ اور زمزمہ و شعر کی اِس دنیا، فصاحت و ترنم کے اِس عالم پر گیتوں کی رانی سیفو کی حکمرانی سب نے مان لی تھی۔ اُس کے حضور ان گانے والوں کا ایک مختصر دربار لگتا تھا، اُس کے ہمعصر نغمہ سرا، حتیٰ کہ الکائیس بھی سیفو ہی کا گیت گاتے تھے!

سیفو کا کمال شعر اس حقیقت میں چھپا ہے کہ سیفو کے عہد سے لیکر فنِ انتقاد کی خردہ گیری جتنی زیادہ شدید

ہوتی گئی۔ دوسری ناقابل انکار حقیقت سیفو کی صناعت کے باب میں یہ ہے کہ اُس کا سرمایۂ شعر ایک ہزار سال تک ہر وقت کی بول چال کا جزو رہا، روزمرہ کے حوالوں میں آتا رہا، استناد کے طور پر مستعمل رہا۔ خیالات بدلتے رہے، نقطۂ نظر میں فرق آتا رہا، لیکن سیفو کے اشعار میں فرسودگی پیدا نہ ہوئی، اُن کی ندرت قائم رہی، وہ اُسی طرح تازہ و شگفتہ رہے۔ فنِ شعر میں جتنی نزاکتیں پیدا کی گئیں وہ گویا سیفو کے کلام سے ہی لے کر پیش کی گئیں، کیونکہ وہ ہر زمانے کے نقد پر پورا اُترتا رہا۔ شاعر اپنا تفوق سیفو کے اتباع سے ثابت اور نقاد اپنا فن اُس کی سند سے قائم کرتے رہے۔

اسے موجودہ و آیندہ زمانوں کی خوش بختی سمجھنا چاہئے کہ سیفو کے کلام کے چند نمونے فنا کی دستبرد سے بچ رہے ورنہ اگر یہ بھی ضائع ہو جاتے تو اس عہد کا نقاد، یونان قدیم کے نقادوں کے اُن تبصروں کو سمجھ بھی نہ سکتا جو سیفو کے اشعار پر لکھے گئے۔ واٹس ڈنٹن (Watts Denton) عہد جدید کے ایک انگریز نقاد نے شعر پر ایک مقالہ لکھا ہے، اُس کی وہ چند سطریں جو سیفو سے متعلق ہیں اس جگہ نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا:-

"سیفو سے پہلے ایسے نغمے نہیں گائے گئے تھے، اور اُسکے بعد بھی انسانی روح نے جذبات کی آگ میں تپ کر ایسی آہ اور کراہ کبھی نہیں کی۔ فنی اعتبار سے بھی صفائی، سلاست اور اُس شاہانہ ایجاز کلام میں جو کسی صناع کو ملہم غیب بھی شاذ ہی سکھاتا ہے، دنیا نے سیفو کا ثانی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کوئی ایسا بھی نظر نہیں آتا جو سیفو کے مقابلہ میں دوسرا درجہ پانے کا بھی مستحق ٹھہرے!"

اس زمانے کے ایک دوسرے نقاد ہیں، اے، سائمنڈ نے (Symonds) لیسباس والوں کی اس خصوصیت کا قصیدہ پڑھا ہے کہ وہ جسمانی حسن، اور مناظر قدرت کے پرستار تھے اور پھر سیفو کے کلام کی خصوصیتوں کو اُجاگر کیا ہے اُس نے سیفو کی بعض تشبیہات بھی پیش کی ہیں، مثلاً:-

چاند کو "آہستہ الجمال وینس کی پجارن[1]" کہا ہے۔

دوسری جگہ چاند کو "آسمانوں کی دلفریب حکمراں" کہا ہے۔

ایک اور مقام پر چاند کو "گلابی اُنگلیوں والی" اور قربانگاہ پر رقص پرستش کو منور بنانے والی" کہا ہے۔

نورِ سحر کو "سنہری چپلوں والی" کہا ہے۔

نخلستان کو "سیب کی شاخوں میں بہنے والے چشمے کے راگ نائم وغنودہ" بتایا ہے۔

لونگ میں "شہد کی مہک" سونگھی ہے۔

"پھولتی جوانیوں سے ہار گندھوائے" ہیں۔

---

[1] یونانی زبان میں چاند کے لئے جو لفظ مستعمل ہے وہ گرامر (صرف۔ نحو) کے لحاظ سے مونث ہے۔ (ادارہ)

رات کو "بہت سے کانوں والی" کہا ہے

زمین کو "بے گنتی پھول مالاؤں سے سجی ہوئی" کہا ہے۔

قمری کے مجسمے کے پروں کو "موت کی خنکی سے نڈھال" دکھایا ہے۔

جھینگے کی آواز کو "گرمی موسم کو مسحور کرنے کا منتر" کہا ہے۔

جو سمار میں ماری پھرتی چڑیا کے حسن کو سراہا ہے۔

بلبل کو "سروش بہار" کہا ہے۔

سیب کی رنگت کو "میٹھا انفعال کہکر اُسے گل داؤدی سے متقابل کیا ہے

اپنی شاعری کے تار و پود کو "نیفون (Nymphs) کے باغ کی آرائش" کہا ہے۔

ایک نوعروس اور اُس کی دوشیزگی کا مکالمہ لکھا ہے۔

یونان قدیم کے اکثر نقادوں نے سیفو پر تبصرے لکھے لیکن بجز تعریف و توصیف اور کچھ نہ لکھ سکے۔ ان قدیم تبصرہ نگاروں کی توصیف اس لئے زیادہ وزن دار ہے کہ وہ اپنے ادب کی روایات اور اپنی زبان کی نزاکتوں سے زیادہ واقف تھے۔

سیفو کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن کی فنی خوبی اور طرز بیان کا حسن پہچاننا تو ہمارے لئے ممکن نہیں، تاہم خیالات و جذبات سے پورے طور پر ہم شرابور ہو سکتے ہیں!

وینس[1] دیوی کی شان میں :-

مزین تخت پر بیٹھنے والی لازوال سائپرس! خداوند جیو پیٹر کی بیٹی! تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ میری روح کو بھی غموں سے نجات دے! کہتے ہیں پچھلے زمانے میں تو اپنے باپ کے سادی محل سے نکل آتی تھی! یہ اگر سچ ہے تو سمادی ملکہ! میری التجاؤں پر بھی رحم فرما! اور اپنے سنہری رتھ کو ایک بار پھر کہکشاں کی سڑک پر دوڑا دے! تیری محبوب قمریوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے تاریک دنیا کی ہوائیں پھر ایک دفعہ پاکیزہ بن جائیں!

مقدس دیوی! میں ایک آواز سن رہی ہوں! کیا یہ تیرے غیر فانی ہونٹوں کی صدا ہے؟ کیا تیرا جلوہ و جمال کی کرنیں پھیلا دینے والا چہرہ مجھ سے میرے غم کا حال پوچھ رہا ہے؟

دیوی! میری محبت کی دیوانی روح تجھ سے اور کچھ طلب نہیں کرتی، بس یہ سننا چاہتی ہو کہ جو دوشیزہ سیفو

[1] ڈایانیسیاس نے اسی نظم پر تبصرہ کیا ہے۔

کے رنج والم کا باعث ہے وہ سیفو کے پہلو سے آلگے گی! اگر تحفے لینے سے نفرت ہے تو تحفے دینے پر ناز کرے گی وہ اگر شرمیلی اور بوسے سے گریز کرتی ہے تو خود بوسے دینے لگے گی!

ملکہ، ایک دفعہ اور آجا، اور اپنی اس بچارن کو غم کے پنجے سے چھڑا دے! اور میری کشت آرزو کو سرسبز بنادے! آ، اور مجھ پر ہمیشہ مہربانی فرما۔ میری دوست بن جا!

مجبوب لڑکی کے نام[1]:۔

وہ جسے تو اپنا مہمان بنالے، جو تیرے روبرو ہو، قریب بیٹھکر تیری میٹھی میٹھی باتیں سننے میں محو ہوسکے، تیری ہنسی کے نشے سے مست ہوسکے، دیوتاؤں کا ہم سر ہے!

مگر یہی منظر میرے پہلو میں میرے دل کو لرزا دیتا ہے! میں تیری صورت پر نظر ڈالتی ہوں تو گونگی ہو جاتی ہوں، منہ سے بات نہیں نکلتی! اُس گھڑی ایک شعلہ بھڑک کر میری ہستی پر چھاجاتا ہے۔ میری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، میرے کان سن نہیں سکتے، میرے اعضا میں بار بار ایک تھرتھری دوڑ جاتی ہے، میرے ماتھے پر پسینے کی شبنم افشاں ہوجاتی ہے، میرا رنگ اُڑجاتا اور میں سفید پڑجاتی ہوں، میں دیوانی ہوجاتی ہوں، نزع کی طرح میرا دم گھٹنے لگتا ہے!

ایک مجسمۂ شباب و رعنائی جوان کو دیکھ کر کہتی ہے:۔

"حسین دوست! سامنے آ، میری طرف دیکھ، اور اپنی آنکھوں میں مستور رعنائی کو عریاں کردے!"

ایک پارے میں اپنے اظہار احساس کے ساتھ انسانی فطرت پر طنز بھی کرجاتی ہے:۔

"وہ مجھے زیادہ دکھ پہونچاتے ہیں جن کے ساتھ میں اچھا برتاؤ کرتی ہوں!"

اپنی میوز (سروش غیبی) کو مخاطب کرنے میں لطیف تعلّی بھی ہے:۔

"میری بنفشہ کی بننے والی میوز! میں تجھسے اپنا جائز حصہ مانگتی ہوں!"

حسن صورت اور حسن سیرت کی تصریح کرتی ہے:۔

"جو حسین ہے، وہ دیکھنے ہی کا حسین ہے، جو نیک ہے وہ حسین پہلے ہے!"

اپنے شاعرانہ احساس کو اس طرح بیان کرتی ہے:۔

"ساحل پر بکھرے ہوئے بلور کے ٹکڑوں کو چھیڑو مت، یوں ہی پڑا رہنے دو!"

حقیقت کی عقدہ کشائی کرتی ہے:۔

"مجھے وہ شہد نہیں چاہئے جس کے اندر مہال ہے!"

---

[1] اِسی نظم پر لاطینی نقاد لانگینس نے بحث کی ہے۔

جذبات کا نغمہ اِس طرح سناتی ہے :-

"چاند اور ثریا اپنی اپنی جگہ قایم ہو چکے ہیں،

آدھی رات آچکی ہے، وقت جارہا ہے،

چلا جارہا ہے، اور میں اکیلی پڑی ہوں!"

ایک شاعرانہ احساس سناتی ہے :-

"نیچے، سیب کی ڈالیوں کو چومتا، پانی بہہ رہا ہے،

اوپر کی پتیاں سرسرا کر گہری نیند بہا رہی ہیں!"

ایک دوسرا :- "قربان گاہ کے گرد کنواریاں کھڑی ہوگئیں،

اُن پر، چودھویں کی چاندنی چھٹک رہی تھی!"

فطرت محبت اور جذبات کے طوفان کو ایک لفظ میں بند کرلیتی ہے :-

"حسین دوشیزہ جب محبت کرتی ہے،

تو بہت سے ہار گوندھ ڈالتی ہے!"

شباب اور عشق کی تصویر کھینچتی ہے :-

"آ، وینس، آ، اور

ان اپنے اور میرے دوستوں کے لئے، طلائی کوزوں کو

محبت کی شراب اور لذتوں سے بھر دے!"

ایک "شادیانے" میں جذبات کو اس طرح گاتی ہے :-

"نئی دلہن، جس کے سینے میں گلابی محبت کا گھر ہے،

اے پافوس کی طرح سندر دلہن!

سہاگ پلنگ طیار ہے،

جا، اُس سے مل اور،

اختلاط کی مٹھاس میں شریک ہوجا،

روشن زہرہ کی کرنیں ہیرا دیوی کی روپہلی چوکی

کو حیران تمناؤں ...... دیکھتے ہوئے،

تیرے دل میں اُسے (شوہر کو) مسند نشین کردیں گی!"

شام کے منظر کی کیفیات کو کس نزاکتِ تخئیل سے پیش کرتی ہے :-

"صبح کی چمک نے جن چیزوں کو دور بھگا دیا تھا،
زہرہ (شام کا ستارہ) تو اُن کو گھر بلا رہی ہے،
تو بھیڑوں اور بچوں کو اس طرح بلا رہی ہے،
جیسے بچوں کو ماں سینے سے لپٹانے کو بلاتی ہے !"

اپنی حسرت کو کتنا حسین بنا دیتی ہے :-

"کیا میں ابھی کنوارپنے کی آرزو رکھتی ہوں !"

آرزوؤں کی نارسائی کا حسین ترین استعارہ ہے :-

"اے دوشیزہ ! تو اُس شیریں اور سرخ سیب کی مانند ہے
جو سب سے اونچی ڈالی میں،
باغباں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے —
نہیں، چھپا ہوا نہیں بلکہ اُسے ترسا رہا ہے !"

نوعروس اور اُس کی دوشیزگی میں مکالمہ کراتی ہے :-

نوعروس :- تو کہاں گئی، کہاں چلی گئی، میری دوشیزگی ؟

دوشیزگی :- نوجوان لڑکی، اب میں تیری نہیں ہو سکتی، میرا جانا تو ایک صبح کی خوش آمد ہے !"

کیفیات شباب کی تصویر یوں بناتی ہے :-

"اور اُن کے بھاری پپوٹوں پر،
رات کی تاریک نیند پڑی لوٹ رہی ہے !"

ایک گل اندام کی تعریف کرتی ہے :-

"دودھ سے زیادہ سفید،
ریشم سے زیادہ نرم،
گلاب سے زیادہ نازک،
رباب سے زیادہ مترنم،
نرگس سے زیادہ لوچدار،
اور سونے سے بہتر سونا !"

ل - احمد (اکبرآبادی)

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

جولائی سنہ ۴۸ء کے نگار میں نیاز صاحب نے مندرجۂ بالا عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، تقریباً وہ صحیح ہے اور مسلمانوں میں ہر نکتہ سنج و دقیقہ رس کے روبرو قرآن کا یہی آئڈیا ہے۔ لیکن مسلم عوام کے خوف کی وجہ سے کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا اظہار کرکے توہم پرستی کو دور کرنے میں مدد دے۔ اگر نیاز صاحب کی یہ صاف بیانی اپنی ذاتی تشہیر سے پاک ہے اور صرف مسلم قوم کی اصلاح کے لئے ہے تو سب سے پہلے میں اس جرأت کی داد دیتا ہوں۔ اگرچہ اس موقع پر داد دینا بھی مقدس گروہ کے نزدیک کفر میں داخل ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک قوم میں ایسے جری اور صاف گو نہ ہوں گے، مسلمان کبھی شاہراہِ اسلام پر نہیں آسکتے، بلکہ ہمیشہ کفر و اسلام کی بحث اور رسم پرستی میں پڑے رہیں گے۔

آج سے چند صدی پیشتر یورپ کی توہم پرستی کا بھی یہی عالم تھا جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے لیکن جب وہاں کے چند علم دوست دلیروں نے عیسائی مذہب کے باب میں صاف بیانی سے کام لیا اور خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی تو مذہبی جماعت میں ہل چل مچ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا اقتدار خطرہ میں ہے تو فلاسفہ کی جماعت اور ان کے ہمنواؤں سے چن چن کر بدلا لینا شروع کر دیا اور چونکہ حکومت کی باگ ڈور نام نہاد مذہبی جماعت کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس کے نزدیک جو بد اعتقاد ہوتا اُس کو سزا دی جاتی۔ اس مذہبی جماعت نے اپنے خلاف اعتقاد جماعت کو ایسی سخت و شدید سزائیں دینا شروع کیں کہ انسانوں کا خون کھولنے لگا اور بے رحمی و سنگدلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عیسائی مذہب اور پادریوں سے بددل ہونے لگے، تاہم مظالم میں کمی نہ ہوئی۔ چنانچہ پیہم شداید و مصائب اور ظلم و عدوان کے باعث رفتہ رفتہ لوگ مذہبی جماعت سے منحرف و متنفر ہونے لگے، یہاں تک کہ توہم پرستی سے آزاد ہوکر آج تمام یورپ تمام دنیا پر قابض ہے۔ اب میں اصل موضوع کو لیتا ہوں۔

ہمارے مقدس گروہ نے خدا کا آئیڈیا جس طرح پر مسلمانوں کے روبرو پیش کیا اس نے خدا کے تصور میں تجسیمیت پیدا کر دی جس سے عوام توہم پرست ہوگئے اور مایل بہ زوال — حالانکہ خدا نہ کوئی جسمانی کیفیت رکھتا ہے اور نہ مثل انسانوں کے جذبات سے لبریز ہے۔ خدا کا بہترین تصور قل ہو اللہ احد نے پیش کیا ہے جس میں کسی اضافہ

کی ضرورت نہیں۔

خدا کی ہستی اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لئے اول تو سورۂ اخلاص کافی ہے۔ دوسرے "کُلٌّ فی فلکٍ یسبحون" کے اعلان سے عملی قوت کو سمجھنا چاہئے۔ کائنات میں کوئی چیز، کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ ایسا نہیں جو سرگرم عمل نہ ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرے جن کو سائنس کی اصطلاح میں (Electron) اور (Proton) کہتے ہیں اور جو انسانی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اپنے بڑے ذروں کے گرد ہر وقت و ہر لمحہ گردش کرتے رہتے ہیں انسان کی لاش جو ایک مدت سے مدفون ہے یا نذر آب و آتش کر دی گئی ہے، اس کے ذرے بھی بے عمل نہیں۔ ایک آہنی صندوق اور فولادی ظرف کے ذرات بھی ہر وقت عمل کرتے رہتے ہیں۔ عمل کے متعلق کرشن مہاراج کا قول ہے کہ جس قوت کا نام عمل ہے، وہی خدا ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ پوشیدہ قوت جو ہر چیز سے عمل کراتی ہے خدا ہے۔ جس طرح روح نظر نہیں آتی، لیکن ہے۔ اسی طرح خدا نظر نہیں آتا، لیکن ہے ضرور۔ پس روح یا جوہر روح برق یا جوہر برق۔ اور حیات یا جوہر حیات جس قوت نے پیدا کی ہے وہی خدا ہے۔ وہی حیّ و قیوم ہے اور مذہب کی زبان میں وہی ربّ العالمین ہے، جو حسب استعداد سب کو روحانی و جسمانی غذا پہونچاتا رہتا ہے۔

اس کے بعد وحی، الہام اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ایک میخوار جو سیہ مستی کی حالت میں بات کرتا ہے، کیا تم اسکے کھلے سنکر نہیں کہتے کہ یہ پینے والا نہیں بول رہا ہے بلکہ کوئی اور ہے؟ حالانکہ نشہ کی حالت میں جس قدر الفاظ آواز کے ساتھ نکلتے ہیں وہ تمام شرابی کے حلق و زبان سے ادا ہوتے ہیں، لیکن تم اس پر یقین نہیں کرتے، مگر جب وہ ہوش میں بات کرتا ہے تو کہتے ہو کہ یہ بولنے والیکا کلام ہے جو اسی کے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے بالکل یہی مثال وحی کی ہے کہ بانیٔ اسلام جس وقت جذب و کیف کی حالت میں بولتے تھے تو اگرچہ الفاظ آپ ہی کی زبان و حلق سے نکلے ہوئے ہوتے تھے لیکن محرک وہ قوت ہوتی تھی جو نشۂ توحید سے لبریز ہوتی۔

بانیٔ اسلام نے خدا کی ہستی کا تصور کیا، اور رفتہ رفتہ کشف و مجاہدے کے ذریعہ، انہماک و محویت کے ذریعہ جب حقیقت کو پالیا تو آپ کا شعور اس قدر کامل ہو گیا کہ کائنات کے تمام راز آپ پر روشن ہو گئے۔ تصور بہ تجرد اور عالم محویت میں آپ اس درجہ سریع الحس و ذکی الفہم ہو جاتے تھے کہ اپنی ذات کا اور اپنے وجود پاک کا احساس تک باقی نہیں رہتا تھا، بجز اس قوت لازوال کے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ایسی حالت میں جو بات، جو کلام، اور جو اشارہ، یعنی جو الفاظ اور فقرے آپ کی زبان مبارک سے نکلتے تھے وہ اسی قوت و فطرت کے قانون کے مطابق ہوتے تھے جس کی تحقیق و جستجو میں آپ مستغرق ہوتے۔ اسی نوع کے کلام کو مسلمان الہام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اور اسی کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔

آپ نے حضرت علیؓ کا یہ تاریخی واقعہ سنا ہوگا کہ جب دشمن کا تیر آپ کے پاؤں میں چھد گیا اور جب ہوش کی

حالت میں اس کو نکالنا چاہا تو آپ کو سخت و شدید تکلیف ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جب میں نماز کی نیت باندھ لوں تب اس تیر کو نکال لیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوئی۔ اگر اس تاریخی واقعہ کو غلط سمجھا جائے تو اس کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں، لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ تصور و انہماک کی قوت کوئی معمولی قوت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

لیکن رسول میں یہ قوت بدرجۂ اتم موجود تھی، اور جس وقت آپ گردن ڈال کر غرق تصور ہوتے تھے اور آپ کا ضمیر اس قوتِ لازوال و بے نیاز کی طرف رجوع ہوتا تھا، جس کو عرفِ عام میں خدا کہتے ہیں، تو آپ کی آنکھیں ہر چیز کو زندگی سے لبریز اور عمل سے معمور پاتی تھیں اس لئے آپ مسلمانوں کو بلکہ عام انسانوں کو عمل و انسانیت کا سبق دیا کرتے اس دلکش آواز پر لوگ کھنچے، لبیک کہتے اور آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے۔ یہی وہ خاموش تکلم تھا جو رسول پر نازل ہوتا تھا، اور جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔

رہا جبرئیل فرشتہ کا رسول پر پیغامِ الٰہی کا لانا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ قوت جس کے ذریعہ وحی آتی تھی، اس قوت کو ہم جبرئیل کے نام سے پکارتے ہیں اور اسی قوت کا نام قرآن کی زبان میں جبرئیل ہے۔ ورنہ فرشتوں کے وجود کا یہ تخیل جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے، ایک استعارے سے زیادہ کچھ نہیں۔

اراھم۔ اکبرآبادی

نوٹ:- اگر الہام علاوہ رسول کے دوسری چیزوں پر بھی ہوتا تھا، جیسا کہ نیاز صاحب نے قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا اور نہ اس سے مسلمانوں کے عقیدے میں کمزوری آنا چاہئے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے الہام نے انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچایا، لیکن رسول کے الہام نے وہ فیض پہونچایا کہ آدمی کو انسانیت و عمل کی دعوت دیکر ممتاز کر دیا۔

اراھم

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچے کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲ نئے پیسے فی پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی ۔ ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیجر نگار

نیاز کی آزاد خیالی

زندگی عبارت ہے حرکت سے اور شعر و ادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطہ پر قایم رہ سکنا محال ہے، شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اصول ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں بھی ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونا لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے ماحول کا آلۂ کار نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کر کے اپنی راہ الگ بناتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے لئے دلیل راہ بنجاتے ہیں چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد کی سطح سے بلند ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاصر اور معاشران کو سمجھ نہیں سکتے اور ود مردود کر دئے جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آجاتا ہے جب ان کے فضل و کمال کی قدر کی جاتی ہے اور انکی پرستش ہونے لگتی ہے، یہی زمانہ آزادی کا حقیقی عہد ہوتا ہے اور ایسے ہی نفوس کے لئے ڈاکٹر جونسن لکھتا ہے:۔

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کثرت زبان کو اسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت و حالت میں کہ زبان ان کے سامنے آتی ہے اس کے برعکس ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصد و ارادہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کے دماغ میں غیر معمولی متنوع جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے احساس و خیال میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے، اس کے تصورات عمیق ہوتے ہیں، زندگی و آداب زندگی کے متعلق اسکی رائے تقلیدی نہیں ہوتی۔ تاریخ کے باب میں اس کا فیصلہ خود اسی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ و زبان میں ایک مخصوص انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کا یہ اظہار خیال چونکہ اس کے ذہنی [illegible] کا عکس ہوتا ہے اس لئے وہ کثیر الاشکال ہوتا ہے اور اس کے لئے جو زبان وہ اختیار کرتا ہے اس میں ندرت، لطافت و حلاوت کا بیک وقت نہایت دلچسپ امتزاج پایا جاتا ہے۔"

کیا جونسن کی یہ تعریف غالب دہلوی اور نظیر اکبرآبادی پر صادق نہیں آتی؟ عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں یہی دو ہستیاں تھیں جنھوں نے تمام مسلک کو ترک کر کے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے انکے زمانہ میں ان کی قدر ہونا ناممکن تھا اگر ہوتی بھی تھی تو بالکل غلط بنیاد پر لیکن ان کی عزت کا عہد بھی آگیا چنانچہ آج

ارباب کمال نے ان دونوں ہستیوں پر خصوصاً غالب پر اس قدر لکھا کہ کوئی پہلو لکھنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ یہی حالت آج جناب نیاز فتحپوری کی ہے، جناب نیاز جس بنا پر آج ننگ اسلاف تصور کئے جاتے ہیں وہ موصوف کی آزاد خیالی ہے اور یہی جوہر ان کے لئے باعث بدنامی ہے، جناب نیاز اگرچہ سماجی قوانین کے شکنجہ میں کسے ہوئے ہیں لیکن اپنے رجحان آزادی کے مقابلہ میں کبھی سماج سے مرعوب نہیں ہوتے اور علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جناب نیاز کا طرز نگارش نہ تفاخرانہ ہے نہ ذریعۂ معاش جس کا ثبوت ان کی داخلی و خارجی زندگی ہے یعنی ان کے جذبات وحسیات اور فعل و عمل میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

نیاز کا الحاد و ارتداد

جناب نیاز کے الحاد کے متعلق اظہار خیال سے پہلے ملحدی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ جہاں تک نفس اختلاف و اعتراض کا تعلق ہے سوائے اسلام میں بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں، جنھوں نے جمہور علماء سے کھلم کھلا اختلاف کیا ہے۔ ابن راوندی، صالح ابن قدوس، یعقوب ابن یوسف، فارابی ابن سینا، ابن رشد سے لیکر، امام رازی، غزالی، طوسی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم تک سب نے خوف وہراس کو بالائے طاق رکھکر بہت سے مسایل میں جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن قیم اور علامہ ابن تیمیہ نے فنائے نار کے مسئلہ میں جو عقاید کا بہت زبردست مسئلہ ہے علانیہ اپنی ذاتی رائے کو جمہور کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، جس کے موید جناب مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب علمار کرام کہتے ہیں تو اعتراض نہیں ہوتا اور جب نیاز وہی بات کہتے ہیں جو قدما کہہ گئے ہیں تو ہدف ملامت بنائے جاتے ہیں۔ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ "الحاد" کا لفظ بہت ہی محدود معنی میں نیاز صاحب کے مضامین پر مستعمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تقلید ترک کر کے خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں اسے پوری بیباکی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب علامہ نیاز بھی وہی لکھتے ہیں جو ہمارے بعض دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں تو ان کے قول کو کیوں بنظر استحقار دیکھا جاتا ہے۔

مثلاً ہندوستان کی آزادی و ترقی کے لئے "نیشلزم" پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جد وجہد مذہب کا آلہ کار ہے چنانچہ بعینہ یہی چیز ہمارے فاضل اجل علامہ عبد اللہ سندھی فرماتے ہیں لیکن ہمارے علمار کرام کچھ نہیں کہتے، حالانکہ انکے نزدیک سیاست سے مذہب کی علحدگی بیدینی و ملحدی ہے۔

نیاز صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کا تعلق چند متعین رسوم و قیود سے نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ غیر مذہب کے عقلاء کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اس طرح ہندوستان کے تمام مذاہب کسی ایک مرکز پر پہونچ کر اشتراک عمل پیدا کر سکیں، لیکن عبد الماجد دریا بادی کے قسم کے مذہبی لوگ اسے کفر و الحاد بتاتے ہیں۔ حال ہی میں قرآن کے کلام ربانی ہونے کے متعلق جو مقالہ جناب نیاز کا جولائی کے نگار میں شایع ہوا ہے اور

جس کی بنا پر عبدالماجد صاحب نے ان کو ابوجہل کا لقب عطا کیا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، لیکن اگر اس میں واقعی کوئی غلطی ہے، تو انسانوں کی زبان میں بغیر کسی برہمی کے اس پر اظہار خیال کرنا چاہیئے۔

"آتش نمرود" کے واقعہ کو بھی جناب نیاز تاریخی واقعہ نہیں بتاتے بلکہ "اساطیر الاولین" میں شمار کرتے ہیں اگر عبدالماجد صاحب یا ان کی طرح دوسرے حامیان مذہب کے نزدیک جناب نیاز کے دلایل غلط ہیں تو ان کا جواب دینا چاہیئے، نہ یہ کہ گالیوں پر اتر آئیں، دنیا کا کوئی مذہب دوسروں کو برا بھلا کہکر کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

ہمارے علمار مذہب یا جمہور کی طرف سے ایسی غیر مہذب و ناشایستہ ذہنیت کا اظہار بجائے اس کے کہ لوگوں کو مذہب کی طرف سے مطمئن کرے، اور غیر مطمئن بنا دینے والا ہے، کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ علما مذہب کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ان کا تنہا حربہ "کافر و ملحد" کہہ دینا ہے۔

جناب نیاز جب تک خدا کی وحدانیت اور رسالت رسول کے قایل ہیں (خواہ وہ رسالت کا مفہوم کچھ قرار دیں) دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ انھیں ملحد یا مرتد کہہ سکے۔

جس طرح عبدالماجد وغیرہ کو اپنی بنائے فکر و تدبر کا حق حاصل ہے، نیاز کو بھی حاصل ہے اور انھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے علماء کی تقلید کریں۔ اگر علما اپنی جگہ اسلام کی خدمت اس بات میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کو "مجموعہ رد و نگارش" بنا کر پیش کریں تو جناب "نیاز" بھی اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کی خدمت اس کو قرار دیتے ہیں کہ وہ "قابل فہم و عقل" چیز قرار پاسکے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے علمائے کرام الحاد و بیدینی کی اشاعت پر ماتم کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی مجرم حقیقتاً خود انھیں کی ذات ہے، جو اس "دور علم و عقل" میں بھی مذہب کو "مزخرفات" کا مجموعہ بنائے ہوئے ہے۔ دنیا کا کوئی ادارہ اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے اور یقیناً مذہب بھی زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔

محمد عبدالشکور فکر ندوی

باب الاستفسار

لوح محفوظ

اور

عذاب و ثواب

(جناب صفی مظہر صاحب ۔ محلہ جوڑن شہید ۔ غازی پور)

نگار ماہ جون سنہ ۴۳ء و جولائی سنہ ۴۳ء میری نگاہ سے گزرے ۔ حسب ذیل سوالات بغرض رفع شک پیش کرتا ہوں امید ہے ان کا جواب نگار ماہ اگست میں شایع فرمائیں گے ممنون ہوں گا ۔

۱ ــ آپ کو تسلیم ہے کہ انبیاء جھوٹے یا مکار نہیں تھے اور ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا (نگار جولائی سنہ ۴۳ء صفحہ ۵ سطر آخری) تو آیت "بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ" کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں ؟

۲ ــ اگر کوئی حقیقت ہے مگر وہ نہیں جو مسلمان ظاہر کرتے ہیں تو آپ خود ہی اظہار حقیقت فرمائیے ۔

۳ ــ اگر آیت بالا میں کوئی حقیقت نہیں اور قرآن مجید کا لوح محفوظ سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ یوں کہئے کہ لوح محفوظ کوئی چیز ہی نہیں تو پھر کوئی ایسی صورت بتائیے جس سے جناب رسالتمآب کا سچا ہونا ۔ ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہونا باور کیا جاسکے ۔

۴ ــ اگر آیت مذکورہ مسلمانوں کی اختراع ہے تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے اور کیا آپ کوئی ایسا معیار بتا سکتے ہیں جس پر پرکھنے کے بعد ہم کہہ سکیں کہ فلاں آیت قرآن کی ہے اور فلاں نہیں ۔

۵ ــ آپ قرآن مجید کو لوح محفوظ میں درج ہونا ایک مستعار عقیدہ جانتے ہیں اور اس کی دلیل میں یہود و نصاریٰ کے اعتقادات متعلق توریت و انجیل پیش کرتے ہیں تو کیا یہ کلیہ ہو سکتا ہے کہ اگر دو روایتیں ایک دوسری سی ملتی ہیں اور انہیں سے ایک غلط ہو تو دوسری بھی غلط ہوگی ۔ اگر ایسا ہی ہے تو مثال مندرجۂ ذیل میں آپ کیا کہیں گے ۔

" دو شخص کسی کے یہاں ملازم ہیں ۔ مالک انصاف پسند ہے ۔ ایک ملازم چھٹی کی غرض سے بیجا عذر پیش کرتا ہے ۔ مالک کے

پاس آکر درد کی شکایت کرکے زمین پر پچھاڑیں کھانے لگتا ہے ۔ مالک تسکین درد کے لئے حکیم حاذق کو طلب کرتا ہے حکیم اپنی حذاقت کی بنا پر اس مریض کو واقعی مریض نہیں قرار دیتا چنانچہ مالک اس مریض کو لعنت ملامت کرکے ٹھکرا دیتا ہے کچھ دن کے بعد دوسرا ملازم بالکل اسی بیماری کا شکار ہوکر مالک کے پاس آتا ہے اور رخصت کی استدعا پیش کرتا ہے کیا مالک واقعہ سابقہ کی بنا پر اس شخص کے عذرات کو بھی لائق التفات تصور نہ کرے اور تصدیق حال نہ کرے ؟

۲ ۔ اگر آپ آخرت کے عذاب وثواب کو بے حقیقت تصور فرماتے ہیں تو آیت " وماکان لنفس ان تموت الا باذن اللّٰہ کتابا موجلا ۔ ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرہ نوتہ منہا وسنجزی الشاکرین " کے معنی اس عنوان سے بیان فرمائیں کہ رسول کی صادق الکلامی بھی بحال رہے اور عقیدۂ ثواب وعذاب بھی مسترد ہوجائے؟

(**نگار**) آپ کے استفسار کا مدعا تمام حشو و زواید کو نکال کر یہ قرار پاتا ہے کہ میں " لوح محفوظ " کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آخرت کے عذاب وثواب پر (آپ کی پیش کردہ آیت کو پیش نظر رکھکر) بحث کروں ۔

میں نے جون اور جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے کلام خداوندی کے ہونیکے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر جس معنی میں قرآن مجید کو خدا کا کلام سمجھا جاتا ہے وہ میرے نزدیک درست نہیں ہے ۔ یعنی یہ عقیدہ کہ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ خدا نے رسول اللہ پر اس طرح نازل کیا ہے جس طرح کوئی مادی چیز کسی کو دیجاتی ہے، میرے لئے قابل قبول نہیں اور اس سلسلہ میں میں نے وحی سے بحث کی تھی تاکہ وہ لوگ جو قرآن کو محض اس دلیل پر " منطوق ربانی " کہتے ہیں کہ اسے " وحی یوحیٰ " کہا گیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن مجید کو وحی کا نتیجہ سمجھنا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے ' خدا کا کلام ' سمجھا جائے ۔

وحی والہام کا لفظ کلام مجید میں ہر جگہ فطری ذہانت وافتاد یا طبعی صلاحیت کے معنے میں مستعمل ہوا ہے اور اس لئے قرآن کا " وحی یوحیٰ " ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے اس غیر معمولی فطری استعلا یا دماغی تفوق کا نتیجہ ہے جو خدا نے ان میں ودیعت کر دیا تھا اور جس کی بنا پر استعارتاً کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ کا قول گویا عین خدا کا ارشاد ہے ــــ کلام مجید کو " کلام ربانی " کہنے کی سب سے بڑی روایتی دلیل یہی تھی اور اسی کو میں نے پیش کر دیا تھا ۔ دوسری دلیلوں سے میں نے اس لئے بحث نہیں کی کہ وہ اس سے زیادہ کمزور ہیں ۔ تاہم چونکہ ذکر آگیا ہے اس لئے ان کمزور دلیلوں میں سب سے قوی دلیل کی حقیقت بھی معلوم کر لیجئے ۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کا جواب کسی انسان سے ممکن نہیں، اس لئے وہ خدا کا کلام ہے ۔ اس سلسلہ میں جو آیات پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں :-

سورۂ بقر :- " ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ "

(جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تمھیں شک ہے تو اس کے مثل ایک سورۃ ہی پیش کر دو)

سورۂ یونس:۔ ام یقولون افتراہ۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

(کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن رسول نے بنایا ہے؟ اگر وہ سچے ہیں تو ایسی ہی ایک سورت بنالائیں اور خدا کے علاوہ جس کی مدد چاہیں وہ بھی حاصل کرلیں)

سورۂ ہود میں بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں لیکن یہاں بجائے ایک سورۃ کے دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے

ام یقولون افتراہ؟ قل فاتوا بعشر سورۃ مثلہ

سورۂ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا مطالبہ ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تمام دُنیا کے انس وجن شریک ہوں تو بھی ایسا ہونا ممکن نہیں:۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثلہ ہذا القرآن لا یاتون بمثلہ

آپ نے دیکھا کہ ایک جگہ پورے قرآن کے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے، دوسری جگہ دس سورتوں کا اور تیسری جگہ صرف ایک سورت کا۔ اگر آپ ظاہر معنی لیں گے تو ان آیات میں معنوی تعارض پیدا ہو جائے گا اور بحث یہ آن پڑے گی کہ کیا پورے قرآن سے کم، یا دس سورتوں یا ایک سورۃ سے کم کا جواب ممکن ہے۔

ان آیات کو پڑھکر ایک یا دس یا پورے کی بحث کرنا حماقت ہے۔ مفہوم وہی ایک ہے کہ بہ حیثیت مجموعی قرآن جس چیز کا نام ہے اس کا جواب پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ لیکن اس دعوے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن کا جواب اس لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ کیونکہ قرآن میں شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو رسول اللہ سے پہلے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو۔ قرآن کے تمام الفاظ اور قرآن کا اندازِ تحریر پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن قرآن کوئی نہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو "خدا کا کلام" یا "معجزہ" کہنا اس بناء پر نہ تھا کہ اس کے الفاظ میں کوئی خاص بات ہے، بلکہ اس حیثیت سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ جو راہِ عمل قرآن نے دکھائی ہے یا جو درس اخلاق و ترقی اس نے پیش کیا ہے، اس میں اُصولاً کسی اضافہ کی گنجایش نہیں۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (ام یقولون افتراہ؟) لیکن اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ قرآن میں کہا ہے وہ ہوائی باتیں نہیں ہیں (ما ینطق عن الہویٰ) بلکہ وہ نتیجہ ہے وحی یا اس تائیدِ غیبی کا جو مخصوص ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

اب الفاظ "لوحِ محفوظ" کو لیجئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن پہلے سے کسی تختی میں منقوش تھا

حالانکہ اسے عقل انسانی باور نہیں کرسکتی کہ خدا نے کسی مادی تختی پر کسی کاتب یا نقاش کی طرح قرآن کو پہلے لکھ لیا ہو اور پھر اسے رسول پر نازل کیا ہو، اس عقیدہ کے تحت خدا اور اس کے انتظام کو یکسر "مادیات" سے متعلق کرنا پڑیگا اور شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو خدا یا اس کے احکام کا تصور مادی چیزوں کی طرح جائز سمجھتا ہو۔

آپ نے غور نہیں کیا کہ لفظ لوح، بغیر الف لام کے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر واقعی کوئی مخصوص تختی مراد ہوتی تو بجائے لوح کے اللوح (الف لام کے ساتھ) استعمال کیا جاتا۔ اس لئے میری رائے میں قرآن مجید کا لوح محفوظ میں منقوش ہونا بالکل وہی معنی رکھتا ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ فلاں بات "پتھر کی لکیر" ہے اور اس سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے۔

اگر آپ "لوحِ محفوظ" کے معنی وہی لیتے ہیں جو عام تختی کے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ "ید اللہ فوق ایدیھم" میں ید کے معنے ہاتھ کے نہ لیں لیکن اگر یہاں ید کے معنی قدرت کے لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوح میں محفوظ ہونے کے معنے "ایک مضبوط و اٹل قانون" نہ سمجھے جائیں۔ علاوہ اس کے اگر آپ نے لوح کے معنی وہی قرار دئے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو پھر اس عقیدہ کی صحت میں کیا کلام ہوسکتا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس میں اتنی ہی پتیاں ہیں جتنے انسان اور ہر پتی پر ایک انسان کی پیدایش و وفات کی تاریخ اور قسمت کی کیفیت درج ہے جب انسان مرتا ہے تو یہ پتہ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ ہوسکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی روایتیں لوحِ منقوش کے متعلق غلط ہوں اور کلام مجید کے متعلق صحیح، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ میں منقوش ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کا بیان ان کی کتابوں کے متعلق کیوں غلط سمجھا جائے۔ جس طرح قرآن منقوش ہوسکتا ہے اور کتابیں بھی ہوسکتی ہیں۔

آخرت کے متعلق جو آیت آپ نے پیش کی ہے بیشک اس میں ثواب دنیا اور ثواب آخرۃ دو چیزیں علٰحدہ علٰحدہ بیان کی گئی ہیں لیکن بحث تو عذاب و ثواب کی اس مادی صورت سے ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ دُنیا و ماوراء دنیا یقیناً دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں، لیکن دُنیا کے علاوہ کسی اور عالم کا پایا جانا اس کو مستلزم نہیں کہ حشر و نشر میزان و صراط، دوزخ و جنت وغیرہ کے بیان کو بیان تمثیلی نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض اکابر اسلام نے دوزخ و جنت کے عذاب و ثواب کو بالکل روحانی چیز قرار دیا ہے اور جسمانی حشر و نشر سے انکار کر دیا ہے۔

تصحیح

گزشتہ ماہ کے نگار میں غلطی سے "بعض حیرتناک سیاسی انکشافات" اڈیٹر کے نام سے شایع ہوگیا حالانکہ یہ مضمون جناب محمد عتیق صاحب صدیقی کا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ - منیجر نگار

مطبوعات موصولہ

ادب اور زندگی پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے سات انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے شایع کیا ہے۔ اس میں سے بعض مقالات ایسے ہیں جن کے کچھ حصے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے اور کچھ لکھنؤ سے نشر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر مجنوں کی صحافتی زندگی کے آغاز کو کافی زمانہ ہو چکا ہے لیکن اس دوران میں جو خدمت انھوں نے اُردو علم و ادب کی انجام دی ہے، وہ کافی سے زیادہ ہے۔ کمیت کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ وہ ایک بے چین قسم کا دماغ رکھنے والے انسان ہیں اور اسی لئے ان کے افکار ذہنی میں ایک مخصوص ندرت و جسارت پائی جاتی ہے۔

ابتدا میں جب انھوں نے فسانے شروع کئے تھے اسوقت بھی یہ حقیقت اہل نظر سے پوشیدہ نہ تھی کہ انکا فطری رجحان ان کو کسی نہ کسی وقت "انتقادیات" کی طرف مایل کر دے گا، چنانچہ جب انھوں نے رسالہ "ایوان" جاری کیا تو ان کے لئے یہ راہ متعین ہو گئی اور اس کے بعد سے جو کچھ انھوں نے لکھا وہ اُردو کے انتقادی لٹریچر میں بالکل نئی چیز تھا۔

مجنوں اپنے مطالعہ کے لحاظ سے فلسفی بھی ہیں اور ادیب بھی اس لئے ان دونوں کے امتزاج نے ان کے رنگ انتقاد میں گہرائی کے ساتھ ساتھ شگفتگی و دلکشی بھی پیدا کر دی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب وہ کسی ایسے موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں جس میں انھیں ایک ([illegible]) اسکول کے آرٹسٹ کی طرح اظہار خیال کا موقع مل جاتا ہے تو اُن کے اشارات بہت پر لطف اور گرانمایہ ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جتنے مقالات شایع کئے گئے ہیں، ان سب میں یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نظیر اور حالی پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں (گو نہ اب حالی موجود ہیں نہ نظیر اکبر آبادی)

"ادب کا تعلق زندگی سے" کیا ہے۔ گو تاثرات کے لحاظ سے انسانی تفکر کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو، لیکن بحث و گفتگو کے لئے اسے ایک مستقل موضوع بنا دینا، بالکل تازہ چیز ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر مقالات اسی خیال کو سامنے رکھکر یکجا کئے گئے ہیں اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اُردو میں شاید ہی اتنا مفید مواد اس موضوع پر کہیں اور مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ علوم مغربی کے مطالعہ سے مجنوں نے خود جتنا صحیح فایدہ اُٹھایا ہے وہ کم کسی کو نصیب ہوتا ہے

اور دوسروں کو جتنا فایدہ پہونچایا ہے اس کی دوسری مثال تو مجھے نظر ہی نہیں آتی۔

تاریخ ادب اُردو پہلا حصہ یہ کوئی جامع تاریخ نہیں ہے بلکہ طلبہ کے لئے یا اُن حضرات کے لئے جو حوالکی بڑی بڑی کتابوں سے فایدہ نہیں اٹھا سکتے، یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔
ابتدا میں زبان اُردو کی مختصر تاریخ درج ہے اور اس کے بعد آغاز ادب سے لیکر اسوقت تک کے مشاہیر کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔
گزشتہ دس سال کے اندر ادارۂ ادبیات اُردو کی یہ ساٹھویں تالیف ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت تک کتنی ادبی خدمت انجام دے چکا ہے۔ اس مرتبہ حیدرآباد پہونچکر میں نے خود اس ادارہ کو دیکھا اور اس کے اہتمام و انصرام کو دیکھکر بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اس ادارہ کے روح رواں ہیں اور حیدرآباد کی جدید نسل میں جو ولولۂ زبان کی خدمت کا پایا جاتا ہے اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر زور کی سعی و کوشش کا ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۱۲ ہے۔

محمد حسین آزاد یہ کتاب بھی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے شایع کی ہے اس میں مولانا آزاد مرحوم کے تمام حالات زندگی کو یکجا کرکے ان کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور شاعری پر بھی۔
یہ تالیف جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم۔اے کی ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک خاتون کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ ادارہ کا شعبۂ نسواں اس سے قبل اور بھی کئی کتابیں خواتین حیدرآباد کی شایع کرچکا ہے۔
قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن۔

آبدوز اور سرنگ۔ پانی کی کہانی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا شروع کیا ہے تاکہ سائنس کے ضروری مسایل عام فہم اُردو میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں۔ ایک میں آبدوز اور سرنگوں کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں پانی کے متعلق تمام ضروری اطلاعات یکجا کردی گئی ہیں۔ جا بجا نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے ان مسایل کو اور زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور اُردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی کوشش ہے۔

قواعد عربی حصۂ اول مولوی محمد ہبۃ اللہ صاحب نے جو گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں عربی کے لکچرر ہیں عربی زبان کے قواعد پر یہ پہلا حصہ ابتدائی تعلیم کے لئے شایع کیا ہے جو بہت سہل و مفید معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان سے مسلمانوں کی بیگانگی بہت افسوسناک بات ہے، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر اسی قسم کی کتابوں کی مدد سے بہت کم مدت میں خاص مہارت اس زبان میں بھی پیدا کرسکتے ہیں۔

امید ہے مولوی صاحب موصوف اس سلسلہ کو جلد مکمل کر دیں گے ۔

جلوۂ زار اظہر — جناب سید دلدار حسین رضوی اظہر الہ آبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ جناب اظہر حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہیں اور وہاں کے اہل علم میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، تاریخ گوئی میں آپ کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے اور شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے

اس کی قیمت ۱۲ ہے اور ملنے کا پتہ ۷۶ ، بازار نور الامراء حیدرآباد دکن ۔

تذکرۃ الہند ۔ یادگار رضائی — حکیم رضا علی خاں مرحوم کی تالیف ہے جس میں دکن اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص نہایت محنت سے یکجا کر دئے گئے ہیں ۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شایع کی گئی ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی نہایت پسندیدہ ہے ۔ انجمن اطبائے یونانی حیدرآباد نے اس کتاب کو شایع کرکے واقعی فن طب کی بڑی خدمت انجام دی ہے ۔ کاش یہ اردو میں ہوتی اور عوام بھی اس سے فایدہ اٹھا سکتے ۔

ان دونوں حصوں کا حجم ۱۰۰۰ صفحات سے زیادہ ہے اور قیمت دس روپیہ ۔

چمن احساس — ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے بعض ادبی ٹکڑوں کا مجموعہ ہے ، جو ٹگور کے رنگ میں لکھے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے مقالات بعض ادبی رسایل میں شایع ہوتے رہتے ہیں اسلئے وہ بزم ادب میں کوئی نووارد شخص نہیں ہیں ۔ ان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور زبان شستہ ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے یہ کتاب مل سکتی ہے ۔

مقدمۂ زندگانی محمد — زندگانی محمد ، محمد حسین ہیکل مصری کی مشہور تالیف ہے ۔ جس پر خود انھوں نے ایک معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھا ہے ۔ یہ کتاب اسی مقدمہ کا ترجمہ ہے ۔ جس میں قرآن مجید اور رسالت پر جدید اصول انتقاد کو سامنے رکھکر بحث کی گئی ہے اور ان دونوں کی اہمیت کو روایت و درایت دونوں سے ثابت کیا گیا ہے ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر ہے اور قیمت ۱۰ ۔

رہنمائے تاریخ اردو — فن تاریخ گوئی کی کتاب ہے جسے حاجی محمد عبد القادر وکیل بنارس نے مرتب کیا ہے اس میں تقریباً ۵۰ شعراء کی تاریخ وفات کے قطعات درج ہیں اور اس سلسلہ میں تاریخ گوئی کے تمام مروجہ طریقوں کو بھی بتا دیا گیا ہے ۔ قیمت ۱۲ ۔

صبح نشاط — مجموعہ ہے جناب نظیر لودھیانوی کی نظموں کا ۔ جناب نظیر بہت کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی نظمیں اکثر رسایل میں شایع ہوتی رہتی ہیں ۔ آپ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے شعر و فلسفہ سے بہت متاثر ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے نظریۂ اقبال ہی کو سامنے رکھ کر کہا ہے ۔

آپ کی نظموں میں استواری ہے اور اداے بیان میں زور و خود داری۔ اس مجموعہ میں ادبی، فطری، مذہبی و معاشرتی سبھی قسم کی نظمیں نظر آتی ہیں اور ان سب میں جناب نظیر کے سچے تاثرات جھلک رہے ہیں۔

طباعت و کتابت وغیرہ بہت خوب ہے اور قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ نیو اسٹریٹ لودھیانہ۔

سحرِ حلال جناب درویش میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب درویش نوجوان شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، تاثر کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے قبل اپنے اور میرے ایک مشترک دوست کے ذریعہ سے انھوں نے اس مجموعہ پر میری رائے حاصل کی تھی جو ابتدا میں دیدی گئی ہے۔ یہ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور جناب درویش محلہ کوٹلہ میرٹھ سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

اُردو کا پہلا شاعر اور پہلا مدوّن پروفیسر اویس احمد ادیب نے ولی دکھنی کو اس عنوان سے پیش کیا ہے اور اس کے تمام اصناف نظم سے بحث کی ہے۔ ولی سے پہلے کے شعراء کو وہ برج بھاشا کے کہنے والوں میں جگہ دیتے ہیں اس لئے اُردو کے پہلے شاعر ہونے کی خصوصیت انکے نزدیک صرف ولی کو حاصل ہے۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور افادہ سے خالی نہیں۔

قیمت ۱۲ر ہے اور ملنے کا پتہ "مصنف حلیم مسلم کالج کانپور۔

خوابِ بیداری آخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور کتاب "خواب شگفت" کا ترجمہ ہے جسے سید یوسف حسین صاحب زیدی نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں تمثیلی انداز سے تمام امم سابقہ و حاضرہ کے اجتماعی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں اوہام پرستی کو کتنا دخل ہو گیا ہے۔ خدا کے روبرو تمام انبیاء یکے بعد دیگرے بلائے جاتے ہیں اور اُن کے سامنے ان کی اُمتوں کی بدعتوں کا بیان کرکے محاسبہ کیا جاتا ہے، اخیر میں حضرت خاتم النبیین کو بھی بلایا جاتا ہے اور تمام نزاعات مذہبی کو پیش کرکے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ و مفید ہے اور وہ لوگ جو مذاہب کے باب میں زیادہ آزاد رائے رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ترجمہ بہت صاف و سلیس کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ سید یوسف حسین زیدی۔ کوچہ میر انیس، لکھنؤ۔ قیمت ۸ر

طلسمِ عمل ترجمہ ہے ڈیل کارنیگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۴۸ ہزار نسخے ستمبر سنہ ۳۹ء تک فروخت ہو چکے تھے۔ کارنیگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے ــــ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ و سلیس کیا گیا ہے ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے نفسیات کے عملی اصول اُردو میں روشناس کرائے ــــ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ۱ر میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے۔

خود دار خاتون ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامہ کا جس میں وکٹورین عہد کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ آسکر وائلڈ کی تصانیف کا ترجمہ آسان نہیں، لیکن جناب محمد مرزا صاحب دہلوی نے بہت کامیابی سے یہ خدمت انجام دی ہے۔

قیمت ۸ رہے اور ملنے کا پتہ دائرۂ ادبیہ۔ دریا گنج۔ دہلی۔

نِشا ڈراما ہے جناب کشن پرشاد کول کا لکھا ہوا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت عورتوں کے باب میں کتنی بیرحم واقع ہوئی ہے اور ہم خدا کی اس مخلوق کے ساتھ کتنی بدسلوکی کرتے ہیں۔
اس کے مصنف بہت کہنہ مشق انشا پرداز ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خاص قسم کی متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں۔ پلاٹ اور کردا سب میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نظر آتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ لیڈر پریس الہ آباد۔

پیامِ کیف مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا صاحب گو پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، لیکن اپنے فکر و احساس کے لحاظ سے پکے شاعر ہیں۔ جس کا حال لوگوں کو اسوقت معلوم ہو گیا تھا جب کلام اصغر پر ان کا تبصرہ شایع ہوا تھا۔ یہ اصغر مرحوم کی شاعری سے بہت متاثر ہیں لیکن ان کا کلام اُن خامیوں سے پاک ہے جو اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ فلسفہ و تصوف غزل کا دشمن ہے، لیکن اگر سلیقہ و تاثر کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے تو غزل میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو آجکل مقبول ہے۔
احسان صاحب کی شاعری میں فلسفہ و تصوف دونوں ہیں، لیکن دونوں کا صرف احتیاط سے کیا گیا ہے۔
یہ کتاب جناب مصنف سے اعظم گڈھ کے پتہ پر عہ رمیں ملسکتی ہے۔

گلستانِ شرف دیوان ہے سید ابوالفتح محمد شرف الدین متخلص بہ شرف رئیس ڈھاکہ کا جس میں غزلیں، قصاید، سلام اور سہرا وغیرہ سبھی کچھ ہے، لیکن ایک رئیس کا کلام جیسا ہوا کرتا ہے ویسا ہی ہے، کوئی خاص بات کسی چیز میں نظر نہیں آتی۔ البتہ لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

سب سے پہلا فرق میرے اور ان کے درمیان یہ ہے کہ میں ہر گفتگو میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ وحشت و درندگی کو۔ وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب اُن سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احمق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دُنیا میں ملحد ہو کر جینا بہتر ہے یا احمق رہکر!

اسلام کیسے شروع ہوا | یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کی ہے ۔ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں جناب رسالتمآب کی سیرت کو نہایت سادہ زبان میں پیش کیا گیا ہے ۔ کتاب مجلد ہے اور قیمت عمر

جوہر عبد الحق نمبر | جامعۂ ملیہ کے طلبہ نے رسالۂ جوہر کا یہ نمبر مولوی عبد الحق کی سترویں سالگرہ کے موقع پر شایع کیا ہے ۔ مولوی صاحب موصوف نے اُردو ادب کی جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا اجمالی علم تو ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن ضرورت تھی کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جاتا۔ اس لئے اہل ملک کو "ارباب جوہر" کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ علاوہ ان مقالات کے جن کا تعلق مولوی عبد الحق صاحب سے ہے، دوسرے ادبی مقالات بھی اس میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نظر آتے ہیں ۔

یہ نمبر مجلد شایع کیا گیا ہے اور قیمت ہر ہے ۔

Our countrymen abroad | انگریزی تصنیف ہے جناب دھرم یاش دیو کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہندوستانیوں کی کیا حالت ہے اور وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتاب نہایت محنت و قابلیت سے لکھی گئی ہے ۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ : ۔ سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی سوراج بھون الہ آباد ہے ۔

نازی ازم | جناب عبد الرحیم شبلی (بی کام) کی تالیف ہے جس میں نازی تحریک کی تاریخ ابتدا سے اسوقت تک درج کی گئی ہے۔ اس کے مولف دنیائے صحافت میں اس سے پہلے بھی اپنے معاشی مقالات کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔

اس زمانہ میں جبکہ اس نوع کے لٹریچر کی ضرورت ہے، مولف نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب کی نہایت برمحل خدمت انجام دی ہے ۔ وہ لوگ جو ہٹلر اور اس کی نازی تحریک کا مطالعہ ہر پہلو سے کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ بہت لطف و فائدہ سے خالی نہیں ۔ قیمت ۲ ۔ ملنے کا پتہ ۔ دار الادب پنجاب بارود خانہ لاہور ۔

طلسم عمل | ترجمہ ہے ڈیل کارنیگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۳۸ ہزار نسخے ستمبر ۳۸ء تک فروخت ہو چکے تھے۔ کارنیگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے ۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ و سلیس کیا گیا ہے ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے نفسیات کے عملی اصول اُردو میں روشناس کرائے ۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ہر میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے ۔

دُنیا میں صرف ایک مُلحد ہے اور ایک مُسلمان!

مُلحد : نیاز فتحپوری اور **مُسلمان : عبدالماجد دریابادی** ــــــ یہ نظریہ یا استقصا میرا نہیں ہے، بلکہ اسی شخص کی باتوں سے سمجھا ہے جسے میں نے دنیا کا صرف ایک مسلمان کہا ہے۔

یقیناً حیرت کی بات ہے کہ خدا کی اتنی بڑی آبادی میں کفر و اسلام کی نیابت اس قدر محدود و مختصر ہو، لیکن عبدالماجد کی رائے یہی ہے اور کسی شخص کی ذاتی رائے کو یوں بغیر سوچے سمجھے غلط کہہ دینا کم از کم مجھ ایسے مُلحد کے نزدیک نہایت نامعقول بات ہے، گو عبدالماجد ایسا مسلمان اسی ضد و رقابت کو اسلام سمجھتا ہو۔

دُنیا میں بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ فلسفے انھوں نے پیش کئے ہیں، لیکن اس زمانہ کے ایک ہندی فیلسوف، ایک ماہر علم کلام نے جس کے مسقط الراس ہونے کا فخر دریاباد کو حاصل ہے، کفر و اسلام کی دیرینہ نزاع کا نہایت ہی سادہ و مختصر فلسفہ پیش کیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے اسکے کہ عقل کچھ کم ہو۔

یہ فیلسوف کہتا ہے کہ اسلام نام ہے صرف اُس چیز کا (میں نے چیز کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کا بتایا ہوا اسلام واقعی عجیب "چیز" ہے) جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور ہر وہ چیز جو سمجھ میں آجائے کیسے غیر اسلامی ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ مختصر کر کے گویا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو عبدالماجد کہے وہ اسلام ہے اور جو نیاز فتحپوری کہے وہ کفر و الحاد ہے ــ کیا دُنیا میں اس سے زیادہ صاف و صریح، اس سے زیادہ آسان تشریح اسلام و کفر کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟ غالباً نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ضرور غور طلب رہجاتی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور میں کیا کہتا ہوں۔

سب سے پہلا فرق میرے اور اُن کے درمیان یہ ہے کہ میں ہر گفتگو میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ وحشت و درندگی کو ۔ وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب اُن سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احمق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دُنیا میں ملحد ہو کر جینا بہتر ہے یا احمق رہکر!

خیر، یہ تو میرے اُن کے اختلاف کے نہایت سطحی و ظاہری حدود ہیں، جن پر نہ آپ کو زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے زیادہ اصرار کی۔ اب آیئے ذرا معنویت کی طرف آئیں۔ میں اسوقت مُسلم و مُلحد کی اصطلاحات پر فقہی حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ میرے اور اُن کے درمیان جو دیرینہ تعلق "اہرمن و یزداں" کا سا چلا آرہا ہے اس کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جو کفر و اسلام کے درمیان ما بہ النزاع یا (زیادہ صحیح الفاظ میں) ما بہ الاشتراک ہے، وہ خدا کا تصور ہے۔ اسلام کا دعوی ہے اور بالکل صحیح دعویٰ ہے کہ اس نے وحدانیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مادیت کے لگاؤ سے یکسر پاک ہے، یعنی اس تصور میں کوئی بعید ترین شائبہ بھی مادیت کا نہیں پایا جاتا۔ یوں اگر عبدالماجد سے پوچھا جائے تو وہ بھی غالباً اس کا اعتراف کریں گے، لیکن اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ میں بھی یہی کہتا ہوں تو انھیں وحدانیت کے اس عقیدہ میں بھی کفر و الحاد کی جھلک نظر آنے لگے گی۔ آپ اس کو مبالغہ نہ سمجھئے بلکہ جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی رکھتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ خدا "نطق و کلام" کی اُس صفت سے مبرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں "خدا کا کلام" کہنا، خدا کی توہین ہے اور تصورِ وحدانیت کے یکسر منافی۔ وہ یہ سنکر آگ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطہ "وحیٌ یوحیٰ" ہے۔ میں کہتا ہوں بیشک قرآن مجید وحی ہے، الہام ہے لیکن اس معنے میں نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس مفہوم میں جو قرآن سے متبادر ہے اور جب میں ثابت کرتا ہوں کہ "وحی الہام" سے مراد صرف فطری ذہانت یا طبعی صلاحیت ہے تو اس کے جواب میں مجھے گالیاں دینے لگتے ہیں۔

کیسی تماشہ کی بات ہے کہ "یداللہ فوق ایدیھم" میں تو وہ ید (ہاتھ) کی تاویل کرکے اس کا مفہوم "قدرت و قوت" بتائیں (کیونکہ خدا مادیت سے مبرّا ہے اور ہاتھ پاؤں کچھ نہیں رکھتا)، لیکن قرآن مجید کے باب میں وہ خدا کا حلق و زبان سبھی کچھ مان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وحی کا مفہوم ان کے نزدیک "خدا کا کلام" قرار پاتا ہے اور "لوحِ محفوظ" کا مفہوم ایک جواہر کار تختی (واقعی تختی) جس پر یہ کلام ازل سے منقوش چلا آتا ہے اور خدا کا یہ ارشاد کہ "ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ" (انسان کا یہ منصب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے) ان کو نظر نہیں آتا۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصود لوگوں میں اعتبار و بصیرت کی کیفیت پیدا کرنا ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے:۔

فاقصص القصص لعلھم یتفکرون ــــــ لقد کان فی قصصھم عبرۃ

لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں کلام مجید تاریخ کی کتاب بھی ہے اور تاریخی نقد و جرح کا ہدف بھی اسے بنایا جاسکتا ہے

میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے، ورنہ ان کی حیثیت ایک ایسے مصلح کی سی قرار پائے گی جو خود نہ کوئی اختیار رکھتا ہے اور نہ اتنی اہلیت کہ وہ تدبیر و مصلحت سے کام لیکر لوگوں کی رہنمائی کر سکے۔ لیکن عبدالماجد کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول کی حیثیت صرف ایک پیامرساں کی سی ہے اور قرآن مجید کی رہبری و ہدایت میں خود انکی ذاتی یا طبعی صلاحیت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو معجزہ کہنا اسی وقت اہمیت رکھ سکتا ہے جب ہم اسے رسول اللہ سے یعنی ایک انسان سے منسوب کریں، ورنہ خدا کے کلام یا خدا کی کسی بات کا معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ آفتاب کو سبھی آفتاب کہتے ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے۔

عبدالماجد کہتے ہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک ایک لفظ منطوق خداوندی ہے اور اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو پہلے سے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو، اس لئے بجائے قرآن مجید کے عربی زبان ہی کو معجزہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اگر معجزہ کا تعلق ہے آیات کے مفہوم سے اُن تعلیمات سے جو ان آیات میں ظاہر کی گئی ہیں، تو میرا بھی مقصود یہی ہے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کے معجزہ یا کلام ربانی ہونے کی بحث قطعاً اُٹھ جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ "نطق یا کلام" کا مفہوم اس وقت تک متعین ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہم زبان، حلق، الفاظ وغیرہ کا تصور اس کے ساتھ شامل نہ کریں اور خدا یقیناً ان چیزوں سے پاک ہے۔ مگر عبدالماجد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ وہی ہیں جو خدا نے جبرئیل کے ذریعہ سے رسول اللہ کے سمع مبارک میں اس طرح القائے جس طرح ایک اُستاد اپنے شاگرد کو ہجے کر کر کے پڑھاتا ہے، خواہ ایسا سمجھنے کے لئے خدا کو حلق و زبان کا محتاج ہی کیوں نہ ماننا پڑے۔

یہ تو صرف کلام مجید کے متعلق میرے اُن کے خیالات کا اختلاف تھا، اب اس سے ہٹ کر اور باتوں کو لیجئے:۔

میں کہتا ہوں خدا بے نیازِ مطلق ہے، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا، وہ تاثر سے مستغنی ہے۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ وہ ہماری عبادتوں سے خوش ہوتا ہے اور نافرمانیوں سے برہم۔ گویا وہ دنیا کا کوئی انسانی بادشاہ ہے جسکی تعریف کیجئے تو انعام دیتا ہے اور نہ کیجئے تو دربار سے باہر نکال دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے اچھے اخلاق سے خدا کا خوش ہونا اور ہماری بداعمالیوں سے اس کا ناخوش ہونا صرف اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسان عرصہ سے دنیاوی بادشاہت کے نظام سے متاثر ہے اور اسی کی مثال کو سامنے رکھ کر اسے بہتر درس دیا جا سکتا ہے، ورنہ اس خوشنودی یا ناخوشنودی کا تعلق صرف ہمارے اعمال یا کردار کے اُن نتائج سے ہے جو اسی دنیا کے اندر فلاح یا بربادی کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دوزخ و جنت کا مفہوم یکسر روحانی مفہوم ہے اور حور و قصور، کوثر و سلسبیل جہنم و فردوس صرف تمثیلی الفاظ ہیں جن سے معنوی راحت و تکلیف کو ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں، حور سے مراد اسی قسم کی دنیاوی عورت ہے جس سے جنسی لطف اُٹھایا جاتا ہے اور عورت و حور میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ عورت کو سیر ہو جانے کے بعد تیس روپیہ کا مہر ادا کر کے طلاق بھی دی جا سکتی ہے اور حور سے علحدگی اختیار کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، نکیرین کی گرز بازی، حشر و نشر، میزان، و پل صراط وغیرہ کا وجود مادی حیثیت سے ماننا ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں تمثیلی ہیں اور خدا نے انسان کو اتنا احمق پیدا نہیں کیا کہ وہ عالم مجاز میں آکر اپنی حقیقتوں کو وا شگاف کرنا ضروری سمجھے۔ خدا لاکھوں کُرے روز بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور اس کا عالم خلق اتنا وسیع ہے کہ زمین ایسا حقیر کرہ اور اس کے حقیر باشندے، تو کیا اگر لاکھوں نظام شمسی روز تباہ ہوتے رہیں تو بھی اسکی کارگاہ کی رونق کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ہمارا حشر و نشر وغیرہ کا قایل ہونا اپنے آپ کو ناواجب اہمیت دینا ہے جس کو خدا کی عظمت کا صحیح تصور برداشت نہیں کر سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ عبادت کا اصل مقصود اخلاق میں بلندی پیدا کرنا ہے، گویا عبادت ذریعہ و وسیلہ ہے نہ کہ اصل مقصود۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ صوم و صلوٰۃ خود اپنی جگہ اصل مقصود ہے اور نجات کے لئے کافی۔

یہ ہیں وہ چند اُصولی باتیں جن کے اختلاف پر عبدالماجد کے اسلام اور میرے الحاد کی بنیاد قایم ہے۔ میں تو انھیں غیر مسلم نہیں کہتا کیونکہ میرے نزدیک بعض عقاید کا اختلاف ایک شخص کو ملت اسلامی سے خارج نہیں کر سکتا لیکن میں ان کے نزدیک مرتد ہوں، ملحد ہوں اور اگر میرے عقاید واقعی ارتداد و الحاد ہیں (جس کا فیصلہ میں عبدالماجد سے نہیں بلکہ دُنیا کے دوسرے اہل علم و عقل سے چاہتا ہوں) تو میں نہایت خوشی سے اس کا اعتراف کرنے پر طیار ہوں۔

ہمارے دوست عبدالماجد ایک نہایت ہی خشک و عبوس قسم کے قنوطی انسان ہیں جن کے نزدیک زندگی نام ہے دنیا و اہل دنیا سے بیزار رہنے کا اور اپنے آپ کو سب کے لئے اجیرن بنا دینے کا، ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی گمراہی اس کی علمی و ذہنی ترقیاں ہیں اس لئے دور حاضر ان کے لئے سخت کرب و اضطراب کا باعث ہے۔

یورپ میں کسی علمی ایجاد کی خبر انھوں نے سنی اور دریاباد میں ان کو تکلیف شروع ہو گئی، امریکہ میں کسی نئی دوربین کی ایجاد کا حال معلوم ہوا اور ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اگر اتفاق سے کوئی جہاز طوفان کے صدمہ سے غرق ہو گیا تو فوراً انھوں نے اس کو خدائی انتقام سے تعبیر کیا۔

انھیں یہ جستجو تو ہر وقت رہتی ہے کہ اہلِ مغرب میں طلاق کا اوسط کیا ہے، شراب پینے والوں کی تعداد کتنی

ہے، موٹروں کے ٹکرانے سے کتنے آدمی روزہ ہلاک ہوتے ہیں اور ان تمام باتوں کو وہ دورِ حاضر کی لعنت قرار دیکر اس سے پناہ مانگتے ہیں، لیکن وہ اس کو بالکل نظرانداز کرجاتے ہیں کہ علوم جدیدہ کتنی زبردست علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور فطرت کے کتنے قوائے کامنہ کو وہ بروئے کار لاچکے ہیں اسی کے ساتھ کبھی اس پر توجہ نہیں فرماتے کہ جس جماعت کو وہ "اپنی" اور "خالص اسلامی" جیز کہتے ہیں خود اس کے اعمال و اخلاق کا کیا حال ہے، اور جب تک خود اپنا دامن خشک نہ ہو دوسروں کی تردامنی پر اعتراض کرنے کا انھیں کیا حق حاصل ہے۔

جس وقت میں نے جون میں "آتشِ نمرود" پر بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ "قرآن مجید" اس معنے میں کلام ربانی نہیں ہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو انھوں نے مجھے ابوجہل و ابولہب بھی کہا، میرے خلاف اخبارات میں مضامین بھی شایع کرائے، میرے اور نگار کے مقاطعہ کے لئے جلسے بھی برپا کئے، لیکن جو دلایل مینے جون اور جولائی کے نگار میں پیش کئے ہیں ان کی تردید کی جرأت وہ نہ کرسکے۔ ان کے نزدیک گویا اسلام کی خدمت نام ہے صرف اس بات کا کہ جو شخص ان کے مزعومہ عقاید کے خلاف کوئی بات کہے اسے مرتد و ملحد کہدیا جائے کسی کو "مرتد و ملحد، کافر و زندیق" بنا دینا، قدامت پرست جماعت کا کوئی نیا حربہ نہیں ہے، اور ہر چند کہ اس حربہ سے انھوں نے "آزاد خیالی" کو کافی نقصان پہونچایا، لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً "عقل انسانی" کی طرف سے اظہارِ حق ہوتا ہی رہا اور برابر ہوتا رہے گا۔

ان لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ مجھے یا کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ان کے عقاید کے خلاف رائے کا اظہار کرکے انھیں تکلیف پہونچائی جائے لیکن بالکل یہی اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ کسی کو آزادانہ اظہار رائے سے باز رکھ کر کیوں اُس جماعت کو تکلیف پہونچائیں جو اسلام کی خدمت اسی میں سمجھتی ہے کہ اُسے لایعنی عقاید سے پاک کیا جائے۔

جس طرح عبدالماجد کو ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے اسلام پر اظہار خیال یا اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، اسی طرح میں بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجاز ہوں کہ اسلام کا وہ مفہوم پیش کروں جو میرے نزدیک صحیح و درست ہے۔ اگر عبدالماجد یہ سمجھتے ہیں کہ میں قرآن کو کلام ربانی نہ مان کر اسلام کی توہین اور رسول کی تکذیب کرتا ہوں، تو میں بھی اپنی جگہ یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام کہکر اسلام کی تخریب اور رسول کی تخفیف کرتے ہیں، فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی پیش کرتا ہوں اور وہ صرف مجھے ملحد و مرتد کہدینا ہی کافی دلیل سمجھتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ بازاری آدمیوں کی طرح سب و شتم پر اُتر آیا جائے۔ خود جناب رسالتمآبؐ کا طرزِ عمل ہمیشہ یہی رہا کہ وہ مخالف کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور

غصہ کبھی نہ فرماتے تھے، لیکن عبدالماجد صاحب کو جو اپنے آپ کو سب سے بڑا محافظ روایات نبوی کا سمجھتے ہیں، سوائے گالیاں دینے اور مقاطعہ وغیرہ کی پست و ذلیل کوششیں کرنے کے اور کوئی جواب اپنے پاس نہیں رکھتے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اس نوع کی غیر انسانی حرکات سے اپنے جذبۂ انتقام کو ایک حد تک پورا کر سکیں، لیکن دنیا میں تماشائیوں کے ساتھ اہل نظر کی بھی کمی نہیں ہے اور وہ یقیناً اس کو بدنفسی پر محمول کریں گے یا اہل مذہب کی بیکسی و بے مایگی پر، اور شاید یہ دونوں باتیں عبدالماجد کو خوش نہیں آسکتیں۔

مجھ پر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا یہ الزام بھی قایم کیا جاتا ہے کہ میں نے اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کا عہد کیا تھا لیکن اس عہد سے پھر گیا۔ لیکن یہ معاہدہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب عبدالماجد اینڈ کو نے خود بھی اپنے عہد کو توڑ کر حکومت سے میرے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی تھی۔ آج اڈیٹر معارف کی طرف سے بھی مجھ پر یہی الزام قایم کیا جاتا ہے، حالانکہ سید سلیمان ندوی خود اس جماعت کے سرگروہ تھے جو میرے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائے جانے کے لئے تگ و دو میں مصروف تھی!

اگر میری معذرت شایع ہونے کے بعد وہ خاموش رہتے اور کوئی معاندانہ کارروائی نہ کرتے تو بیشک مجھ پر "انحراف عہد" کا الزام قایم ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ کس منھ سے مجھ پر الزام قایم کر سکتے ہیں۔ خود پاس عہد نہ کرنا اور دوسروں سے ایفا چاہنا عجیب تماشہ کی بات ہے!

میں نے عبدالماجد صاحب کو خط کے ذریعہ سے بھی اطلاع دیدی ہے اور اب نگار کی وساطت سے بھی میں انھیں اور تمام اُن کے ہم عقاید لوگوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں اسلام کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کرتا ہوں اس کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں، لیکن اگر اُن کے نزدیک وہ غلط ہے تو نگار کے صفحات کھُلے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے تردیدی جوابات کو من و عن شایع کر دینے کا وعدہ کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر ان کے جوابات سے مجھے تسکین ہوگئی، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کروں گا — ورنہ یوں مجھے ان کے مرتد و ملحد کہنے کی پرواہ نہیں ہے، میرا اور میرے عقاید کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیت کیا ہے۔

وکفیٰ باللہ شہیدا

دو منظر

پنگھٹ کی صبح :

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں جاڑے کی رُت، بہار کے دن، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے حبابوں کی کہکشاں موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
سرسبز پتّیوں کے پیالے چھلک گئے
آئی کرن نگاہ سے پَر تولتی ہوئی، کُہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی،
شبنم کے تابناک گُہر رولتی ہوئی، پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
موجوں کی بیقرار جبینیں چمک گئیں،
وہ جوشِ کیف ہے کہ ہوائیں بہک گئیں
اشنان کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی کاندھے پہ ایک ململی دھوتی پڑی ہوئی
ندّی کے پاس جاکے جو انگڑائی اُس نے لی ملّاح کے بھی ہاتھ سے پتوار چُھٹ گئی
موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا،
شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جُھکا لیا،

پنگھٹ کی شام:

پیڑوں کی چھاؤں، ریت کے ذرّے، شفق کی ضو ساحل کو چومتی ہوئیں موجیں بہ طرزِ نو
خورشید کے چراغ کی بجھتی ہوئی سی لو بربط سا چھیڑتی ہوئی ندّی کی تیز رو
موجوں کے جزر و مد میں عجب اہتمام ہے،
فردوس کی سحر ہے کہ پنگھٹ کی شام ہے
پھیلی ہوئیں جُھکے ہوئے پیڑوں کی ڈالیاں دریا کی سطح بن گئی سایہ کا آسماں،
جاتا نہیں ہے ایک بھی نظارہ رائگاں گاؤں سے آ رہی ہیں کسانوں کی لڑکیاں
مٹّی کی گاگروں کو سروں پر لئے ہوئے
مستی کی تیز تیز شرابیں پئے ہوئے،

چڑھتا ہوا شباب، مکمل جوانیاں،
موضوعِ حسن و عشق، مجسم کہانیاں
تہذیبِ عہدِ رفتہ کی زندہ نشانیاں
کھیتوں کی شاہزادیاں گاؤں کی رانیاں
آتے ہی اُن کے منظرِ ساحل بدل گیا،
ماحول حسن و کیف کے سانچے میں ڈھل گیا

ماہر القادری

رات کی دیوی

نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے
شانہ پہ کاکلوں کو پریشاں کئے ہوئے
پلکیں جُھکی جُھکی ہوئی نیندوں کے بوجھ سے
دامن میں جگنوؤں کے جلائے ہوئے دئے
ہونٹوں پہ خامشی سی درختوں کی چھاؤں کی
وہ لوریاں سی چال میں آہستہ پاؤں کی
سونی جبیں پہ سوئی ہوئی بستیوں کا حال
دھندلا ہٹوں کے ابر میں کھوئے ہوئے سے گال
آنکھیں خمار و خواب کے جادو لئے ہوئے
ہر ہر نگاہ تیز سی صہبا پئے ہوئے
انگشت خوابناک میں ذوقِ گناہ کے
مبہم سے کچھ حسین اشارے چھپے ہوئے
سانسوں کے دھیمے ساز میں خاموشیوں کی لے
سنسان جنگلوں کے مسافر کے دل کا بھے
بوسوں کے عطر بیز ترنم کی گرمیاں،
فرقت زدہ حسینہ کی بیتاب ہچکیاں
دھڑکن میں دل کی راز کی باتوں کی خامشی
جسموں کا اتصال وہ سانسوں کی راگنی،
نیندوں کے ابر تار میں کھویا ہوا جمال،
اوڑھے ہوئے حسین ستاروں کا ایک شال
آہستہ پا رواں ہیں افق پر خیال کے
ماضی کے خواب ہائے پریشاں کے قافلے
سایوں کے کاروان جلو میں لئے ہوئے
دھندلے، سکوں فروش، مسلسل، خموش سے

نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے

طفیل احمد خاں سلطانپوری

نازی سپاہی

ہم نشیں! آ دیکھ میرے ساتھ میں دیکھوں جہاں
دیکھ یونیفارم میں وہ ایک فوجی نوجواں

دیکھ کتنے صاف و روشن ہیں ٹیونک کے بٹن
شارٹ پر ڈالی ہے اس نے کس قدر بانکی شکن

دیکھ اس کے بوٹ پر پالش ہے کتنی دل فروز
پٹیوں پر کتنی خوبی سے الٹ رکھے ہیں ہوز

دیکھ کتنی کس کے یہ تھامے ہوئے ہے رائفل
اس کے بازو ہو نہیں سکتے کسی صورت سے شل

بے حس و حرکت کھڑا ہے ایڑیوں کو جوڑ کر
ہر نظر اس کی گزر جائے گی پتھر توڑ کر

کس نئے انداز سے سینے کو ہے تانے ہوئے
سر کو ہے سیدھا کئے، ٹھوڑی کو ہے بھینچے ہوئے

آہنی قوت سے اس نے داب رکھی ہے زمیں
آندھیوں میں یہ جگہ سے اپنی ہل سکتا نہیں

مارچ کرتے وقت دائیں ہاتھ سے تھامے سلنگ
عزم سے بڑھتا ہے خالی ہاتھ کو دے کر سوئنگ

دبدبے سے اس کے گھبراتے ہیں سب پیر و جواں
راہ دیدیتے ہیں ہٹ کر راستے سے کارواں

گرمیاں سینے میں دل میں ہے شجاعت کا سرور
حوصلوں سے سرخ چہرہ، عزم سے آنکھوں میں نور

یہ محافظ بن کر اٹھا تھا کبھی تہذیب کا
یہ معالج بن کر آیا تھا کبھی تہذیب کا

کیا خبر تھی ہے فرشتہ پیشہ ور جلاد بھی
ضامنِ امن و اماں بن جائیگا صیاد بھی

ریڑھ کی ہڈی پہ کٹ سکتی تھی اس کی زندگی
ذہن اسے دے کر خدا نے ذہن کی توہین کی

عقل کی اس کو ضرورت ہی نہیں تھی عمر بھر،
ناچنا ٹھہرا اسے جب دوسروں کے حکم پر

یہ جتانے کے لئے ہے اپنے افسر کا غلام،
یہ سلامی رائفل پر اس کو دیتا ہے مُدام

اس کو کوئی مس نہیں ہے زندگی کے سوز سے
میت پروانہ سے یا شمع شب افروز سے

ایک آنسو آنکھ سے اس کی کبھی اُمڈا نہیں،
ایک شعلہ اس کے سینے میں کبھی بھڑکا نہیں

اس کو تاروں کی چمک میں کیف کچھ ملتا نہیں
آتشیں نغمات سے بھی اس کا دل ہلتا نہیں

پھول کے رومان رنگ و بو سے بے بہرہ ہے یہ حسن کیا سمجھے گا جب پیدائشی اندھا ہے یہ
سامنے بلور کی مینا ہو یا پھولوں کا جام مار کر ٹھوکر اسے سب کچھ کچل دینے سے کام
واحد اپنی نوعیت کا ہے یہ حیوان سر بسر پھینک دیتا ہے یہ انسانوں کی گردن توڑ کر
گن مشینوں سے کئے ہیں اس نے مجبوروں پہ وار اس نے بنیٹ سے کیا معصوم سینوں کو فگار
گیس کی صورت میں اسنے غم ہی غم پھیلائے ہیں اس نے فاقہ کش نہتوں پر بھی بم برسائے ہیں
بھر گیا انسان سے دل تو تنوع کے لئے ہڈیوں کے پیسنے کو اس نے توڑے مقبرے
ناز کرتا ہے یہ بچوں کے گھروندے توڑ کر لطف لیتا ہے یہ ماؤں کو تڑپتا چھوڑ کر
بھاگتا ہے جب نظیر ابن کے یہ میدان سے نوچ لیجاتا ہے گہنے بچیوں کے کان سے
کاش یہ گنتا مری بہنوں کی ٹوٹی چوڑیاں دیکھتا اے کاش ان کی ساڑیوں کی دھجیاں
کر دئے کتنے کتب خانے جلا کر اس نے خاک کتنی تصویروں کو اسنے کر دیا وحشت میں چاک
کتنے شاعر ظلم سے اس کے ہوئے ہیں سوگوار پاؤں سے کچلے ہیں اس نے اپنے کتنے شاہکار
جانور کی طرح اس نے روند ڈالیں کھیتیاں اس نے باغوں پر گرائیں بے ضرورت بجلیاں

ہم نشیں! کب تک میں اس کمبخت کا شکوہ کروں؟
لا مجھے پستول دے، میں اسکے گولی مار دوں!

فضل الدین اثر ایم۔ اے

غزل: خلیل اللہ قریشی

کسی کا آستاں ہے اور میں ہوں نشاطِ جاوداں ہے اور میں ہوں
زمیں کی گردشوں پر ہے تسلط شرابِ ارغواں ہے اور میں ہوں
خوشا ساعاتِ رنگینِ محبت وہ کافر شعر خواں ہے اور میں ہوں
یقینِ عظمتِ کعبہ کے باوصف بتوں کا آستاں ہے اور میں ہوں
وہ دز دیدہ نظر اور پرسشِ حال محبت کامراں ہے اور میں ہوں
طلسمِ بے خودی ہے کارفرما خیالِ دلستاں ہے اور میں ہوں
قدم کی چاپ اور ان کے قدم کی ستم پرور گماں ہے اور میں ہوں

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳۸ | دسمبر ۴۰ء | شمار ۶

ملاحظات

رفتارِ جنگ

ایک جنگ پر کیا موقوف ہے، دُنیا کی ہر چیز اپنی دلچسپی کھو بیٹھتی ہے اگر اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ جس زمانہ میں روس و فنلینڈ کی لڑائی ہو رہی تھی اس وقت بھی یہی بے لطفی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ مہینوں تک یہی خبریں آتی رہیں کہ روس کی فوجیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں اور فن لینڈ والے انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتے، ان خبروں سے طبیعت اسقدر اُچاٹ ہو گئی تھی کہ جب آخر میں دفعتاً فن لینڈ کے ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی تو بھی وہی اُداسی باقی رہی۔ اس کے بعد جب جرمنی نے دفعتاً ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کیا تو پھر دلچسپی شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ برابر جاری رہا یہانتک کہ فرانس پر حملہ ہوا اور اس لطف کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کچھ زمانہ تک دُنیا سونی سونی نظر آتی رہی حتےٰ کہ انگلستان پر جرمنی کے ہوائی حملوں نے پھر چہل پہل پیدا کر دی، یہ زمانہ جولائی سے شروع ہوا اور ۱۵ اگست تک یہ دلچسپیاں برابر بڑھتی ہی رہیں کیونکہ ہٹلر نے یہی تاریخ داخلۂ لندن کی مقرر کی تھی، لیکن جب یہ تاریخ بھی گزر گئی اور اِدھر سے انگلستان نے بھی جرمنی پر ہوائی حملے شروع کئے تو ان خبروں میں رفتہ رفتہ پھر پھیکا پن پیدا ہو گیا

وہی روز کی دونوں طرف سے بمباری، وہی ہر ایک کا دوسرے کو "بے پناہ" نقصان پہونچا دینے کا دعویٰ اور پھر کوئی نتیجہ نہ نکلنا، طبیعت پر سخت بار ہو گیا۔

ہر چند یہ بمباری کا سلسلہ جاڑوں میں بھی جاری ہے (حالانکہ اس کی توقع نہ تھی) لیکن اس سے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اگر ان تمام خبروں پر یقین لے آیا جائے جو دونوں طرف سے سنائی جاتی ہیں تو اس وقت تک لندن اور برلن دونوں کو خاک سیاہ ہو کر زمین کے برابر ہو جانا چاہئے تھا، لیکن ابھی تک یہ دونوں شہر اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور شاید جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ واقعی نقصان ان بمباریوں سے کتنا ہوا اور کس ملک نے کس حد تک اس کو چھپانے میں کامیابی حاصل کی۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ جس وقت نازی فوجوں نے فرانس فتح کیا تو یہ ہٹلر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسی کے بعد اس کا زوال بھی شروع ہو گیا اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت تک وہ اپنے ہوائی حملوں سے انگلستان کے ضبط و تحمل کو متزلزل نہیں کر سکا۔

ہٹلر کی تاریخ اقتدار میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ اہل جرمن کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملا کہ ہٹلر اپنے عزم و ارادہ میں کبھی ناکام بھی رہ سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہٹلر نے اپنی اس ناکامی کو نہایت تکلیف کے ساتھ برداشت کیا ہو گا۔

فرانس کی شکست کے بعد ہٹلر کو بالکل یقین تھا کہ وہ بہت جلد برطانیہ کو مجبور کر کے اپنی فاتحانہ شرطیں اس سے تسلیم کرا لیگا، تاہم احتیاطاً اس نے اٹلی کو اپنا شریک کر لیا تھا تاکہ بحر روم اور افریقہ کی طرف بھی برطانیہ کو اپنی بحری قوت صرف کرنا پڑے اور انگلستان کی حفاظتی تدابیر کمزور ہو جائیں۔ مگر نازی حکومت کو اس میں ناکامی حاصل ہوئی، یعنی نہ وہ خود ہوائی حملوں سے ابتک برطانیہ کو زیر کر سکا اور نہ اٹلی بحر روم سے برطانوی اقتدار کو چھین سکا۔

پھر یہ ناکامی ایسی نہ تھی جو ہٹلر کو بے چین نہ کر دیتی، چنانچہ اس نے اب ایک تدبیر سوچی اور اٹلی کو یونان پر حملہ کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یونان، اٹلی کے مقابلہ میں زیادہ نہ ٹھہر سکیگا اور اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک طرف محوری طاقتوں کا کھویا ہوا اقتدار پھر قایم ہو جائے گا اور دوسری طرف وہ بحر روم کے شمال مشرق میں نئے ہوائی و بحری مرکز قایم کر کے بحر روم میں برطانوی طاقت کو کمزور کر دے گا، لیکن ہٹلر اس میں بھی کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ یونان کی کامیابیاں اٹلی کے مقابلہ میں حیرتناک ہیں۔ تین ہفتے اُس طرف کی بات ہے کہ مسولینی نے اپنی طیاریاں مکمل کر لینے کے بعد، یونان کی حکومت کو صرف چند گھنٹے کا الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کی باگ اٹلی کے ہاتھ میں دیدے لیکن یونان اس پر راضی نہ ہوا۔ اطالوی فوجوں نے البانیہ کی طرف سے یونان پر حملہ کیا اور کورشیرا کو فوجی مرکز قرار دیکر تین طرف سے فوجیں آگے بڑھائیں، لیکن کسی ایک طرف بھی اٹلی کو کامیابی نہ ہوئی اور کورشیرا کو خالی کرا کے یونان نے اپنی دفاعی پوزیشن کو جارحانہ پوزیشن میں تبدیل کر لیا۔ یقیناً ہم

پیشین گوئی نہیں کر سکتے کہ لڑائی کا رُخ آیندہ بھی یہی رہے گا اور یونان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ کسی فیصلہ کن جنگ کا پیش خیمہ ہیں، لیکن جن اسباب کی بنا پر یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے ان پر غور کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا یونان ایک کوہستانی علاقہ ہے اور خاصکر البانیا کی طرف کا حصہ جدھر سے اٹلی نے حملہ کیا تھا سوائے پہاڑوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اٹلی کے پاس ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی کمی نہ تھی، لیکن ان سے کوہستانی علاقہ میں وہ کوئی کام نہ لے سکتا تھا۔ یونانی فوجیں ہر چند آراستگی و سامان کے لحاظ سے اطالوی فوجوں کے برابر نہ تھیں، لیکن وہ اس سرزمین میں مقابلہ کر رہی تھیں جو ان کی جانی بوجھی تھی اور اس سے انھوں نے پورا فایدہ اُٹھایا۔

اسی کے ساتھ یونانیوں کو برطانوی ہوائی جہازوں سے بھی کافی مدد ملی جنھوں نے اطالیہ کے ہوائی و بحری مرکزوں پر بمباری کر کے یونانیوں کے حوصلے بڑھا دئے اور اطالیہ کو دوسری طرف اپنی بچاؤ کی فکر میں مبتلا کر دیا یونان کی آبادی ۷۰ لاکھ کے قریب ہے اور اٹلی کی تقریباً ساڑھے چار کروڑ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ کیا، علاوہ اس کے اٹلی کی فوجیں جدید آلات حرب سے پوری طرح آراستہ ہیں اور ہوائی جہاز اور ٹینکوں کافی تعداد اس کے پاس موجود ہے۔ برخلاف اس کے یونان کی کل فوجی طاقت دو لاکھ سے زیادہ نہیں اور ٹینک وغیرہ بھی اس کے پاس بہت کم ہیں، لیکن اس کمی کو برطانیہ کی مدد نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے جو وسطی مشرق کی طرف سے بھی برابر کمک بھیج رہا ہے اور بعض یونانی جزیروں کو ہوائی و بحری مرکز بنا کر مغرب کی طرف سے بھی اٹلی کی ہوائی و بحری قوت کو کمزور کرتا جا رہا ہے اور جس کا ثبوت ٹارنٹو میں مل چکا ہے۔ تاہم یہ جنگ کا صرف ایک رُخ ہے اور ہمیں دوسرے رُخ کو بھی نظر انداز نہ چاہئے یعنی اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہٹلر، اٹلی کی اس شکست پر صبر کر کے بیٹھ جائے گا، کیا وہ یونان کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہے گا اور کیا وہ اٹلی کی مدد نہ کرے گا۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے ابھی تک اپنے ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ اپنے اقدام کے لئے زمین طیار کر رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت اٹلی کی فوجوں کو ہٹا کر خود میدان میں آ جائے۔

پچھلے مہینے ہٹلر نے جتنی سیاسی چالیں چلی ہیں وہ ایک خطرناک مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ خطرہ کی گھنٹی کس وقت بج جائے۔ جاپان، اٹلی اور جرمنی کے اتحاد ثلثہ میں رومانیا، ہنگری، سلووکیا، شریک ہو چکے ہیں، بلغاریا ابھی تک شریک نہیں ہوا اور اسپین بھی اپنی غیر جانبداری کو قایم رکھے ہوئے ہے اور ہو سکتا ہے کہ بلغاریا اور اسپین کا پس و پیش یونان کی کامیابی کا نتیجہ ہو، لیکن ہم کو اس پر زیادہ اعتماد نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اگر ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر اپنی فوجوں کو اُن کے ملک کے اندر سے لیجانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر سوال خوشی یا ناخوشی کا باقی نہیں رہے گا بلکہ سینہ سپر ہو کر سامنے آ جانے کا ہوگا اور اس کی ہمت

تنہا نہ بلغاریا میں ہے نہ اسپین میں۔ اس لئے اسوقت تک اگر ہٹلر نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ روس اور ترکی کی طرف سے اُسے پورا اطمینان حاصل نہیں ہوا ہے اور جب تک ان دونوں کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے وہ آگے بڑھنے سے مجبور ہے۔

ترکی کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اظہار کر چکا ہے اور وہ اپنی غیر جانبداری پر قایم رہنے کے لئے ہر قربانی کے لئے آمادہ ہے، وان پاپن جرمن سفیر متعینۂ ترکی برلن سے کچھ تازہ ہدایتیں لیکر انقرہ پہونچا ہے اور یقیناً وہ کچھ نئی لالچ یا کوئی نئی دھمکی لیکر آیا ہوگا، لیکن اس وقت تک ترکی اس اسکیم میں شامل نہیں ہے جو یورپ میں جدید نظام قایم کرنے کے لئے ہٹلر نے سوچی ہے بلکہ برخلاف اس کے ترکی حکومت نے اپنی سلطنت کے اس یورپی حصہ کو جو بلغاریا و یونان سے قریب واقع ہے ایک زیرِ محاصرہ حصہ کی حیثیت دیدی ہے تاکہ اگر بلغاریا یا بلغاریا کی طرف سے جرمن افواج اس طرف آگے بڑھیں تو ان کو سرحد ہی پر روک دیا جائے۔

روس کی پالیسی البتہ بالکل معمہ بنی ہوئی ہے اور اسی پر لڑائی کے مستقبل کا انحصار ہے۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ نہ وہ خود میدان میں آنا چاہتا ہے اور نہ بلقان میں لڑائی کی آگ کو پھیلتے ہوئے دیکھنا پسند کرسکتا ہے فن لینڈ میں اس کو جو سبق ملا ہے وہ کم از کم ایک سال تک تو اسے کسی طرح لڑائی پر آمادہ کر ہی نہیں سکتا اور اسکے بعد بھی وہ دیکھے گا کہ اسے جرمنی کی کمزوری سے فایدہ اُٹھانا چاہئے یا اس کی قوت سے، کیونکہ اسٹالین کی موجودہ پالیسی چاہے کچھ ہو، لیکن سوویٹ حکومت کبھی اس بات کو نہیں بھلا سکتی کہ یورپ میں جدید نظام حکومت قایم کرنے والے وہی ہیں جن کے اتحاد کی بنیاد روس کی دشمنی پر قایم ہوئی تھی اور اگر آج کسی غرض کی بنا پر جاپان، اٹلی اور جرمنی اس کی دوستی کا دم بھر رہے ہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ کل غرض پوری ہونے کے بعد وہ پھر اپنے تیور نہ بدلدیں چنانچہ تازہ ترین خبروں سے روس کے اس اندیشہ کی تصدیق ہوتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بحر اسود کے آس پاس وہ کسی طرح جرمن اقتدار کو بڑھتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اس لئے ابھی تک بلغاریا محوری طاقتوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔

چونکہ ہٹلر نے خود اپنے قول و فعل سے یہ اُصول مقرر کر دیا ہے کہ کسی حکومت کو کبھی سچ بولنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُس سے کبھی یہ توقع رکھنا چاہئے اس لئے نہ خود اسے بلقان کی اُن ریاستوں پر بھروسہ ہے جو اس کے ساتھ شامل ہو رہی ہیں اور نہ ان ریاستوں کو یقین ہے کہ جو ہٹلر کہتا ہے اسے پورا کریگا بھی یا نہیں، بالکل یہی حال روس اور ترکی کا بھی ہے کہ وہ ہٹلر کے کسی معاہدہ کا اعتبار نہیں کرسکتے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنا کام نکال لے، اور جتنی دیر ہوتی جاتی ہے اس کی کامیابی کے امکانات ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔

ایک طرف اس کی یہ توقع ختم ہوگئی ہے کہ انگلستان کے ذرایع ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے مقصد میں
یاب ہوجائے گا، دوسری طرف اٹلی پر جو بھروسہ اس نے کیا تھا وہ بھی غلط ثابت ہوا، ساتھ ہی ساتھ
روزولٹ کے تیسری بار صدر امریکہ منتخب ہوجانے کی وجہ سے بھی اس کی توقعات کو سخت صدمہ پہونچا اسلئے
یہ تو ضرور چاہتا ہے کہ مشرق بعید میں جاپان کے ذریعہ سے بے چینی پیدا کرکے برطانوی حکومت کو بحر پاسفک
طرف بھی اُلجھا دے اور وسطی مشرق میں بلقان کی ریاستوں کو ملا کر موصل و عراق کی طرف سے بھی انگریزوں
کر میں مبتلا کر دے، لیکن بحر روم، سویز اور جبرالٹر پر انگریزوں کا اقتدار، بحر ہند میں سنگاپور کا زبردست بحری مرکز
پاسفک میں جزایر امریکہ کا وجود، اسپین، روس اور ترکی کا اپنے غیر جانبدار رہنے پر اصرار اور خود اس کے
متوحہ ملکوں کی آبادی میں اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے بے چینی پیدا ہونے کا اندیشہ یہ تمام باتیں ایسی ہیں
اس کی اسکیم کو پورا ہونے نہیں دیتیں۔

یہاں تو وہ حالات تھے جن سے جرمنی کی مشکلات کا پتہ چلتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھنا
چاہیئے کہ برطانیہ کی راہ میں کیا کیا دشواریاں حایل ہیں۔

سب سے بڑی بات جو برطانیہ کے لئے زیادہ پریشان کُن ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس کا کوئی ساتھی نہیں
ہے، پچھلی لڑائی میں فرانس، اٹلی، روس، آئرلینڈ سب اس کے ساتھ تھے اور امریکہ بھی کُھلم کُھلا اخیر میں شریک
ہوگیا تھا، لیکن اس مرتبہ فرانس ختم ہوچکا، آئرلینڈ، ترکی اور روس غیر جانبدار ہیں اور اٹلی مخالف۔ اس کے معنے
ہیں کہ وہ نہ سواحل آئرلینڈ سے فایدہ اُٹھا سکتا ہے نہ سواحل اٹلی سے اور اس طرح بحر اٹلانٹک اور بحر روم
دونوں اس کے لئے مخدوش ہوگئے ہیں، اسی کے ساتھ ناروے، بلجیم، ہالینڈ اور ڈنمارک کی پیداوار سے بھی
وہ محروم ہوگیا ہے، درانحالیکہ جرمنی کو نہ صرف وسط یوروپ کے تمام ممالک بلکہ روس اور ناروے سے بھی ہر قسم کا
ن پہونچ رہا ہے۔ رہ گیا امریکہ سو وہ بھی فوجی مدد نہیں دے رہا۔ اِدھر مشرق میں بھی جاپان مخالفت پر تُلا ہوا
ہے اور برما کو بُری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، الغرض جس حد تک دوسرے ملکوں کی اعانت و ہمدردی کا
تعلق ہے، برطانیہ اس سے بالکل محروم ہے اور سچ پوچھئے تو اس وقت مشرق سے لیکر مغرب تک سارا حصہ
س کے لئے محاذ جنگ بنا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خود برطانیہ کی سلطنت بہت وسیع ہے اور اس کے مقبوضہ ممالک اس کو ہر طرح کی
مدد پہونچا رہے ہیں، لیکن چودہ کرور روپیہ روز کا خرچ کوئی معمولی بات نہیں اور اسی لئے لارڈ لوتھین کو آخر کار
تسلیم کرنا پڑا کہ برطانیہ کی مالی حالت کمزور اور محفوظ سونے کی مقدار بہت کم ہوگئی ہے۔ اگر اسی کے ساتھ اُن
نقصانات کو بھی شامل کیجئے جو جرمنی کی بمباری سے انگلستان کی صنعت و تجارت کو پہونچ رہے ہیں، تو ہم

برطانیہ کی پریشانیوں کا صحیح اندازہ کرہی نہیں سکتے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے سب سے بڑی چیز جس نے برطانیہ کے پلّہ کو بھاری کر دیا ہے، اس کا عزم و استقلال ہے۔ برطانوی قوم کی یہ خصوصیت کہ وہ ہر مصیبت کا مقابلہ نہایت اطمینان سے کرتی ہے اور آخر وقت تک ہمت نہیں چھوڑتی ایک ایسی زبردست سپر ہے جسکے مقابلہ میں دشمن کو ہتھیار ڈالدینا ہی پڑتا ہے۔

انگریز قوم اس میں شک نہیں، بڑی محتاط، نہایت دور اندیش اور حد درجہ مستقل مزاج قوم ہے، نہ وہ کسی بات سے گھبراتی ہے اور نہ کبھی غیر دانشمندانہ اضطراب اس میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ لڑائی کو بھی بالکل فلسفیانہ حیثیت سے دیکھتی ہے اور ایک فلسفہ ہی کی طرح اس کا حل بھی چاہتی ہے۔ اس لئے یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ موجودہ مشکلات کو آسانی سے دور نہ کرسکے، لیکن ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں وہ جرأت و پامردی سے کام نہ لے، ممکن نہیں۔ ایک سال تین مہینے لڑائی کو شروع ہوئے ہوچکے ہیں اور ہرچند اس دوران میں یورپ کا نقشہ بالکل بدل چکا ہے، لیکن برطانوی حکومت کے حدود بدستور اپنی جگہ قایم ہیں۔ سب سے زیادہ زور جرمنی نے انگلستان پر صرف کیا، لیکن وہ لندن ایسی گنجان بھری آبادی میں بھی پریشانی کے آثار پیدا نہ کرسکا، جہاں اس نے لاکھوں بم گرائے۔

یقیناً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حفاظت کے انتظامات یہاں بہت مکمل ہیں اور دشمن اپنے حملوں سے پورا فایدہ نہیں اُٹھانے پاتا، لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا سبب اس قوم کی قوت تحمل ہے جو باوجود ہر وقت خطرہ کی زندگی بسر کرنے کے، اضطراب و پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتی اور مردانہ وار ان مصائب کا مقابلہ کررہی ہے۔ برخلاف اس کے برطانوی بمباری نے جرمنی کے شہروں میں بے چینی پیدا کردی ہے اور روہر کا علاقہ تقریباً خالی ہوچکا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس وقت جرمنی و برطانیہ دونوں مشکلات میں مبتلا ہیں، لیکن ایک ان کا مقابلہ پروپاگنڈا اور سیاسی مکروفریب سے کررہا ہے اور دوسرا صرف اپنی ہمت و استقلال سے، لیکن چونکہ فطرت کے قانون میں کوئی کلیہ ہمیں ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ کامیابی ہمیشہ صداقت ہی کو ہوتی ہے یا یہ کہ کذب و باطل کو کبھی شکست نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس جنگ میں برطانیہ کو شکست ہوئی تو دُنیا میں پھر اسی فتنہ کا دور شروع ہوگا جو اب سے صدیوں قبل ایشیا کے شمال مغرب سے اُٹھا تھا، اور ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہوگا سوائے اس کے کہ اُس کا سرچشمہ تاتار تھا اور اِس کا جرمنی!

آیندہ پرچہ جنوری ۱۹۴۱ء کا ہوگا

اور اسی میں فروری کا پرچہ بھی شامل ہوگا، کیونکہ اسکی ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات کی ہے۔
اس لئے جن حضرات کا چندہ دسمبر اور جنوری میں ختم ہوتا ہے ان دونوں کا اپنا سالانہ چندہ اخیر دسمبر یا ۲ر جنوری تک بھیجدینا چاہئے ورنہ ۳ر جنوری سے وی۔پی کی روانگی شروع ہوجائے گی۔ اگر کوئی صاحب دسمبر کے بعد خریدار نہ رہنا چاہیں تو براہ کرم فوراً مطلع کردیں تاکہ ان کے نام وی پی نہ بھیجا جائے، ورنہ وی پی کی واپسی سے دفتر کو نقصان پہونچے گا۔
جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ اپنے موضوع کے لحاظ سے جتنا اہم اور جسقدر دلچسپ ہوگا، اسکے متعلق اظہار کی ضرورت نہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے کہ موجودہ عہد کے تمام اکابر شعراء کا حال اور انتخاب کلام خود انھیں کا لکھا ہوا تذکرہ نویسوں اور انتقاد نگاروں کے لئے کتنی بڑی چیز ہے۔
اسی کے ساتھ رنگِ تغزل پر ایک بسیط مقالہ، اڈیٹر نگار کا ہر شاعر کے کلام کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ اور "مئے دو آتشہ" کے عنوان سے حضرت نیاز کا انتخاب لاانتخاب دوسری خصوصیات اس نمبر کی ہیں
ایجنٹ صاحبان، ابھی سے اطلاع دیدیں کہ ان کو کتنے پرچے درکار ہوں گے، کیونکہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے یہ نمبر زیادہ تعداد میں شایع نہیں کیا جا رہا ہے اور پھر مشکل ہی سے ہم فراہم کرسکیں گے یہ پرچہ وقتی چیز نہیں ہے کہ اس کی مانگ ختم ہوجائے۔ بلکہ جتنا زیادہ وقت گزرتا جائے گا اتنی ہی زیادہ اس کی مانگ ہوگی۔ قیمت فی پرچہ دو روپیہ۔ کمیشن ۲۵ فی صدی۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

سطحیات سید سلیمان ندوی

نقوش سلیمانی مولانا سید سلیمان ندوی کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو اُردو زبان و ادب سے متعلق ان کی زبان قلم سے نکلیں، زیر نظر مجموعے میں ۹ خطبات، ۱۴ مقالات اور ۱۱ مقدمات ہیں جو سب کے سب معارف، ہندستانی اور دوسری جگہ شایع ہو چکے ہیں۔

خطبوں میں شان خطابت ہونی چاہئے جو موجود ہے، مقالات میں "اکبر کا ظریفانہ کلام" اچھا ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں، "زبان اُردو کی ترقی کا مسئلہ ایک خط کا جواب ہے وہ مضامین کے مجموعہ کے بجائے مکاتیب میں رہتا تو زیادہ اچھا تھا اُردو انسائکلو پیڈیا اور ہوم رول سے پہلے" سطحی سے ہیں، لیکن سب سے زیادہ نا امیدی مقدمات کو دیکھکر ہوتی ہے، گلستان امجد، خمستان، خیابان، وغیرہ پر مقدمے نہایت سرسری طور پر لکھے گئے ہیں، اولاً توان کتابوں پر سید صاحب کو لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، اس مجموعہ میں وہ رسوائے عالم مقدمہ "شعلۂ طور" بھی ہے جو کتاب میں شایع ہوکر پھر نکال دیا گیا

نقوشِ سلیمانی، مجموعی لحاظ سے بہت ہی ناکامیاب اور مایوس کن مجموعہ ہے اور چونکہ سید صاحب کی اس کتاب سے بہتوں کے گمراہ ہو جانے کا ڈر ہے، اس لئے ہم اس کی بعض غلطیوں پر لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

سید صاحب نے ذیل کے تین شعر شیخ شرف الدین احمد بہاری کے بتائے ہیں:

لودھ پھٹکری مردہ سنگ	ہلدی زیرا ایک ایک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں چار	اُردبھر موتھا اس میں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے	نینا پیرا پل میں ہرے

اولاً تو اس کا کوئی معتبر ثبوت نہیں کہ یہ دوہے مخدوم کے لکھے ہوئے ہیں، دوسری بات یہ کہ یہ تینوں شعر آزاد کی آب حیات میں موجود ہیں اور وہ انھیں امیر خسرو کا بتاتے ہیں، سید صاحب نے اشعار نقل بھی صحیح نہیں کئے ہیں ظاہر ہے کہ "سنگ" کا قافیہ "ٹنگ" ہوگا نہ کہ "ٹنک" چوتھے مصرعہ میں "پھر" نہیں "بھر" ہے، اسی طرح "موتھا" بھی صحیح نہیں یہ اصل میں "تھوتھا" ہے چھٹا مصرع آب حیات میں یوں ہے: - "تُرت پیر نینوں کی ہرے"

اور ہمارے خیال میں یہی صحیح ہے جیسا کہ ہماری ایک قدیم بیاض سے معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار کو صاحب "سیرت الشرف" نے بھی مخدوم کی طرف منسوب کیا ہے اور اپنے تفحص بلیغ کی داد چاہی ہے، لیکن ثبوت کوئی پیش نہیں کیا۔

سیرت الشرف میں ان اشعار کی صورت کچھ بدلی ہوئی ہے دوسرا اور تیسرا شعر اس طرح ہے:

افیم سچنے بھر مرچیں چار کراؤ برابر تھوتھا ڈار

پوست کے پانی سے پوٹری کرے مینن کا بیدا ترتے ہرے

صاحب کتاب نے مخدوم صاحب کے کچھ اشعار اور بھی درج کئے ہیں:

پات کسونجی بکھ ہرے اور پھول رتوندھی جائے جڑ کسونجی باگھ رونیں ہیچ سے ہیچ نسائے

تل، تیسی، دانا تیلھر، تال، کھانا

گھی شکر میں سانا کھائے زنانہ ہو مردانہ

ہڑ بھیڑا آونلا اور چتیا تنک سونٹھ لادے پتیا

کھانسی سانسی سب جرجائے آن نہ جانوں کتنا کھائے

فاضل مولف نے ذیل کا شعر بھی مخدوم کی طرف منسوب کر دیا ہے جو شیخ مظفر بلخی کا بتایا جاتا ہے:

جی لگن میں ہے کہ آئی ہے سہانی رتیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

ہمارا خیال ہے کہ یہ شعر ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کا نہیں، آخرالذکر شاعر تھے اور برہان تخلص کرتے تھے انکا کلام نہیں ملتا ہے، دیوان فارسی کا ایک نادر مخطوطہ مولانا ظفر الدین صاحب قادری استاذ ہیئت و حدیث جامعہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ہماری نظر سے گزر چکا ہے، ان کے کلام کا انداز اس شعر سے بہت حد تک مختلف ہے اور پھر یہ زبان بھی ان کے عہد کی نہیں۔

حیرت ہے کہ سید صاحب انشاء اللہ خاں انشا کو لکھنوی سمجھتے ہیں، سید انشا کے متعلق تذکروں میں مذکور ہے کہ ان کے بزرگ نجف اشرف یا کشمیر سے آئے تھے وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آنا ہوا تھا، دہلی میں آکر سکونت اختیار کرلی تھی، ہمارے خیال میں یہ بھی صحیح نہیں انشا نہ دہلی کے تھے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کب تک دہلی میں رہے شجاع الدولہ کے زمانہ (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۸ھ) میں مرشد آباد سے فیض آباد گئے تھے اور ان کی وفات کے بعد وہاں سے رخصت ہوگئے ان کے کلیات سے اُن پر مختلف السنہ ہند سے واقف ہونے کا پتہ چلتا ہے اور تعجب نہیں کہ کسی ایک جگہ جم کر رہنے کے بجائے یہ مختلف اقطاع ہند کی سیر کرتے رہے ہوں۔

سید انشا کی دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ نہیں یہ سنہ تکمیل کا ہے کتاب کی ابتدا شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہوچکی تھی جن کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے اسلئے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ہی دریائے لطافت کا دھارا بہ نکلا تھا،

"دریائے لطافت" لکھنؤ ہی میں لکھی گئی یہ محل نظر ہے، دیوان مصحفی کا لکھنؤ سے چھپ کر شایع ہونا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا مصحفی کا تقریباً سارا کلام اب تک غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے، صرف دیوان اُر دو کی چار جلدیں کچھ عرصہ ہوا رام پور سے شایع ہوئی تھیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ نہ شایع ہونا ہی بہتر تھا، وہ دواوین مصحفی کے تو نہیں ہاں امیر مینائی مرحوم کے کہے جا سکتے ہیں، کیونکہ انھیں کے ذوق کا انتخاب ان میں پایا جاتا ہے۔

سید صاحب نے ولی کا سال وفات ۱۱۵۵ھ لکھا ہے، یہ آج سے ۵۵ برس پہلے کی تحقیق معلوم ہوتی ہے ولی کے متعلق جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں انسے سید صاحب کو غافل نہیں رہنا چاہئے تھا، صحیح ۱۱۱۹ھ ہے، بعض حضرات ۱۱۴۳ھ کو صحیح سمجھتے ہیں انھیں اس شعر سے دھوکا ہوا ہے:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں،

لیکن اصل یہ ہے کہ نہ یہ ولی کا سال وفات ہے اور نہ یہ شعر ولی کا ہے، دیوان ولی کے جو نسخے اب تک ملسکے ہیں ان میں سے کسی میں یہ شعر نہیں، یہ شعر در اصل مضمون کا ہے صاحب تذکرہ "گلشن گفتار" اور چمنستان شعرا نے اس شعر کو خفیف تصرف کے ساتھ مضمون کے نام سے منسوب کیا ہے:

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین،   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس کی ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے، مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے: "دیوان ولی در شاہجہان آباد آمد" لوگوں نے غور نہیں کیا اور سمجھ لیا کہ وہ خود دہلی آئے تھے حالانکہ اس میں صرف ولی کے دیوان کے آنے کا ذکر کیا ہے۔

اب رہی ۱۱۱۹ھ کی سند اس کے لئے یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل   والی ملک سخن صاحب عرفاں ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت   باد پناہ ولی ساغر کوثر علی

کچھ دن ہوئے لاہور کے ایک پروفیسر صاحب نے اورینٹل کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ ولی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ نہیں۔ ۱۱۱۸ھ ہے اور اس قطعہ سے بھی مستخرج ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ قطعہ صنعت تعمیہ میں لکھا گیا ہے چوتھے مصرع سے ۱۱۱۸ھ نکلتے ہیں لیکن شاعر نے سر الہام "ا" سے تعمیہ ہے اب ۱۱۱۹ھ ہوگئے سید صاحب ولی کو دکنی سمجھتے ہیں حالانکہ ولی گجراتی تھے، آزاد نے صاف لکھا ہے "احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے (آب حیات صفحہ ۷۹) آزاد کے بیان اکثر غلط بھی ہوتے ہیں لیکن بعض مرتبہ بہت اہم بات کہہ جاتے ہیں۔

میر حسن نے بھی یہی لکھا ہے، خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی "گلشن گفتار" اور قایم "مخزن نکات" میں اسے گجراتی بتاتے ہیں، کتاب خانۂ مولانا ظفر الدین قادری میں دیوان ولی کا ایک قدیم قلمی نسخہ نظر سے گزرا لوح پر لکھا ہوا تھا "دیوان ولی محمد گجراتی" اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ وہ گجراتی تھے دوسری بات یہ کہ ان کا صحیح نام

"ولی محمد" تھا، یہ بھی یاد رہے کہ یہ نسخہ ولی کی حیات ہی میں لکھا گیا، یہ نسخہ بعض حیثیتوں سے بہت اہم ہے۔

اس مجموعہ میں "ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی" کے عنوان سے ایک مقالہ درج ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ اس مضمون سے لوگوں کو کچھ نئی باتیں معلوم ہوں گی ہمارا خیال ہے کہ اُردو شہ پارے، یورپ میں دکنی مخطوطات وغیرہ جس کی نظر سے گزرے ہیں اس کے لئے اس مضمون میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ہم مجموعی حیثیت سے ڈاکٹر زور کے مضمون کو جو اُردو شہ پارے میں درج ہے اس مضمون پر ترجیح دیتے ہیں۔

وہ یہ بھی صحیح نہیں فرماتے کہ ہاشم علی کا حال کہیں نہیں ملتا، یہ بھی صحیح نہیں کہ ہاشم علی ولی کا معاصر تھا، ہاشم علی گیارھویں صدی کے آخر یا بارھویں صدی کی ابتدا یا آخر میں پیدا ہوا ---------- برخلاف ولی کے کہ وہ تقریباً سنہ ۱۰۹۳ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوا دونوں زمانوں میں بہت فرق ہے ایک بارھویں صدی کی ابتدا میں فوت ہوتا ہے اور دوسرا بارھویں صدی کے آخر میں لیکن سید صاحب دونوں کو ہمعصر سمجھے ہوئے ہیں

ہاشم علی کے جو اشعار درج ہیں وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ "دیوان حسنی" کا وہ نسخہ بہت بدخط اور مہمل لکھا ہوا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تصحیف ہو لیکن سید صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس کی تصحیح کرتے ورنہ ایک عامی کاتب میں اور سید صاحب میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

اشعار کی غلطیوں کی سب سے بڑی وجہ شاید سید صاحب کی قدیم دکنی اُردو سے ناواقفیت ہے اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں عرفی کا مقولہ "شعر گفتن چہ ضرور" دہرانا پڑے گا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ جب اس موضوع پر مضامین لکھے جا چکے ہیں اور جن کا سید صاحب کو بھی علم ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ مضمون اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھا گیا ہے اور نظر ثانی ۱۹ اگست سنہ ۳۰ء کے بعد تک ہوتی رہی اور ڈاکٹر زور کی کتاب "اُردو شہ پارے" ۱۵ ستمبر سنہ ۲۹ء سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔

اثر کا نام میر محمد نہیں محمد میر ہے یہ مصحفی کا بیان ہے جو صحت سے دور ہے۔ اثر کے صحیح نام کے لئے دیکھئے تذکرۂ میر حسن ص۲۶، مخزن نکات ص۱۷، نکات الشعراء ص۱۵۱، گلزار ابراہیم ص۳۶۔

سید صاحب نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی کے اواخر کی تصنیفات میں اُردو کا نام لغوی اضافت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن تیرھویں صدی میں کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور زبان کا نام اُردو ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اپنے خیال میں سب سے پہلی کتاب جس میں اُردو کا لفظ موجود ہے ایک فقرہ نقل کیا ہے

"در زبان ہندی کہ مراد از اُردو است خیلے فصیح و بلیغ بود"

(مخزن الغرائب)

سید صاحب ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تذکرۂ مخزن الغرائب کو احمد علی سندیلوی نے ۱۲۱۸ھ میں مرتب کیا، اس لحاظ سے یہ کوئی قدیم کتاب نہیں ہوئی وہ اگر اپنے مطالعہ میں تھوڑی سی وسعت اور دیتے تو ۱۲۱۸ھ سے پہلے کی کتابوں اور تذکروں میں یہ لفظ موجود پاتے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی متوفی ۱۲۴۰ھ اپنے تذکرۂ ہندی میں حضور کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"نقل است کہ روزے در شاہ جہاں آباد بہ خانہ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف "اور" بمعنی طرف تقرر داشت وازیں جہت بعضے از فصحا اور اخلاف اُردو شمردہ پیرویش نہ کردند"

(تذکرۂ ہندی صفحہ ۸۲)

پھر نثار کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

چوں اصلش معمار است لہذا بر بنائے ریختہ ہم بہ خوبی نہادہ ادائے زبان اُردو چنانچہ باید از زبان ندرت بیانش میشود ۱۵۵

مصحفی کے تذکرۂ ہندی کی ابتدا ۱۲۰۰ھ سے بھی پہلے ۱۱۹۹ھ کے قریب ہو چکی تھی۔

مصحفی کے یہاں یہ لفظ اور بھی کئی جگہ ملتا ہے، مہجور کے حال میں ہے:

"سہ کتاب در زبان اُردو و ریختہ شکر آمیختہ از خامۂ فکرش رونق سواد پذیرفتہ"

قہر کے تذکرہ میں قتیل کے متعلق درج ہے:

"او ہم باوصف فارسی گوئی دعوی اُردو دانی ریختہ داشت"

اگر ہمارا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو ہم نے یہ لفظ مصحفی کے ابتدائی دواوین میں بھی کہیں دیکھا ہے لیکن اُنکے دواوین اتنے ضخیم ہیں کہ اسوقت اس لفظ کو ڈھونڈھکر نکالنا مشکل ہے، اگر یہ لفظ دیوان اول میں ہے تو اس کا سال ترتیب ہمارے خیال کے مطابق ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ ہے۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کی سب سے پہلی ڈکشنری فالن صاحب نے لکھی، حالانکہ اس سے پہلے بیسوں لغت لکھے جا چکے تھے۔

فرگسن نے بہت پہلے اُردو کا ایک لغت لکھا جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں چھپا۔

جنرل ولیم کرک پاٹرک نے بھی ایک لغت لکھا اسکے تین حصے کئے مگر صرف ایک حصہ لندن سے ۱۷۸۵ء میں شایع ہو چکا۔

میجر ڈیوڈ ٹامس رچرڈسن نے بھی اُردو کا ایک لغت لکھا تھا، مگر یہ شایع نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر ٹیلر نے بھی ایک لغت ۱۸۰۸ء میں طبع کرایا تھا اس کتاب کو پھر ڈاکٹر ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے نظر ثانی کے بعد پھر چھپوایا۔

گلیڈون نے بھی دو جلدوں میں ایک لغت لکھا۔

جان شکسپیر نے بھی ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرایا۔

فوربس نے بھی ایک لغت لکھا جو لندن سے ۱۸۴۸ء میں شایع ہوا۔

برٹرنیڈ نامی ایک فرانسیسی نے بھی ایک لغت لکھا جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوا۔

بلیٹ نے بھی ایک لغت لکھا، اور طبع بھی ہوا۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی کا سال وفات ۱۲۴۴ھ نہیں ۱۲۴۶ھ ہے اسی طرح شیخ فرید شکر گنج کا سال وصال ۶۶۸ھ صحیح نہیں (نقوش صفحہ ۴۰) خلاصۃ التواریخ میں شنبہ ۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ، بعض دوسری کتابوں میں ۶۷۰ھ درج ہے سید صاحب کا یہ فرمانا کتنا مضحکہ خیز ہے کہ خواجہ کی ولایت مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ میں ہوئی، یہ بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عالم شیر خوارگی ہی میں خواجہ کو ولایت مل گئی تھی۔ نصیر الدین حسین نے فارسی علی بابا تبریزی سے پڑھی یہ محض گپ ہے۔ سید صاحب کو ایسی گپوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مولانا علم الدین حسین کی تصنیف کا نام "سلم الاخلاق" نہیں "سلم الافلاک" ہے یہ عربی زبان میں ہیئت کی ایک کتاب ہے اور ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ "نقوش سلیمانی" کے یہاں وہاں سے ایک سرسری مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے کتاب اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور جو مقامات محل نظر نظر آئے ان کا ذکر کر دیا گیا، اب ہم چاہتے ہیں کہ کسی ایک مضمون کو لیکر اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے اور یہ مضمون "یادگار عشق" کا مقدمہ ہے۔ سید صاحب نے پہلے چند صفحوں کی تمہید لکھی ہے اور تمہید اچھی ہے اس میں انھوں نے بہار کے قدیم علماء و فضلا کا ذکر کیا ہے، پھر اصل مبحث کی طرف آئے ہیں اور عشق اور کلیات عشق پر بڑی سنجیدگی سے بحث کی ہے، کہیں کہیں صاحب کتاب کی لغزشوں کی تصحیح بھی کر دی ہے لیکن پھر بھی بہت سی غلطیاں کتاب میں رہ گئی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید صاحب ان بیانوں کو غلط نہ سمجھتے ہوں۔

اب ہم مختصر طور پر ان اغلاط کا ذکر کرتے ہیں جو سید صاحب کے مقدمہ میں نظر آتی ہیں۔

صفحہ ۳۹۶ پر فرماتے ہیں:

"اس علمی مرکز کے قدیم سخن وروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو ولی دکنی میر و سودا اور میرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے ہم پہلو تھے، ملا محمد علیم تحقیق، عبد القادر بیدل، اشرف خاں فغاں، سید محمد شاکر ناجی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی بسمل، شیخ غلام یحییٰ حضور، میر محمد تسلیم اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور یہاں گزرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اُردو زبان نے ترقی پائی ہے۔"

صفحہ ۴۰۶ پر ان ناموں میں اور اضافہ فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔۔ خواجہ امین الدین امین، ملا محمد علیم تحقیق، شیخ محمد روشن جوشش، میر باقر حزیں، ہیبت علی خاں حسرت، میر غلام حسین شورش، رحمت اللہ عشقی، شاہ رکن الدین عشق، غلام حسین محرم، آغا حسین قلی خاں عشق نظریت الملک کوکب

اشرف علی خاں فغاں، میرزا احمد علی فدوی، محمد شاکر ناجی، شیخ غلام علی راسخ، میرزا مظہر علی جذب، شیخ غلام یحیٰی حضور، میر محمد تسلیم، راجہ پیارے لال الفتی، شیخ محمد عابد دل، شاہ الفت حسین فریاد ...... "

ہمارے خیال میں سید صاحب کی یہ فہرست بہت ہی مسرفانہ ہے اور ان کا یہ مختصر سا بیان اغلاط سے بھرا پڑا ہے، یہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ دلایل و شواہد سے ثابت کیا جاتا کہ اس فہرست کے بعض شعرا کو بہاری یا عظیم آبادی سمجھنا مدرجہ سادہ لوحی ہے، ہم کوشش کریں گے کہ مختصر لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیں۔

پہلی بات تو یہ کہ سید صاحب ریختہ گو شعرا کا تذکرہ فرما رہے ہیں اور پیش کرتے ہیں بیدل کو جو فارسی گو شاعر ہے، اردو میں اب تک اس کے صرف دو شعر مل سکے ہیں اور وہ بھی مشکوک سے ہیں یہ اشعار وہی ہیں جنھیں میر و قایم نے اپنے تذکروں میں نقل کیا ہے۔ یہ اشعار اگر بیدل کے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پر گو شاعر ہوتے ہوئے اس نے صرف دو شعر کیوں کہے اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اردو میں بہت سے اشعار کہے تھے مگر وہ ضایع ہو گئے تو تذکروں اور قدما کی تصانیف سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

بیدل کو عظیم آبادی سمجھنا بھی عجیب بات ہے ہمیں اس کا علم ہے کہ مصحفی نے بھی یہی لکھا ہے لیکن مصحفی کا لکھنا کوئی وزن نہیں رکھتا، مصحفی بیدل کے معاصر بھی نہیں کہ ان کی بات قابلِ قبول ہو، ان دونوں میں تقریباً سو برس کا فصل ہے، مصحفی کا سالِ وفات صحیح قول کی بنا پر ۱۲۴۰ھ ہے اور بیدل کا ۱۱۳۳ھ مصحفی نے ان کا حال یا تو کسی غیر معتبر راوی سے سنا یا ادھر اُدھر سے نقل کر لیا، ان حضرت کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بیدل کا سال وفات ۱۱۳۳ھ ہے ۱۱۴۳ھ نہیں۔

اور تذکرہ نگاروں میں طاہر نے ان کا وطن لاہور، صاحب مجموعۂ نغز نے بخارا، اور خوشگو نے اکبر آباد بتایا ہے، ہمارے خیال میں خوشگو کا بیان زیادہ صحیح ہے، کیونکہ خوشگو بیدل کا بڑا معتقد تھا اور اس نے لکھا ہے کہ اسے سیکڑوں بار بیدل سے ملنے کا اتفاق ہوا، خوشگو پہلا تذکرہ نگار ہے جس نے تفصیل سے بیدل کے حالات لکھے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا بیان زیادہ صحیح ہوگا، خود عظیم آبادی تذکرہ نگاروں میں عشقی اور نواب ابراہیم خاں خلیل نے انھیں اکبر آبادی بتایا ہے۔

عظیم آبادی شعرا میں اشرف علی خاں فغاں کو شمار کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی یہ دہلوی تھے، چند مشہور تذکروں کی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

(الف) " مولدش دہلی است" سفینۂ ہندی صفحہ ۱۴۴ از بھگوان داس

(ب) نواب ابراہیم خلیل جو فغاں کے صرف معاصر ہی نہ تھے بلکہ وہ خود لکھتے ہیں " با راقم آثم ربطے داشت" انکا بیان سنئے

" از دہلی پیش عم خویش موسوم بہ محمد ایرج خاں وارد مرشد آباد و باز بہ دہلی رفت، و بعد چند سال مراجعت کردہ

در عظیم آباد..... اقامت ورزیدہ" (گلزار ابراہیم صفحہ ۱۹۲)

(ج) شفیق بھی انھیں دہلوی لکھتے ہیں:

"فغاں دہلوی ..... پس از چندے در اوائل عشرۂ سابعہ بعد مایۃ والف رخت جانب عظیم آباد کشید اعیان وارکان آں مقام قدم او را گرامی داشتند و بالفعل در مزاج راجا مذکور شتاب رائے ناظم صوبہ عظیم آباد دخل تمام دارد" (گل رعنا صفحہ ۲۷)

(د) فغاں کے دہلوی ہونے کے ثبوت میں اور دلایل سے قطع نظر کرکے ہم صرف ایک عظیم آبادی تذکرہ نگار آغا حسین قلی خاں عاشقی کے "نشتر عشق" سے فغاں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جو سترہ اٹھارہ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، چونکہ یہ تذکرہ بہت کم یاب ہے اس لئے ہم فغاں کا پورا ترجمہ من وعن نقل کر دیتے ہیں، اس سے فغاں کی وطنیت کے علاوہ ان کے حالات، پر بہت اچھی طرح روشنی پڑتی ہے، جو حضرات کتب خانے آئے اور قلمی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت اُٹھائے بغیر تحقیقی مضامین لکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان کے لئے یہ اقتباس بہت مفید ہوگا،

"فغاں اشرف علی خاں شاہ جہاں آبادی مشہور بکوکہ چوں مادر آں مرحوم احمد شاہ بن فردوس آرام گاہ حضرت محمد شاہ را شیر دادہ بود لہذا بایں لقب شہرت داشت، در اوائل عہد احمد شاہ مرحوم از دہلی متوجہ دیار مشرق شد واول صوبہ اودھ رسیدہ بہ نواب شجاع الدولہ بہادر پیوست، و چندے در آں جا بسر ساخت وبعد آں در سنہ یکہزار و یک صد و ہفتاد بہ شہر عظیم آباد رفتہ بہ راجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار توسل جست۔ و راجہ قدر دان بہ خوب ترین وجہ با وپیش آمدہ بہ رفاقت خود کشید و متکفل معاش او گردید و بہ وساطت و سے خطاب ظریف الملک از حضور شاہ عالم بادشاہ مغفور کہ دراں ہنگام در بلدہ الٰہ آباد بر ونق پذیر بود دریافت۔ و دو سہ دیہہ بہ طریق آل تمغا حصول ساختہ بہ فارغ البالی وخوشحالی اوقات بسر می نمود سوائے آں دیگر امرا واعزاء آں شہر سلوک و مراعات با وی کردند وعزت وخاطرش می نمودند چنانچہ اولاد آں مرحوم تا تحریر مجموعہ ہذا در شہر عظیم آباد موجود اند واز ہماں معاش مذکورہ زندگانی می نمایند گویند خاں مذکور کمال شگفتہ مزاج بود و از بس ظرافت در مزاج برخاطر داشت، نوبتے مکان پختہ برائے سکونت خود بنا نہاد و لعبد تیاری آں احباب را ضیافت کرد و دراں مجلس عندالاذکار بر زبان آورد، کہ می خواہم کدام نشانے بر مکان درست سازم تا ازاں دریافت شود کہ مکان فلانے است خدمت گارے خاں مرحوم ایستادہ بود دست بستہ عرض کرد کہ نشان مکان بہ خاطر فدوی خوب رسیدہ است، چوں خاں استفسار کرد گفت کہ بالائے دروازہ دو پستان بسازند تا مرداں دریافت کنند کہ ایں مکان اشرف علی خاں کوکہ است خان وحاضرین بخندہ در آمدند دو سے را انعام نمودند۔ اکثر تلاش نظم بہ زبان ریختہ می کرد و گاہ گاہے فکر فارسی ہم می نمود"

مختصر یہ کہ فغاں دہلوی تھے آخر عمر میں عظیم آباد آئے اور یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہیں ....

ان کی قبر کا بھی پتہ چل گیا ہے جس پر یہ کتبہ درج ہے :

کوکہ خاں آں بہار باغ سخن　　سوئے خُلدِ بریں زدنیا رفت
کرد مفتوں چو فکر تاریخش　　گفت ہاتف سرورِ دلہا رفت

سال وفات ۱۱۸۶ھ مستخرج ہوتا ہے، یہی عشقی نے لکھا ہے، اور یہی صحیح ہے، دتاسی کا لکھنا کہ سال وفات ۱۱۹۶ھ ہے صحت سے دور ہے، راقم نے اس سلسلہ میں ان کے دیوان اُردو کے بھی کئی قلمی نسخے دیکھے لیکن ان میں بھی ان کے عظیم آبادی ہونے کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

شاہ رکن الدین عشق پر سید صاحب نے کئی صفحے سیاہ کئے ہیں حالانکہ وہ عظیم آبادی کسی طرح نہ تھے، وہ بلاشبہ دہلوی تھے، ان کی شاعری کی ابتدا وہیں ہوئی، وہیں پروان چڑھی، بہار کی شاعری کا ان پر مطلق اثر نہیں ہے اور نہ وہ اس عمر میں یہاں آئے تھے کہ ان کی شاعری کسی رنگ سے متاثر ہو سکتی، میرزا علی لطف نے انھیں شاہ جہاں آبادی میر حسن نے " اصلش از شاہ جہاں آباد" اور نواب ابراہیم خلیل نے " از عمدۂ مشائخ شاہ جہاں آباد" لکھا ہے۔

محمد علی فدوی کو بھی عظیم آبادی کہنا صحیح نہیں، تذکرۂ میر حسن میں ہے "اصلش از شاہ جہاں آباد" صفحہ ۱۲۸۔ مسرت افزا میں ہے " وطن اصلی وے دہلی است"(ــــــ)۔ علی لطف اور نواب ابراہیم خلیل بھی اسے دہلوی ہی لکھتے ہیں ـ خود عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش لکھتا ہے " از صاحب طبعان شاہ جہاں آباد است"ــــــ عظیم آباد میں ان کا قیام مسلّم لیکن اس سے وہ عظیم آبادی تو نہیں ہو گئے، یہاں وہ کچھ دن رہے تھے ضرور لیکن جیسا میر حسن نے لکھا ہے وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھے کبھی عظیم آباد رہے کبھی مرشد آباد اور کبھی فیض آباد۔

مزاج اور یک جا قرار نمی کند گاہے در عظیم آباد وگاہے بہ مرشد آباد وگاہے بہ فیض آبادمی ماند والحال شنیدہ ام کہ در بنگالہ - - - - بسر می برد - صفحہ ۱۴۸۔

میر باقر حزیں کا شمار بھی عظیم آبادی شعرا میں کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ میر حسن اور قائم نے " از سادات اکبر آباد" لکھا ہے، گردیزی بھی انھیں اکبر آبادی لکھتا ہے ایک زمانہ تک بنگالہ میں قیام بھی ثابت ہوتا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۸۰۔ نواب ابراہیم خلیل کے دوست ہیں اگر وہ عظیم آبادی ہوتے تو وہ گلزار ابراہیم میں ضرور لکھتے۔

حیرت ہے کہ سید صاحب، سید شاکر ناجی کو بہاری یا عظیم آبادی سمجھتے ہیں، میر حسن شفیق اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے صاف لکھا ہے " متوطن شاہ جہان آباد بود"۔ قائم کا بیان بھی بہت واضح ہے : " زادگاہ او دار الخلافت شاہجہاں آباد است" خلیل نے بھی یہی لکھا ہے۔

اسی طرح جبار علی بسمل اور راجہ پیارے لال اُلفتی کو بھی بہاری نہیں کہہ سکتے، بسمل کا قیام کچھ دنوں کے لئے عظیم آباد میں ضرور تھا لیکن اس سے وہ عظیم آبادی تو ہونے سے رہے، الفتی بھی دہلوی تھے، آخر میں عظیم آباد میں آ کر بس گئے تھے

سید صاحب نے شتاب رائے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود بھی شاعر تھا اور شعرا کا مربی و سرپرست تھا" ہمیں اپنی بے بصری پر افسوس ہے کہ کسی تذکرے یا تاریخ میں شتاب رائے کے شاعر یا ادب نواز ہونے کا ذکر نہ دیکھ سکے، وہ شعرا کا مربی و سرپرست تھا اس کا بھی ہمیں علم نہیں ایک اشرف علی خاں فغاں ان کے یہاں لازم ضرور تھے اور وہ بھی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شاید مصاحب و ظریف کی حیثیت سے ورنہ شتاب رائے انھیں ظریف الملک و مصاحب الدولہ کے خطاب نہ دیتے۔

شتاب رائے کے بعد سید صاحب نے راجہ بہادر راجہ کا نام لکھا ہے ہمیں یاد آتا ہے کہ سید صاحب اپنے پہلے کسی مضمون میں اسے شتاب رائے کا بیٹا قرار دیا ہے یہ غلط فہمی انھیں غالبًا لالہ سری رام کے خمخانۂ جاوید سے ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ شتاب رائے کے تین بیٹے تھے اور تینوں شاعر تھے ایک کا تخلص عاشق دوسرے کا مجبور تیسرے کا گریاں، راجہ کسی کا تخلص نہ تھا بعض ذمہ دار حضرات مہاراجہ کلیان سنگھ کا تخلص راجہ بتاتے ہیں اور سند میں مجموعہ نغز پیش کرتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ قاسم نے غلطی سے ایسا لکھا ہے، عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش، عشقی عبرتی، ان میں سے کسی نے اس کا تخلص راجہ نہیں بلکہ عاشق لکھا ہے، ہم نے اس کی بعض تصانیف[1] کا غور سے مطالعہ کیا لیکن اس سے بھی راجہ کے تخلص ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ غلطی سب سے پہلے قاسم سے ہوئی لالہ سری رام نے

---

[1] مہاراجہ کلیان سنگھ کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے:

(۱) مثنوی اُردو یہ ایک صاف اور شستہ ہے جو سحر البیان کے طرز پر لکھی گئی ہے، اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار ہے، لیکن اس کا جو نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے وہ بہت بوسیدہ و کرم خوردہ اور ناقص ہے اور اس میں چھ سو سے زاید اشعار نہ ہوں گے، عاشق نے مثنوی بالکل آخر زمانے میں لکھی جب کہ بصارت بھی جواب دے چکی تھی، پوری مثنوی انھوں نے دوسرے سے لکھوائی ہے اس کا یہ کمال ماننا پڑتا ہے۔ کلیان سنگھ نے زبان کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ: یہ شعرائے دہلی کی گفتار ہے۔ کرسن اس کو طوطی شکر بار ہے" مثنوی اس نے ۷۰ برس کی عمر میں لکھی تھی اس کی تکمیل ۱۵ شعبان المعظم [illegible] بروز سہ شنبہ کو جیت پور کلکتہ میں ہوئی۔

(۲) مثنوی زیبا، یہ فارسی مثنوی انھوں نے ۶۶ سال کی عمر میں اپنے لڑکے کنور حشمت علی کے لئے لکھی تھی، زیر نظر نسخہ کلکتہ میں [illegible] لکھا گیا (۳) دیوان قصاید، دو جلدوں میں ہے، کتابت ۱۱ نومبر ۱۸۶۰ء کی ہے، یہ قصاید تمام کے تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ اور دوازدہ امامؑ کی شان میں لکھے گئے ہیں، قصاید کی زبان بہت اچھی ہے ان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلیان سنگھ فارسی کا اچھا جاننے والا تھا، زیر نظر نسخے بہت قدیم ہیں اور ہمارے علم میں یہ واحد نسخے ہیں، بعض اوراق خراب ہو گئے ہیں کتابت وائل انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے — (۴) خلاصۃ التواریخ، یہ کلیان سنگھ کی بہترین تصنیف ہے مغلوں کی آخری عہد کی اور بنگال کے گورنروں کی بہترین تاریخ ہے پوری کتابت [illegible] میں لکھوائی گئی ہے۔ اس کا دوسرا نام "واردات قاسمی" ہے۔ اس پر سید حسن عسکری صاحب ایم۔اے پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج ایک بسیط مضمون انگریزی زبان میں لکھ چکے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ عاشق کی ادبی و علمی زندگی پر بہت جلد ایک مضمون لکھیں۔

وہیں سے نقل کیا ہے۔

سید صاحب نے جس جگہ عظیم آبادی یا بہاری شعرا کے نام گنائے ہیں وہ عبارت تو چار سطر سے زاید کی نہیں، لیکن غلطیوں کا ایک دفتر اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

فغاں کا نام اشرف خاں نہیں، اشرف علی خاں ہے۔ اسی طرح حسرت کا نام ہیبت علی خاں نہیں ہیبت قلی خاں ہے عشقی صاحب تذکرہ کا نام رحمت اللہ بتایا ہے، یہ صحیح نہیں، یہ غلطی سب سے پہلے دتا سی سے ہوئی، اس کا نام وجیہ الدین ہے، تذکرے اس کے شاہد ہیں عظیم آبادی تذکرہ نگار آغا حسین قلی خاں کی "نشتر عشق" میں بھی اسی طرح درج ہے عشقی سے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے بہت زیادہ روابط تھے وہ عشقی کے شاگرد بھی تھے، عشقی سے انھوں نے کتب درسیات بھی پڑھی تھیں اس لئے ان کا بیان بہت زیادہ قابل قدر ہوگا۔ عشقی کا تذکرہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے، اس کی بعض دوسری تصانیف کا بھی ہمیں علم ہے تعجب نہیں کہ ان سے بھی ہمارے قول کی تائید ہو، اس وقت ان کی طرف رجوع مشکل ہے۔

غلام حسین محرم، یہ کوئی مشہور شاعر نہیں اور اگر سید صاحب کی مراد عشقی کے باپ سے ہے تو ان کا تخلص غلط لکھا ہے، ان کا تخلص مجرم ہے۔

نشتر عشق، کے مصنف کا تخلص عشق نہیں عاشقی ہے، خود لکھتے ہیں: "وعاشقی تخلص کہ امداد کردۂ شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی است"۔

سید صاحب ان ناموں کو نقل کر کے لکھتے ہیں: .... اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور یہاں گزرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اُردو زبان نے ترقی پائی ہے"۔ حالانکہ اس میں ایسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے اُردو زبان میں ترقی دینا کیا اُردو زبان میں ایک شعر بھی نہیں کہا۔

اشرف علی خاں فغاں فارسی اشعار بھی کہتے تھے، مصحفی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کے فارسی اشعار کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن یہ بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ وہ اُردو زبان کے بھی شاعر تھے ان کا دیوان اُردو کم یاب ہے، لیکن نایاب نہیں، دیوان فغاں کے چار نسخوں کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ نسخے اور بھی ملیں۔

عشقی کی اُردو شاعری کے متعلق بہتر ہے کہ اسی کے زبان سے سنئے:

.... مقیم کوئے بے استعدادی، عشقی عظیم آبادی مولف تذکرۂ ہذا از متوطنان شہر مرقوم است ———— اگرچہ فقیر را در فن شعر و شاعری شعور سے در دست گاہے نیست، اما بحسب موزونی طبع بیشتر اوقات تصنیف و تالیف نظم و نثر فارسی می پردازد، و بہ شیوۂ طرز ریختہ اصلاً میلے و رغبت نہ دارد ———— مخفی نماند کہ قلم راقم اوراق را با شعر ہندی ہیچ علاقہ نبود ہذا .... فارسی .... برائے تفریح خاطر دوستاں قلمی می گردد"۔

یہ تو مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے، خود عشقی تو کہتا ہے " بہ شیوۂ طرز ریختہ اصلا میلے و رغبت نہ دارد" اور " راقم را با شعر ہندی ہیچ علاقہ نبود" مشکل سے اپنے صرف چھ اشعار درج کرتا ہے اور وہ بھی یہ لکھ کر " چند اشعار ریختہ جستہ کہ بہ حسب اتفاق قلم زبان و زبان قلم سرزدہ ..." عشقی خود اپنے ان اشعار سے مطمئن نہیں، اس کا رجحان فارسی کی طرف تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو کے چھ اشعار لکھ کر اپنے فارسی اشعار نقل کرتا ہے۔ اور ہمارے سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ان لوگوں میں ہے جنھوں نے اُردو زبان کو ترقی دی فیا للعجب!

ہمارے پاس یہ ماننے کے لئے کافی ثبوت ہے کہ وہ فارسی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ تھا، اُردو کے اشعار جیساکہ اس نے خود لکھا ہے کبھی کبھی اتفاقیہ لکھ لیتا تھا اور بہت ممکن ہے کہ ان کی تعداد چھ سے بہت زیادہ زاید نہ ہو۔ ورنہ وہ تذکرہ لکھ رہا ہے اور قلم اس کے ہاتھ میں ہے، اپنے سیکڑوں اُردو اشعار نقل کرسکتا تھا جیساکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے اکثر تذکرہ نگاروں کی عادت ہے، دتاسی اپنے ایک خطبہ میں اسی کو روتا ہے:

" تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ اپنے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ دوسرے شعرا کے حالات بھی اسی طرح لکھتے اور اپنے اشعار نقل کرنے میں کبھی نہیں چوکتے"

غلام حسین مجرم فارسی گو تھے، وہ شاہ محمد وفا کے شاگرد تھے اور وہ بلاشبہ ایک فارسی گو شاعر تھے نشترِ عشق کے مصنف کا بیان سنئے:

مجرم مرد صاحب طبیعت است و فکر ہموار دارد، اصلاح سخن و استفادہ صحبت از خدمت شاہ محمد وفا کرد " وقائع مہابت جنگی" از تالیفات اوست برداشتہ، راقم حروف ـــــ آں سخن سنج را در عظیم آباد دیدہ است ـــــ ہنگام تحریر مجموعۂ ہذا از کلام او ہمیں یک بیت بہ خاطر بود ـــــ

بنواز بہ زخم تیغ ظالم   از آب مکن دریغ ظالم

تذکرے میں نہ اُردو کا کوئی شعر ہے نہ اُردو شاعری کا کوئی تذکرہ۔ خود تذکرۂ عشقی میں بھی اُردو گو کی حیثیت سے غالباً اس کا ذکر نہیں، اگر وہ اُردو کے شاعر ہوتے تو عشقی اپنے باپ کے اشعار ضرور درج کرتے۔ یہی حال عاشقی کا ہے اپنا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے لیکن نہ تو اپنی اُردو شاعری کا کچھ حال لکھا ہے اور نہ ایک اُردو شعر ہی درج کیا ہے۔ یہاں تو بے دلگی کا یہ حال ہے اور ہمارے سید صاحب چیخ چیخ کر فرما رہے ہیں کہ ان کی محنتوں اور کاوشوں سے اُردو زبان نے ترقی پائی، سید صاحب نے اپنی فہرست میں سب سے نمایاں جگہ ملا محمد علیم تحقیق کو دی ہے، حالانکہ وہ غریب سرے سے ریختہ گو ہی نہیں، وہ ایک فارسی گو شاعر تھا، یہ بات ابھی حال میں ہم نے دریافت کی ہے کہ وہ صاحب دیوان بھی تھا، تذکرۂ خوشگو اور نشترِ عشق میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن ریختہ گو نہیں بلکہ فارسی گو شاعر کی حیثیت سے، یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ

کسی عظیم آبادی تذکرہ نگار نے بھی ان کا ذکر ریختہ گو کی حیثیت سے نہیں کیا۔

سید صاحب، تحقیق کو زمانی حیثیت سے بیدل سے بھی مقدم قرار دیتے ہیں، حالانکہ تحقیق کا سال ولادت ۱۰۷۵ کے لگ بھگ ہے اور سال وفات ۱۱۶۲ھ اور بیدل کا سال ولادت ۱۰۵۴ھ اور سال وفات ۱۱۳۳ھ ہے، اس حساب سے بیدل کی ولادت کے تقریباً بیس برس بعد تحقیق پیدا ہوئے اور ان کی وفات کے کم و بیش ۳۰ برس بعد مرے ہیں۔

سید صاحب کے پاس تحقیق کے ریختہ گو ہونے کی کیا سند ہے اس کا ہمیں علم نہیں، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انھوں نے یہ رائے تحقیق کے اردو اشعار دیکھ کر قایم کی ہے یا کسی تذکرے کے مطالعہ کے بعد، دونوں صورتوں میں انہیں حوالہ دینا چاہئے۔ ہمارا خیال ہے کہ سید صاحب کو دو شعروں سے دھوکا ہوا ہے جو تحقیق کی طرف منسوب ہیں:

جھگڑا باندھ دل موں سماجا ۔۔۔ سلونو سانورے ایدھر کوں آجا

سرجن ترے مکھڑے میں سورج کی کرن دیا ہے ۔۔۔ دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں مری چندھرا ہے

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ اشعار تحقیق کے نہیں ہو سکتے، تحقیق کے زمانہ میں ریختہ گوئی کا عام طور پر رواج ہو چکا تھا، اور پھر یہ زبان بھی بارھویں صدی کی نہیں معلوم ہوتی۔

اس جگہ بیدل کے متعلق بھی دو لفظ کہہ دینا غیر مناسب نہ ہوگا، بیدل کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں:

مت پوچھ دل کی باتیں اب دل کہاں ہے ہم میں ۔۔۔ اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا ۔۔۔ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

شہرۂ حسن سے از بس کہ وہ محجوب ہوا ۔۔۔ اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس ۔۔۔ پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس

ظاہر ہے کہ پہلے تین اشعار جس شاعر کے ہیں چوتھا اس کا نہیں ہو سکتا، پھر شاد مرحوم کے علاوہ کسی نے اس شعر کا ذکر نہیں کیا، شاد مرحوم ایک شاعر آدمی تھے اور آخر عمر میں ان کا حافظہ بھی خراب ہو گیا تھا اس لحاظ سے ان کی سند معتبر نہیں۔ تیسرے شعر کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بیدل کا نہیں بلکہ سوز کا ہے۔ اب رہے اوپر کے دو شعر جنھیں میر اور قایم نے اپنے تذکروں میں درج کئے ہیں، تو پہلی بات یہ کہ ہمیں ان کے ماخذ کا علم نہیں، دوسرے یہ کہ یہ دونوں ان کے معاصر بھی نہیں، تیسری بات بڑی پُرلطف ہے وہ یہ کہ یہ دونوں اشعار بیدل کے اور پہلے دو اشعار تحقیق کے مان لینے کی صورت میں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم بیدل زمانہ سے زیادہ قریب ہیں اور تحقیق کے عہد کی زبان سے بہت دور حالانکہ بیدل کا زمانہ پہلے ہے اور تحقیق کا بعد کو۔ بیدل کا سال وفات ۱۱۳۳ھ ہے اور تحقیق کا ۱۱۶۲ھ۔

سید صاحب یہ بھی صحیح نہیں کہتے کہ تحقیق ولی کے قریب العصر تھے۔ ولی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ ہے۔ اب رہا تحقیق کا سال وفات، ایک بہاری شاعر کے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سال وفات ۱۱۶۲ھ ہے۔

مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں فارسی کا ایک مختصر سا رسالہ ہے، اول و آخر غائب ہے، یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحمید صاحب فہرست نگار نے اسے لا معلوم الاسم لکھدیا ہے، خان بہادر عبدالمقتدر صاحب نے اپنی انگریزی فہرست میں بھی تصنیف و مصنف کے متعلق کچھ نہیں بتلایا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لالہ اُجاگر چند اُلفت کے خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے احباب اعزہ اور بزرگوں کو لکھتے ہیں۔ اُلفت حسب روایت عبرتی قوم کایستھ سے تھے اور عظیم آباد کے روسا میں ان کا شمار ہوتا تھا پہلے تخلص غربت کرتے تھے بعد کو اُلفت رکھا، یہ تحقیق کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک رقعہ اس کتاب میں موجود ہے جو تحقیق کے صاحبزادے میر محمد حسین کو لکھا گیا ہے، اس مکتوب سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں اس لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ زیرِ نظر نسخہ آب رسیدہ، بوسیدہ اور نہایت بدخط ہے، بعض جگہ قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے:

بخدمت میر محمد حسین صاحب خلف الصدق قبلہ ارباب تدقیق میر محمد علیم صاحب (تحقیق)

میر صاحب قدر دان　　　سلامت

اشعار انتخاب دیوان میر صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ خدمت گزار سرکار رساند انشاء اللہ تعالیٰ لالہ خوشگو صاحب سلمہ المنان داخل تذکرۃ الشعرامی نمایند و احوال ہم حسب الارقام حال بہ شرح و بسط قلمی می فرمایند، قطعہ تاریخ وصال میر صاحب مغفور کہ طرح گفتہ احقر بود ارسال بعالی خدمت نمود۔۔۔۔ بہ نظر خواہد گزشت:

آں میر علیم رمز معنی جا کرد　　　در خلوت عرش فوق چرخ ازرق
افتاد ستون کاخ فطرت افسوس　　　شد گلشن تحقیق خرد بے رونق
در ماتم او کرد سخن خامہ سیاہ　　　چوں گریہ نمود خامہ از دیدۂ شق
در خونِ جگر دلِ سیہ پوش زغم　　　زد غوطہ چو داغ لالہ در رنگ شفق
تاریخ وصال او بہ الفت ہاتف　　　فرمود کہ تحقیق شدہ واصل حق

یہاں تک لکھ لینے کے بعد تذکرۂ خوشگو کے ایک نسخہ تک رسائی ہوئی تحقیق کا بیان دیکھا اس میں سال وفات سنہ ۱۱۶۴ھ دیا ہے اور "تحقیق شدہ واصل حق"۔ مادہ تاریخ کا پورا قطعہ نقل نہیں کیا ہے صرف مادۂ تاریخ لکھ دیا ہے۔ ولی اور تحقیق میں، چالیس برس سے زاید کا فصل ہے وہ دونوں قریب العصر نہیں۔

سید صاحب نے صفحہ ۴۰۹ کے فٹ نوٹ میں "یادگار عشق" کے ایک غلطی کی تصحیح کی ہے کہ سنہ ۱۱۹۵ھ تاریخ وفات عشق سمجھنا غلط ہے جیسا کہ علی لطف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ان کی تصحیح صحیح ہے، لیکن انھوں نے خود نہیں بتایا کہ عشق کا سال وفات کیا ہے، بہ ظاہر جو کچھ صاحب یادگار عشق نے لکھا ہے اسے وہ صحیح سمجھتے ہیں، کتاب میں سال وفات سنہ ۱۲۰۳ھ درج ہے ہم اس معاملہ میں مشکوک ہیں، میرزا محمد علی فدوی جو عشق کے مخصوص شاگردوں میں تھے ان کا ایک قطعۂ تاریخ ہمیں ایک قدیم بیاض سے ملا ہے جو درج کیا جاتا ہے:

شور واویلا فتاد اندر جہاں   چوں اجل آمد سر بالین عشق

گفت فدوی سال تاریخ وفات   "یادی یا شاہ رکن الدین عشق"

اس مصرع سے سنہ ۱۲۰۲ھ غلط ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ فدوی کا بیان دوسروں کے بہ اعتبار زیادہ مستند سمجھا جائے گا، فدوی کا احمد شاہ بادشاہ دہلی کا وقایع نویس ہونا بھی متحقق نہیں، ان کا نام غلام حسین نہیں محمد علی ہے عرف بجو نہیں، بجو یا بچھو ہے۔

سید صاحب کا سال ولادت عشق سنہ ۱۱۰۲ھ بتانا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

سید صاحب نے لکھا ہے کہ بہار میں تین قابل قدر تذکرے لکھے گئے تذکرۂ شورش، تذکرۂ جوشش اور گلزار ابراہیم ہمارا خیال ہے کہ جوشش نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔

تذکرۂ عشقی کے متعلق یہ لکھنا بھی عجب ہے کہ یہ شعرائے اردو کا سب سے قدیم تذکرہ ہے جو اب نایاب ہے، اس تذکرہ کا سال تصنیف ہمارے خیال کے مطابق سنہ ۱۲۲۵ھ کے لگ بھگ ہے اس سے پہلے بیسیوں تذکرے لکھے گئے یہ بھی صحیح نہیں کہ نایاب ہے اور کہیں نہیں ہے، تذکرۂ عشقی خود ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

سید صاحب نے میر جعفر عظیم آبادی کا نام شعرا کی فہرست میں لکھا ہے، اس نام کا کوئی مشہور شاعر عظیم آباد میں نہیں گزرا، اگر مولف کی مراد میر جعفر استاذ میر تقی میر سے ہے تو انھیں جاننا چاہئے تھا کہ میر نے صرف ان سے فارسی کی کتابیں پڑھی تھیں شعر وسخن میں ان کے استاد نہ تھے۔

میر حمزہ کو لکھا ہے کہ عظیم آباد کی خاک سے اٹھے اگر ایسا ہوتا تو نواب علی ابراہیم خاں حال انھیں دہلوی نہ لکھتے گلزار ابراہیم کے بیان کے بموجب وہ سنہ ۱۱۹۳ھ کے قریب عظیم آباد آئے ہیں۔

سید صاحب کا یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ فغاں رکن الدین عشق، محمد علی فدوی اور میر باقر حزیں نے عظیم آباد کی آغوش تربیت میں نشو ونما پائی۔ قدرت اللہ قدرت صاحب تذکرہ کا سال وفات سنہ ۱۲۰۵ھ نہیں اگر یہ صحیح ہوتا تو مصحفی سنہ ۱۲۰۹ھ میں "بالفعل در رام پور استقامت دارد" کبھی نہ لکھتے۔ (تذکرۂ ہندی صفحہ ۱۰۵)

یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ فدوی عشق کے ساتھ سنہ ۱۱۶۲ھ میں مرشد آباد سے عظیم آباد آئے، پہلے تو عشق ہی کا سنہ ۱۱۶۲ھ میں آنا متحقق نہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ عشق نواب قاسم علی خاں کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر عظیم آباد آئے۔ نواب قاسم کا عہد نظامت سنہ ۱۱۶۲ھ سے بارہ برس بعد سنہ ۱۱۷۴ھ سے شروع ہوتا ہے، سنہ ۱۱۶۲ھ تو علی وردی خاں کا زمانہ تھا، اس وقت میر قاسم کا کیا ذکر ان کے پیش رو میر جعفر اور سراج الدولہ بھی میدان میں نہیں آئے تھے، یہی حال فدوی کا ہے سنہ ۱۱۶۲ھ میں فدوی عظیم آباد تو در کنار دہلی سے مرشد آباد بھی نہیں آئے تھے، یہ صحیح نہیں کہ فدوی کا دیوان نایاب ہے، یہ موجود ہے اور ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

سید صاحب، اس مقدمہ میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"میر کی نکات الشعرا اور تذکرۂ حیرت کے بعد سخن گویان اُردو کے ابتدائی تذکرے پہلے یہیں مدون ہوئے،
شورش نے ۱۱۹۳ھ اور عشقی نے ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ یہیں شعرائے اُردو کے تذکرے لکھے۔ یہ عظیم آباد ہی میں لکھے گئے
ان کے علاوہ گلزار خلیل اور اس کا ترجمہ گلشن ہند بھی اسی چمن زار کے پروردہ ہیں" (نقوش صفحہ ۵۰۴)

دیکھنے میں تو یہ صرف دو سطریں ہیں لیکن اغلاط سے پُر۔

ہماری طرح ناظرین بھی حیرت میں ہوں گے یہ "تذکرۂ حیرت" کیا بلا ہے، ہمارے علم میں اس نام کا کوئی مشہور تذکرہ نہیں
سید صاحب کا یہ فرمانا بھی حیرت انگیز ہے کہ اُردو کے ابتدائی تذکرے پہلے یہیں مدون ہوئے تذکرۂ شورش اور تذکرۂ
عشقی سے پہلے بہت سے تذکرے، بہار سے باہر لکھے گئے۔ ہم ذیل میں ان کی ایک مختصر فہرست درج کرتے ہیں، ترتیب
فہرست میں کسی قسم کی تفحص و تلاش کو دخل نہیں بلکہ جو راقم کے پیش نظر تھے یا فوری طور پر خیال میں آئے درج کئے گئے:۔

نام[1]	مصنف	سال تصنیف و تکمیل	نام	مصنف	سال تصنیف و تکمیل
مخزن نکات	قائم	سنہ ۱۱۶۸ ہجری	چمنستان	شفیق	سنہ ۱۱۷۵ھ
تذکرۂ شعرا	خاکسار	سنہ ۱۱۱۵ھ	طبقات الشعرا	شوق	سنہ ۱۱۸۸ھ
تذکرۂ ریختہ گویاں	گردیزی	سنہ ۱۱۶۶ھ	گلشن ہند	لطف	سنہ ۱۲۱۵ھ
تحفۃ الشعرا	افضل بیگ اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۶۵ھ	مجمع الانتخاب	کمال	سنہ ۱۲۱۹ھ
گلشن گفتار	خواجہ حمید احمد خاں اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۶۵ھ	مجموعۂ نغز	حکیم قاسم	سنہ ۱۲۲۱ھ
تذکرۂ شعرا	معین الدین خاں سرورکی والاشاہی	(عہد محمد شاہ سنہ ۱۱۳۱ تا سنہ ۱۱۶۱)	مخزن الغرائب	احمد علی سندیلوی	سنہ ۱۲۱۸ھ
تذکرۂ شعرا	سودا	(قبل از سنہ ۱۱۶۵ھ)	تذکرۂ عمدۃ المنتخبہ	سرور	
تذکرۂ ہندی	مصحفی	سنہ ۱۲۰۹ھ	تذکرۂ عشق	عشق میرٹھی	
گلزار ابراہیم	خلیل	سنہ ۱۱۹۸ھ	عیار الشعرا	خوب چند ذکا	
تذکرۂ میر حسن	میر حسن	قبل از سنہ ۱۱۸۸ھ و بعد از سنہ ۱۱۹۳ھ	تذکرۂ بے جگر	خیراتی لال بے جگر	

---

[1] نام کے بجائے جہاں پر "تذکرۂ شعرا" لکھ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل نام کا علم نہیں خاکسار کے تذکرے کا نام میر نے "معشوق چہل سالۂ خود" لکھا ہے لیکن یہ کسی کتاب کا نام نہیں ہو سکتا "عمدۃ المنتخبہ" تذکرۂ سرور کے نام سے بھی مشہور ہے، جہاں جہاں سال تصنیف پر ( ) یہ نشان لگا دئے گئے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ سال تالیف کا صحیح علم نہیں تذکرۂ گردیزی کا سال تصنیف سنہ ۱۱۶۵ھ نہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ ہو)

(۳) تذکرۂ شورش کا سال تصنیف ۱۱۹۲ھ بتانا صحیح نہیں۔

(۴) تذکرۂ عشقی کے سال تصنیف میں اکثر لوگوں نے دھوکا کھایا ہے، ندوہ کے مایۂ ناز فرزند مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے ۱۱۱۵ھ لکھا ہے (شعرالہند)۔ سید صاحب نے اس کی تصحیح کی ہے (نقوش صفحہ ۴۰۵) اور لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ لکھا گیا، ہمارا خیال ہے سید صاحب قبلہ کو بھی دھوکا رہا، تذکرۂ عشقی میں ۱۲۱۵ھ کے بعد کے بھی حوالے ملتے ہیں، سال تصنیف ۱۲۲۵ھ کے لگ بھگ ہے، ۱۲۱۵ھ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ہے جو صحیح نہیں اور دتاسی کا بیان ظاہر ہے کہ انھیں سے منقول ہے۔

(۵) تذکرۂ عشقی عظیم آباد ہی میں لکھا گیا۔ اسکی سید صاحب کے پاس کیا سند ہے؟ ہمارا تو علم یہ ہے کہ عشقی دس برس تک ضلع اناؤ میں تحصیلداری کے عہدہ پر مامور رہے، پھر کچھ دنوں تک اپنے والد محترم کے پاس ڈھاکا رہے، پھر عظیم آباد آئے لیکن ۱۲۱۶ھ میں پھر ڈھاکا گئے اور عمر بھر وہیں رہے اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۶) نواب ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے کا نام "گلزار ابراہیم" ہے گلزار خلیل نہیں جیسا کہ مرتب نے لکھا ہے۔

(۷) "گلشن ہند" کو "گلزار ابراہیم" کا محض ترجمہ سمجھنا بھی عجیب ہے علی لطف نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا گلزار ابراہیم میں پتا تک نہیں۔ لطف نے جو اضافے کئے ہیں ان کے لئے آفتاب، آشفتہ، انشا، افسوس، بقا، بیدل، فقیر، قائم، میر، مجذوب، مصحفی، منت وغیرہ کے تراجم دیکھیے۔

(۸) سید صاحب علی لطف کو عظیم آبادی کہتے ہیں یہ بڑے لطف کی بات ہے، لطف ہندوستان کے بھی نہیں استرآباد کے رہنے والے تھے، نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے کچھ دنوں تک نواب اعظم الدین ارسطوجاہ کے ساتھ دکن میں رہے کچھ دن لکھنؤ میں رہے، ہاں کچھ دن تک قیام عظیم آباد میں بھی رہا۔ م - ا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۴:- خود گردیزی خاتمہ میں لکھتا ہے: "ختم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنتظمہ فی ہمام ستہ وستین و مائہ بعد الالف من الھجرۃ المبارکۃ النبویۃ" ۱۱۶۵ھ — میر حسن کے تذکرے کا سال مولوی حبیب الرحمن صاحب شروانی نے ۱۱۸۹ھ و ۱۱۹۲ھ کے مابین بتایا ہے عام طور پر بھی مشہور ہے، لیکن یہ صحیح نہیں اس لئے کہ شجاع الدولہ متوفی ۱۱۸۸ھ کو بقید حیات لکھا ہے اور فصیح کے ترجمہ میں ہے: "در سال یک ہزار و یک صد و نود بہ رحمت حق پیوست" معلوم ہوا کہ وہ ۱۱۸۸ھ سے شروع تذکرہ لکھنا شروع کر چکے تھے اور ۱۱۹۲ھ کے بعد تک لکھتے رہے۔ طبقات الشعرا کا سال تالیف ۱۱۸۸ھ ہے۔ مگر شوق اس کے بعد بھی اس میں اضافے کرتے رہے تھے، عمدۃ المنتخبہ کا سال تالیف پروفیسر شروانی نے ۱۲۱۶ھ بتایا ہے مولانا عبدالحق اسے صحیح نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں اس میں ۱۲۱۹ھ تک حوالے ملتے ہیں اس لئے کہ قائم کا ذکر ۱۲۱۹ھ میں کیا ہو، اصل یہ ہے کہ تذکرہ کی ابتدا ۱۲۱۱ھ میں ہو چکی تھی لیکن وہ ۱۲۱۹ھ تک ہی نہیں بلکہ دس بارہ برس تک اسے مرتب کرتے رہے اور نظر ثانی اس کے بھی بہت بعد تک کرتے رہے اس لئے کہ اس میں غالب کا حال بھی درج ہے، غالب کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے تذکرۂ بے جگر دتاسی کے بیان کے مطابق ۱۱۵۵ھ بھی لکھا گیا ہو۔ چھٹے تذکرے کے متعلق مولف کا نام امام الدین خاں بتایا جاتا ہے ہمارے خیال میں میری مراد معین الدین سے ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ عہد محمد شاہ میں لکھا گیا، لیکن اگر سید صاحب اسکا عہد محمد شاہ میں تالیف ہونا مانیں جب بھی ہمارا بیان اپنی جگہ پر درست ہو اسلئے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ سے یقیناً پہلے لکھا گیا ہے۔ سودا اور جوشش کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تذکرے لکھے آخر الذکر کے متعلق ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا تذکرۂ سودا کے متعلق مولانا عبدالحی اور دوسرے لوگوں کو یقین ہے ہم اس معاملہ میں بھی مشکوک ہیں، ہم اپنے دلائل کسی دوسری جگہ بیان کریں گے ۱۲۰۰ھ تذکرۂ ہندی کا سال تکمیل ہے اس کی ابتدا وہ ۱۱۹۹ھ کے قریب کر چکے تھے۔

نشری ڈرامہ اور اداکاری

بی بی سی کے ڈرامہ ڈائرکٹر مسٹر ویل گل گڈ (Mr. Val Gilgud) کا قول ہے کہ صنف ڈرامہ میں نشری ڈرامہ بہت بیقدری کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم نشری ڈرامہ کا مقابلہ اسٹیجی ڈرامہ سے کریں جس کی ابتدا (Aeschylus) بلکہ اس سے بھی پہلے ہوتی ہے یا سینما سے اس کا تقابل کیا جائے جس کو عالم وجود میں آئے چالیس پینتالیس سال ہوتے ہیں، تو اس کی کم مائگی پر تعجب ہوتا ہے، مگر اس کم مدت میں جو مقبولیت اس نے حاصل کرلی ہے اور ترقی کے جو امکانات اس میں پائے جاتے ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گل گڈ ابھی اس کے قایل نہیں کہ نشری ڈرامہ کی تاریخ لکھنے کا وقت آگیا ہے یا یہ کہ نشری ڈرامہ لکھنے اور اس کے پیش کرنے کے جو اُصول مقرر ہیں ان کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا فلم کی طرح ہمہ گیر مقبولیت حاصل کرنا مشتبہ ہے، کیونکہ عوام اپنے کانوں کو استعمال کرنے سے زیادہ آنکھوں کو استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہی ذریعہ زیادہ کامیاب ہوگا جو بیک وقت دونوں قوتوں (بصارت اور سماعت) کو متاثر کرے تاہم اسکا کافی ثبوت موجود ہے کہ نشری ڈرامہ سننے والوں اور لکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اس سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ سامعین اس کی ٹیکنک سے بھی واقف ہوتے جارہے ہیں اور اس طرح ذوق تنقید کا معیار بھی بلند ہو رہا ہے۔

انسان نے اب تک دُنیا میں جو کچھ معلوم کیا ہے، وہ بہت کچھ اس کی بصارت کا نتیجہ ہے۔ لیکن نشری ڈرامہ نگاروں کے پاس ذریعۂ اظہار صرف آواز ہے اس لئے اس کو دوسری قسم کے ڈرامہ نگاروں کے مقابلہ میں زیادہ دقتیں محسوس ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ہم ان سہولتوں کا مقابلہ کریں گے جو نشری ڈرامہ نگار، اسٹیجی ڈرامہ نگار اور فلم نگار کو اپنے اپنے میدانوں میں حاصل ہیں، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ نشری ڈرامہ نے ابھی تک کیوں ترقی نہیں کی۔

اسٹیج فلم اور نشری ڈرامہ نگار کو مکالمۂ صوتی (Sound Effects) اثرات اور موسیقی میں جولانیٔ طبع دکھانے کا برابر موقعہ حاصل ہے، لیکن جسمانی خصوصیات سوانگ (Make up) اور ساز و سامان وغیرہ جو پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتے ہیں ان سے نشری ڈرامہ لکھنے والا استفادہ نہیں کرسکتا۔ وہ ان سب

محروم ہے کیونکہ ان کا تعلق صرف بصارت سے ہے۔

اسٹیج اور فلم بہت سے اداکاروں کو شریک کرسکتا ہے اور ان کی مدد سے مختلف قسم کے اثرات پیدا کرسکتا ہو اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

فضل: صفیہ تم خاموش کیوں ہوگئیں مجھے معاف کردو۔

(صفیہ نہایت مغموم انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میز کے قریب پہونچتی ہے کتاب اُٹھاتی ہے۔ دو چار صفحات اُلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر سر کا پورا وزن ہاتھوں پر ڈال دیتی ہے۔ فضل اپنی جگہ سے اُٹھ کر صفیہ کے قریب آتا ہے اور اُس کی چوڑیوں میں اپنی اُنگلیاں پھنساتے ہوئے میز پر بیٹھ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ)

یہ جزو صرف اسٹیج پر یا سنیما میں دکھایا جاسکتا ہے کیونکہ سوائے ابتدائی جملہ کے باقی تمام حصہ کا تعلق بصارت سے ہے اور ریڈیو سننے والے اس سے ہمیشہ کے لئے محروم ہیں۔

قدرتی مناظر، تاریخی مقامات یا فوٹوگرافی کے کرشمے صرف فلم میں دیکھے جاسکتے ہیں اور اس لئے جہاں تک سہولتوں کا تعلق ہے، فلم نگار کو اولیت حاصل ہے اور نشری ڈرامہ نگار کو کم سے کم حصہ ملتا ہے۔ اس کے سامنے ایک اور دقت ہے اور وہ وقت کی تنگی ہے۔ اس کو فلم نگار اور اسٹیجی ڈرامہ نگار کی طرح وقت نہیں ملتا۔ اس کو تو کم سے کم وقت میں دلچسپ سے دلچسپ ڈرامہ پیش کرنا ہے۔ سنیما اور تھیٹر میں تو یہ ہوتا ہے کہ ناظرین اسے پیسے خرچ کرکے دیکھتے ہیں اس لئے عام طور پر آخر وقت تک بیٹھے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ریڈیو سننے والے کا یہ حال ہے کہ اگر اس کو ڈرامہ ذرا بھی ناپسند ہو تو فوراً سوئی دوسری نشرگاہ کی طرف گھما دیتا ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں ایک بات ضرور تسکین بخش ہے اور وہ یہ لوگوں کو ڈرامہ پسند آئے یا نہ آئے، نشری ڈرامہ نگار اُن کی لعن طعن نہیں سنتا۔

چند بنیادی اصول

ڈرامہ خواہ کسی قسم کا ہو اس میں ہم کو چند بنیادی اُصول مشترک ملیں گے۔ نام موضوع پلاٹ، تخالف، کردار، ابتدا، وسط اور ختم یہ ہیں ایک ڈرامہ کے اجزا، جن پر یہاں سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

نام یا سرخی

ڈرامہ کی سرخی یا نام جاذب توجہ ہونے کے علاوہ پلاٹ کی طرف رہبری کرنے والا بھی ہونا چاہئے یعنی یا تو وہ ایسا ہو کہ اس سے فوراً ڈرامہ کے موضوع کا اشارہ ملے جیسے شیکسپیر کا ڈرامہ "جولیس سیزر" (Julius Caesar) یا پھر ایسا کہ سرخی سے موضوع کا پتہ ہی نہ چلے اور جیسے جیسے پلاٹ پھیلتا جائے ڈرامہ کے نام، موضوع اور پلاٹ کا باہمی تعلق واضح ہوتا جائے جیسا کہ شیکسپیر کا ڈرامہ "مرچنٹ آف وینس" (Merchant of Venice) جولیس سیزر کا نام سنتے ہی ہمارا دھیان اُن ہستیوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے

جن کے قصّے ہم سنتے آئے ہیں یا پڑھ چکے ہیں۔ "مرچنٹ آف وینس" کا نام ہم پہلے سے نہ جانتے ہوں تو یہ معلوم نہ کر سکیں گے کہ یہ وینس کے کس سوداگر کا کونسا قصہ ہے۔ ڈرامہ کی سرخی ہمیشہ مختصر اور دلکش ہونا چاہئے۔ نشر نگار کو تو خصوصیت کے ساتھ نہایت اختصار سے کام لینا چاہئے کیونکہ اس کے نام اخباروں میں چھپتے ہیں اور انکا اعلان بھی کیا جاتا ہے

موضوع موضوع سے مراد یہ ہے کہ ڈرامہ کا مقصد کیا ہے، واضح رہے کہ جو ڈرامہ اسٹیج کے لئے ناموزوں ثابت ہوگا وہ یقینی نشر کے لئے بھی ناموزوں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کا موضوع اسٹیج کے لئے ناموزوں اور ریڈیو کے لئے موزوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ایسی صورت میں اس کو ریڈیو کے خاص رنگ میں رنگنا ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جو ڈرامہ عملاً اسٹیج کے لئے مناسب نہ سمجھا جائے اس کو ریڈیو کے لئے منتخب ہی نہ کیا جائے۔

لندن کے ویسٹ اینڈ تھیٹر (West End Theatre) کے منیجر سے ایک نوجوان نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آئے دن اخباروں میں چھپتا رہتا ہے کہ اچھے اور معیاری ڈراموں کا کال ہے۔ کیا واقعی ایسا ڈرامہ لکھنا مشکل ہے جس کو تھیٹر کا منیجر پسند کر سکے۔ منیجر نے جواب میں اس نوجوان سے کہا کہ وہ سامنے کے پلندہ میں سے کوئی ایک ڈرامہ اُٹھا کر پڑھے۔ اس نے ایک ایسی خاتون کا لکھا ہوا ڈرامہ نکالا جس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اس کو ڈرامہ لکھنے کا خاصہ تجربہ اور دیکھنے کا کافی شوق رہا ہے۔ اس ڈرامہ میں سات ایکٹ اور ۳۴ کردار تھے اس کے نیچے لکھا تھا کم سے کم دو ہاتھی درکار ہوں گے۔ اب غور کیجئے کہ اگر ۳۴ کردار اور کم سے کم دو ہاتھی والے ڈرامہ کو ریڈیو پیش کرنے کی کوشش کرے تو کیا نتیجہ ہوگا؟۔

ارباب نشر یہ تصور کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ان کا پروگرام گھروں میں پورا خاندان سنتا ہے سینما آپ اکیلے جا سکتے ہیں، تھیٹر بھی تنہا دیکھ سکتے ہیں، کمرہ میں خود کو بند کر کے کوئی ناول پڑھ سکتے ہیں مگر جب ریڈیو کام کرتا ہوتا ہے تو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے گھر کے تقریباً سب یا زیادہ سے زیادہ افراد پروگرام سنتے ہی رہتے ہیں اسلئے پروگرام اور بالخصوص ڈراموں میں عام دلچسپی کے عناصر شریک کرنا ضروری ہے اُن ممالک میں بھی جہاں اشتہاری[1] پروگرام دئے جاتے ہیں ایسی اشیاء کے اشتہار کا مشورہ نہیں دیا جاتا جو محدود طور پر استعمال کی جاتی ہوں یا جن سے دلچسپی

---

[1] اشتہاری پروگرام (Sponsored Programmes.) اُن پروگراموں کو کہا جاتا ہے جن کو فیکٹریاں کارخانے یا کاروباری ادارہ جات مرتب کر کے نشر کرتے ہیں اور اس نشر کا معاوضہ ارباب نشرگاہ کو ادا کرتے ہیں اس پروگرام میں انکی فروخت شدنی اشیاء کا اشتہار ہوتا ہے۔ سننے والوں کو پروگرام کے ذریعہ محظوظ بھی کیا جاتا ہے اور وہ کاروباری اشتہار ہو جاتا ہے۔

رکھنے والوں کی تعداد کم ہو۔ ڈرامہ کا موضوع در اصل اس کی روح ہے۔ روح کی کثافت اور لطافت کا اثر جسم پر یقینی پڑیگا "عام دلچسپی" (Mass Appeal) بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ اسٹیج فلم اور ریڈیو کے متعلق بارہا اعداد و شمار حاصل کئے گئے، لیکن "عام دلچسپی" کے سلسلہ میں کوئی نتیجہ خیز بات معلوم نہ ہو سکی۔ بہر حال اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عوام تفریح چاہتے ہیں، نہ کہ تعلیم و تربیت اس لئے ان سے جو کچھ کہا جائے اس میں معلمانہ شان نہ ہو اور اپنے دماغ پر بار ڈال کر اور سوچ کر ان کو نتیجہ نکالنا نہ پڑے، صاف صاف باتیں کہئے ان کو لطف آئے گا، وہ حزنیہ سے زیادہ طربیہ اور دل خوش کن انجام چاہتے ہیں کسی گہرے مزاح سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ عمر، طبقہ، صنف، مذہب، اور تمدن کو بھی انتخاب موضوع کے وقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ہے۔ ایسا موضوع منتخب کیجئے جو سوسائٹی کے ہر طبقہ کو پسند آئے۔ پروگرام کا ہر وہ جزو نشرگاہ کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوگا جس میں سوسائٹی کے کسی طبقہ کی تضحیک کی گئی ہو یا اس کے احساسات کو ٹھکرایا جائے۔ گو اکثریت کو اہمیت حاصل ہے مگر اقلیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

پلاٹ

مناسب موضوع منتخب ہونے کے بعد پلاٹ کی تیاری نہایت اہم کام ہے۔ ڈرامہ کا موضوع خود چند واقعات پیش کرتا ہے اور ان امکانات کو ظاہر کرتا ہے جن پر پلاٹ کی بنیاد رکھی جاتی ہے مگر بقیہ اجزار کی تیاری کچھ آسان کام نہیں۔ ایک افسانہ یا قصہ لکھتے وقت اگر ہم اپنے موضوع سے کچھ ہٹ جائیں اور کوئی خاص ماحول پیدا کرنے یا کسی منظر کو رنگین بنانے کے لئے دو ایک صفحوں کا اضافہ کر دیں تو اس کا اثر بُرا نہ ہوگا، لیکن اسٹیج، فلم اور ریڈیو میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ڈرامہ سنتے وقت سامعین کے تخیلات و تاثرات کا ایک دھارا ہوتا ہے اس لئے اگر غیر ضروری باتوں سے دھیان پلٹ گیا تو پھر جی لگنا مشکل ہے۔ تمام قصوں کے پلاٹ ایسے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مرکزی کردار کو اپنا مقصد حاصل کرنے میں مدد ملے یا تعویق پیدا ہو جائے۔ ڈرامہ کا ہر جزو منطقی طور پر اپنے کل سے وابستہ ہے، اس لئے علت و معلول کے ضابطہ کے تحت اس کی تشریح پوری طرح ہونی چاہئے۔ آپ فلم ایک سے دو مرتبہ دیکھ سکتے ہیں، ناول کو بار بار پڑھ سکتے ہیں مگر نشری ڈرامہ ایک ہی مرتبہ نشر ہوتا ہے اگر پلاٹ سمجھ میں نہ آیا تو وہ ہمیشہ کے لئے ناقابل فہم رہ جائے گا۔ تھیٹر اور سنیما ہال میں مکمل خاموشی رہتی ہے اس کے خلاف گھر میں بچوں کا ہنگامہ، عورتوں کا شور و غوغا، نوکروں کی آمد و رفت غرض طرح طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں، اس لئے پلاٹ جتنا زیادہ واضح و صریح ہو اچھا ہے۔ یہ کیوں تصور کیا جائے کہ سامعین اپنے تفریح کے اوقات میں بھی فلسفیوں کی طرح غور و فکر پر وقت صرف کریں گے۔

تخالف و تصادم

ہر ڈرامہ میں تخالف و تصادم لازمی ہے اس کے بغیر وہ ڈرامہ بنتا ہی نہیں۔ مرکزی کردار کو چمکانے کے لئے رقابت اور رقیب کی شکست دکھانا ضروری ہے۔ تصادم ڈرامہ کی جان ہے جو ذہنی بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی بھی۔ مرکزی کردار کو ان طاقتوں سے لڑنا لازمی ہے جن پر وہ قابو حاصل

لڑنا چاہتا ہے۔ اگر مرکزی کردار قوی تر ثابت ہوتو انجام طربیہ ہوگا ورنہ حزنیہ جیسا کہ " رومیو اینڈ جولیٹ "
(Romeo And Juliet.) اور دوسرے حزنیہ ڈراموں سے ظاہر ہے۔

کردار ڈرامہ نگار کے لئے کرداروں کا انتخاب بھی کوئی سہل کام نہیں کیونکہ موضوع کو پھیلانے والے کردار ہی ہوتے ہیں۔ نثری ڈرامہ میں بہت زیادہ کردار شریک نہ کرنا چاہئے، باوجود آوازوں کے اختلاف کے سامعین کو مختلف کرداروں میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسٹیج پر اور فلم میں تو ہم کرداروں کو دیکھ بھی سکتے ہیں، ان کی حرکات و سکنات اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ لباس کی وجہ سے بھی تمیز کرنے میں آسانی ہوتی ہے مگر ریڈیو میں یہ ممکن نہیں اس لئے ۴ہم کرداروں اور کم سے کم دو ہاتھیوں کا سوال ہمیشہ غور طلب رہے گا۔

ابتداء کسی پلاٹ کی " ابتداء " اس سے ہوتی ہے کہ مرکزی کردار اور اس کے معاونین اپنے مقصد کو خود پیش کریں یا دوسروں کے ذریعہ سے پیش کرائیں۔ اس مقصد کا تعارف سب سے پہلے موقعہ پر کر دینا زیادہ مناسب ہے تاکہ سامعین فوراً متوجہ ہو جائیں۔ نثری ڈرامہ نگار کو ناول نویس یا افسانہ نگار وغیرہ کے مقابلہ میں زیادہ عجلت کے ساتھ مرکزی کردار کا تعارف کرا دینا چاہئے۔

وسط مرکزی کردار جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی وجہ سے مناقشات پھیلتے ہیں اور تصادم ہوتا ہے۔ ان مناقشات کو مختلف صورتوں میں تسلسل کے ساتھ ڈرامہ کے وسط میں جگہ دینا چاہئے اور وسط ہی میں بتانا چاہئے کہ مرکزی کردار اپنے مقصد کے حصول کی خاطر مشکلات کو دور کرنے میں مصروف ہے۔ وہی مشکلات اور مقصد جن کا تعارف ڈرامہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔ اس کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے طرح طرح کی شکلیں پیدا کی جا سکتی ہیں مگر ہر شکل ایسی ہو کہ نازک صورت حال دکھائی دے یا یہ کہ اس کی وجہ سے مرکزی کردار کی شکست کا خدشہ پیدا ہو اور حالات ایک نئی کروٹ لینے والے ہوں۔ تنگی وقت کی وجہ سے نثری ڈرامہ میں اس قسم کی مشکلات کو زیادہ نہیں پھیلایا جا سکتا۔

اختتام ڈرامہ کا اختتام ان صورتوں اور پیچیدگیوں کا سلجھاؤ ہے جو حصول مقصد کے سلسلہ میں شروع سے پیدا ہوتی چلی آئی ہیں، ڈرامہ کے اختتام پر سامعین کی تشفی ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ دل خوش کن انجام پر کسی تبصرہ کی چنداں ضرورت نہیں لیکن المناک انجام کے متعلق بیشک یہ کہنا ہے کہ سامعین یہ محسوس کریں کہ پلاٹ کا اس سے بہتر انجام نہیں ہو سکتا تھا یا پھر " رومیو اینڈ جولیٹ " کی طرح اثر پیدا کیا جائے کہ دو معزز خاندان دو مرکزی کرداروں کی دردناک موت کی وجہ سے آپس میں مل گئے۔

نثری ڈرامہ نگار کے پاس تین ہی ذرایع ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا پیام سامعین تک پہونچا سکتا ہے۔ مکالمہ، صوتی اثرات اور موسیقی، ان کو ہم مجموعی طور پر آواز کہہ سکتے ہیں۔

مکالمہ

ڈرامہ کے مکالمہ کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس میں عام دلچسپی کی آسان باتیں وضاحت سے پیش کرنا چاہئے۔ اسٹیج پر اگر کوئی کردار ایک سگریٹ پھینکدے اور اسی سے فرش جلنے لگے تو دوسرا کردار صرف یہ کہنے پر اکتفا کر سکتا ہے "دیکھو وہ جل رہا ہے"۔ نشر میں جلتے ہوئے سگریٹ کے پھینکنے اور فرش کے جل اُٹھنے کا حوالہ دینا ضروری ہے ورنہ سامعین کچھ نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں نے صوتی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا حوالہ اگر مکالمہ میں دیدیا جائے تو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے، مکالمہ کے دوران میں مناسب مقامات پر کردار ایک دوسرے کے نام وقفہ وقفہ سے لیتے رہیں تو سامعین کو نام جلدیاد ہو جائیں گے اور سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ غالباً نیویارک ٹائمز کے ریڈیو ایڈیٹر مسٹر او ای ڈنلاپ جونیر (Mr. O. E. Dunlop Jr. Radio Editor, New York Times) کسی جگہ کہا ہے کہ ریڈیو میں الفاظ "یہ" اور "وہ" کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہمیشہ واضح کر دینا چاہئے کہ یہ کون ہے اور وہ کون۔ اگر کسی ڈرامہ میں باپ اپنی بچی کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہے "اُن سے یعنی (اپنی ماں سے) پوچھو" تو وہ اتنا موثر نہ ہوگا جتنا کہ "اپنی ماں" کے کہنے سے۔ فرض کیجئے تین آدمیوں کی محفل میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے اگر ان میں سے ایک کہے "واہ، یہ تو ان کا اعتراض ہے" تو لفظ "ان" کا اشارہ ظاہر ہے تیسرے شخص کی طرف ہوگا لیکن اگر تعداد تین سے زیادہ ہوئی تو پھر "ان" یا "اُن" سے کام نہ چلے گا؟ الغرض کردار کو ذہن نشین کرانے کے لئے نام لینا بے حد ضروری ہے اور "یہ" "وہ" "اُن" "اِن" وغیرہ سے پرہیز لازم ہے۔

مناظر کی ترتیب

جس طرح اسٹیجی ڈرامہ میں مناظر کی تبدیلی سے قصہ کے مختلف اجزاء کو ملایا جاتا ہے اسی طرح نشری ڈرامہ میں موسیقی، صوتی اثرات اور اناؤنسر (Announcer) کے تبصرہ سے مختلف مناظر کو ملایا اور ترتیب دیا جاتا ہے۔ مثلاً دو افراد اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے آیندہ سفر کا ذکر کر رہے ہیں اس کے بعد کا منظر اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے۔ گھر کی گفتگو اور پلیٹ فارم کے منظر کے درمیان اگر موٹر کا آنا ان دونوں کا اس میں بیٹھنا موٹر کا چلنا پر شور سڑک پر سے گزرنا اسٹیشن کے پاس موٹر کا رکنا وغیرہ بتایا جائے تو یہ ترتیب ضرور جاذب توجہ ہوگی۔ ترتیب کے متعلق بھی کوئی خاص اصول نہیں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ڈرامہ ہو اور ہم اس کی گنجایش کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ مناظر کو کس طرح کی ترتیب دی جائے۔

ہدایات

جس طرح اسٹیجی ڈرامہ میں اداکاروں کی رہبری کے لئے ہدایات لکھی جاتی اسی طرح نشری ڈرامہ میں بھی ہدایات کا وضاحت کے ساتھ لکھا جانا ضروری ہے مگر ان میں اور اسٹیجی ڈرامہ کی ہدایات میں بہت فرق ہے۔ مثلاً اسٹیج کے لئے لکھا جاتا ہے "حامد داخل ہوتا ہے"۔ نشری ضرورت کے پیش نظر "حامد کے داخل ہونے کی آواز" لکھا جائے کیونکہ اسٹیج پر تو حامد خود داخل ہوتا ہے مگر اسٹوڈیو میں یہ ہو سکتا ہے کہ حامد پہلے ہی سے مائکروفون

کے قریب بیٹھا ہوا اور اس کے داخلہ کے وقت کسی اور کو چلا کر اس کے داخلہ کا اثر پیدا کیا جائے۔ اسٹیج کی بعض ہدایات مائی کروفون (Microphone) کے لئے بالکل مضحکہ خیز ہوں گی مثلاً "افسری گلے میں باہیں ڈال کر باتیں کرتی ہے۔" "ممتاز پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتا ہے۔" "سراج سر کا اشارہ کرتا ہے۔"
"جمیل کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھ لی جاتی ہے" وغیرہ۔ نثری ڈرامہ میں اگر ایک کردار کوئی کام کرے اور اس کی وجہ سے کوئی آواز ہو یا اس کا حوالہ مکالمہ میں دیا جائے تو ہمیشہ اس آواز کے پیدا ہونے کی ہدایت درج کرنا چاہئے۔

موسیقی نثری ڈرامہ میں موسیقی کو شریک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی قطعی بات اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ہر ڈرامہ کی انفرادی ضروریات اور گنجائش پر منحصر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ موسیقی کو نقل مکان یا مرور ایام کے اظہار کے لئے خوبی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس طرح اسٹیج کا پردہ چھوڑ کر منظر بدلا جاتا ہے اسی طرح موسیقی سے کام لیا جا سکتا ہے مگر اس کا دوران تیس سکنڈ سے زیادہ نہ ہو۔ موسیقی کا انتخاب جس طرح ہر وہ ڈرامہ نگار جو موسیقی سے واقف نہ ہو نہیں کر سکتا اسی طرح ہر اچھا مطرب بھی انتخاب نہیں کر سکتا کیونکہ ہر مطرب کا ڈرامہ کی ٹکنیک سے واقف ہونا ضروری نہیں۔ اگر چند ایسے اشخاص جن کو ڈرامہ اور موسیقی دونوں پر قدرت حاصل ہے، باہم مشورہ سے موسیقی کا انتخاب کریں تو بہتر ہے۔ پس منظر میں بھی موسیقی یا اس کے اثرات دئے جا سکتے ہیں۔

آواز نشریات میں آواز کی اہمیت ظاہر ہے۔ اگر مطرب، مقرر اور اداکار کی آواز میں دلکشی نہ ہو تو یہ مشکل ہے کہ سامعین کوئی دلچسپی لیں۔ بلکہ ان کو کامل آزادی رہتی ہے کہ وہ فوراً دوسری نشرگاہ کا پروگرام سننے لگیں یہی وجہ ہے کہ کسی فن کار کی فنی صلاحیتوں کا امتحان لینے سے پہلے اس کی آواز کا امتحان لیا جاتا ہے۔ نشرگاہ ایک پبلک ادارہ ہے۔ حکام کا بے جا دباؤ امرا کی دولت اور ارباب نشر کی جانبداری وغیرہ سامعین کی پسند اور ان کے ذوق کے مقابلہ میں بے اثر ہے۔ سننے والوں کی پسند طرح طرح کی ہوتی ہے۔ کسی کو باریک آواز پسند ہے کسی کو موٹی آواز بھلی لگتی ہے کوئی اوسط قسم کی آواز پسند کرتا ہے۔ بعض ایسے ہیں جو مردوں کی آواز میں قدرے لوچ اور نزاکت کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض عورتوں کی آواز میں مردوں کی آواز کا رعب اچھا سمجھتے ہیں۔ پسند کی تو خیر کوئی حد ہی نہیں مگر "ناپسند" کی حدیں مقرر ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو خرخراہٹ والی آواز اچھی کہے۔ کون ہوگا جو ایک توتلے سے سقراط کی کہانی سنے جو ہر بار سقراط کو "ٹھک لات" کہتا ہے؟ کون ایسا ہے جو برٹش میوزیم پر تقریر سننے کے لئے ریڈیو کے قریب بیٹھے اور برٹش کو "بہ بہ بہ برٹش" اور میوزیم کو (مہ مہ مہ میوزیم) سننا پسند کرے؟ بعض اصحاب کی زبان موٹی ہوتی ہے اور وہ الفاظ صاف طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ ہکلے نہ ہونے کے باوجود بھی روانی کے ساتھ بولنے یا پڑھنے سے قاصر ہیں۔ ایسے اصحاب کے لئے نشرگاہ کا دروازہ بند ہے اور مائی کروفون مردہ، اس میں ارباب نشر کا قصور نہیں بلکہ قدرت ذمہ دار ہے بعض معترضین کا کہنا ہے کہ "پھر یہ لوگ کیا کریں؟" لیکن

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر لنگڑا فٹ بال نہیں کھیل سکتا، بہرا گانا نہیں سن سکتا اور اندھا ایم سی سی (M.C.C.) کا میچ نہیں دیکھ سکتا تو اس میں محمڈن اسپورٹنگ کلب (Mohammadan spotting club)، گویئے اور ایم سی سی کا کیا قصور ہے؟

فاصلہ ہم فاصلہ کے ذریعہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ آواز کس طرف سے آرہی ہے اگر ایک سے زیادہ آوازیں ہوں تو ان کے باہمی فاصلہ کو بھی ایک حد تک بتایا جا سکتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سمت اور فاصلہ میں قریبی تعلق ہے ان میں سب سے زیادہ اہمیت مبداء آواز اور مائکروفون کے باہمی فاصلہ کو حاصل ہے کیونکہ فاصلہ کا علم ہو جانے سے سامعین اصلی منظر یا بہ الفاظ دیگر تصور کردہ منظر کا حقیقی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ہم نہایت آسانی کے ساتھ یہ پہچان سکتے ہیں کہ آواز دائیں جانب سے آرہی ہے یا بائیں جانب سے۔ دائیں جانب سے آنے والی آواز ہمارے دائیں کان میں بمقابل بائیں کان کے جلد داخل ہوگی اور اس طرح ہم جان لیں گے کہ آواز ہماری دائیں جانب سے آئی ہے۔ برخلاف اس کے آگے پیچھے اور اوپر نیچے کا فرق اتنا واضح نہیں ہوتا۔ ذیل کے نقشہ کو ملاحظہ کیجئے:
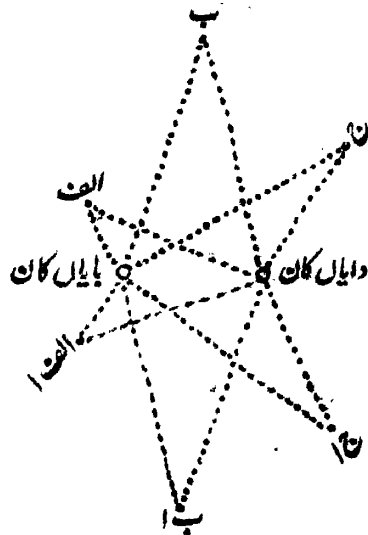
فرض کیجئے کہ آواز مقام الف سے آرہی ہے تو ہم آسانی سے کہہ سکیں گے کہ مبداء آواز کا بائیں جانب ہے یا اگر ب سے آئے تو سمجھ لیا جائے گا کہ سامنے سے آرہی ہے۔ اگر آواز مقام ج سے نکلے تو مبداء آواز دائیں رخ پر ہوگا۔ اسی طرح اگر الف ب اور ج سے آوازیں آئیں تو ان کا رخ ترتیب وار بایاں پچھلا اور دایاں ہوگا۔ برخلاف اسکے ہم الف الف ا ب ب ا اور ج ج ا میں فرق نہیں کر سکیں گے کیونکہ یہ نقاط دونوں کانوں سے متوازی فاصلہ پر واقع ہیں۔ جانور بالعموم اپنے کان کھڑے کر کے اصلی رخ آواز کا دریافت کرتے ہیں، ہم اپنے دونوں کانوں کی مدد سے بائیں اور

دائیں بائیں کا فرق بتا سکتے ہیں مگر مائکروفون ایک کان ہے۔ اگر ہم دو مائکروفون استعمال کریں اور دونوں کی نشریات دو مختلف ٹرانسمٹروں (Transmitter) اور لاؤڈ اسپیکروں (Loud speaker) پر سنی جائیں تب بھی دائیں اور بائیں کا فرق نہیں بتا سکتے۔ اور ایک نقشہ ملاحظہ کیجئے:
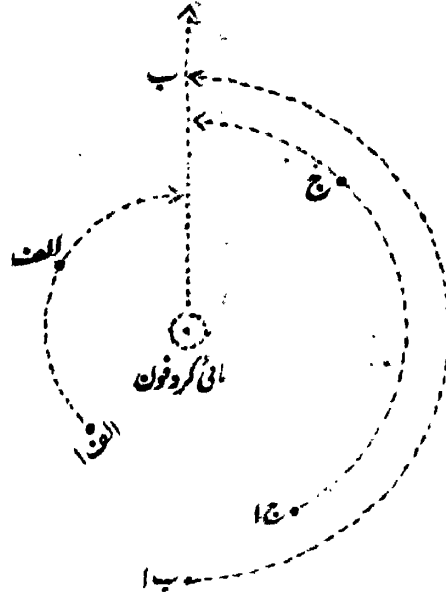
الف الف ۱، ب ب ۱ اور ج ج ۱ سے آنے والی آوازوں کا حجم ایک ہو تو ان آوازوں کے مقامات کا تعین نہیں کیا جا سکے گا۔ یعنے الف سے آنے والی آواز بالکل ویسی ہی ہوگی جیسی کہ الف ۱ سے آنے والی آواز۔ اصل اہمیت فاصلہ کی ہے اور فاصلہ ہی سے مبدا، آواز کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کوٹھے سے گفتگو کر رہا ہے اور اس کا جواب دوسرا شخص نیچے سڑک پر سے دے رہا ہے تو اس کیفیت کو بغیر کوٹھے اور سڑک کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص مائکروفون کے قریب ہو اور دوسرا دور تو بالکل وہی اثرات ہونگے بشرطیکہ بات چیت میں کوٹھے کا حوالہ دیدیا جائے اور لب و لہجہ سے دوری کا اظہار ہوتا ہو۔

حرکت اب تک ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ آواز اور فاصلہ کی کیا اہمیت ہے اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ سامعین اداکار کی حرکات "سن" سکتے ہیں۔ سمت کی تبدیلی، فاصلہ کی تبدیلی یا سمت اور فاصلہ دونوں کی تبدیلی سے یہ پہچان لیا جا سکتا ہے کہ مبدا آواز ہٹ گیا ہے یا آواز پیدا کرنے والے جسم نے حرکت کی ہے۔
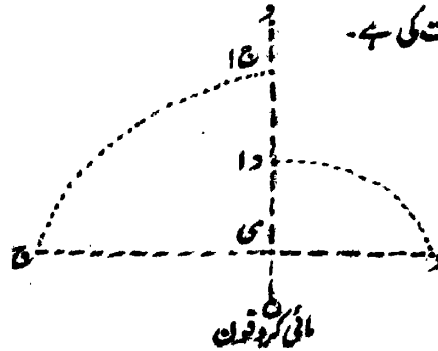
اس نقشے کے مطابق فرض کیجئے کہ مبداء آواز مقام ج سے حرکت کرتا ہوا سیدھی سمت میں مائکروفون کے سامنے سے گزرتا ہوا مقام د تک پہونچتا ہے ۔ اس حرکت کی وجہ سے سامعین پر یہ بھی اثر ہوسکتا ہے کہ مبداء آواز مقام ج اسے حرکت کرتا ہوا مقام ی تک آیا اور پھر مقام د اپر واپس ہوگیا، کیونکہ ج ی اور ج آ ی کا باہمی فاصلہ ایک ہے ۔ جب مبداء آواز مقام ی تک پہونچنے کی کوشش میں دا ی کا فاصلہ طے کرچکا تو اس مقام سے نکلنے والی آواز کا ۔ ی د اور ی د ا کا فاصلہ برابر ہے اس لئے ہمارے پچھلے ادعا کے مطابق کوئی فرق نہ ہوگا ۔

نہ صرف آواز پیدا کرنے والے اجسام کی حرکتوں بلکہ بے آواز اجسام کے وجود کو بھی محسوس کرلیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان کے وجود سے آواز کے حجم میں فرق پڑے ۔ فرض کیجئے کہ مائکروفون کے قریب دو آدمی بیٹھے باتیں کررہے ہیں اگر ان کی بات چیت کے دوران میں بڑے جسم والی کوئی چیز ان کے اور مائکروفون کے درمیان حایل ہوجائے تو اس کا وجود محسوس ہوسکے گا ۔ اگر کسی اسٹوڈیو (Studio) کے باہر مکمل خاموشی ہو اور اس خاموشی کے عالم میں اسٹوڈیو کا دروازہ یا کھڑکی کھولی جائے تو اس کی وجہ سے اسٹوڈیو کی فضا اور ہوا میں حرکت ہوگی اور یہ حرکت محسوس کی جاسکتی ہے ۔

نہ صرف آواز پیدا کرنے والے اجسام کو حرکت دیکر اور ان کے فاصلہ میں کمی بیشی کرکے آواز اور فاصلہ کا فرق ظاہر کیا جاسکتا ہے بلکہ خود مائکروفون کو ہٹا کر بھی اثر پیدا جاسکتا ہے ۔ سامعین یہ محسوس نہیں کرسکتے کہ مائکروفون ہٹایا جارہا ہے یا خود مبداء آواز ہٹ گیا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں صرف فاصلہ کا فرق پڑتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ اگر مبداء آواز مائکروفون سے دس فیٹ دور ہوجائے یا مائکروفون کو مبداء آواز سے دس فیٹ دور کردیا جائے تو نتیجہ ایک ہی ہوگا ۔ البتہ بعض صورتوں میں سامعین خاص حالات کے تحت بتاسکیں گے کہ کس کو ہٹایا گیا ہے مثلاً یہ کہ کسی ڈرامہ میں دیوار کی گھڑی کی آواز کا حجم بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہوجائے تو سامعین پر یہ اثر ہوسکے گا کہ مائکروفون گھڑی کے قریب کردیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر گھڑیاں دیوار پر لٹکی رہتی ہیں ۔ برخلاف اس کے پیروں کی آواز بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہوجائے تو وہ یہ سمجھنے میں بالکل حق بہ جانب ہوں گے کہ کوئی شخص چلتا ہوا مائکروفون کے قریب آیا ہے ۔ اگر ہر دو مثالوں کو عملاً بالکل اُلٹ دیا جائے یعنی یہ کہ گھڑی کو مائکروفون کے قریب کیا جائے اور کوئی شخص ایک جگہ کھڑا کھڑا چلنے کی آواز پیدا کرے اور مائکروفون آہستہ آہستہ اس کے قریب لیجا کر چلنے والے کے قریب آنے کا اثر پیدا کیا جائے تو سامعین پہچان نہیں سکتے ۔ کیونکہ اب بھی وہی سمت و فاصلہ کا مسئلہ ہے ۔ اس سلسلہ میں اور ایک چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص تقریر کرتے ہوئے اپنا سر ہٹالے یا سر نیچے کی طرف کرلے تو یہ حرکت " سنائی دیتی " ہے ۔ آواز کا سمتی اثر محسوس ہوتا ہے ۔ وائلن اور پیانو جیسے گونجنے والے باجوں کو بجاتے وقت یہ اثر کم محسوس ہوتا ہے، لیکن مخروطی (Conical)

باجوں اور اُن باجوں کو بجاتے وقت جو منہ سے بجاتے جاتے ہیں یہ زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ سمت بدل دی گئی ہے۔

حجم جب معمولی بات چیت میں آواز کے حجم کو اہمیت حاصل ہے، تو نشریات میں یقیناً اور زیادہ ہوگی کیونکہ بات چیت میں بہت سی باتیں آنکھ اور ہاتھ پیر کے اشاروں اور ہونٹوں کی حرکات سے بھی سمجھ میں آجاتی ہیں لنشر میں صرف سامعین کے کان اور تخیل کا کام ہے۔ اگر حجم میں کمی زیادتی ہو تو نشر پر برا اثر پڑے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ کنٹرول پینل (Control Panel) مشین کا وہ حصہ جہاں آواز کو ضرورت کے مطابق بڑھایا یا کم کیا جاتا ہے) کے ذریعہ آواز کو گھٹا یا بڑھایا جا سکتا ہے مگر جس طرح آپ پچیس کینڈل پاور (Candle Power) کے قمقمہ سے صرف پچیس کینڈل پاور کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں، موٹر اتنی ہی تیز دوڑا سکتے ہیں جتنی کہ اس میں طاقت ہے اسی طرح کنٹرول پینل سے آواز کو اتنا ہی گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں جتنی کہ اس میں گنجائش موجود ہے۔ اداکار کی آواز اور کنٹرول پینل میں جتنی صلاحیت اور طاقت ہوگی اتنا ہی کام لیا جا سکے گا۔ بعض گویئے، مقرر، اور اداکار مائیکروفون سے دور بٹھائے جائیں تو وہ آہستہ آہستہ کھسک کر خود ہی قریب آجاتے ہیں۔ ان کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ بُعد کی وجہ سے ان کی آواز دور تک نہیں جا رہی ہے۔ بعض دوسروں کو بلند آواز سے بولتے ہوئے سنکر خود بھی بلند آوازیں بولنے لگتے ہیں۔ واضح رہے کہ اداکار اور مائیکروفون کا درمیانی فاصلہ اس کی آواز کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ غلط خیال ہے کہ بلند آواز سے بولئے تو آواز دور تک جائے گی۔

رفتار عام طور پر حجم (Volume) اور رفتار (Velocity) کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ حجم تو آواز کی بلندی یا پستی کا نام ہے لیکن رفتار یہ ہے کہ فی منٹ آپ کی زبان سے کتنے الفاظ ادا ہو رہے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص فی منٹ سو لفظ ادا کر رہا ہے اور اس سے کہا جائے کہ وہ رفتار تیز کر دے تو وہ فی منٹ ڈیڑھ سو الفاظ اور کم کرنے کے لئے کہا جائے تو ۷۵، الفاظ بولے گا۔ ڈرامہ کے کس حصہ کو کس حجم اور رفتار سے ادا کیا جائے اس کا تعین بھی مکالمے کی مناسبت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ سرگوشیاں کم حجم کی ہوں گی۔ لڑائی کا مکالمہ تیز رفتار کے ساتھ ادا ہوگا اور ڈرائنگ روم کی گفتگو گھریلو انداز کی ہوگی۔ میں پھر اس نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ کامیابی نشر کے لئے اداکار کے مکالمے کے ساتھ ساتھ اس کے آواز کے حجم اور رفتار کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

صوتی اثرات نشریات میں صوتی اثرات کو وہی اہمیت حاصل ہے جو تھیٹر یا سینما میں سین سینری، لباس، فرش، فرنیچر اور روشنی کو حاصل ہے لیکن صوتی اثرات کے سلسلہ میں

اس اُصول کو ہمیشہ یاد رکھئے کہ وہ اسوقت تک استعمال نہ کئے جائیں جب تک خاص تاثر پیدا کرنے کے لئے انکی ضرورت نہ ہو۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ بہت سی مانوس آوازیں لاؤڈ اسپیکر پر صحیح اور حقیقی شکل میں سنائی نہیں دیتیں۔ تجربہ کے طور پر آپ سینما میں تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے کوئی ناطق فلم دیکھئے۔ آپ کو بہت سے صوتی اثرات ایسے سنائی دیں گے جو بالکل بے معنی ہیں اور ان کو بغیر فلم دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ان صوتی اثرات سے واقفیت حاصل کر لیجئے، مثلاً بچے کے رونے کی آواز، سیٹی، متعدد گھریلو اور جنگلی جانوروں کی آواز، ٹیلیگرافی آلہ کی آواز وغیرہ۔ اس کے مقابلہ میں آبشار اور بارش، گائے اور بکری کا دودھ دوھنا، فٹ بال کی آواز مختلف اجسام کے زمین پر گرنے کی آواز وغیرہ ہے۔ ان آوازوں سے ہم مانوس ہوں گے مگر وہ ایک دوسرے سے اتنی ملتی جلتی ہیں کہ بغیر مکالمہ اور حوالہ کے تمیز کرنا مشکل ہے۔

ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

اناؤنسر: سرور نے خانصاحب کے مکان سے فوراً نکل جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ارشاد بھی اس تخلیہ کا موافق ہو دونوں انتہائی عجلت میں اپنا سامان اُٹھاتے اور بڑے دروازے کھولتے ہوئے خانصاحب کے جہنم نما مکان سے نکل جاتے ہیں۔

(بارش کا اثر)

سرور: (مائی کروفون سے ذرا دور ہوکر) ارشاد خدا کے لئے دروازہ بند کرنے کے لئے نہ رکو۔ چلو جلدی چلو

ارشاد: (مائی کروفون کے قریب سے) اچھا مگر میرے لئے ٹھیرو تو دیکھو گر پڑو گی۔ کہیں چوٹ نہ آجائے۔

سرور: (مائی کروفون کے قریب سے) مجھے اس کی قطعاً پروانہیں میں یہاں سے جلد نکل جانا چاہتی ہوں۔ افوہ یہ ایک لعنت ہے — کیوں ہے نا۔

ارشاد: "ہاں یقین ہے۔ اگر ہم کو ریل نہ ملے تو رات اسٹیشن میں ہی بسر کریں گے"

اس مکالمے میں بارش کا اثر شریک کیا گیا ہے مگر کہیں حوالہ نہیں دیا گیا۔ بارش کا اثر فضائی خلل سمجھا جا سکتا ہے جب تک کہ مکالمہ میں اور اناؤنسر کے تعارف میں بارش کا ذکر نہ ہو مکالمہ مبہم رہیگا۔ تھوڑی سی تبدیلی سے دیکھئے کتنا فرق ہو جاتا ہے اور مطلوبہ ذہنی تصویر کتنی مکمل ہو جاتی ہے۔

اناؤنسر: سرور نے خانصاحب کے مکان سے فوراً نکل جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ارشاد بھی اس تخلیہ کا موافق ہے۔ دونوں انتہائی عجلت میں اپنا سامان اُٹھاتے اور بڑے دروازہ کو کھولتے ہوئے موسلا دھار بارش کی پروا کئے بغیر خانصاحب کے جہنم نما مکان سے نکل جاتے ہیں۔

(بارش کا اثر)

سرور: (مائکروفون سے ذرا دور ہوکر) ارشاد خدا کے لئے دروازہ بند کرنے کے لئے ذرا رکو۔ چلو جلدی چلو۔
ارشاد: (مائکروفون کے قریب سے) اچھا مگر میرے لئے ٹھیرو تو دیکھو کیچڑ ہے گر پڑو گی کہیں چوٹ نہ آجائے۔
سرور: (مائکروفون کے قریب سے) مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں، میں جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ افوہ یہ بارش ایک لعنت ہے۔ کیوں ہے نا۔
ارشاد: ہاں یقین ہے اگر ہم کو ریل نہ ملے تو رات اسٹیشن ہی میں بسر کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ خط کشیدہ الفاظ سے مکالمہ کا سارا ابہام جاتا رہا اگر مکالمہ میں اور اناؤنسر کے تبصرہ میں بارش کا حوالہ نہ دیا جائے تو سرور جس لعنت کا ذکر کر رہی ہے اس سے بارش کا مفہوم نہیں نکلتا بلکہ خانصاحب کا مکان متصور ہوتا ہے۔

صوتی اثرات تین چار طریقوں سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو انسان خود اپنے ہاتھوں سے کام لیکر مختلف اثرات پیش کرسکتا ہے مثلاً دیا سلائی سلگاتا ہے۔ طمانچہ مارتا ہے۔ گھڑی میں کنجی دیتا ہے۔ کوئی ساز بجاتا ہے وغیرہ وغیرہ دوسرا ذریعہ میکانکی ہے۔ گو اس میں بھی انسان کی ضرورت ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔ انسانی ہاتھوں کی تھوڑی بہت مدد سے کام چل جاتا ہے۔ میکانکی ذریعہ کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی ٹب میں تھوڑا سا پانی بھر کر اس کا فوارہ کھول دیا۔ فوارہ کا پانی جب ٹب کے پانی پر مسلسل گرتا ہے تو بارش کا اثر پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ گھڑی مائکروفون کے قریب رکھدی اور مطلوبہ گھنٹے بجانے لگی۔ بجلی کے ذریعہ سے بھی صوتی اثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے اثرات کے ریکارڈ تیار کرلئے گئے ہیں جن کو مکالمہ کی مناسبت سے بجایا جاتا ہے۔ مختلف صوتی اثرات کو چاہئے وہ میکانکی ذریعہ سے پیش کئے جائیں یا ان کے ریکارڈ بجائے جائیں، آپس میں ملانا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے حقیقی اثر پیدا کرنا نہایت مشکل اور مہارت کا کام ہے۔ اس کی ٹیکنیک وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسٹوڈیو، مائکروفون، گرامونون ٹرن ٹیبل[1] اور ڈرامیٹیک کنٹرول پینل[2] سے واقف ہیں اور ان سب کی فنی خصوصیات جانتے ہیں۔ مگر میں ان کا ذکر عمداً نہیں کروں گا کیونکہ یہ فرائض ڈرامہ اور تھیٹر کے پیش کرنے والوں کے ہیں اور ڈرامہ نگاروں سے ان کو بہت کم تعلق ہے۔ صوتی اثرات کے سلسلہ میں ڈرامہ نگاروں کو یہ ہمیشہ ذہن نشین رکھنا ہے کہ "ایک آونس اشارہ ایک ٹن نقالی کے برابر ہے"

صوتی اثرات کے ضمن میں گرامونون ٹرن ٹیبل بڑا مفید آلہ ہے۔ ہم بیک وقت چھ چھ اور اس سے زیادہ ریکارڈ

[1] (Gramophone Turn Table) ایسا گرامونون جس پر بیک وقت دس دس اور بارہ ریکارڈ مختلف یا ایک ہی حجم اور رفتار کے ساتھ بجائے جاتے ہیں ——

[2] (Dramatic Control Panel) مشین کا وہ حصہ جس سے ڈرامہ کی مناسبت سے مشین کنندہ یا کوئی اور متعلقہ شخص اداکاروں کی آواز پر صوتی اثرات ریکارڈ اور موسیقی وغیرہ کو ملاتا یا ان کے حجم میں مناسب کمی بیشی کرتا رہتا ہے۔

بجا سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کو ایک ایسا منظر پیش کرنا ہے جس میں بچہ کے رونے کی آواز، کسی گوئیے کا گانا، موٹر ہارن، ریل مجمع کا شور وغل اور ہوائی جہاز کے اثرات پیدا کرنا ہیں تو ہم بیک وقت یہ تمام اثرات ریکارڈ کے ذریعہ سے پیدا کر سکتے ہیں اور حسب ضرورت ان کے حجم کو کم زیادہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً کبھی گانے کا حجم بڑھا کر دوسرے اثرات پس منظر میں پیش کر دئے کبھی مجمع کا شور وغل زیادہ کر دیا۔ کبھی ہوائی جہاز کی آواز تیز کر دی۔ اسٹیجی ڈراما میں تو سینری اور فرش، فرنیچر بدلنا پڑتا ہے مگر ریڈیو میں مختصر صوتی اثر اور مکالمے کے حوالہ سے ایک مقام دوسرے مقام میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

اسٹوڈیو میں آپ کو بے شمار چیزیں ایسی ملیں گی جن کو دیکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ان کا مصرف کیا ہے۔ ایک لمبی میز جو مختلف سطحوں کی ملے گی۔ ایک سطح لکڑی، ایک دھات کی ایک نمدے کی۔ ایک مصنوعی پتھر اور دو مختلف قسم کے ربر کی۔ ان سطحوں پر سلاخوں وغیرہ سے ضرب لگانے اور رگڑنے سے کئی قسم کی آوازیں نکلتی ہیں۔ حتیٰ کہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اور بندوق کی آواز تک انھیں سے نکالی جا سکتی ہے۔ ایک تاروں والا بڑا پنجرہ ہے جس کے اندر موٹر سے چلنے والا پنکھا لگا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ سے معمولی ہوا سے لیکر طوفان خیز ہوا تک کا اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

نشری اداکاری کی اولین خصوصیت اپنی آواز پر قادر ہونا ہے واضح رہے کہ خطیبانہ انداز آج کل کام نہیں دیتا۔ وہ زمانہ گزر چکا جب اس انداز سے دل ہل جایا کرتے تھے آج کل اس انداز کا بچہ بھی مذاق اڑاتے ہیں، اس میں قطعاً صداقت و تاثر نہیں ہوتا۔ چونکہ نشر اور آواز لازم و ملزوم ہیں اس لئے یہ احساس ضروری ہے کہ اصلی آرٹ آواز میں پوشیدہ ہے اور یہ اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اداکار آواز پر قدرت حاصل کرلے اور کوشش سے یہ مشکل نہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض گانے والے اول اول گھڑے میں منھ ڈال کر گایا کرتے تھے۔ یہ دراصل آواز میں حُسن پیدا کرنے کا ایک ہندوستانی طریقہ تھا۔ آواز میں حُسن پیدا کرنا اناؤنسر اور اداکار کا فرض ہے۔ اس کو اسقدر حسین بنائیے کہ وہ سریلے پن اور دلکشی کا کمال حاصل کرلے۔ اس میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔ آواز کو اتنا حساس بنایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر جذبہ، ہر گانے خیال اور ہر تاثر کو پیش کر سکے۔ اس میں اتنی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ زیر و بم اور خفیف سے خفیف اُتار چڑھاؤ کو ظاہر کر سکے۔ نشری ڈراموں میں صرف آپ کی آواز ہی "شخصیت" کو پیش کر سکتی ہے۔

اداکار کو دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ایک تو یہ کہ وہ نہایت توجہ کے ساتھ اپنا پارٹ دیکھتا رہے اس کا دھیان ایک ایک حرف پر رہے۔ دوسرے وہ آواز کے اُتار چڑھاؤ اور حجم کا بھی خیال رکھے۔ اداکار کو گفتگو کرتے وقت اپنے اعضا یا اعصاب میں کوئی حرکت کرنا چاہئے یا نہیں، یہ بھی اپنی جگہ کم اہم مسئلہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مکالمہ کی مناسبت سے اس قسم کی حرکات کی جائیں تو جذبات پیدا کرنے میں مدد

ملتی ہے۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حرکات و سکنات سے بہت کم کام لیا جائے کیونکہ اس طرح اداکار جلد تھک جاتا ہے۔ ڈراموں کی نشر کے وقت غیر متعلق لوگوں کو ناظرین کی حیثیت سے اسٹوڈیو میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اسٹوڈیو کے ناظرین اگر آنکھوں آنکھوں میں یا مسکراہٹ یا کسی اور ذریعہ سے اداکاری کی داد دیں یا کسی اچھے جملہ پر اپنے طور پر محظوظ ہوں اور اداکار کو اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دھیان پلٹ جاتا ہے اور وہ اس کے بعد کے موقعوں پر ان کی طرف تحسین و داد کی خاطر غیر شعوری طور پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسے لایق پروفیسر کو جانتا ہوں جو اپنے مضمون کے بہت اچھے اُستاد اور عمدہ ناشر ہیں مگر ان میں ایک کمزوری یہ ہے کہ اگر نشر کے وقت ان کے اسٹوڈیو میں کوئی شخص رہتا ہے تو اس سے ورنہ کم از کم اناؤنسر ہی سے اپنے خیالات اور مزاحیہ نکات کی داد لینے کے لئے گردن موڑ کر دیکھتے ضرور ہیں۔

نشری اداکار کو اپنا پارٹ یاد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یاد کرنے میں ایک تو وقت ضایع ہوتا ہے دوسرے ذہین سے ذہین اداکار بھی اپنا پارٹ بھول سکتا ہے۔ نشر کے وقت اسٹیج کی طرح کوئی "لقمہ دینے والا" تو ہوتا نہیں اس لئے حفظ کرنا بلا ضرورت ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کو یہ چاہئے کہ وہ اپنے پارٹ کو اتنی مرتبہ پڑھ لے کہ الفاظ بالکل بے اختیارانہ طور سے اس کی زبان سے ادا ہوں، اور سننے والے یہ محسوس نہ کریں کہ سارا مضمون پہلے ہی سے اسکے ذہن نشین ہوگیا ہے اور وہ پڑھ رہا ہے۔

اوراق اُلٹنے میں انتہائی احتیاط کرنی چاہئے۔ مائی کروفون بے حد حساس ہوتا ہے معمولی سانس تک کی آواز نشر ہو سکتی ہے۔ اگر ورق اُلٹنے کی آواز سامعین سن لیں گے تو ان کو احساس ہو گا کہ پارٹ پڑھا جا رہا ہے اور سارا اثر زایل ہو جائے گا۔ اگر کسی اداکار کا کام ختم ہوگیا ہے یا اس کا پارٹ شروع ہونے میں کچھ دیر ہے تو اس کو بالکل خاموش رہنا چاہئے۔ دوسرے اداکاروں سے کانا پھوسی کرنے یا اشارہ کرنے سے قطعی احتراز کرنا چاہئے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ پہلا ڈرامہ جو نشری ضروریات کو خاص طور پر پیش نظر رکھکر لکھا گیا، سنہ ۱۹۲۲ء کی کرسمس کی شام کو لندن کی نشرگاہ سے بچوں کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔ اس کا نام "دی ٹرتھ اباوٹ فادر کرسمس" (The Truth About Father Christmas) تھا، اس کے بعد ریجنلڈ برک لی (Reginald Berkley) کا ڈرامہ "واھیٹ شیٹو" (White Chateau) سنہ ۱۹۲۵ء میں نشر کیا گیا۔ اُس وقت سے لیکر اب تک ارباب بی۔ بی۔ سی نشری ڈرامہ اور اداکاری کے سلسلہ میں ان تھک کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی قطعی ٹکنیک دریافت نہیں ہوئی ہے اور نہ اداکاری کے مسلمہ تفصیلی اُصول بیان کئے گئے ہیں۔ تاہم ارباب نشر کی اسوقت تک کی کوششوں کی داد دیتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اب تک جو جستجو کی گئی ہے اور جو اُصول و قواعد اس وقت تک مرتب ہو چکے ہیں انہیں مقامی ضروریات کے مدنظر تبدیلی کر کے ان سے بہت کچھ فایدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ)

خان آرزو کی مثنوی "شورِ عشق"

خان آرزو کا پایۂ شاعری میں کتنا بلند تھا اور قدرت کی طرف سے وہ کیسا ذہن رسا لیکر آئے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ صرف چودہ سال کے سن میں درسیات سے فارغ ہوکر شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے اور اصناف شاعری میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ میر حسن کی روایت کے مطابق انھوں نے سات دیوان لکھے "دہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی میزند" افسوس کہ میر حسن نے اُن سات دیوانوں کی تفصیل نہیں لکھی، تاہم ہمیں اپنی تحقیق سے چار دیوانوں کا نام اور بعض کا پتہ معلوم[۲] ہوا ہے۔ ایک دیوان[۱] انھوں نے شفیعائے اثر کے رنگ میں کہا دوسرا بابا[۳] فغانی کے دیوان کے جواب میں تیسرا محمد قلی سلیم کے جواب میں اور چوتھا کمال خجند[۴] کے دیوان کے جواب میں۔ اسی طرح اکثر و بیشتر اساتذہ کی مثنویوں کے جواب میں مثنویاں لکھیں مثلاً ملا ظہوری کے ساقی نامہ کے جواب میں ساقی نامہ کہا اور نام اس کا عالم آب[۵] رکھا۔ ایک مثنوی بحر غیر متعارف[۶] میں کہی جس کے دو شعر یہ ہیں:

آدم گل باغ است جہان شیطان باشد نافرمان
راست براست رقم کردم شاخ سرو قلم کردم

ملا فوقی کی مثنوی سوز و گداز کے رنگ میں جوش و خروش[۷] کہی۔ حکیم سنائی کے حدیقہ کی بحر میں ایک دوسری مثنوی[۸] کہی اور ملا زلالی کی مثنوی محمود و ایاز کے جواب میں انھوں نے شورِ عشق[۹] کہی۔ مثنویوں کے علاوہ مخمسات و ترکیب بند و ترجیع بند و مقطعات و تواریخ وغیرہ بھی ہیں۔ جن کا ذکر سفینوں و تذکروں میں موجود ہے۔

تعجب ہے کہ خان آرزو کا فارسی کلام[۱۰] تو اس قدر ملتا ہے لیکن میر و سودا کا اُستاد اُردو کا ایک دیوان بھی نہ چھوڑ سکا اس کا سبب مولوی محمد حسین صاحب آزاد سے سنئے:

"خان آرزو کو زبان اُردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے۔ جب تک کل منطقی ارسطو کے

---

[۱] سفینۂ عشرت بانکی پور لائبریری۔ [۲] صحف ابراہیم۔ [۳] مجمع النفائس جلد اول پٹنہ لائبریری۔ [۴] مجموعۂ نغز۔ [۵] خلاصۃ الکلام ——
[۶] سفینۂ خوشگو قلمی۔ [۷] مقدمہ عطیۂ کبریٰ قلمی کتب خانہ جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ [۸] سفینۂ خوشگو۔ [۹] اسپرنگر اودھ کیٹلاگ صفحہ ۱۳۳۔
[۱۰] آب حیات ذکر خان آرزو

عیال کہلاتے رہیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے ۔ فارسی تصنیفات کی وجہوں نے انھیں کوئی دیوان اُردو میں نہ لکھنے دیا اس لئے اُن کے باب میں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ خان آرزو وہی ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شایستہ فرزند پرورش پاکر اُٹھے جو زبان اُردو کی اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذومعنی الفاظ پر تھی ۔ اُسے کھینچکر فارسی کی طرز اور اداے مطالب پر لے آئے یعنی مرزا جان جاناں مظہر ۔ مرزا رفیع ۔ میر تقی میر ۔ خواجہ میر درد وغیرہ ۔

خان آرزو اُردو کے شاعر نہ تھے نہ اُسے اُس زمانہ میں کچھ کمال سمجھتے تھے البتہ چند متفرق اشعار برائے تفنن طبع کہے تھے ۔ میر نے نکات میں ان کے پانچ شعر دئے ہیں ۔ قائم[1] نے بھی پانچ شعر دئے ہیں جن میں تین وہی ہیں جو میر نے لکھے ہیں ۔ گردیزی[2] نے آٹھ شعر دئے ہیں ۔ علی لطف نے البتہ دو پوری غزلیں لکھی ہیں ۔ اشعار کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ خان آرزو کو زبان اُردو پر بھی کافی عبور تھا دو شعر ملاحظہ ہوں

ہر صبح آ دکھاتا ہے تیری برابری کو　　کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سپارۂ گل کھول آگے عندلیبوں کے　　چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

خان آرزو محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ تنقید میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور اسی لئے غلام علی آزاد ان کو سراج الشعراء اور طراز الفصحا کہتے ہیں ۔ صاحب نتائج الافکار[3] ان کے متعلق لکھتے ہیں "گرم ساز ہنگامۂ سخن و بازار نقادی" اخلاص[4] لکھتے ہیں کہ "از جواہر زواہر اشعار لعل آبدار بدخشاں را بخاک و خون نشاندہ و زمین گلشن سخن را از شادابی اندیشۂ رسا سرسبز نمود" حسین قلی خان عظیم آبادی[5] ان کو "سراج و باج محفل سخندانی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور خوشگو کہتا ہے :

"جوہر اغراض آدمیت و حکیم امراض قابلیت ۔ گوہر علم را بسعی گرد آوریش آبروئے محیط اعظم حاصل، ذرۂ شعر را بہ یُمن سایہ پرورش رتبۂ آفتاب عالمگیر در ظل"

ایک دوسرے مقام[6] پر وہ خان آرزو کو دوسرے صائب کے لقب سے یاد کرتا ہے :

ہند از ذات او شدہ ایران　　بخدا ہست صائبِ دگر

حقیقت یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی نے ایسا جامع انسان دوسرا نہیں پیدا کیا ۔ تاریخ ، لغت ، نجوم ، فقہ ، منطق ، فلسفہ ، تذکرہ نویسی ، انشا پردازی ، شرح نگاری ، انتقاد سخن ، صرف و نحو اور شاعری ان سب میں اُستادی کا درجہ حاصل تھا ۔ اس جگہ میر حسن[7] کا یہ کہنا کہ امیر خسرو کے بعد ایسا صاحب کمال سننے میں نہیں آیا بہت کچھ حقیقت رکھتا ہے ۔ خان آرزو نے ملا وحشی یزدی کی ایک غزل کو تضمین کیا تھا اور اپنے ہی ہاتھ سے سفینۂ خوشگو میں لکھا تھا تاکہ یادگار رہے ۔

---

[1] تذکرۂ قائم ۔ [2] تذکرۂ گردیزی ۔ [3] گلشن ہند ۔ [4] خزانۂ عامرہ ۔ [5] نتائج الافکار مطبوعہ ۔ [6] ہمیشہ بہار ۔ [7] نشر عشق ۔ [8] سفینۂ خوشگو ۔ [9] تذکرۂ میر حسن ۔

مخمس یہ ہے: نو برگشتم کہ از تو پیامے مرا بس است از باغ وصل جلوۂ خامے مرا بس است
ور بشنوم ز درد کلامے مرا بس است از تو ہمیں تواضع عامے مرا بس است
در ہفتہ جواب سلامے مرا بس است

عمرے اگرچہ داشتہ ام حُب جاہ قرب می پیچم از عداوت دوری پناہ قرب
اکنوں چو یافتم کہ بُود صعب راہِ قرب نے صدر بر وصل خواہم و نے پیشگاہ قرب
ہمراہی تو یکدو سہ گامے مرا بس است

ہرچند العطش زدہ ام بہر آب وصل گردیدہ ام بآتش حسرت کبابِ وصل
قانع بہ جلوۂ شدہ ام از حباب وصل خمخانۂ نمی طلبم از شرابِ وصل
یکقطرہ باز ماندۂ جامے مرا بس است

چوں نقش پا فتادہ گہے در رہ تو ام حیراں برنگ ہالہ وسے بر مہ تو ام
دیدار جو گدائے در خرگہ تو ام بیہودہ گرد عرصۂ جولانگہ تو ام
گاہے کرشمہ گاہے خرامے مرا بس است

اے نرگس تو از مژہ گردید کجکلاہ من بندہ ات بدعوی من آرزو گواہ
مگذار کار من ز تغافل شود تباہ وحشی بگو بگو سگِ کو بلکہ خاکِ راہ
یعنی ز تو نوازش نامے مرا بس است

ایک قطعہ بھی ملاحظہ فرمائیے جس سے اُن کی شوخی ظاہر ہوتی ہے:

زاہد از مسجد سوئے میخانہ شب آمد مگر دین فروشیہاش را آنجا خریدارے نبود
من ہم از میخانہ رفتم جانب مسجد مرا گرچہ غیر از لغزش مستانہ رفتارے نبود
مجمعے دیدم کہ ہریک را بجز بر گو ئیم بعد تجدید وضو اشغال و اذکارے نبود
یادم آمد مجلس مستاں کہ از بس بیخودی با بد و نیک کسے ایں قوم را کارے نبود
باز گشتم زاں مکاں لاحول گویاں سوئے دیر در دو دین شان چو دیدم غیر آزارے نبود

خان آرزو کی مثنوی شورِ عشق مجھے پوری دستیاب نہیں ہو سکی۔ عام تذکروں نے تو اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے انتخاب دینا درکنار۔ بعضوں نے اگر نام بھی دیا ہے تو غلط۔ اس ضمن میں سفینۂ عشرت درگا داس، خلاصۃ الکلام وصحف ابراہیم علی ابراہیم، سفینۂ خوشگو و مجمع النفائس خان آرزو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ درگا داس نے تقریباً پوری مثنوی اپنے سفینہ میں نقل کی ہے لیکن نام اس کا نہیں لکھا۔ علی ابراہیم نے اس مثنوی کا نام جوش و خروش

رکھا ہے اور یوں شروع کرتے ہیں:

خدا وندا چہ گویم شرمسارم عرق پروردہ چوں ابرِ بہارم

انھوں نے چار توحیدوں۔ لغت، تعریفِ براق، معراج، تعریفِ سخن۔ تعریفِ ہندوستان حضرت دہلی تعریفِ فیل، تعریفِ شراب اور بہت سے عنوانات کو جو درگا داس نے اپنے سفینہ میں قبل آغاز مثنوی لکھے ہیں ترک کر دیا اور مثنوی کو فوراً یوں شروع کر دیا ہے: خدا وندا چہ گویم شرمسارم

اور آخر میں ایک خاتمہ، پر مثنوی ختم کر دیتے ہیں جو یوں شروع ہوتا ہے:

ایا نالان دل لبریز دلدار

درگا داس کے یہاں بھی خاتمہ یوں ہی ہے لیکن سرخی بدلی ہوئی ہے یعنی بجائے 'خاتمہ' کے 'خطاب لعشق' نمبرا و نمبر۲ اور نمبر دو پر کتاب یوں ختم ہو جاتی ہے:

ایا نالان دل لبریز دلدار

علی ابراہیم کو اس مثنوی کے نام میں مغالطہ ہوا اور غالباً اس کا یہ سبب ہو کر اس کا آخری شعر یہ ہے:

چو زین غمنامہ دردِ دل بجوش است خطابش از خرد جوش و خروش است

خان آرزو نے ایک مثنوی جوش و خروش[۱] نامی بھی لکھی ہے لیکن وہ ملا نوعی کے 'سوز و گداز' کے جواب میں ہے ملا زلالی کی مثنوی محمود و ایاز کے جواب میں انھوں نے شورِ عشق ہی کہی ہے جیسا کہ گردیزی[۲] نے بھی لکھا ہے سفینۂ خوشگو میں اس مثنوی کا نام حسن و عشق ہے لیکن یہ بھی کتابت کی غلطی ہے اس لئے کہ خان آرزو نے خود مجمع النفائس جلد اول فولیو ۱۱ پر اپنی مثنوی شورِ عشق میں سے انتخاب دیا ہے جس میں قصہ کا کوئی انتخاب نہیں ہے ہاں شروع کے وہ کل عنوانات موجود ہیں جو سفینۂ عشرت میں درج ہیں۔ اسی کتاب میں فولیو ۱۴ پر بھی یونسی بیگ انیسی کے ذکر میں اپنی اس مثنوی کا جو محمود و ایاز زلالی کے جواب میں کہی گئی ہے پھر ذکر کیا ہے اور نام اس کا شورِ عشق ہی بتایا ہے۔

مثنوی کا قصہ دکن میں ایک نہایت اچھا شہر تھا۔ وہاں ایک عادل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اُس کے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکا تھا جس کا وقت سیر و شکار میں گزرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب شہزادہ شکار کھیلنے گیا تمام دن پرندوں و چرندوں کا شکار کھیلتا رہا شام کو معہ اپنے ساتھیوں کے محل کی طرف رخ کیا۔ جب لوگوں نے شہزادے کی واپسی کی خبر سنی تو شہر میں اژدہام عام ہو گیا۔ اسی مجمع میں ایک نوجوان بھی تھا جو شہزادہ کا عاشق

---

[۱] عطیۂ کبریٰ کا مقدمہ۔ [۲] تذکرۂ گردیزی

تھا وہ بھی معشوق کی دیدار کا منتظر تھا۔ شہزادہ کی سواری آئی، عاشق سے نظریں دوچار ہوئیں۔ شہزادہ نے پہچان لیا لیکن چشم پوشی کی۔ محل میں پہونچکر کپڑے اُتارے اور ہاتھ منھ دھویا۔ یہاں عاشق کا اضطراب وجنون بڑھتا جاتا ہے اور وہ معشوق کی گلیوں میں جاکر نہایت دلخراش بین کرتا اور روتا ہے اور شہزادہ کا نام لیکر اظہارِ عشق کرتا ہے۔ شہزادہ کی بڑی رسوائی ہوتی ہے اور عاشق راز کو طشت از بام کر دیتا ہے۔ جب معاملہ بہت بڑھ گیا تو لوگوں نے عاشق کے ہلاک کرنیکی تدبیر سوچی اور یہ رائے ہوئی کہ اس دفعہ جب وہ دکھائی دے تو اُسے دربار میں لایا جائے اور خود شہزادہ اس سے کہے کہ:

بہائے وصل اینجا نقدِ جانست بدہ جان گر ترا سودائے آنست
دریں سودا زیانہا سود باشد ہلاکِ عاشقاں بہبود باشد

چنانچہ تمام لوگوں نے اس رائے کی تائید کی کہ اگر وہ بوالہوس ہوگا تو چلا جائے گا اور اگر سچا عاشق ہوگا تو اپنے کو ہلاک کرلیگا، یوں شہزادہ رسوائی سے بچ جائے گا۔ دوسرے دن عاشق لایا گیا لوگوں نے اُسے تاؤ دیا اور کہا:

مبادا چوں تو کس در عاشقی خوار ز پہلوئے تو دل گر دید دشوار
بہائے وصلِ یار از نقدِ جانست حیاتِ خضر عینِ عاشقان است

عاشق نے جب یہ شرط سُنی خوش ہوگیا فوراً خنجر نکالا اور اپنے سینہ کو زخمی کیا اور شہزادہ کے سامنے آیا:

بزخمے سینۂ خود ساخت گلشن در آمد باغ حسرت در شگفتن
دلِ مانند گل خونیں جگر را بغل پر کرد زخم نیشتر را
چو آمد روبروئے قاتلِ خویش لب شکرش کشاد از سینۂ ریش
زبان موجِ خوں گرم دعا کرد بکف لعلے بسودش رونما کرد

غرضکہ عاشق خوں میں نہایا ہوا پہونچا۔ معشوق کے سامنے نمازِ بیخودی ادا کی اور رکوع میں جان بحق تسلیم ہوگیا شہزادہ نے جب یہ منظر دیکھا تو برداشت نہ کرسکا، بیتاب ہوگیا اس کی موت پر نوحہ کیا اور خود بھی اسی کے ہمراہ عالمِ بقا کی طرف سدھارا:

پری دیوانہ ما چوں ایں چنیں دید ز بیتابی بسانِ زلف لرزید
بجائے زلف خود بر خاک اُفتاد کہ دیدہ جانشینِ سایہ شمشاد
الف بر سینہ از حسرت کشیدے چو کبک نیم بسمل می طپیدے
تنش نیلی ز آسیب فتادن پر افشاں گشت طاؤس گلشن
بشیون آنچناں پرداخت آں گل کہ از ہر مو فغاں برداشت بلبل

چناں آں کوہ تمکیں ناز سر کرد | کہ اے خون دلت گلگونۂ درد
درستی اینقدر مقدور کس نیست | قیامت کردۂ عشق و ہوس نیست
بسودا روح مجنوں ساختی شاد | بمُردن زندہ کردی نام فرہاد
بیک دیدن خراب ناز گشتن | بحرفے مرگ را دمساز گشتن
ہمیں از چشم خونبارے تو آید | ز دستِ عشق ہر کارے تو آید
کنوں ننگ است مارا زندگانی | بود مردن حیات جاودانی
چنیں گفت و ز جا برجست چوں آہ | بآہے جانِ پاکش رفت ہمراہ
قیامت ہر طرف سر زد ز شیون | کہ چاک جیب رفت آنسوئے دامن
چراغے از نسیم عشق، افسرد | ز جان افشانی پروانۂ مُرد

خانِ آرزو نے اپنی اس مثنوی میں جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، سراپا، وارداتِ عشق کو نہایت وضاحت سے ادا کیا ہے اور ہر موقعہ پر حسنِ ترتیب، اور جزئیات کا استقصار ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں کسی چیز کی صفت یا منظر کشی کرتے ہیں وہاں اُن کے قلم کی سحر آفرینیاں قابل دید ہیں۔ ایک موقعہ پر جس شہر کا یہ قصہ ہے اس کی منظر کشی کرتے ہیں:

شنیدم در دکن شہریست معمور | سوادش شام عید طرۂ حور
چہ شہر آئینۂ آبادی دل | سرایش بہر معموریست منزل
گل خود روش حُسن لالہ رویاں | تمامی سنبلش زلف نکویاں
ہوا چوں نغمۂ نے عشرت انگیز | فضائے خانہ چوں آئینہ گلخیز
بہر سو دلبرے سرمایۂ شرم | چو خورشیدش دکانِ دلبری گرم
نگہ ہر جا متاعِ دل خریدار | تماشا ہر طرف بازار بازار
ز تاثیر جنوں پرور ہوایش | سراسر اشک و آہ آب و ہوایش
صراحی گردنان در تیز دستی | بہم چوں موج مے گلبار مستی

ایسے جنوں خیز خطہ میں ایک بادشاہ عادل کی حکومت قصہ کے پس منظر کو بہت کچھ مستحکم کر دیتی ہے ملاحظہ ہو:

در آنجا بود شاہے عدل گستر | بسان رحمت حق خلق پرور
رگِ ابرِ کرم چینِ جبینش | جہاں چوں مہر و در زیر نگینش
بدستش چوں کماں محکوم افلاک | رواں چوں آب حکمش بر سر خاک

جہاں را از نگاہش روح در تن　　حنائے پائے تمکنش خونِ دشمن

ایک منظر اور ملاحظہ ہو۔ شہزادہ شکار کھیلنے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مقام جنگل ہی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ان کو شہزادہ کا سراپا ایسا دکھانا ہے کہ اس کو دیکھکر لوگ بسمل ہو جائیں۔ اس وجہ سے جنگل بھی اس کے ورود سے بہار آگیں ہو گیا ہے، شہزادہ شکار کھیلتا ہے اور تمام دن شکار کھیلنے کے بعد واپس آتا ہے۔ واپسی کے وقت بھی اس کے حسن و جمال اور دبدبہ کو شاعر نے ملحوظ رکھا ہے لیکن چونکہ اُسے معشوق کی صورت میں پیش کرنا ہے اس لئے یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی گئی ہے۔ جزئیات کا احاطہ ملاحظہ ہو:

صباحے با طلوعِ نشاء ہمدوش　　شفق گلہا ز شوخی نسترن پوش
دمش فیضِ گلستانِ تبسم　　بہارش گل بدامانِ تبسم
ہوا با معتدل چوں چشم انساں　　مزاج خرمی را آب حیواں
دلِ شہزادہ شد گرم طپیدن　　کہ باید صید را درخوں کشیدن
ز فرمانش مہیا شد سواری　　بلا سیلاب در ہر کوچہ جاری
بروں آمد ز شہر آں شوخ چوں ماہ　　ہزارش اختر تا بندہ ہمراہ
چو شد شامِ خط او دامِ افسوں　　سیاہی کرد بر مرغانِ شبخوں
ز خون طائراں چوں دست خود شست　　بقتلِ آہواں شد شوخیش جست
تفنگ اندازی آں ترک بدخو　　سیاہی می ربود از چشم آہو
نشانہ گشتہ ہر داغ پلنگش　　قرہ در پیش دستی از تفنگش،

تمام دن شکار کھیلنے کے بعد ظاہر ہے کہ شہزادہ خستہ ہو گیا ہو گیا ہو گا پیاس کا ضرور غلبہ ہوا ہو گا اس بات کو بھی شاعر نے فراموش نہیں کیا ہے۔

چو جوشِ گرمی اندر آسماں یافت　　بسوے سایہ خورشیدش عناں تافت
پریرو دلربایاں در رکابش　　بلا گرداں انداز خطابش
یکے چوں جاں سبکروحی سرشتہ　　بدستش مروحہ بال فرشتہ
دگر چوں خضر گرمِ آبیاری　　رواں اندر جلو ابر بہاری
بفکر آنکہ سازد آب را سرد،　　ز شور خویش محشر شورہ آورد

[ش]ہزادہ کا سراپا ملاحظہ ہو:-

پری دیدار شوخ ناز پرور　　رُخِ او صفحۂ دیوانِ محشر،

سفید از عشق او چشم صباحت   نمک در زخم از حسنش ملاحت
قدش یک نیزہ خورشید جہاں سوز   دل و دین و د ماغ و خانما سوز
سراپا مست صہبائے تبسم   برنگ غنچہ مینائے تبسم
چو چشمش علم قتلِ عام دادے   زبان عذر مژگاں برکشادے
لبش گر ریختے خونِ زمانہ   تبسم آفرین صد بہانہ
بہ پشت لعل لب خطے دمیدہ   کہ صد یاقوت پیشش خط کشیدہ
رخ او نو بہار لالہ رنگے   خطِ او مصحف خطِّ فرنگے،
نگاہش شد بہر باغے خراماں   کہ ہر خارے شگفتہ نرگستاں

عاشق کے سراپا کے ساتھ اس کا کیرکٹر بھی ملاحظہ ہو:

چو زلف، اورا سیہ روزے جوانی   بعمرِ آشکارش زندگانی،
دماغِ بیخودی وجانِ مستی   پیمبر زادۂ شاہد پرستی،
برنگ نے ہمہ حسرت مقالہ   کہ مغز استخوانش بود نالہ
ز مجنوں داشت افزوں حسرت و درد   محبت کردے از خاک رہش گرد
بہ کہسار دکن فرہاد او بود   خراشش تیشہ اورا مو بمو بود
کنیزِ ہمتش شوقِ زلیخا،   کہ با یوسف بجاں میکرد سودا
بملک بے نوائی بادشہ بود   ایا ز حسرت او عشق محمود،
بساں مردہ او را پیرہن نہ   بجز عریانی خویشش کفن نہ

اب اسی عاشق کی بیتابی کو بیان کرتے ہیں:

بر آمد نالہ از ہر بند چوں نے   جنوں سودا در آمد در رگ و پے
دگرگوں گشت احوالش بہردم   تغیر بردش از جا ہمچو عالم
گریباں خندہ زد بر روئے گلزار   کنار از اشک شد آئینہ بازار
تخیل کردے آمد آمدِ یار   زخود رفتے باستقبال صد بار
بہ ہر آواز پائے جستے از جا   اگر برخاستے بنشستے از پا
بصبر از بے خودی چوں کار شد تنگ   بزورِ دل طپیدن بال زد رنگ
گہے با طالع برگشتہ در جنگ   خطابش کردہ نالیدے بصد رنگ

"بطوفاں خیز دریایم فگندی　　تو اے سیل بلا بایخ بہ بندی"
گہے معشوق خود بودش مخاطب　　بہ ہذیاں آمدے از گرمی تب
"لبت نوشین و عمرِ من از آں تلخ　　عذارت ماہ از وے غرہ ام سلخ"

اسی حالت میں وہ رازِ طشت ازبام کر دیتا ہے اور انتہائے عشق میں شہزادہ کا نام لے لیتا ہے:

شبے بر خاک راہش زار دیدند　　ہمہ زد نام شہزادہ شنیدند

جب اُس نے شہزادہ کا نام لیا تو لوگوں کو بہت غصہ آیا اور اُس سے کہا کہ تو نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اگر وہ حکم دیدے تو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس سے عاشق کی شورش اور بھی بڑھ گئی اور اس نے جنون میں یوں بکنا شروع کیا۔

کہ اے سودا فروشانِ دماغم　　نمک سایان چشم تازہ داغم
اگر تیغم بسر می آزمائید　　بپائے دوست بسم اللہ بیائید
من اینک حاضر و سر پیش دارم　　سر فرمانِ یارِ خویش دارم
نہ خود اُفتادہ ام در حلقۂ دام　　بہ پرسید از سرِ زلفِ سیہ فام
عزیزاں داد می خواہم خدارا　　نمی باید گزشت از حق شمارا
چہ می باشد گناہِ صید دل ریش　　کہ صیادش نماید خستۂ خویش
ز مژگان ہر بنِ موزخم دارم　　جراحت با نیاید در شمارم
دریں صورت ملامت بے حساب است　　خطا بر من گرفتن ناصواب است

اب چند اشعار شکایت عشق و خطاب بعشق کے سنئے:

حذر یاراں ازیں عشقِ جگر باز　　نیارد ناز راہنگامہ پرداز
کہ سازد جور او پامال یکساں،　　سرِ بیگانگان و آشنایاں
بر در طوفاں جہاں راگہ سراپا　　نگردد موج چیں زابروش پیدا
جفا جو یا جہاں سوز ابلا یا،　　خدا نشناس کافر ماجرا یا،
چہ سوزی جان خوبانِ جفا کیش　　کُنی آتش کباب گرمی خویش
عذارے راکہ رشک آفتاب است　　جگر از گرمیت چوں شبنم آب است
ازیں حسرت نوائے داد فریاد　　زمین شعر شد بیتابی آباد

اقبال انصاری

؟

فلسفی — یا — پاگل — ؟ - مگر نہ اسے فلسفی کہہ سکتے تھے نہ پاگل — زیادہ سے زیادہ آپ اسے اس سلسلہ کی درمیانی کڑی تصور کر لیجئے - کچھ خبطی وہ ضرور تھا ورنہ اس زمانہ میں چار سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری چھوڑ کر ہرگز گھر پر نہ بیٹھ رہتا۔ وہ کچھ فلسفی بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسکی علمیت بے انتہا خشک تھی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھا بلکہ درمیانی نقطہ بھی نہ تھا اس لئے کہ بعض اوقات نہ وہ پاگل ہی معلوم ہوتا نہ فلسفی یوں سمجھئے کہ لفظ "عجیب" کا اگر صحیح اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو یہی شخص تھا۔ زندگی کا ایک طنز یا زندگی پر ایک طنز جو بہتر سمجھئے کہہ لیجئے۔

اتنے بڑے شہر میں تنہا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز! ایسی ہولناک زندگی گزارنا اسی کے بس کی بات تھی۔ لوگ اسے علاوہ خبطی، پاگل اور سڑی کے مغرور بھی کہتے تھے اور حق بجانب ہی تھے کیونکہ بہت کم لوگوں سے حضرت سیدھے منہ بات کرتے ——— میرا مکان اس کے پاس ہی تھا میں البتہ کبھی کبھی وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا "کیوں جناب دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایک مرتبہ یوں ہی پوچھ لیا تھا کہ "کیا آپ اخبار بھی نہیں پڑھتے؟" چنانچہ اس کا جواب وہ یوں اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دیا کرتا تھا جب سے پروفیسری چھوڑی اس شخص نے نہ کوئی اخبار منگایا نہ لوگوں سے حالات سننے کی کوشش کی۔ کتابوں سے اسے نفرت تھی۔ کہا کرتا تھا "انسان اپنی ذہنی تنہائیوں کی اذیت سے بچنے کے لئے کتابیں لکھتا ہے"۔ کتابیں اس کے یہاں بہت تھی جن میں زیادہ تر ادبیات سے تعلق رکھتی تھیں لیکن سب کی سب الماری اور گرد کا "جزو لاینفک" بن کر رہ گئی تھیں۔

مجھے ادبیات — خصوصاً شعریات سے فطری دلچسپی تھی اسی لئے پروفیسر صاحب سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کی زندگی پر کبھی کبھی ایک تلخ شعر کا گمان ہو جاتا تھا۔ جب کبھی میں ان سے کسی شاعر کا تذکرہ کرتا وہ نہایت خشک لہجہ میں فرما دیا کرتے "بھئی شاعروں کی بات چھوڑو شاعر۔ اخبار اور کتابیں یہی تین چیزیں تو ہیں جو دنیا کو خراب کرتی ہیں" میں اگر زیادہ اصرار کرتا تو وہ صاف کہہ دیتے "جناب جائیے کوئی کام کیجئے اور دوسروں کو کام کرنے دیجئے" گویا انھیں بڑا کام ہی رہتا ہے ——— دن بھر بیٹھے رہنا۔ سگریٹ پینا اور شام کو کسی ویرانہ میں

نکل جانا — یہ تھا ان کا کام!

ان کی کوئی ایسی زیادہ عمر بھی نہ تھی کہ کہا جا سکتا کہ شاعری سے اب انھیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ صرف چالیس برس کے تھے اور سچ پوچھئے تو چالیس برس میں لوگ مکمل شاعر بنتے ہیں۔ بہر حال میں بھی موقع کا منتظر رہتا۔ باوجود ان کی گھڑکیوں اور طنزیہ جملوں کے ایک آدھ شعر ضرور سنا دیتا اور وہ چپ 'نہ ہوں نہ ہاں' منھ بنائے بیٹھے رہتے۔

انھیں دنوں مجھے ایک نوجوان شاعر جمالؔ کے کلام سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ جمالؔ کا رنگ یکسر عاشقانہ تھا۔ اس کی شکستگی اور درد مع خود دارانہ پہلوؤں کے مجھے بہت پسند تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے اشعار پروفیسر صاحب کے جمود اور بے حسی کو توڑ دیں گے مگر وہ شخص کبھی نہ پسیجا — کبھی کبھی سن لیتے یہی غنیمت تھا۔ جب زیادہ تنگ آ جاتے تو ٹہلنے لگتے اسی درمیان میں میں نے جمالؔ سے بھی دوستی پیدا کر لی تھی۔ ہم عمر اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی 'شعریت' کا جامہ پہنتی جا رہی تھی۔ ایک دن جمالؔ کو لیکر پروفیسر صاحب کے یہاں پہونچا۔ نو بجے رات کا وقت تھا پروفیسر صاحب کے اتنے بڑے مکان میں تمام اندھیرا تھا صرف دو کمروں میں روشنی تھی ایک تو وہ جہاں خود تشریف فرما تھے۔ دوسرے جہاں کھانا پک رہا تھا۔ پروفیسر صاحب آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے نظریں چھت پر جمائے سگریٹ پی رہے تھے — سامنے گول میز پر لیمپ ہلکا ہلکا جل رہا تھا۔ کمرہ میں خاموشی طاری تھی اور کچھ وحشت سی برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آدمی رہتے ہی نہیں — ہم لوگ بیٹھ گئے مگر وہ چپ چاپ جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ جمالؔ کو سخت مایوسی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ میرا ہاتھ دبایا کہ چل نکلو۔ اسے اس بے توجہی سے صدمہ پہونچا تھا مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ " ذرا ٹھیرو، دو تین منٹ کے بعد پروفیسر صاحب اپنے آپ میں آئے۔

"کہئے دُنیا میں کیا ہو رہا ہے"

میں نے کہا: "ہر شخص خوش و خرم ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مسرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے"

کہنے لگے: "کیوں جناب یہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟"

"یہ تو فطری خواہش ہے۔

"اور یہی فطری خواہش — یہی بے قراری کبھی مسرت نہ حاصل کرنے دیگی انسانی زندگی سے یہ 'نامکمل کا احساس' کبھی نہ مٹے گا۔

"خیر ہوگا — آپ کو جمالؔ سے ملاؤں"

"وہی آپ کے شاعر صاحب؟"

"ہاں"

نہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے نہ جمالؔ۔ میں دل ہی دل میں بے انتہا شرمندہ ہو رہا تھا۔ گو یہ جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب کم سخن، وحشی، خبطی اور بددماغ ہیں لیکن اس حد تک ان کو گیا گزرا نہ سمجھتا تھا ۔۔۔۔۔۔

آج بے حد مایوسی ہوئی۔ میں جمالؔ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ لاکھ چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب کی اس بدتہذیبی اور بے رخی کو کسی طرح جمالؔ کے سامنے ہلکا کرکے پیش کردوں مگر کوئی تاویل ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی آخرکار میں نے کہا "اچھا تو آپ اجازت دیجئے"۔ "بصد شوق" انھوں نے کہا اور پھر چھت پر نظریں جما دیں گویا اوپر مکڑی کے جالوں میں کوئی خاص دلکشی تھی۔

میں خاموشی سے اُٹھا اور جمالؔ کو لیکر باہر چلا آیا یہاں آکر میں نے کھلی ہوا میں فراغت کی سانس لی۔ جمالؔ چپ تھا میں نے کہا "بھئی معاف کرنا۔ بہرحال زندگی کی ایک تصویر تم نے یہ بھی دیکھ لی" اس کے بعد میں دو ہفتے تک پروفیسر صاحب کے یہاں نہیں گیا۔ اس دن وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے عزم کرلیا تھا کہ اب انکے ہاں کبھی نہ جاؤں گا مگر جیوں جیوں دن گزرتے گئے میرا عزم متزلزل ہوتا گیا ـــ جمال سے مجھے بے انتہا محبت تھی اور اس سے زیادہ اس کے اشعار سے مگر پھر بھی پروفیسر صاحب کی محبت اور ان کی بہکی بہکی باتوں میں زیادہ لطف ملتا تھا ـــ

تیسرا ہفتہ قریب ختم تھا کہ پروفیسر صاحب میرے عزم پر غالب آگئے اور میں ان کے یہاں پہونچ گیا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے پہونچتے ہی کہا:

"دنیا بدستور ہے"

مسکرائے ـــ وہی مسکراہٹ "آج تمہارے منھ سے کس قدر صحیح جملہ نکل گیا"

میں نے کہا، "پروفیسر صاحب اُس دن جمالؔ کے ساتھ آپ کا برتاؤ کچھ زیادہ مستحسن نہیں رہا"

"میرا برتاؤ؟" انھیں بڑا تعجب ہوا گویا ان کے خیال میں تمام باتوں کا ذمہ دار صرف میں ہی تھا ان کی آنکھوں میں چمک اور زیادہ بڑھ گئی۔ کہنے لگے "انسان اگر دوسرے انسان سے پہلے ہی سے کوئی توقع نہ قایم کرلے تو بدگمانی اور بداخلاقی کا وجود ہی مٹ جائے"

میں نے کہا، "تو دُنیا کا کام کیسے چلے؟"

"نہ چلے!" نہایت فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا اور ان کے شکن آلود ماتھے پر ایک شکن کا اور اضافہ ہوگیا۔

"جمالؔ کی زندگی سے آپ واقف نہیں اس کی شاعری اور اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے" میں نے پھر چھیڑا ـ

"تو بیوقوف ہے!" یہکر وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئے میں بھی گھر چلا آیا، میں نے اپنے ضمیر کو بہت بُرا بھلا کہا۔ بہتیرا احساس خود داری دلایا مگر پروفیسر صاحب کی شخصیت کے سامنے ایک نہ پیش گئی۔ میں روز بروز انکے یہاں "جمالیات" لیکر زیادہ جانے لگا۔ کسی نہ کسی طرح کچھ اشعار سُنا ہی دیتا۔ بعض اوقات وہ بے حس بیٹھے رہتے بعض دفعہ گھبرا کر چلے جاتے مگر میں باز نہ آتا۔ جمال کی زندگی اور اس کے اشعار یہی دو باتیں میں انھیں سنایا کرتا۔ آخر وہ دن بھی آہی پہونچا جب انھوں نے نہایت نرم مگر مستحکم لہجہ میں کہہ دیا کہ "آج سے میں نے عزم کر لیا ہے کہ کسی سے نہ ملوں گا۔"

پروفیسر صاحب کے عزم کے معنی میں جانتا تھا "موت اور میرا عزم" وہ کہا کرتے تھے "یہ دو چیزیں کبھی نہیں ٹل سکتیں" اتنک وہ میری جسارت کو برداشت کئے گئے مجھے تو یہی خوشی تھی ورنہ میری جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو نہ معلوم کیا کر بیٹھتے۔ بہرحال مجھے رنج ضرور ہوا اور میں نے دوبارہ ارادہ کر لیا کہ اب کبھی نہ جاؤں گا۔ ادہر خوش قسمتی سے میرا تبادلہ بھی دوسری جگہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پروفیسر صاحب ذہن سے اُترتے چلے گئے۔ ہاں جمال سے البتہ تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ وہ میرے یہاں کبھی کبھی آ بھی جاتا تھا۔ جمال میں ادھر ایک بین تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اب افسردہ رہا کرتا۔ اس کی گفتگو اور لہجہ سے شگفتگی زائل ہو چلی تھی مگر اشعار میں درد اور بڑھ گیا تھا۔ میں اس تغیر کی وجہ بخوبی جانتا تھا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے تھے۔

تین سال کے بعد مجھے ایک کام سے پھر وہیں جانا پڑا۔ ریل میں سوار ہوتے ہی مجھے پہلی بار پروفیسر صاحب کی یاد آئی۔ گاڑی جتنی قریب ہوتی گئی، جمال سے زیادہ پروفیسر صاحب میرے دل و دماغ پر چھاتے گئے میں نے عجیب بیچینی اور کشش سی محسوس کی۔ گاڑی سے اُترنے کے ساتھ ہی میں سیدھے ان کے بنگلہ پر پہونچا۔ مگر وہاں وہ نہ ملے — بنگلہ خالی تھا، میرا دل دھک سے ہو گیا — دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے مگر پروفیسر صاحب جنبش کرنے والے نہیں تھے — دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں، تلاش کرنے پر انکا مکان ملا مکان دیکھتے ہی ایک نامعلوم خوف جس میں کچھ غم بھی شامل تھا میرے تمام بدن میں سرایت کر گیا۔ مکان نہایت چھوٹا اور تاریک تھا جس سے مفلسی کی بو آتی تھی۔ میں اندر گیا۔ تین کمرے تھے۔ جس میں سے صرف ایک میں روشنی تھی۔ "اور باورچی کہاں گیا؟" میں نے دل میں سوچا اور پھر نہ معلوم کیوں اپنے خیال پر خود ہی پریشان سا ہو گیا میں کمرے کے سامنے پہونچا۔ پروفیسر صاحب کرسی پر پاؤں پھیلائے حسب دستور لیٹے ہوئے تھے اور سگرٹ کا دھواں کمرہ میں چکر لگا رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑے۔ شاید مدت سے وہ انسانی قدموں کی چاپ سے نا آشنا تھے — مجھے دیکھا۔ میں ان کی آنکھوں کا سامنا نہ کر سکا۔ ایک عجیب مسکراہٹ، جس میں پہلی بار بیچارگی کا عکس تھا ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ بولے "کہئے آپ کی دُنیا کا کیا حال ہے؟"

میں ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ اچھی طرح دکھائی پڑ رہا تھا۔ شدت، تاثر اور ہجوم خیالات سے میں ان کے سوال کا جواب دینا یا کچھ اور کہنا بھول گیا۔ ان کے خشک چہرہ پر جھریاں زیادہ پڑ گئی تھیں سر کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ آنکھوں میں چمک ضرور تھی مگر بجھتے ہوئے چراغ کی سی۔ کمرہ بالکل خالی تھا معلوم ہوتا تھا کہ اسباب اور فرنیچر بہت کم ہو گیا ہے۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"کہئے کیسے ہیں؟"

میرے اس سوال سے غالباً انھیں اذیت ہوئی کہنے لگے "اس سوال کو آپ میرے سوا دنیا میں سب سے پوچھ سکتے ہیں اور میرے سوا غالباً ہر شخص اس کا جواب دے سکتا ہے۔"

میں پھر چپ ہو گیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"جمال کے کچھ شعر سناؤں"

میں نے سنانا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب اسی محویت کے عالم میں بیٹھے رہے جس طرح پہلے بیٹھا کرتے تھے۔

"پسند آئے؟"

"وہ زندہ ہے ابھی تک؟" یہ سوال انھوں نے کسی دوسرے کے بارے میں اب تک شاید نہ پوچھا تھا!

میں نے کہا: "اس کی زندگی ہی کیا اسے محبت نے تباہ کر ڈالا۔"

"محبت؟" انھوں نے طنزیہ لہجہ میں دہرایا اور پھر خلاف معمول خوب ہنسے۔ خوب ہنسے — اتنا ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

میں اُٹھ کر گھر چلا آیا۔

مجتبیٰ حسین

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچہ کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲۰ر دیگر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیجر نگار۔

خداکاماضی، حال اور مستقبل

"مذہبی ایجادات و فریب" (Religious Inventions & Frauds) کے نام سے مسٹر لوئس کالنج (Louis Coulange) نے ایک ضخیم کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوگیا ہے۔ ذیل کا مضمون اس کتاب کے اُن ابواب سے ماخوذ ہے، جن میں مصنف نے خدا کے عیسوی تخیل سے گفتگو کی ہے۔

عرصہ تک مذہبی زندگی بسر کرنے کے بعد مصنف نے یکایک محسوس کیا کہ اسوقت تک وہ شدید فریب میں مبتلا رہا ہے اُسی وقت سے اس نے اعتقاد کا جامہ اُتار کر تحقیق و تفتیش شروع کی، جس کو وہ خود "تلاش حق" سے تعبیر کرتا ہے۔ متذکرۂ بالا کتاب موصوف کی اسی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔

آج یورپ میں مسٹر لوئس کالنج کو مذہب عیسوی کے باب میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ (عتیق)

اولین عیسائی قدیم یہودی تھے۔ قبول عیسائیت سے قبل قدرتاً اُن کے معتقدات کا ماخذ عبرانی انجیل تھی لیکن تبدیل مذہب کے بعد بھی انھوں نے اس کتاب کا دامن نہ چھوڑا۔ اُن کے اعتقاد کے مطابق اُن کے خدا نے اس دُنیا کو ایک خلا سے پیدا کیا اور اُس کی تکمیل چھ یوم کے اندر ہوئی[1]۔ اسی خدا نے ابراہیم سے ایک معاہدہ کیا کہ اُنکی آنے والی نسلوں کا ارض کنعان پر (جس کو آج فلسطین کہتے ہیں) تسلط ہوگا۔

عبرانی انجیل کی طرح اولین عیسائیوں کا خدا بھی بالکل انسانوں کی طرح ہاتھ پاؤں رکھتا تھا، اگرچہ اُسکا جسم

---

[1] ڈاکٹر جان لائٹ فٹ جو کیمبرج یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اپنے وقت کے ماہر عبرانیات تھے اُن کا بیان ہے کہ "زمین و آسمان، مرکز و محیط، پانی سے لبریز بادل اور انسان کی تخلیق ۲۳ اکتوبر ۴۰۰۴ قبل مسیح کو نو بجے صبح کے وقت تثلیث نے کی"
("A History of Warfare of Science with Theology in Christendom")
By Andrew D. White. جلد اول صفحہ ۹

گوشت و خون سے مرکب نہ تھا۔ جوتن، جس نے خدا کو مرتے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اُس کا بیان تھا کہ خدا کے داہنی جانب جناب مسیح متمکن تھے اور خدا یشب و عقیق کا ہم رنگ تھا۔

تقریباً سنہ ۱۳۰ء میں ایک شخص مارسیون (Marcion) نامی نے جس کا باپ ایک پادری تھا، یونانی فلسفہ کا عموماً اور افلاطون کا خصوصاً مطالعہ کیا۔ طویل غور و فکر کے بعد اُس نے اپنے خیالات عوام کے سامنے پیش کئے۔ یہ تصور خدا کے اُس تصور سے بالکل مختلف تھا جو خدا کو متشکل کرتا تھا۔ کلیسائی گروہ نے اس کی جی کھول کر مخالفت کی مگر اُن کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ بالآخر خدا کے تخیل نے ایک نیا چولا بدلا اور انجیل نے دُنیا کے سامنے خدا کا جو تخیل پیش کیا تھا وہ دلوں سے یکسر محو ہوگیا۔ اب خدا کی ذات غیر مادی اور ماورائے تخیل قرار پائی۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جس کو انسان اپنے ذہن میں محدود کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یعنی اب خدا نے عبرانی جامہ اُتار پھینکا اور اُس کی جگہ پر فلسفہ کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔

اس دور میں خدا کا ایک تخیل قائم ضرور ہوگیا مگر عبد و معبود کے تعلقات متعین نہ ہوسکے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک اُس خدا کی پرستش ہوتی رہی جس نے انسان کو اس دُنیا کا بادشاہ بنایا تھا اور جس نے دوسری دنیا میں انسان کے لئے فردوس میں عالیشان محلات تعمیر کئے تھے (اُس زمانہ میں ارض فلسطین کی حکومت کا وعدہ لوگوں کے ذہن سے فراموش ہوگیا تھا) ان دنوں لوگوں کے اعتقاد کے مطابق انسان مختارِ کل تھا اور اُس کو اپنی تقدیر پر پورا اختیار تھا، خواہ وہ اُسے سیاہ کرے یا سپید۔ عبد و معبود کے تعلقات کا یہ تخیل سینٹ آگسٹائن کے خیال کے مطابق خدا کے ناقابل انتقال حقوق پر شدید قسم کی ڈاکہ زنی تھی۔ انسان کو اس کی تقدیر کا مالک قرار دینے کے معنی سینٹ آگسٹائن کے نزدیک صرف یہی نہیں تھے کہ انسان کو خدا کی سلطنت سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دینا ہے کہ ہم کو "عدم" سے "وجود" میں لایا گیا ہے۔

سینٹ آگسٹائن کو اس پر پورا اعتقاد تھا کہ ہر وہ چیز جو ہم میں موجود ہے (اور اس میں تقدیر بھی شامل ہے) خدا کے احکام کے تابع ہے۔ نجات و بخشایش صرف اُن لوگوں کی ہوگی جن کو خدا بخشنا چاہے گا، اور باقی سب دوزخ کے کندے بنیں گے، کیونکہ خدا اُن کی نجات و بخشایش نہ چاہے گا اور اُس کی یہی مرضی ہوگی۔ شاید انھیں خیالات کا نتیجہ تھا کہ سینٹ آگسٹائن کو صدیوں تک لاطینی کلیسا کا مرکز سمجھا جاتا رہا۔

سولھویں صدی نے خدا کے اس تصور کو ایک پلٹا دیا جس کو سینٹ آگسٹائن نے پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی جگہ قدیم خیال نے لی۔ غرض صدیوں تک خدا کا تصور ذہن انسانی سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں خدا کے تصور کے متعلق لوگوں کا جو بھی خیال رہا ہو لیکن اُس کے وجود کا لوگوں کو یقین ضرور تھا۔

خدا کا علم اُن کو کیونکر ہوا؟: دو باتوں نے اس سلسلہ میں اُن کی رہنمائی کی۔ ایک روح، دوسرے خدا کے

متعلق متصوفانہ خیال، مگر خدا کو پہچانتے کا یہ بلند زینہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لئے مخصوص رہا۔ دوسرا طریقہ عوام الناس کا تھا۔ انھوں نے خدا کو بالعموم قدرت کی عام عینک سے دیکھا۔

آج خدا کا تصور۔ آسمان پکار پکار کر اُن تبدیلیوں کا اعلان کر رہا ہے، جس کا سولھویں صدی سے وہ آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ پہلے آسمان زمین کے گرد چکر لگاتا تھا اور زمین ایک پر وقار ملکہ کی طرح کائنات کے وسط میں تخت شاہی پر متمکن نظر آتی تھی۔ زمانہ کے انقلاب نے اُس کی یہ حیثیت بدل دی ہے۔ آج اُس کی حیثیت ایک تخت سے اُتاری ہوئی شہزادی کی سی ہے، بلکہ مہر عالمتاب کی ایک ادنےٰ کنیز سمجھی جاتی ہے اور اس کا کام آفتاب کے گرد طواف کرنا ہے۔

موجودہ دور میں یہ دعویٰ کرنا کہ آسمان کی تخلیق زمین کے لئے ہوئی تھی یا یہ کہنا کہ آسمان پر انسان کے لئے محلات تعمیر کئے گئے ہیں ایک مہمل سی بات ہے۔ اب ان باتوں کا زمانہ گزر گیا اور آج نظام شمسی میں زمین ایک بے وقعت سی چیز ہے۔

زمین پر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ - کل انسان کو زمین پر کلی اقتدار حاصل ہوگا اور لاتعداد قوتیں لونڈیوں کی طرح اُس کی فرماں بردار ہوں گی۔ اس عظیم الشان سلطنت کا خاکہ تو آج ہی تیار ہو گیا ہے۔ حیوانات و نباتات کا جہاں تک تعلق ہے ہم نے اُن پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ حیوانات و نباتات کی شکل میں ہمارے جو لاتعداد دشمن چھپے ہوئے تھے اُن پر ہم نے اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مہذب ممالک میں ہیضہ، طاعون اور کوڑھ وغیرہ کا سرے کوئی وجود ہی نہیں اور جب جنون و خناق جیسے امراض کا کسی پر حملہ ہوتا ہے تو ہم فوراً اُس کا تدارک کر لیتے ہیں — صرف بڑے بڑے جاندار ہی نہیں بلکہ قدرت کی طاقتیں بھی ہماری مطیع ہو چکی ہیں۔ اگر بغور ان حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بہ آسانی پتہ چل سکتا ہے کہ انسان آہستہ آہستہ زمین پر حکمران کا درجہ حاصل کر رہا ہے۔

یہ قوت انسان کو کہاں سے نصیب ہوئی؟ — عیسائی کہتے ہیں "اِس طاقت کو خدا نے عطا کیا ہے" مگر یہ خیال کس قدر مبالغہ آمیز ہے۔ ہماری حکومت جو آج زمین پر قایم ہے وہ ہر چند بہت محدود ہے لیکن اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ کمزور اور بے حقیقت حکومت بھی خدا ہی کا عطیہ ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی کرم النفسی ظاہر کرنے میں اتنی کوتاہی سے کیوں کام لیا اور پہلے ہی انسانوں کو ان مصائب سے کیوں نہ چھٹکارا دیا۔ - - - -

- - - - صرف ستر سال ہوئے کسی متمدن ملک پر ہیضہ کا حملہ نہیں ہوا اور خناق پر قابو حاصل کئے ہوئے تو ابھی شاید پورے تیس سال بھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے بدنصیب انسانیت ان نادیدہ دشمنوں کے حملوں کے مقابلہ میں کیوں بیدست و پا رکھا گیا — اب ہم کو زیادہ عرصہ تک خوابوں کی دنیا میں رہنا نہیں ہے۔ یہ سوچنا کہ خدا ہماری نگہبانی نگرانی اور رہنمائی کرتا ہے خوابوں کی دنیا کی باتیں نہیں تو پھر کیا ہیں۔ اس خیال میں اور قدیم دُنیا کے اُس خیال میں کہ

مین کائنات کے مرکز میں ایک اہم اور مخصوص جگہ کی مالک ہے، کیا فرق ہے۔ ہزاروں سال تک قدرت کی مہیب طاقتوں اور خوفناک درندوں کے سامنے لرزہ براندام رہنے کے بعد انسان نے موجودہ جگہ حاصل کی ہے اور یہ نتیجہ ہے اُس لگا تار محنت کا جس کا سلسلہ اُس نے صدیوں سے جاری رکھا ہے۔ اس میں خدا کی مہربانی و عنایت کو کیا دخل ہے ؟

عیسائی کہتے تھے کہ اُن کا خدا پوشیدہ ہے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے تعین کو اور بھی چھپا رکھا ہے۔ لیکن خدا کی عدم موجودگی میں بھی ہر چیز اپنی جگہ پر بدستور جاری و ساری ہے۔ خدا کے وجود کے وہ روشن و تابناک نشانات جو کبھی بہت نمایاں نظر آیا کرتے تھے اب اُن کا کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ گویا سائنس نے خدا کے وجود کو ختم کر دیا ہے۔

کل خدا کا تصور کیا ہوگا ـــــ دنیا آج اس سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے کہ گویا خدا کا کوئی وجود ہے تو اس نے کائنات کے کسی نا معلوم گوشہ میں اپنا منھ چھپا لیا ہے اور اس دنیا اور اُس کے کاروبار سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کی موجودہ دنیاوی زندگی جو صدیوں تک سنگدل دشمنوں کا مقابلہ کرنے اور بیشمار موانع کو ہٹانے کے بعد تشکیل ہوئی ہے، خدا نے اُس سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔

کیا خدا کا کوئی وجود ہے ؟ ـــــ بہت سے متمدن دماغ آج بھی اس کا جواب اثبات میں دیں گے۔ لیکن کل جب سائنس کی ایجادیں ذہن انسانی کا گوشہ گوشہ اپنی روشنی سے منور کر دیں گی کیا اُسوقت بھی کوئی دماغ اسکا جواب اثبات میں دے گا ؟

دوسری دُنیا کا ذکر تو خدا کے اُن حقیقی پرستاروں کے لئے چھوڑ دجن کے لئے وہاں محلات کھڑے کئے گئے ہیں آؤ ہم اُن حقایق پر غور کریں جو ہماری عقل کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ہماری آنکھیں مصائب کے ایک لامتناہی سلسلہ کو دیکھتی ہیں۔ جس نے انسان کو بےچین و بےقرار کر رکھا ہے۔ ہمارے کان انسانیت کی چیخ و پکار سے پھٹے جارہے ہیں۔ انسان پریشان ہیں، جانور پریشان ہیں، غرض جو ہے وہ پریشان ہے۔ آخر یہ کیا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے جانوروں کو کھانا پڑتا ہے، اسی طرح جانور اپنی زندگی قایم رکھنے کے لئے اپنے ہم جنسوں کو کھاجانے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ سب ہوتا ہے خدا کی مرضی سے، اور صرف عیسائیوں ہی کے خدا کی مرضی سے نہیں بلکہ تمام اقوام کے خداؤں کی مرضی سے بھی ـــ غیر جانبدار مبلغین مذاہب نے بھی خدا کے تصور کی اس خامی کو تسلیم کیا ہے۔

شاید خدا انسان کے معیار انصاف و کرم ایک دوسرے سے بیحد مختلف ہے۔ ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو وہ بیحد ظالم ہے۔ کتاب تخلیق ہم کو بتلاتی ہے کہ انسان کو خدا نے اپنے نمونہ پر بنایا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو خود انسان کے جذبۂ خوف نے پیدا کیا۔ اُس کے بعد فلسفی آئے جنھوں نے وجود خدا کی اس تعبیر کو منطقی استدلال کی خراد پر چڑھا کر اور زیادہ نمایاں کیا، لیکن یہ پہلے سے زیادہ مکروہ ثابت ہوا ۔

محمد عتیق صدیقی

دُنیا کا ایک بڑا مفکر ـــــ مذہب کا ایک بڑا باغی

اسپنوزا

سرخ و سپید رنگ، اوسط قد، متناسب الاعضا، گھنی سیاہ پلکوں کے اندر مقناطیسی کشش رکھنے والی روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، لمبی ستواں ناک، باریک شانوں تک بکھرے ہوئے سیاہ گھنے بال، اُٹھے ہوئے جبڑے سیرت کی مضبوطی اور عزم و استقلال کے آئینہ دار، چہرے مہرے کے ہر ہر انداز سے تفلسف اور علمیت آشکار، نام و نمود کے خیال سے بے پروا، مال و دولت کے خیال سے بے نیاز، فقر و فاقہ کے خیال سے بے ہراس مصائب کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے والا مذہب کا باغی، کورانہ تقلید کا دشمن، عقل کا پرستار، آزاد خیالی کا علمبردار، سترھویں صدی کا یہودی النسل ذہین، طباع، نڈر، بیباک، بے لوث مفکر، علوم مذہبیہ کا عالم ریاضیات و طبیعیات کا ماہر، یورپ کی متعدد زبانیں بولنے اور سمجھنے والا فلسفی ـــــ یہ تھا ڈی اسپنوزا۔ جس کا حال پیش کیا جا رہا ہے۔

نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح نے یورپ میں جس ذہنی بغاوت کی آگ لگائی تھی، سترھویں صدی میں اُس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، ڈیکارٹے (Descartes) کی ذات میں ہم کو اُس دور کے دونوں پہلو، یعنی کمزور اور قوی دونوں کا اچھا نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ پہلا فلسفی تھا جس نے یورپ میں پہلی بار تشکیک کی آواز بلند کی۔ اُس کے علمی کارنامے اس عہد کے روشن اور قابل احترام شاہکار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ڈیکارٹے کی اُن کمزوریوں کے نقوش بھی کم گہرے نہیں ہیں، جن کے مظاہرے اُس نے کلیسا اور سماج کی دار و گیر سے پناہ حاصل کرنے کیلئے کئے۔ عہد حاضر کے ایک فاضل فلسفی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ مصیبت کے وقت خدا کی ذات سے شاید ہی کسی نے اتنا ناجائز فایدہ اُٹھایا ہو جتنا ڈیکارٹے نے مگر وہ آواز جو اُس نے ایک بار بلند کی تھی اُس کی صدائے بازگشت برابر فضا میں گونجتی رہی۔ اُس کی کمزوری کے باوجود اُس کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اور کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے کورانہ تقلید کی جگہ سوجھ بوجھ اور عقل سے کام لینا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کو "فلسفۂ جدید" کا امام سمجھا گیا تھا

سترھویں صدی کا سب سے زیادہ جری مفکر اسپنوزا تھا۔ انسائکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ "اسپنوزا دراصل ڈیکارٹے کا متبع تھا" لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ڈیکارٹے کے خیالات سے متاثر ضرور تھا اور اُس کے خیالات کی پختگی میں ڈیکارٹے کے خیالات کو کافی دخل تھا لیکن اسی کے ساتھ اسپنوزا کے اکثر نظریے ڈیکارٹے کے خیالات سے متصادم نظر آتے ہیں۔

اسپنوزا کی سیرت اور اُس کے فلسفہ سے متعلق یورپ کی تمام زبانوں میں بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ جہاں تک اُس کی سیرت کا تعلق ہے، ان تمام کتابوں کا ماخذ (Maximilien Lucas) کی مرتب کردہ سیرت ہے جس کو مستند ہونے کے ساتھ ساتھ اولیت کا بھی فخر حاصل ہے۔

اسپنوزا کی ایک اور سوانح حیات ۱۷۰۵ء میں کولیرس (Colerus) نے مرتب کرکے شایع کی۔ اس کو دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مصنف جرمن تھا اور اس کو ذاتی طور پر اسپنوزا سے کوئی واقفیت نہ تھی مگر اس کی معلومات کا ذریعہ بھی بہت اہم تھا۔

کولیرس (Colerus) چونکہ ایک متعصب عیسائی تھا، اس لئے یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اسکو اسپنوزا کے تمام فلسفیانہ معتقدات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی، خصوصاً اسپنوزا کے اُن خیالات کے ساتھ جو اس نے انجیل کے باب میں ظاہر کئے تھے، اس لئے ان کی کتاب کا مقصد دراصل اُس کے خیالات کی تردید تھی۔ اس کتاب میں اکثر واقعات غلط بیان کئے گئے ہیں اور بعض واقعات کی صورت مسخ ہوگئی ہے۔ لیکن یہ ایک ناگزیر چیز تھی کیونکہ اول تو یہ کتاب اسپنوزا کے انتقال کے کافی عرصہ کے بعد مرتب کی گئی اور پھر لکھنے والا خود اُس کے حالات سے ناواقف تھا۔

اسپنوزا، یورپ کے حسین وجمیل شہر اسٹرڈم (Amsterdam) میں ۲۴ نومبر ۱۶۳۲ء کو پیدا ہوا جس مکان میں اُس کو زندگی کی پہلی شعاع نظر آئی تھی آج وہ "ملّہ واٹر لوپلین" کے نام سے مشہور ہے اُس کے خاندان کا شمار معزز یہودی گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اُس کے باپ اور دادا ہجرت کرکے اسٹرڈم میں آبسے تھے۔ اُس کی ماں کا ۱۶۳۸ء میں لسبن (Lisbon) کے مقام پر انتقال ہوا اور اُسکے باپ کا انتقال ۱۶۵۴ء میں ہوا اُس وقت اسپنوزا کی عمر بائیس سال کی تھی۔ اُس کے باپ نے تین شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، دوسری سے خود اسپنوزا اور تیسری سے بھی ایک لڑکی۔ اُسکا باپ ایک معزز یہودی تاجر تھا اور یہودیوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسپنوزا کی تعلیم، مقامی یہودی مدرسہ میں شروع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس اسکول میں اُس کو صرف مذہبی تعلیم دی گئی تھی۔ اسپینی زبان اُس کی مادری زبان تھی، اور پرتگالی زبان اس نے اپنے باپ سے

سیکھی تھی۔ لاطینی زبان اُس نے (Jeremiah Felbinger) سے حاصل کی اور شاید جرمن زبان بھی اُسی سے سیکھی ہو۔ ان زبانوں کے علاوہ آگے چل کر یونانی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں اور فرانسیسی اور اطالوی زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کی۔

علم الحساب اور طبیعیات کا شوق اسپنوزا کو کیونکر پیدا ہوا اور یہ زبانیں اُس نے کس سے حاصل کیں، اُس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان علوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ کسی کا بھی رہین منت نہیں تھا۔ اِن علوم کا اچھا ذخیرہ مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اسپنوزا نے یقیناً اس کتب خانہ سے پورا فایدہ اُٹھایا ہوگا اور شاید اسی چیز نے گردوپیش کے مذہبی ماحول کے باوجود اُس کو ایک آزاد خیال مفکر بنا دیا۔

وہ بلا کا ذہین تھا۔ پندرہ سال کا سن ہی کیا ہوتا ہے لیکن اس سن و سال میں بھی اُس نے اپنی ذہانت کا سکہ اساتذہ پر بٹھا دیا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں جو طوفان چھپا ہوا تھا اُس کی موجیں اس سن میں بھی آہستہ آہستہ بلند ہونے لگتیں اور اکثر وہ ایسے شکوک کا اظہار کرتا جن کو رفع کرنے سے اُس عہد کے بڑے بڑے علماء بھی قاصر رہتے۔

اسپنوزا سے پہلے بھی ایک دو آزاد خیال یہودی پیدا ہوئے اور احتساب مذہبی کی عدالت نے ان کو پوری سزا بھی دی۔ مثلاً جبرئیل ڈی کوسٹا (Gabrial de Costa) (۱۵۸۵ء-۱۶۴۰ء) کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ وہ خودکشی کے لئے مجبور ہوگیا۔ اسی طرح سے دوسری مثال ڈاکٹر ڈینیل ڈی پریڈو (Dr. Danial de Predo) کی ہے۔ اُس نے اپنی آزاد خیالی صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھی بلکہ نوجوانوں میں بھی اُس کی تبلیغ شروع کی اُس کے خلاف عدالتِ احتساب میں مقدمہ چلایا گیا مگر اُس نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ علماء یہود نے اُس کو رشوت بھی دینے کی کوشش کی تاکہ وہ ہجرت کر جائے مگر اُس نے اس پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ بالآخر عدالت احتساب نے اُس کو دائرۂ یہودیت سے خارج کرکے اُس کا سماجی مقاطعہ کیا۔ اُس کے ایک ہمعصر یہودی شاعر نے ایک طویل ہجو بھی لکھی جو یہودی مذہبی حلقوں میں زبان زدِ خاص و عام ہوئی۔ یہ تو تھا یہودیوں کا حال لیکن عیسائیوں کی حالت بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ چنانچہ اسپنوزا سے نصف صدی قبل کی بات تھی جب کیتھلک چرچ (Catholic Church) نے ایک شخص مسمی بردنو (Bruno) کو اُس کے ملحدانہ خیالات کے جرم میں زندہ جلا دیا تھا۔

اسپنوزا نے اول اول تو اپنے شکوک علماء یہود سے رفع کرنا چاہے لیکن اس کو جلد ہی معلوم ہوگیا

کہ یہ کوشش بے سود ہے کیونکہ علماء روایات کی کورانہ تقلید سے آگے ایک قدم آگے نہیں جانا چاہتے اسپنوزا کو اس کا بھی جلد ہی احساس ہوگیا کہ اگر یہ روش اُس نے ترک نہ کی تو شکوک کا رفع ہونا ایک طرف، خود اُس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اب وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ جہاں تک "حقیقت" کا تعلق ہے، علماء اُس سے قطعاً ناآشنا ہیں اور ان کا مذہب سوائے حماقت پرستی کے اور کچھ نہیں۔

اسپنوزا نے اب اپنی نظریں علماء کی طرف سے ہٹاکر خود اپنی عقل کو خضرِ راہ بنایا اور یہی ہے مذہب کی بارگاہ میں وہ سب سے بڑا جرم جس کی سخت سے سخت سزا دینے کے بعد بھی جذبۂ انتقام آسودہ نہیں ہوتا۔ گویا مذہب اور عقل دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور مذہب کی سرحدیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں عقل کے حدود ختم ہوتے ہیں اسپنوزا نے اس ارادے کے ساتھ ہی انجیل اور تالمود (Talmud) کا از سرِ نو عمیق مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلہ میں اُس کو ایک یہودی عالم مورٹیرا (Morteira) سے جو نسبتاً مذہبی معاملات میں کم غلو رکھتا تھا کافی مدد ملی۔ اُس نے اسپنوزا کو اپنا شاگرد بنایا لیکن کسے خبر تھی کہ ایک دن شفیق اُستاد ہی شاگرد کا بدترین دشمن ہو جائے گا۔

دو اور نوجوان تھے جو پُرجوش انداز میں اسپنوزا کی ہمنوائی پر آمادہ تھے۔ شاید اسپنوزا سے ان لوگوں کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ لیکن انھیں لوگوں نے آگے چل کر اسپنوزا کی مخبری کی اور اُس کے متعلق طرح طرح کی غلط افواہیں پھیلائیں۔ اسپنوزا اور علماء یہود کے درمیان مابہ النزاع خیالات، وہی تھے جن کا آزاد خیال مفکرین اس سے پہلے بھی اظہار کر چکے تھے۔

یہودی صحایف کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ ان کی موجودہ ترتیب سکندرِ اعظم کے زمانہ کے بعد ہوئی ہے اور یہ ایسی بات نہ تھی جسے یہودی علماء برداشت کر سکتے۔ چنانچہ عدالت احتساب میں اُس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ اسپنوزا کا آزاد خیال اُستاد مورٹیرا (Morteira) اس عدالت کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے اسپنوزا کو مخاطب کر کے کہا:

"میں نے جس دلسوزی اور دل ہی سے تم کو تعلیم دی تھی، کیا تم اُس کا بدلہ یوں دینا چاہتے ہو؟ کیا تم کو اپنے جرم کی اہمیت اور سزا کا کچھ اندازہ ہے؟ تمھارا جرم یقیناً بہت بڑا ہے مگر ابھی لوٹنے کی راہیں بند نہیں ہوئی ہیں۔ تم پھر ایکبار غور کر لو۔"

مورٹیرا (Morteira) کی تقریر کے بعد ججوں نے اسپنوزا سے کہا کہ وہ یا تو معافی مانگے اور اپنے ملحدانہ خیالات سے باز آئے ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جائے۔ اُس نے جواب دیا:

"سزا کی اہمیت کا مجھ کو بخوبی اندازہ ہے جس کی مجھ کو دھمکی دی گئی ہے ------ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا کے متعلق

ہماری معلومات کا ماخذ قرار پائیں یہ چیزیں ہوں ...... مثلاً وہ اولین سنگی لوح جس کو موسیٰ پٹک کر پاش پاش کر سکتے تھے یا جو گم ہو سکتی تھی ...... وہ کتاب جو ہم تک ناقص اور پر از اغلاط شکل میں آئی ہو۔ اور پھر تم اُس کے بعد دوسروں پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہو۔ تمہارے خیالات خود کفر انگیز ہیں اور تم خود سب سے بڑے کافر ہو جو یہ سمجھتے ہو کہ خدا اپنی ذات کے متعلق حقیقی معلومات کسی ایسی شے کو سونپ سکتا ہے جس میں برداشت کا مادہ قلب انسانی سے بھی کم ہو۔"

بالآخر مذہب کے علمبرداروں نے، اُن تمام حربوں کو کام میں لاتے ہوئے جن کو قسامِ ازل نے اُنکے دست و بازو کے لئے مخصوص کر دیا ہے، اسپنوزا کو تمام لعنتوں کے ساتھ "مقدس مذہب" سے خارج کر دیا۔

یہودیت سے خارج ہونے سے پہلے ہی اسپنوزا کے تعلقات چند عیسائیوں کے ساتھ استوار ہو گئے تھے۔ اُنمیں ایک شخص وان ڈن ایڈن (Van den Eden) نامی بھی تھا۔ یہ پہلے یہودی تھا اُس نے امسٹرڈم میں ایک اسکول بھی کھول رکھا تھا۔ کچھ دنوں تک اسپنوزا نے اُس کے ساتھ قیام کیا۔ یہیں اُس نے ایڈن (Eden) کی تحریک پر لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھیں اور یہیں چند اور عیسائیوں سے شناسائی ہوئی جو ڈیکارٹ کے فلسفۂ جدید کے بیحد دلدادہ تھے۔

اس وقت اسپنوزا ایک ایسے گوشۂ عافیت میں تھا جہاں یہودیوں کی کوئی دسترس نہ تھی اس لئے وہ اور زیادہ برہم تھے۔ یہ بھی کتنی عجیب چیز ہے کہ انسان کی دوستی اور دشمنی میں اُس سے بھی کم فصل ہے جس قدر لوگ مردی و نامردی کے متعلق کہا کرتے ہیں۔ مورٹیرا (Mortecra) جو چند روز قبل اسپنوزا کا بہترین دوست تھا اب اُس کا بدترین دشمن تھا۔ اسپنوزا کے ایک سوانح نگار جین میکسی ملین لوکاس (Jean Maxi-milion Lucas) نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ "وہ لوگ جو قربانگاہ سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں معاف کرنا بالکل نہیں جانتے۔"

یہودیت کے صرف چند فروعی مسایل تھے، جن کے باب میں اُس نے اجتہاد سے کام لیا تھا۔ اور بقول انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اسپنوزا یہودیت سے قطعاً منحرف تھا، یا اس سے قطع تعلق کرنے پر تلا ہوا تھا، بلکہ اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اسپنوزا نے ۱۶۵۵ء میں سب کے ساتھ عبادت میں حصہ لیا اور ۱۶۵۵ء میں اپنے باپ کی برسی کے موقعہ پر باضابطہ عبادت کی اور دوسرے مذہبی رسوم ادا کئے۔

مورٹیرا (Morteira) اور اُس کے ہمنواؤں کے دل میں سب سے زیادہ یہ چیز کھٹک رہی تھی کہ جس شخص کو وہ ذلیل و خوار اور بے وطن کرنا چاہتے تھے، وہ اب بھی اُسی شہر کے ایک گوشہ میں موجود تھا اُن لوگوں نے اپنے جذبۂ انتقام کو آسودہ کرنے کے لئے ایک طریقہ بالآخر سوچ نکالا۔ مورٹیرا شہر کے حاکم اعلیٰ کے پاس گیا اور اسپنوزا کے کفر اور خدا دشمنی کے افسانے خوب گڑھ گڑھ کر سنائے اور اس کا یقین دلایا کہ یہودی عدالت

نے اُس کو جو سزا دی ہے وہ قطعاً حق بجانب ہے، اس لئے اُس کو فوراً جلاوطن کر دینا چاہئے۔ شہر کا حاکم صورت حال سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن وہ ایک طرف ایک معزز یہودی عالم کو صاف جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا اور دوسری طرف وہ غلط قدم بھی اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُس نے یہ درخواست علمار کلیسا کی طرف بڑھا دی، جنھوں نے اپنے "ہم پیشوں" کے خلاف فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسپنوزا کو چند ماہ کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن پھر وہ اُمسٹرڈم کبھی بھی واپس نہ آیا۔

اس سزا سے یہودیوں کو یقیناً سکون ہوا مگر اسپنوزا کو بجائے تکلیف کے اطمینان نصیب ہوگیا۔ وہ خود کچھ دنوں سے کسی گاؤں میں جاکر رہنے کا ارادہ کر رہا تھا کیونکہ علوم انسانیہ کے متعلق ایک فلسفی کو جتنا علم ہونا چاہئے، اسپنوزا اُس قدر علم حاصل کر چکا تھا۔ اب کسی گوشہ میں بیٹھ کر وہ حقیقت کی جستجو کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیز ایک اعتبار سے اور بھی ضروری تھی اور وہ یہ کہ خود اُس کے مذاق کے صرف ایک آدھ فلسفی تھے جن کی تصانیف سے وہ استفادہ کر سکتا تھا اُس نے یہاں بھی اپنی عقل ہی کو اپنا رہبر بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لئے جس قدر اطمینان کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے۔

اسپنوزا اُمسٹرڈم سے نکل کر ایک گاؤں رائن برگ میں پہونچا اور یہاں اُس کا قیام دو سال تک رہا۔ ابتداء میں تو لوگوں کو اُس کی جائے قیام کا علم نہ ہوسکا مگر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُس کے شناسا اور شیدایان علم رائن برگ پہونچنے لگے۔ شروع میں آنے والوں کی تعداد محدود رہی مگر رفتہ رفتہ اُس میں اضافہ ہونے لگا۔ اب لوگوں نے اسپنوزا کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ کسی ایسی جگہ قیام اختیار کرے جہاں لوگ بہ آسانی آجا سکیں۔ کچھ دنوں تک وہ ٹالتا رہا مگر پھر مجبوراً اُس کو رائن برگ کا قیام ترک کرکے ہاگ (Hague) کے شہر میں منتقل ہونا پڑا۔

ہاگ میں اسپنوزا کے یہاں آنے والوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہاگ ایک پُرفضا مقام تھا اور یہاں لوگ دور و دراز حصوں سے تبدیل آب و ہوا اور قابل دید چیزیں دیکھنے کے لئے آتے تھے اور انھیں نوادر میں اب اسپنوزا کی بھی ذات کا شمار ہونے لگا۔

ہاگ میں اُس کی مصروفیتوں میں ایک اضافہ اور ہوا یعنی خطوط کا جواب دینا کیونکہ اب یورپ کے مفکرین نے اسپنوزا سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ یہ خطوط کتابی صورت میں یکجا شایع ہو گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو لکھنے میں اُس کا کافی وقت صرف ہوتا رہا ہوگا، کیونکہ یہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پُرمغز اور مدلل ہوتے تھے۔ جب مطالعہ اور دیگر مصروفیتوں سے چھٹی ملتی تو وہ خوردبینوں اور دوربینوں کے شیشے گھستا اور اُن کو تیار کرتا۔

اُس کی صحت خراب تھی اور ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اُس کے لئے مکمل سکون و آرام کی ضرورت ہے لیکن اُسنے

ڈاکٹروں کے اس مشورہ کو کبھی قابل التفات نہ سمجھا۔ اُس نے اپنی مشغولیتوں کے مرتبہ خاکہ میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دی اس چیز نے اُس کی صحت کو خراب تر کر دیا مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

اسپنوزا سے پہلے کسی شخص نے یہ ہمت نہ کی تھی کہ صحائف آسمانی پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے کی جگہ ناقدانہ انداز میں غور و فکر سے کام لے۔ وہ پہلا مفکر تھا جس نے اپنی کتاب (Treatise on Theology+ Politics) میں اس مسئلہ پر مدلّل تنقید کی۔ دنیا میں افترا پردازی سے زیادہ انسان کے قلب و دماغ کو مجروح کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا حربہ ہو۔ اسپنوزا کی متذکرۂ بالا تصنیف کے سلسلہ میں علمار مذہب نے جو اوچھے اور کمینے حربے استعمال کئے ہیں اُن میں ایک افترا پردازی کا بھی حربہ تھا اور اس حربہ کو جس بیدردی کے ساتھ اس موقعہ پر استعمال کیا گیا اُس کی دوسری مثال مشکل ہی سے تاریخ میں ملے گی۔ انھوں نے اس کتاب کی عجیب عجیب بے سروپا شرحیں کیں ایک شخص ڈاکٹر ڈی وٹ (De Witt) نامی تھا، وہ اسپنوزا کو دو سو فرانک بطور پنشن دیا کرتا تھا۔ جب اُس کا انتقال ہوا تو یہودی علمار نے اُس کے جانشین کو اس قدر مجبور کیا کہ وہ پنشن بند کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اسپنوزا نے خاموشی کے ساتھ اپنی اس تصنیف کے مسودات ڈاکٹر وٹ کے جانشین کو دکھائے۔ اس نے غور کے ساتھ ان مسودات کو پڑھا اور اُس کے تمام شکوک رفع ہو گئے اور پنشن بند کرنے کا خیال اُس نے دل سے نکال ڈالا۔

علمار مذہب کے ان کمینہ حربوں نے اسپنوزا کو بدنام و رسوا کرنے کی جگہ اُس کی شہرت اور چار چاند لگا دئے شہزادہ کونڈ (Conde) جو خود صاحب علم و ذوق تھا اور جس کو فلسفیوں اور آزاد خیالوں تبادلۂ خیال کرنے اور اُن کی بحثیں سننے کا بیحد شوق تھا اُس نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اسپنوزا کو بلایا لیکن اسپنوزا نہ جا سکا متعدد درسگاہوں نے بھی اُسے اپنے یہاں جگہ دینا چاہی مگر اُس نے انکار کر دیا۔

بعض معاملات میں وہ دوسرے فلسفیوں سے بالکل مختلف مزاج واقع تھا۔ مثلاً وہ طبعاً بیحد نفاست پسند واقع ہوا تھا۔ خصوصاً جب کبھی وہ باہر نکلتا تو لباس کی درستگی اور اُن کی صفائی کا پورا پورا خیال رکھتا۔ اُس کا خیال تھا کہ لباس کی گندگی اور جسمانی کثافت کا خیالات پر برا اثر پڑتا ہے۔

اُس کے انداز گفتگو میں عجیب دلکشی تھی۔ جس سے وہ ایک مرتبہ گفتگو کرتا ہمیشہ کے لئے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا اُس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، تراش و خراش کے اعتبار سے زیادہ اچھے نہ ہوتے مگر اُس کی گفتگو بیحد مدلل ہوتی دوران گفتگو میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہوتی جس سے سننے والا بہت لطف اُٹھاتا۔

دوستی کے باب میں اسپنوزا بیحد بدنصیب واقع ہوا تھا۔ اُس کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ "جو لوگ اُس سے ملنے آتے اُن میں سے ہر شخص اُس کی دوستی کا دم بھرتا۔ مگر انسان کے دل سے زیادہ مخدوش اور ناقابل

اعتبار کوئی دوسری چیز نہیں۔ یہ دوستیاں بھی ایک نہیں بلکہ تقریباً سب کی سب مصنوعی تھیں۔ وہ لوگ جن پر اسپنوزا کے سب سے زیادہ احسانات تھے، اُنھیں لوگوں نے اُس کے ساتھ سب سے زیادہ برے سلوک روا رکھے۔

اسپنوزا ازدواجی زندگی کو انسان کے لئے کوئی لعنت یا مصیبت نہ سمجھتا تھا مگر اس کے باوجود اُس نے شادی نہیں کی۔ شاید اس ڈر سے کہ ازدواجی مشغولیتیں اُس کے مطالعہ و تفکر کی اُن مشغولیتوں میں حارج نہ ہوں جو اُس کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔

اسپنوزا مطالعہ کی وجہ سے دیرخوابی کا عادی ہوگیا تھا۔ اکثر تو اس کو رات رات بھر سونا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات اُس کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی اور اُس کو حرارت رہنے لگی۔ کچھ دنوں بعد اسی چیز نے شدت اختیار کی اور بالآخر فروری ۱۶۷۷ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔

م۔ص

باب الاستفسار

ترک مذہب کا مطالبہ

(سید تقی الدین - حیدرآباد دکن)

آپ کی طرف سے مسلمانوں یا کم سے کم علماء اسلام کو سب سے زیادہ شکایت یہ ہے کہ جب آپ مسلمہ عقاید اسلام کے قایل نہیں تو آپ اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہیں۔ کیوں نہ آپ اس کا اعلان کردیں کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کے بعد غالباً پھر کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ کی برہمی کا زیادہ تر سبب یہی ہے۔ کیا آپ نگار کے ذریعہ سے جواب دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

(نگار) اس مشورہ کا شکریہ، لیکن جن بزرگوں کا نام آپ نے لیا ہے ان کو بھی یہ مشورہ دیجئے کہ وہ بھی اپنے انسان ہونے سے انکار کردیں، کیونکہ اگر اسلام کے مسلمہ عقاید سے انکار کرنے کے بعد مجھے اپنے آپ کو مسلمان نہ سمجھنا چاہئے تو ان لوگوں کو بھی اپنے آپ کو انسان نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ مذہب کی حمایت میں یہ بھی انسانیت کے مسلمہ اُصول کے پابند نہیں رہتے۔

آپ یاد رکھئے، میں نے تنہائی میں بارہا غور کیا کہ یہ لوگ اپنے عقاید کے خلاف کوئی بات سُنکر کیوں برہم ہوتے ہیں لیکن میری سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ یا تو خود وہ بہت تنگ ظرف ہیں یا یہ کہ ان کا مذہب تنگ مایہ ہے۔ مذہب کو میں ایسا نہیں سمجھ سکتا اس لئے لامحالا انھیں حضرات کو تنگ نظر ماننا پڑتا ہے اور اس طرح سوال صرف ذاتیات کا پیدا ہوجاتا ہے، یعنی یہ لوگ نمایندۂ مذہب کی حیثیت سے مجھ کو بُرا نہیں کہتے، بلکہ اپنے آپ کو ایک خاص ادارہ کا عقل کُل جان کر مجھ سے صرف اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ میں کیوں اُنکے اداروں کا احترام نہیں کرتا۔

میں اسوقت ان تمام واقعات کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا، جنکی بناء پر ان حضرات کے ذاتی بغض وعناد کو پوری طرح ثابت کیا جاسکتا ہے، کیونکہ باوجود نہایت معمولی، جاہل، اور کم ظرف انسان ہونے کے میں اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہیں کہنا چاہتا جو میرے مخالفین کے ذاتی اخلاق سے تعلق رکھتی ہو، اور اس طرح میں بھی اخلاق کی اس نیچی سطح پر آجاؤں جو ان اکابر قوم و مذہب کے لئے باعث فخر ہو تو ہو، لیکن میرے لئے کبھی وجہ ناز نہیں ہوسکتی۔

سید سلیمان اور اُن کے شرکاء نے پبلک کو میرے خلاف اُبھارنے کے لئے جس قدر کذب و فریب سے کام لیا ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے مجھ سے وہ باتیں منسوب کیں، جو کبھی میری زبان سے نہ نکلی تھیں اور میرے خیالات کو مسخ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ رسول اللہ کو میں بہت بڑا انسان سمجھتا ہوں، اُن کے اخلاق کی بلندی کا قایل ہوں، لیکن سید سلیمان فرماتے ہیں کہ یہ میرے دل کی بات نہیں

ہے، اور کوئی شخص پوچھنے والا نہیں کہ وہ کس کشف کی بنا پر میرے ضمیر پر یہ حکم لگاتے ہیں۔ میں نے کہیں نہیں لکھا کہ
سول اللہ نے کلام اللہ میں سنی سنائی باتیں خود اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر دیں، لیکن سید سلیمان علانیہ یہ جھوٹ
لتے ہیں اور کوئی ان سے اس لغو بیانی کا مطالبہ نہیں کرتا۔

یقیناً میں نے جون کے نگار میں لکھا تھا کہ میں کلام اللہ کو الہام یا وحی نہیں سمجھتا، لیکن اس سے مقصود صرف
تھا کہ عام طور پر جس معنی میں اسے وحی و الہام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اس کا قایل نہیں ہوں، چنانچہ میں نے بعد کو اسکی
مراحت بھی کر دی تھی، لیکن میرے مقصود و مفہوم کو قصداً چھپایا جاتا ہے اور میرے الفاظ کی ایسی غلط تعبیر
لی جاتی ہے جو میرے معہود ذہنی کے بالکل خلاف ہے۔

میں نے صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ وحی و الہام کا تعلق خود ذات نبوی یا رسول اللہ کی اس فطرت بلند سے ہے جو
قدرت کی طرف سے عطا کی گئی تھی، اس لئے کلام مجید کو خدا کا کلام کہنا اس لحاظ سے بالکل صحیح ہے کہ وہ نتیجہ ہے اک فطری اشارہ
کا، ایک قدرتی ملکۂ رشد و ہدایات کا اور ایک رسول ایسے کلام کو جو اس جذبہ کے زیر اثر بے اختیارانہ زبان سے ادا ہو جائے
الہام خداوندی اور وحی ربانی کہہ سکتا ہے لیکن جس حد تک صرف الفاظ کا تعلق ہے انھیں خدا کے الفاظ نہیں
کہا جا سکتا کیونکہ خدا کا صحیح تصور اس مادی نسبت کے منافی ہے، وہ یقیناً انسانی الفاظ ہیں اور اسی زبان کے الفاظ
ہیں جو عام طور پر سرزمین عرب میں رائج تھی۔ لیکن میرے اس بیان کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بالکل غلط اتہامات
مجھ پر قایم کئے جاتے ہیں —— جو کچھ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے، جس قدر کاوش انھوں نے منقولات کے پیش کرنے
میں صرف کی ہے اور جن لایعنی معقولات سے انھوں نے جواب دینے میں کام لیا ہے اُن کی حقیقت پر آیندہ کسی وقت
تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ لیکن فی الحال میں اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اصل مسئلہ یا اصل اعتراض
کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ سب سے پہلے انھیں کلام کی حقیقت پر بحث کرنا چاہئے اور پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ کلام مجید میں جو
الفاظ عربی زبان کے پائے جاتے ہیں کیا وہ کلام انسانی سے علٰحدہ کوئی صورت رکھتے ہیں اور اسی پر بحث کا اختتام ہے۔
اگر وہ یہ مانتے ہیں اور انھیں ماننا پڑے گا کہ کلام مجید کا ہر ہر لفظ انسانی زبان سے تعلق رکھتا ہے تو پھر مجھے اُن سے کوئی
اختلاف نہیں ہے اور اگر وہ یہ تسلیم نہیں کرتے ہیں تو اس کھلی ہوئی حقیقت سے انکار کرنے کے دلایل پیش کرنا ان کا
فرض ہے میرا نہیں —— پھر ان حالات میں جبکہ میں خدا اور رسول کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا وہ اُن کو یا کسی کو
کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسلمان نہ سمجھے اور میں کیوں ترک اسلام کا اعلان کروں جبکہ میں عقاید اسلامی کو
اپنے نزدیک اُن سے بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب بالکل انفرادی چیز ہے اور اسکا تعلق انسان کے
ضمیر سے ہے۔ سید سلیمان اگر مجھے گمراہ سمجھتے ہیں تو میں بھی ان کو ایسا ہی سمجھ سکتا ہوں، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ مجھے
گمراہ سمجھ کر گالیاں دینا اور ذاتیات پر حملہ کرنا بھی ثواب خیال کرتے ہیں، اور میں اس فعل ناصواب کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرتا

سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریا بادی سے!

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے — تو پھر یہ دشمنیِ عقل و ہوش کیا معنی
یہ شور کافر و زندیق و ملحد و بے دین — برائے گوشِ نصیحت نیوش کیا معنی
سوالِ "وحی" پہ آخر یہ برہمی کیسی — مثالِ "نحل" پہ جوش و خروش کیا معنی

اگر "سکوتِ روایات" ہے "جوابِ خرد"
تو پھر یہ شورشِ محشر بدوش کیا معنی

"حدیثِ دین" کو عقل و خرد سے کیا نسبت" — یہ ادعا بزبانِ خموش کیا معنی
"بغیر نطق جو ممکن ہے گفتگو و پیام" — تو پھر وساطتِ پیکِ سروش کیا معنی
جو بابِ میکدۂ غور و فکر باز نہیں — تو دعوتِ ہوس نائے و نوش کیا معنی
کلام و فلسفہ ما! خرد کے دھوکے ہیں — مگر یہ "علم حقیقت فروش" کیا معنی

فریبِ فہم میں آکر۔ فریبِ فہم نہ دے
یقیں کے نام سے ہم کو پیامِ وہم نہ دے

"نگاہِ فکر" کو ایماں طلب نہیں کہتے — تلاشِ حق کو "غمِ بے سبب" نہیں کہتے
"تجلیاتِ جنوں" پردۂ "دلیل" نہیں — جمالِ حق کو حجابِ ادب نہیں کہتے
"یقینِ غیب" پہ تسکین کا مدار سہی — ہر ایک شکلِ توہم کو رب نہیں کہتے

محمدِ عربی کو جو مانتا ہو نبی،
عزیز دوست! اُسے بولہب نہیں کہتے

فضائے چرخ کو تو بندشِ نظر نہ سمجھ — اسے نہایتِ پرواز بال و پر نہ سمجھ
طلوعِ صبحِ قیامت ہے انتہا اس کی — فسانۂ غمِ تحقیق مختصر نہ سمجھ
جمالِ قدس پہ جس کی نگاہ رہتی ہو — اُسے جہانِ تماشا میں بے بصر نہ سمجھ
رسول کو جو امامِ زمن سمجھتا ہو — اُسے مقامِ رسالت سے بے خبر نہ سمجھ

نیاز عظمت و شانِ پیمبری داند
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

گوہر حسن گوہر

نغمۂ وفریاد!

اُن کے سامنے!

نظروں کے سامنے ہے اک شوخ ماہ پارا
میں لڑکھڑا رہا ہوں دُنیا کوئی سہارا

وہ اُس کا میری جانب یکبارگی اشارا
رخ جس طرح بدل دے دریا کا تیز دھارا

اُس جانِ گلستاں نے انگڑائی ناز سے لی
یا طاقِ میکدہ سے شیشہ کوئی اُتارا

رنگیں لبوں پہ رقصاں ہلکی سی مُسکراہٹ
جیسے شفق کی ضو میں اک کانپتا ستارا

یہ بے پناہ شوخی، یہ مدھ بھری جوانی
اک بیقرار دریا جس کا نہیں کنارا

اندازِ کم نگاہی، جلووں کی بے پناہی
بے تاب ہے تمنا، سکتہ میں ہے نظارا

یہ چال یہ قیامت، یہ ناز یہ شرارت
حل ہو گیا ہے جیسے شوخی میں گرم پارا

میں بسمل سراپا، در زعم باطلِ خود
وہ قاتلِ مجسم "بالاتفاق آرا"

یہ کس نے مسکرا کر نیچی نظر سے دیکھا،
جنبش میں آگیا ہے دل کا نظام سارا

اِس مختصر نظر پہ، سب جان و دل نچھاور
اک کامیاب سودا جس میں نہیں خسارا

ماہر یہی گھڑی ہے معراج زندگی کی
اتنے حسیں مناظر ملتے نہیں دوبارا

مشاہدہ!

میرے حالِ دل کی کس صورت سے رسوائی ہوئی
روک لی ظالم نے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی،

رنگ و بو کے جھُرمٹ میں!

یہ ہاتھ یہ پھُول سی گلابی
یہ آنکھ یہ عارضِ شہابی

اے رحمتِ حق! معاف کرنا
بننا ہی پڑا مجھے شرابی

ایک حُزنیہ!

چمن میں سوگ ہے اُس بدنصیب غنچہ کا
جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

تاثر:-

اُس نے ایک دن ماہر مُسکرا کے دیکھا تھا
وہ گھڑی محبت کی روز یاد آتی ہے

ماہر القادری

مذاہبِ عالم کی تنگ ظرفی

کہا ہے ایک نظر ور نے کس سلیقے سے
زبانِ راز میں ایک سرمدی طریقے سے!!

کہ اِس صدی کے بتوں میں وطن بھی اِک بُت ہے
ختن میں نخوتِ بوئے ختن بھی اک بُت ہے

وطن سے صرف محبت ہی ہم نہیں کرتے
کچھ اِس صنم کی پرستش بھی کم نہیں کرتے

مگر یہ نکتۂ حکمت نہ ہے وہ بجھا سا چراغ
کہ جس سے روشنی کرتا ہے اخذ دل نہ دماغ

یہ فلسفہ بھی تقاضائے بُت پرستی ہے
کہ اسکے تہ میں بھی اک برہمن کی مستی ہے

ہے غزنوی کی جبیں میں بھی اک صنمخانہ
عجیب چیز ہے ساقی! بتوں کا افسانہ،

وطن کے بُت کو نہیں پوجتے جو اہلِ نظر
ہے پائے نخوتِ مذہب پہ اُن کے شوق کا سر

وطن کے بت کی پرستش ہے دل کی خاصیت
بھری ہوئی ہے اس آتش سے زیست کی فطرت

چمن میں نکہتِ پراں کی جان رہتی ہے
گرنے کے دل میں نوا کی زبان رہتی ہے

تڑپ ہے موج کی، دریا کا ایک ذکرِ جمیل
جنوں ہے ذرّے کا اک جزوِ داستانِ طویل

ذرا فلک سے ستاروں کو توڑ کر دیکھو
کرن کا ربط زمینوں سے جوڑ کر دیکھو

اُٹھا کے نشّے کو مے سے ذرا دکھاؤ تو
بغیر شمع کے پروانے کو جلاؤ تو

اُتار کر ذرا قوسِ قزح کو رفعت سے
طلسمِ رنگ کو رکھو تو قیدِ حکمت سے

وطن ہے مذہبِ دل، دل ہے ایک پروانہ
ہے ناگزیر محبّت کا رقصِ مستانہ

وطن کا عشق اگر تنگیِ تصوّر ہے،
تو مذہب ایک تنگ ظرفیِ تفکّر ہے

مضر نہیں ہے جو انساں کو بت پرستی سے
تو ربط چاہیے ہر جاں نواز مستی سے

حرم میں پڑھتے ہیں جو لوگ صبح و شام نماز
ہے اُن کا فرض کہ دیں دیر کو بھی نذر و نیاز

ہو دردِ عشق بہم مذہب و وطن کے لئے
نگاہ چاہیئے رتشنہ چمن چمن کے لئے

عدم

غزل : قہر اکبر آبادی

کوئی نشاں نہ کوئی پتہ پا رہا ہوں میں
منزل کی دھن ہے یہ کہ چلا جا رہا ہوں میں

یوں مل رہی ہے اب مجھے ذوقِ طلب کی داد
کچھ اُن کو ملتفت بہ کرم پا رہا ہوں میں

وارفتہ راہِ عشق میں ہوں گامزن مگر
اس کی خبر نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں میں

وارفتگی و بیخودیِ شوق السلام
آہٹ سی ایک دل کے قریں پا رہا ہوں میں

دُنیا تمام ہیچ ہے دُنیا کا ذکر کیا
تجھ سے بھی بے نیاز ہوا جا رہا ہوں میں

ایسا نہ ہو کہ حُسن بُھلا دے پیامِ عشق
پھر داستانِ درد کو دہرا رہا ہوں میں

شاید مرا مذاقِ خلش خام ہے ابھی،
دُنیا کی شورشوں سے جو گھبرا رہا ہوں میں

وہ دِل جو ہوچکا ہے زمانہ سے بے نیاز
اُس کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں میں

اے قہر سرد ہوگئی کیا نبضِ کائنات
نغموں سے کیوں یہ آگ سی برسا رہا ہوں میں

غزل : پروفیسر شور

اِس احتیاط سے نزدیک آ رہا ہے کوئی
کہ جیسے مجھ سے ہی دامن بچا رہا ہے کوئی

نگاہِ شوق سے پردے اُٹھا رہا ہے کوئی
کھڑا ہے سامنے اور مسکرا رہا ہے کوئی

کچھ اس طرح سے تصور میں آ رہا ہے کوئی
سمجھ رہا ہوں کہ مجھ میں سما رہا ہے کوئی

رکا رکا یہ تنفس جھکی جھکی یہ نظر!
خود آ رہا ہے کوئی، یا بلا رہا ہے کوئی

سکوتِ شب میں یہ دل کی دھڑک ارے توبہ!
مجھی کو میرا فسانہ سنا رہا ہے کوئی

یہ مد و جزرِ تجلی، یہ چاند کا عالم!
فضائے نور میں جیسے نہا رہا ہے کوئی

چلا ہوں شور کچھ اس طرح رہگزاروں سے
کہ جیسے دور سے مجھکو بلا رہا ہے کوئی

مطبوعات موصولہ

کلیم عجم حضرتِ سیماب اکبر آبادی کی ۷۰۰ غزلوں کا مجموعہ ہے جو تین ادوار میں تقسیم کرکے درج کی گئی ہیں، پہلا دور "صہبائے کہن" ہے جس میں ۱۸۹۰ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک کی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ دوسرا دور "بادۂ دوشیں" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۱۹ء تک کی غزلیں نظر آتی ہیں، تیسرا دور "نشید نو" کا ہے جس میں ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کی غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں۔

اس ترتیب سے ایک شخص کو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ شاعر کی غزلگوئی میں رفتہ رفتہ کیا تغیر پیدا ہوا اور امتداد زمانہ کا اس کی شاعری پر کتنا اثر ہوا۔

جناب سیماب دورِ حاضر میں ایک اُستاذ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن کی غزلوں کو دیکھ کر ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اُستادانہ حیثیت انھوں نے ایک مستحق کی حیثیت سے حاصل کی ہے۔

"صہبائے کہن" ان کی نوجوانی کا کلام ہے جب انھیں غالباً یہ شہرت حاصل نہ تھی، لیکن اُسوقت بھی انکا رنگِ تغزل اس قسم کے اشعار سے خالی نہ تھا:

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں ۔۔۔ اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی،
ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے ۔۔۔ نہ تھا حجاب، تو آنکھوں میں اشک بھر آئے
ایک وہ شمع نہ ہوگی جو بجھی جل جل کر ۔۔۔ شام بھی ہوگی زمانہ میں سحر بھی ہوگی

ان کا یہی رنگ "بادۂ دوشیں" میں اور زیادہ پختہ ہو کر یوں نظر آتا ہے:

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حُسن تھا ۔۔۔ دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب کی
ورقِ گل ہو کہ آئینہ زارِ شبنم ۔۔۔ انھیں ہر رنگ سے آتا ہے نمایاں ہوتا
آیا مری سمجھ میں مآلِ کلیم و طور ۔۔۔ جب سر چڑھا لیا تو نظر سے گرا دیا
کوئی چمن نہیں ایسا جہاں بہار نہیں ۔۔۔ مگر بہار مرے دل کو سازگار نہیں

"نشید نو" بڑا حصہ ہے اور ۱۷۱ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سیماب صاحب کی شاعری کا ارتقاء

پوری طرح نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی، تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا
اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا
تا چند اعتبار پہ یوں سجدۂ نیاز ہوتے وہ سامنے تو مزہ بندگی کا تھا
ہم اور تیری بزم میں آتے، محال تھا لیکن کسی خیال نے مجبور کر دیا
روایاتِ محبت میں نہ تبدیلی ہوئی ابتک ہزاروں انقلاب آتے رہے تاریخ انساں میں

سیماب صاحب ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کو افادی حیثیت دینے میں بڑا حصہ لیا ہے اور بہت سے وہ بدنما داغ جن کی وجہ سے ہماری شاعری بدنام تھی، دور کر دئے۔

سیماب صاحب کے کلام کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر اس نے پہلے پوری طرح غور کر لیا ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ اسے پیش کرنا چاہتا ہے، اسی لئے اُن کے یہاں خیال کی سخافت و دنائت یا اندازِ بیان کی رکاکت کہیں نہیں پائی جاتی، گو اس ملہمانہ آمد کی بھی کمی ہے جو فن سے زیادہ صرف جذبات کی بیخودگی کو دیکھتی ہے۔

اس مجموعہ میں سیماب صاحب کے وہ چودہ خطبات بھی شامل ہیں جو انھوں نے شعر و شاعری پر مختلف صحبتوں میں پڑھے تھے۔ یہ خطبات بجائے خود ایک نقادِ شعر و ادب کے لئے بڑے کام کی چیز ہیں۔

سیماب صاحب نے اپنے حالات بھی اس مجموعے میں شامل کر دئے ہیں اور ایک فہرست متروک و مختار الفاظ کی بھی دیدی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ ہے اور مجموعہ قصر الادب آگرہ سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

دستور الاصلاح

یہ تصنیف بھی مولانا سیماب اکبرآبادی کی ہے۔ اس میں پہلے بتایا گیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ اصلاحِ شعری سے قبل شاگرد و اُستاد دونوں کو خود اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور پھر اصلاح کے طریقوں سے بحث کرکے اساتذۂ متقدمین و متاخرین اور شعراءِ حال کے نمونے پیش کئے ہیں اور پھر اصلاح کی مثالیں درج کی ہیں، اس میں شک نہیں کتاب کام کی ہے اور اس کے مطالعہ سے فنِ شعر میں کافی درک پیدا ہوسکتا ہے اس کی قیمت ۱۲؍ ہے۔ قصر الادب آگرہ سے خط و کتابت کی جائے۔

اُردو شاعری پر اک نظر

مسٹر کلیم الدین احمد بی۔اے (کیمبرج) پروفیسر انگریزی پٹنہ کالج کی تصنیف ہے اور جدید اصولِ انتقاد کے لحاظ سے غالباً بالکل پہلی تصنیف ہے جو اس قدر شرح و بسط کے ساتھ اُردو شاعری پر لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں شعراء متقدمین و عہد وسطیٰ کے کلام کو پرکھا گیا ہے اور تمیر سے لیکر انیس و دبیر تک سب کا ذکر اس سلسلہ میں آگیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کو البتہ علٰحدہ ضمیمہ کی صورت میں لیا گیا ہے غالباً مصنف سے پہلے سہو ہوگیا تھا اس لئے بعد کو بڑھانا پڑا۔

دوسرے حصہ میں آزاد و حالی سے لیکر اس وقت تک کے شعراء سے بحث کی گئی ہے جن میں ترقی پسند شعراء بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ضخامت رکھتی ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہم بیکار کہہ سکیں۔ کام کی باتیں کام کی زبان میں بتائی گئی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے کافی غور و مطالعہ کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہمیں یا کسی اور کو ان کی رائے سے کہیں کہیں اختلاف ہو، لیکن اس رائے میں، مجھے اُن سے بالکل اتفاق ہے کہ "موجودہ زمانہ کے قومی، ملی و سیاسی مضامین نے اُردو شاعری کو وہی نقصان پہونچایا ہے جو کبھی عشقیہ مضامین کی وجہ سے پہونچا تھا۔ اور اگر اس جنس کی یہی ارزانی رہی کہ ہر وہ شخص جو شعر موزوں کر سکتا ہے، قومی و ملی شاعر بن بیٹھے تو "اُردو شاعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا"

انداز بیان وہی ہے جو فن انتقاد کی انگریزی کتابوں کا ہوتا ہے، لیکن زبان کی لغزش ضرور کہیں کہیں پائی جاتی ہے، جو چنداں قابل لحاظ نہیں۔ بہرنوع کتاب نہایت مفید ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اُردو شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔ قیمت ۶ؔ اور ملنے کا پتہ کتابستان، الہ آباد۔

اُردو کہاوتیں مسٹر عبدالرافع فریدی ام۔ اے کی تالیف ہے جس میں اُردو کی تمام اونچے اور نیچے درجے کی وہ کہاوتیں جمع کردی گئی ہیں جو ہماری زبان کا جزو بن گئی ہے۔ ہر کہاوت کے ساتھ اس کا مفہوم بھی بتا دیا گیا ہے، لیکن کتابت کی اتنی غلطیاں پائی جاتی ہیں کہ اس کو دوبارہ طبع کرائے بغیر ان کا ازالہ ممکن نہیں۔ شروع میں کہاوتوں کی تاریخ پر ایک مختصر لیکن نہایت دلچسپ مقالہ بھی نظر آتا ہے۔ کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ مولف سے محلہ زنبورخانہ لکھنؤ کے پتہ پر خط و کتابت کی جائے۔

کارل مارکس کامریڈ بارتی کی تالیف ہے جس میں موجودہ اشتراکیت کے ابوالآبا کارل مارکس کے حالات اور اس کے معاشی و سیاسی نظریوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس عہد کے اشتراکی انقلاب کا پس منظر بالکل کارل مارکس کی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اس لئے ہر وہ شخص جو علمی اور عملی حیثیت سے اشتراکیت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ پہلے کارل مارکس کا مطالعہ کرے۔ بارتی صاحب نے اس مختصر رسالہ میں سارا بات کو پیش کردیا ہے جو کارل مارکس کے بنیادی اُصول کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

ان اگر اور زیادہ آسان ہوتی تو بہتر ہوتا۔

یہ کتاب مکتبۂ اُردو لاہور سے چھ آنے میں مل سکتی ہے۔

اسٹالین یہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے محمد اشرف خاں عطا نے اُردو میں منتقل کیا اور مکتبۂ اُردو لاہور نے شایع کیا ہے۔

اس رسالہ میں سوویٹ حکومت کے نظام اور اس کی ترقیوں سے بحث کر کے اسٹالین کے حالات اور روس کی موجودہ سیاست خارجہ سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ موجودہ جنگ میں اسٹالین کی حیثیت اس بادنما کی سی ہے جس کے ذریعہ سے ہوا کا رُخ پہچانا جاتا ہے اس لئے اسٹالین کے حالات اور اس کی پالیسی کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو موجودہ جنگ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ قیمت ۲ روپے۔

انقلاب فرانس مکتبۂ اُردو لاہور پہلا اڈیشن اس سے قبل شایع کر چکا تھا، اب یہ دوسرا اڈیشن شایع کیا گیا ہے اس کے مولف بھی کامریڈ بارلی ہیں۔ انقلاب فرانس کا مطالعہ اب کلاسکی مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے سیاسیات کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے واقف ہو۔

اس کی قیمت بھی ۲ روپے۔

افتتاح الاندلس ترجمہ ہے ابن القوطیہ کے عربی رسالہ کا جسے مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ام۔اے، پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ نے پیش کیا ہے۔ فاضل مترجم نے ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کر دیا ہے اور مفید حواشی بھی دیدئے ہیں، جن سے ترجمہ کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

فتح اندلس، تاریخ اسلام کا خاص واقعہ ہے اور اس پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسی کو پیش نظر رکھکر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے جو کافی سلیس و آسان ہے، ادارۂ کتابستان الہ آباد سے یہ کتاب ... میں مل سکتی ہے۔

یادگار نصیر مجموعۂ کلام ہے مولوی محمد نصیر الدین علوی مرحوم کا جسے اُن کے بھائی سید ظہیر الدین احمد علوی نے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں متعدد حضرات کے تعزیت نامے درج کئے گئے ہیں اور پھر ان کا فارسی و اُردو کلام پیش کیا گیا ہے۔ تعزیت ناموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر مرحوم نہایت اچھے انسان تھے اور کلام کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر بھی بُرے نہ تھے۔

اس مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ شروانی بک ڈپو علی گڈھ۔

پاکستان ضیاء سرحدی کا مختصر سا ڈرامہ ہے جو انھوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں لکھا ہے اور غالبًا یہ پہلی علامت ہے اس بات کی کہ یہ تحریک شاید ڈراموں اور افسانوں کی حیثیت سے

آگے نہ بڑھ سکے - خلوتیاں راز تو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تحریک کا مقصود سوائے ڈرانے دھمکانے کے کچھ نہیں لیکن ضیا صاحب اسے زیادہ غایر نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں - اعظم بک ہاؤس - ماہم - بمبئی سے یہ ڈرامہ مل سکتا ہے

قرآن اور اقبال جناب ابو محمد مصلح کی تالیف ہے جس میں کلام اقبال سے وہ اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو تعلیمات قرآن سے متعلق ہیں - ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدر آباد دکن نے اسے شایع کیا ہے اور قیمت دو روپیہ ہے -

سلطان محمد قلی قطب شاہ قطب شاہیوں میں محمد قلی قطب شاہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی گلدستہ میں چوٹی کے پھول کو حاصل ہوتی ہے - یہ بڑا بادشاہ، بڑا شاعر اور بڑا شخص تھا اور جس طرح دکن کی کوئی تاریخ اس کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اسی طرح دکن کی کسی ادبی تاریخ میں اسکی شاعری کا ذکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور پروفیسر زور کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے - اس میں قطب شاہ کے مفصل حالات بھی درج ہیں اور اُن کے اُردو فارسی کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے - یہ تصنیف، فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اُصول کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور حوالہ جات، تصاویر و نقوش، طباعت و کتابت غرض ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے - پروفیسر زور نے اس کی ترتیب و تالیف میں جس محنت و سلیقہ سے کام لیا ہے اسکی جتنی تعریف کی جائے کم ہے -

قیمت پانچ روپیہ اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد - حیدر آباد دکن -

فن تقریر خطابت کا سلیقہ بالکل فطری چیز ہے، لیکن چونکہ اب ہر فطری ودیعت کو علمی جامہ پہنایا جا رہا ہے اس لئے خطابت کو بھی فنی حیثیت دیدی گئی ہے اور یورپ میں اس موضوع پر بکثرت لکھی گئی ہیں - اُردو میں غالباً سب سے پہلی کوشش ادارۂ ادبیات اُردو کی ہے جس نے اس رسالہ کے ذریعہ سے مجملاً لیکن جامع حیثیت سے اس فن کی خصوصیات کو پیش کیا ہے -

قیمت ۱۲ار اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن

مقدمۂ تاریخ دکن جناب عبد المجید صدیقی اُستاذ تاریخ جامعۂ عثمانیہ کی تالیف ہے جس میں انھوں نے دکن کے تمام شاہی خاندانوں کے شجرے مختصر تمہید کے ساتھ دیدئے ہیں اس کے مطالعہ سے بیک نگاہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے لیکر اس وقت تک کتنے خاندانوں نے کب سے کب تک حکومت کی اور حکمراں افراد کون کون تھے - مولف لکھتے ہیں کہ "اس کو تاریخ دکن کا نقش اول سمجھنا چاہئے جو اس کے بعد تفصیل سے لکھی جائے گی" لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی تفصیلی تاریخ نہ لکھی جائے تو بھی یہ مقدمہ ایک حد تک اس فرض کو پورا کر سکتا ہے - اسوقت عام اشاعت تعلیم کے لئے بڑی بڑی کتابوں کی اتنی زیادہ ضرورت

نہیں ہے، جتنی مختصر کتابوں کی، اس لئے یہ مقدمہ بجائے خود کام کی چیز ہے اور تاریخ دکن کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ازبس مفید۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن۔

نمودِ زندگی جناب سید علی منظور حیدر آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں یکجا کردی گئی ہیں جو اُردو کے مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں۔ جناب منظور حیدر آباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کی ۱۰۱ نظمیں ہیں اور محبت سے لیکر ترکِ محبت تک جتنی منزلیں اخلاقی یا معاشی حیثیت سے سامنے آسکتی ہیں اُن سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ان کی شاعری کو یہ خصوصیت کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں نہایت سادگی اور آسانی سے کہ جاتے ہیں اُن کی غزلوں میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور لطف دیجاتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ پر کھلیں گے اور ابھی رازہائے عشق — دل کو ملے گی لذتِ بیچارگی کچھ اور،
ضبطِ گریہ کی تلقین ختم کر بس اے ہمدم — بات بات پر رونا بے سبب نہیں آتا
لطفِ رنجش بیجا آج دونوں پاتے ہیں — مسکرا رہے ہیں وہ، دل ہے شادماں اپنا
میں نے جب کبھی دیکھا سر جھکا لیا تو نے — تو نے جب کبھی دیکھا دل تڑپ گیا میرا
ان کی مشکوک نظر میں وہ مزا تھا منظور — کہ یقیں اپنی محبت کا دلایا نہ گیا،
ساتھ ان کے لے رہا ہوں میں گلگشت کے مزے — یہ خواب ہی سہی مرا جی تو بہل گیا،

قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن

کاغذ کی ناؤ مجموعہ ہے صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے ان چھ ڈراموں کا جو حیدر آباد لاسلکی اسٹیشن سے نشر کئے گئے۔ صاحبزادہ میکش، حیدر آباد کے اُن نوجوانوں میں سے ہیں جو اسوقت زبان کی خدمت میں شبانہ روز مصروف نظر آتے ہیں۔

اس مجموعہ میں اکثر ڈرامے حُزنیہ ہیں اور جناب میکش کی فطرت اسی نوع کے ڈرامہ لکھنے کے لئے زیادہ موزوں واقع ہوئی ہے وہ ایک خاموش انداز کے سوچنے والے نوجوان ہیں اور اس لئے وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں اس میں ایک خاموش حیرت کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے۔ تمام ڈرامے ہماری معاشرت سے متعلق ہیں اور کافی اثر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

یہ کتاب بھی عہ میں سب رس کتاب گھر حیدر آباد سے ملسکتی ہے۔

ملک گوہریں ایک منظوم ڈراما یا آپیرا ہے جسے محمد جلال الدین رشک نے تصنیف کیا ہے۔ مصنف نے

ابتدا میں اس کی صراحت بھی کردی ہے کہ اس آیتہ سے ان کا مقصود کیا ہے - انھوں نے اس میں اپنا نظریہ محبت کو پیش کیا ہے جو جنسیات سے ہٹ کر صرف کائناتی حیثیت رکھتا ہے - قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن -

اُردو رسم خط رسالہ ہے محمد سجاد مرزا ام - اے پرنسپل عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدر آباد کا جس میں انھوں نے علمی، تاریخی اور میکانکی حیثیت سے ثابت کیا ہے کہ اُردو رسم خط کے لئے جو ٹائپ کامیاب ہو سکتا ہے وہ نستعلیق نہیں بلکہ نسخ سے بننا چاہئے - انھوں نے پہلے عربی اور فارسی رسم خط کی تاریخ پیش کی ہے اور پھر اُردو رسم خط کے مختلف ادوار سے بحث کی ہے اور آخر میں خود وہ نمونہ پیش کیا ہے جو ٹائپ کے لئے موزوں ہو سکتا ہے - فاضل مصنف نے اس کی ترتیب میں نہایت سلیقہ و محنت سے کام لیا ہے اور ضرورت ہے کہ ارباب فن اس پر غور کریں - قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن -

---

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۳۲ء (غالب نمبر) - غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ - علاوہ محصول -

جنوری ۳۵ء (اُردو شاعری نمبر) اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۲۶ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے ساتھ جس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے - قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری ۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

جنوری ۳۷ء ڈرامہ اصحاب کہف - خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے - صفحات ۱۴۴ - قیمت عہ علاوہ محصول -

جنوری ۳۸ء تاریخ اسلامی ہند - یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا - صفحات ۱۵۲ قیمت ہر - علاوہ محصول

جنوری ۳۹ء (مصحفی نمبر) اسکے بعض عنوانات یہ ہیں :- حیات مصحفی - اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۴ - قیمت عہ علاوہ محصول -

جنوری ۴۰ء (نظیر نمبر) بعض عنوانات :- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۲۸ قیمت عہ علاوہ محصول -

منیجر نگار لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کے جہازوں کی روانگی

حکومت ہند کے مشورے سے حاجیوں کی روانگی کے لئے جہازوں کا انتظام ہوگیا ہے جسکے لئے مغل لائن بہترین رہائش کا انتظام اور سہولتیں بہم پہونچائے گی۔ جنگ کی وجہ سے جہازوں کی روانگی کی تاریخ اور جہازوں کی روانگی کی تاریخ اور جہازوں کے نام نہیں شایع کئے جاسکتے لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کے سرکاری اعلان مورخہ ۱۹ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء کے مطابق عازمان حج ۱۶ دسمبر تک بمبئی اور ۱۹ دسمبر تک کراچی پہونچ جانا چاہئے۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہوگی

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ
فرسٹ کلاس کا واپسی کا ٹکٹ معہ خوراک:	۷۲۵ روپیہ	۷۰۰ روپیہ
تختہ جہاز کا ٹکٹ واپسی معہ خوراک کے:	۱۹۵ روپیہ	۱۸۹ روپیہ

مزید تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ سے خط و کتابت کیجئے:

ٹرنر ماریسن کمپنی لمیٹڈ

[illegible] اسٹریٹ بمبئی